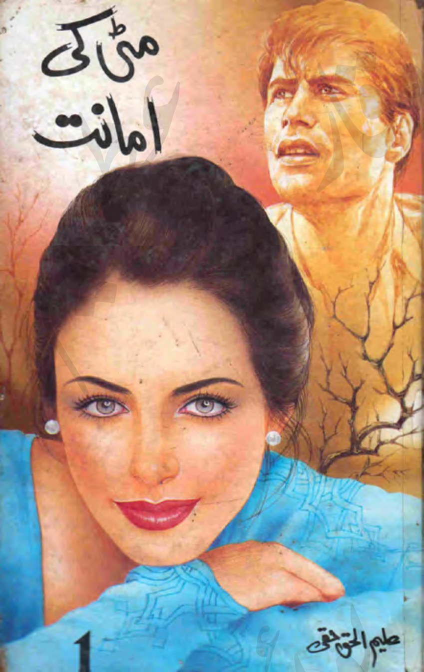

مٹی کی
امانت
علیم الحق حقی
1

کہانی ختم ہو چکی تھی!

صفورہ کو احساس ہی نہیں تھا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اسے اپنا ہوش ہی نہیں تھا۔ یہ احساس بھی نہیں تھا کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔ وہ تو کہانی کے آخری منظر میں گم تھی۔ وہ خود اس منظر میں موجود تھی.... اس کا حصہ تھی بلکہ وہ اس وقت صفورہ بھی نہیں تھی۔ وہ عذرا تھی.... کہانی کی ہیروئن۔ جو سب کچھ لٹا کر' درد کی صلیب اٹھائے زندگی کے راستے پر تھکے قدموں سے چل پڑی تھی اور اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اسے کہاں تک اور کب تک چلنا ہے۔ اس کا سفر کب ختم ہو گا۔ زندگی کا انت کب کسی کو معلوم ہوا ہے۔ پاؤں تھک جائیں' جسم شل ہو جائے' تب بھی رک تو نہیں سکتے۔

کہانی کے آخری صفحے نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ تھا ہی اتنا اثر انگیز۔ اتنا جیتا جاگتا منظر تھا۔ ایسا زندہ ماحول تھا کہ پڑھنے والوں پر طاری ہو جائے۔ کردار کی کیفیت پڑھنے والے میں اتر جائے۔ کردار کا دکھ پڑھنے والے کا دکھ بن جائے۔

دروازے پر دستک نہ ہوتی تو وہ نجانے کتنی دیر تک اسی طلسم کی اسیر رہتی۔ دستک بھی بس اتنا ہی کر سکی تھی کہ اسے اپنے وجود کا احساس ہو گیا۔ یہ پتہ چل گیا کہ وہ کہانی کے آخری منظر میں نہیں' اپنے گھر میں ہے۔ اس کے باوجود وہ ساکت و صامت بیٹھی رہی۔ دروازہ کھولنے کے لئے بھی نہیں اٹھ سکی۔ ویسے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اماں موجود ہیں۔ بڑبڑاتے ہوئے ہی سہی' اٹھ کر دروازہ کھول دیں گی۔

ہوا بھی یہی۔ دروازہ کھلنے کی آواز اور پھر آتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ یقیناً ابا تھے۔ اماں ان کے ساتھ ہی آئی تھیں۔ اس ڈر سے کہ وہ اس کمرے میں نہ آ جائیں' صفورہ نے ڈائجسٹ بند کر کے ایک طرف رکھا' جس کا آخری صفحہ پڑھ لینے

کے باوجود وہ نظروں کے سامنے رکھے بیٹھی تھی۔

اس لمحے اسے احساس ہوا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ اس نے اپنے آنسو پونچھے اور کہانی کی کیفیت کے سحر سے نکلنے کی کوشش کی۔ کسی حد تک تو وہ آزاد ہو گئی لیکن پوری طرح سے اس سحر کو وہ توڑ نہیں سکی۔

ابا اور اماں برابر والے کمرے میں بیٹھ گئے تو اسے بے فکری ہو گئی۔ جانتی تھی کہ اب ابا' اماں سے دنیا جہان کی باتیں کریں گے۔ چنانچہ اس کے لئے فرصت ہی فرصت ہے۔ وہ نہایت اطمینان سے اپنی سوچوں میں کھو گئی۔

اپنی کیا' درحقیقت وہ سوچیں مجیب انور کی تھیں' جس کی کہانی اس نے ابھی ختم کی تھی۔ سوچتے سوچتے وہ ڈوبنے لگی۔ مجیب انور بہت گہرے پانی میں پڑنے والے بھنور کی طرح تھا۔ بھنور میں پاؤں پڑتے ہی وہ چکرا کر ڈوبتی چلی جاتی۔

اس روز بھی یہی ہوا۔ وہ ڈوبتی چلی گئی اور اچانک اس نے خود کو سطح سمندر پر پایا۔ وہ ٹہلتی ہوئی ایک طرف چلی۔ یکلخت جیسے جادو کے زور سے مجیب اس کے سامنے آ گیا لیکن مجیب نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو سر جھکائے چل رہا تھا۔ کبھی وہ جھک کر کوئی سیپی اٹھاتا' اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا اور دوبارہ ریت پر پھینک دیتا۔ وہ گرد و پیش سے پوری طرح بے خبر تھا۔

وہ اس کی طرف بڑھتی رہی اور اچانک ہی اس سے ٹکرا گئی۔ توازن دونوں کا بگڑا اور دونوں ہی گر گئے۔

مجیب نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ پہلے ہی سحرزدہ سی اسے تک رہی تھی۔

"معاف کیجئے گا۔ میں نے آپ کو دیکھا نہیں تھا۔" وہ بولا۔

"آپ سیپیاں چننے میں کھوئے ہوئے تھے۔" صفورہ نے کہا۔

"جی ہاں۔"

"میں نے دیکھا تھا۔ آپ کو ادھر ادھر کا ہوش ہی نہیں تھا۔"

ابھی تک وہ دونوں ریت پر ہی گرے ہوئے تھے۔ صفورہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ گیلی ریت کپڑوں پر چپک گئی تھی۔ وہ اسے جھاڑنے لگی۔

مجیب بھی اٹھ گیا لیکن اسے کپڑے جھاڑنے کا خیال نہیں آیا۔ "آپ نے جواب

نہیں دیا میری بات کا؟"

"کیا جواب دوں؟"

"کچھ تو کہیں۔"

"جی ہاں۔ میں آپ کو دیکھ رہی تھی۔ آپ کو میرا پتہ نہیں تھا۔"

"وہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔ آپ چاہتیں تو ہم دونوں گرنے سے بچ سکتے تھے۔"

"جی ہاں۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

وہ جھنجلا گیا۔ "عجیب لڑکی ہیں آپ۔ جب گرنے سے بچ سکتی تھیں تو بچی کیوں نہیں؟"

"میں گرنے سے بچنا ہی نہیں چاہتی تھی۔" صفورہ نے سادگی سے کہا۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ آپ کے ساتھ گر رہی تھی۔"

"کمال ہے بھئی۔ مجھے خوامخواہ گرایا آپ نے۔"

"لطف نہیں آیا آپ کو؟"

"مجھے گرنا پسند نہیں' گرنا کمزوری ہے۔"

"کبھی گرنا مقدر بھی ہوتا ہے۔" صفورہ نے آہ بھر کے کہا۔ "اور جسے معلوم ہو کہ اسے ہر حال میں گرنا ہے تو وہ گرنے کے لئے ایسی جگہ تلاش کرتا ہے' جہاں اس کے لئے خوشی ہو۔"

"میری سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آ رہیں۔" مجیب کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"کمال ہے۔ حالانکہ اس سے بہت مشکل باتیں آپ اتنی آسانی سے بیان کر دیتے ہیں کہ ہر ایک کی سمجھ میں آ جائیں۔"

مجیب نے چونک کر اسے دیکھا پھر سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "وہ تو کہانی ہوتی ہے نا۔"

"آپ مجھ سے بہتر طور پر جانتے ہیں کہ کہانی کی بنیاد بھی حقیقت پر ہی رکھی جاتی ہے۔ خواہ وہ حقیقت کتنی چھوٹی اور غیراہم کیوں نہ ہو۔"

مجیب انور کی نظروں میں پہلی بار ستائش جھلکی۔ "ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ' مگر میں

کہانی کار ہوں۔ خود کو کہانی کا کردار بنانا پسند نہیں کرتا۔"

"مگر میں تو آپ کے ساتھ آپ کی کہانی کا کردار بن گئی۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔"

"ہو کیوں نہیں سکتا۔"

"مقدر سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔"

"کیسی بات کرتی ہیں آپ۔" مجیب نے خفگی سے کہا۔ "کہانی پر میرا اختیار ہے۔ مقدر بے بس کر کے مجھ سے کہانی نہیں لکھوا سکتا۔"

"چھوڑیں اس بات کو۔ آپ نہیں سمجھیں گے۔" صفورہ مسکرائی۔

"چلیں چھوڑیں؟ مجھے گرانے پر معذرت نہیں کریں گی آپ؟" مجیب بھی مسکرا دیا۔

"معذرت کیسی؟ گری تو میں۔ گروں گی تو میں۔ آپ تو سربلند ہی رہیں گے۔"

"میری سمجھ میں واقعی آپ کی باتیں نہیں آ رہیں۔"

"شاید میں وقت سے بہت پہلے پیدا ہو گئی ہوں۔" صفورہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ "یا شاید معاملہ تاخیر کا ہے۔" اس نے گہری سانس لی اور گفتگو کا رخ بدلا۔ سچی بات یہ ہے کہ اپنی باتیں خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ "آپ سیپیاں تلاش کر رہے تھے؟"

"سیپیاں؟" مجیب نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "نہیں تو..... میں تو لفظ ڈھونڈتا ہوں۔"

صفورہ نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ "اور یہ جو آپ اٹھا کر دیکھتے تھے اور پھینک دیتے تھے"

"یہ عام اور پامال لفظ تھے۔ ان سے پوری طرح بچا تو نہیں جا سکتا لیکن میں بچنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں۔"

"تو آپ کو موتیوں کی جستجو ہے؟"

"موتی اتنے عام' اتنے ارزاں کہاں ہوتے ہیں۔ ایسے لفظوں کی جستجو کی جائے تو ایک جملہ لکھنا بھی آسان نہیں ہو گا۔ کہانی تو بہت دور کی بات ہے۔"

"تو پھر؟"

"کہانی کی تھیم کو موتی سمجھ لو۔ اس کے لئے جستجو کرتا ہوں۔ ادھر ادھر ڈھونڈتا ہوں۔"

"واہ۔" صفورہ نے بے ساختہ کہا۔ "بہت خوب اور یہ آپ کے ہاتھ میں کیا ہے؟"

مجیب نے ہتھیلی کھول دی۔ ہتھیلی پر ایک سیپ رکھی تھی۔

"تھیم ہے کہانی کی؟" صفورہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ خالی لفظ ہے۔"

"تو اسے پھینک کیوں نہیں دیا؟"

"تم نے اسے غور سے نہیں دیکھا۔ یہ عام سیپ نہیں' جس میں پانی کا قطرہ بند رہا ہو۔" مجیب نے کہا۔ "یہ ایک ایسی سیپ ہے' جس میں یقیناً کبھی موتی رہا ہو گا۔"

صفورہ نے سیپ کو بہت غور سے دیکھا۔ سیپ واقعی خوبصورت تھی۔ اوپر سے ہموار اور اندر سے کئی رنگ کی ۔ جیسے کسی نے رنگوں کے لہریئے بنا دیئے ہوں۔ "خوبصورت تو یقیناً ہے۔" اس نے کہا۔ "لیکن یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اس میں کبھی موتی رہا ہو گا۔"

"یہ رنگوں کی گواہی تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ پانی کا قطرہ موتی بننے میں رنگوں کے جس کیمیاوی عمل سے دوچار ہوتا ہے' اس کی نشانیاں سیپیوں کی دیواروں پر نقش ہو جاتی ہیں۔ ورنہ موتی کے جانے کے بعد سیپ کی قدر کیسے ہو۔"

"گویا سیپ کی اپنی کوئی اہمیت نہیں؟" صفورہ نے افسردگی سے کہا۔

"ہاں۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ سیپ کے بطن میں پانی کا عام قطرہ آیا ہے یا بارش کا پہلا قطرہ۔ عام پانی والی سیپ عام ہوتی ہے۔ ساحل پر بکھری رہتی ہے۔ گزرنے والے اس پر نظریں ڈالے بغیر قدموں سے روندتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ کبھی کوئی ایک لمحے کے لئے اٹھا لی تو بھی پھینک جاتا ہے..... جیسے کوئی عام سا لفظ' جیسے کوئی گالی۔"

"تو آپ رنگین سیپیوں والے لفظ جمع کرتے ہیں۔"

"ہاں مگر عام لفظوں کے بغیر بھی گزارہ نہیں ہوتا۔ مجبوری ہے ورنہ دنیا میں عام

لفظ اور سیپیاں نہ ہوتیں۔"

"تو پھر آپ کیا کرتے ہیں؟"

"میں عام لفظوں کو جذبوں کے رنگ میں رنگ کر استعمال کرتا ہوں۔"

"یہ تو بہت مشکل کام ہے۔"

"ہاں۔ ہر بار تھوڑا سا اپنا آپ مارنا پڑتا ہے۔" مجیب نے آہ بھر کے کہا پھر پوچھا۔ "تم کہاں رہتی ہو؟"

"میں.... میں تو بہت دور رہتی ہوں۔" صفورہ نے اشارہ کیا۔ "یہ جو سمندر ہے نا' اس میں چلتے جائیں پھر بائیں جانب مڑ کر کنارے پر پہنچ جائیں۔ اس کے بعد کئی دن کئی رات خشکی پر چلیں تو میرے گھر پہنچ سکتے ہیں۔"

"یوں کہو کہ نہیں پہنچ سکتا۔" مجیب نے سنجیدگی سے کہا۔ "بہت.... بہت دور رہتی ہو تم۔"

"جی ہاں۔ آپ وہاں کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ اسی لئے تو میں خود چلی آئی۔ جانتی ہوں کہ مجھے خود ہی آپ تک پہنچنا پڑے گا۔"

"تم آئیں کیسے؟"

"اپنی سوچ کی وجہ سے۔ میں سوچتی ہوں کہ ڈوبنا ہی تو ہے ساحل پر کیوں ڈوبوں۔ گہرے پانی میں کیوں نہ ڈوبوں مگر گہرے پانی سے ڈر بھی لگتا ہے۔" وہ کہتے کہتے رکی۔ وہ عجیب سی کیفیت میں بول رہی تھی۔ اسے خود بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ "سو میں بھنور کی طرف لپکتی ہوں۔ بھنور کا اپنا ایک لطف ہے۔ جیسے تیزی سے گول گھومنے والے جھولے میں بیٹھی ہوں اور ہر چکر کے ساتھ بھنور نیچے ہی نیچے لئے جاتا ہے۔ یہاں تک کہ پاؤں زمین پر لگ جاتے ہیں۔ آج میں سمندر کے نیچے نیچے اس زمین پر چلتے چلتے آپ تک آ گئی۔"

"عجیب بات ہے۔ مجھے جھولوں سے بھی ڈر لگتا ہے اور بھنور سے بھی۔ میں تو کسی کے لئے بھی ایسا نہیں کر سکتا۔"

"ڈر تو مجھے بھی بہت لگتا ہے۔ شاید آپ سے بھی زیادہ لیکن جب یہ معلوم ہو گیا کہ قسمت میں گردش لکھی ہے تو ہر ڈر نکل گیا۔ میں نڈر ہو گئی۔"

"مقدر کا کسی کو کیا پتہ؟"

"آپ کو نہیں معلوم۔ کچھ لوگوں کا مقدر نوشتہ دیوار بھی ہوتا ہے اور یوں تو خدا کو بھی کسی نے نہیں دیکھا لیکن واحد اس کا یقین ہے' جو ایمان کہلاتا ہے۔"

"بہت گہری باتیں کرتی ہیں آپ۔"

"وقت اور حالات کی عنایت ہے۔"

اسی لمحے گہرے پانیوں سے ابھرتی ہوئی دھیمی اور منتشر آواز سنائی دی۔ "صفورہ....بٹی صفورہ۔"

صفورہ چونکی۔ مجیب نے پوچھا۔ "یہ آواز کیسی ہے؟"

"پانی کے پار سے ابا پکار رہے ہیں۔ مجھے جانا ہے پھر آؤں گی۔" صفورہ پانی کی طرف لپکی۔

"اپنا نام تو بتا دو۔" پیچھے سے مجیب پکارا۔

"پھر آؤں گی تو بتاؤں گی۔" وہ پانی میں اتر گئی۔

اس بار بھنور اسے اوپر لے جا رہا تھا۔ وہ پانی سے ابھر ہی رہی تھی کہ اماں اسے پکارتے پکارتے کمرے میں آ گئیں۔ "بیٹا کہاں کھوئی رہتی ہو ہر وقت۔"

صفورہ نے بہت تیزی سے خود کو سنبھالا۔ "کیا بات ہے اماں؟"

"لو.... ایک گھنٹے سے پکار رہی ہوں۔ اب پوچھتی ہو کہ کیا بات ہے۔ تمہارے ابا بلا رہے ہیں تمہیں۔"

صفورہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ حالانکہ اسے چکر آ رہے تھے۔



سحاب دوبارہ کمرے میں آئی تو چائے کی پیالی جوں کی توں رکھی تھی۔ "ارے آپ نے چائے نہیں پی؟" اس نے کہا۔

مجیب نے سر اٹھا کر پہلے اسے اور پھر چائے کی پیالی کو دیکھا۔ "مجھے تو پتہ بھی نہیں چلا کہ تم چائے رکھ گئی ہو۔" وہ بولا۔ "چلو.... اب پی لوں گا۔"

"جی نہیں۔ اب یہ ٹھنڈی برف ہو گئی ہے۔" سحاب نے پیالی کو چھو کر دیکھنے کے بعد کہا۔ "میں ابھی لاتی ہوں۔"

لیکن شاید مجیب نے سنا بھی نہیں۔ وہ اس سے پہلے ہی سر جھکا کر دوبارہ لکھنے میں مصروف ہو گیا تھا۔

سحاب دوبارہ چائے لے کر آئی تو وہ لکھنے میں گم تھا۔ سحاب نے چائے کی پیالی میز پر رکھی۔ "اس بار ضرور پی لیجئے گا۔" اس نے کہا۔

"ہاں.... پی لوں گا۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔" مجیب نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

سحاب نے ایش ٹرے کو دیکھا جو سگریٹ کے ٹکڑوں سے بھر چکی تھی۔ اس نے ایش ٹرے لے جا کر ڈسٹ بن میں خالی کی۔ ایش ٹرے دوبارہ میز پر رکھتے ہوئے اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "سنیں.... میں ذرا بینک جا رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔" مجیب نے بے دھیانی سے کہا۔ اس نے اس بار بھی سر نہیں اٹھایا تھا۔

سحاب کمرے سے نکل آئی۔ اس نے اپنے ہینڈ بیگ کو ٹٹول کر رقم چیک کی' پھر بل بیگ میں رکھے اور آہستہ سے دروازہ بند کرتے ہوئے باہر نکل آئی۔

سحاب کے لئے وہ وقت بہت کڑا ہوتا تھا' جب مجیب کسی کہانی میں بری طرح انوالو ہو جاتا تھا۔ اس عرصے میں اسے دوسروں کا تو کیا' خود اپنا بھی ہوش نہیں رہتا تھا۔ وہ بے حد چڑچڑا اور بدمزاج ہو جاتا تھا۔ حالانکہ عام حالات میں وہ بے حد خوش مزاج آدمی تھا۔ بہرکیف ازدواجی زندگی کے دس برسوں میں وہ اس کی عادی ہو گئی تھی۔ پریشانی اس بات کی ضرور ہوتی تھی کہ کام کے دوران میں مجیب کی اسموکنگ ویسے ہی بڑھ جاتی تھی مگر جب وہ کہانی میں ڈوبتا تو اسے خود بھی پتہ نہ چلتا کہ سگریٹ بجھانے اور سگریٹ جلانے میں ایک منٹ کا وقفہ بھی نہیں رہا ہے۔ اس عرصے میں اس کی صحت بری طرح متاثر ہوتی اور سحاب کو اس بات کی بڑی فکر رہتی تھی۔

"بل جمع کرانے کے بعد مرغیوں کے پنجے خریدنے ہیں۔" زینوں سے اترتے ہوئے سحاب نے خود کو یاد دلایا۔ "ان کے لئے سوپ بناؤں گی۔"

○

مجیب اس وقت کہانی کا کلائی میکس لکھ رہا تھا!

کردار جس جذباتی بحران سے' جس کیفیت سے گزر رہے تھے' وہ اس نے خود بھی

طاری کر رکھی تھی۔ جتنا کرب وہ سب مل کر جھیل رہے تھے' اتنا ہی وہ اکیلا جھیل رہا تھا۔ اس کی اپنی عجیب کیفیت تھی۔ قلم کی رفتار بہت تیز تھی لیکن خیالات کی رفتار اس سے کہیں زیادہ تیز تھی۔ کبھی اسے محسوس ہوتا کہ کوئی بات ذہن کو چھو کر محو ہو گئی ہے اور وہ اسے لکھ نہیں سکا ہے تو اس پر بے بسی اور جھنجلاہٹ طاری ہو جاتی۔ یہ اس کیفیت پر مستزاد تھا' جو کرداروں کے حوالے سے پہلے ہی اس پر طاری تھی۔ بے بسی اور جھنجلاہٹ اس کیفیت کو ڈسٹرب کرتی تھی اور ارتکاز میں بھی خلل پڑتا تھا۔

جو صورت حال لکھی جا رہی تھی' وہ اس قدر کشیدہ تھی کہ اس کا دل گھبرانے لگا۔ حلق یوں خشک ہوا کہ اس میں صاف کانٹے پڑتے محسوس ہوئے۔ اس نے جلدی سے قلم بند کر دیا۔ گھڑی کی طرف دیکھا۔ ساڑھے بارہ بجے تھے۔ گویا مسلسل لکھتے ہوئے اسے ساڑھے چار گھنٹے ہو گئے تھے۔

"سحاب.... سحاب.... ذرا مجھے پانی پلا دو۔" اس نے بیوی کو پکارا اور آنکھیں بند کر کے اپنے پپوٹوں کو انگلی سے سہلانے لگا۔

ایک منٹ بعد اس نے آنکھیں کھولیں۔ میز پر پانی کا گلاس نہ پا کر اسے حیرت ہوئی۔ اتنی دیر میں تو سحاب کو پانی لے آنا چاہئے تھا۔ "سحاب.... کہاں ہو بھئی؟" اس نے پھر پکارا۔ اس بار بھی جواب نہ ملا تو اسے تشویش ہوئی۔ ایک بار اور پکارنے کے بعد اس نے تسلیم کر لیا کہ سحاب باتھ روم میں گئی ہو گی ورنہ اب تک آ چکی ہوتی۔

اس نے چند گہری گہری سانسیں لیں اور اپنا لکھا ہوا نامکمل صفحہ پڑھا۔ گلا خشک ہونے کا احساس اب بھی ستا رہا تھا مگر وہ یوں خود اٹھ کر پانی پینے والا نہیں تھا۔ ویسے بھی کہانی اختتام پر تھی۔ اس کے بعد وہ آزاد ہوتا۔ ایسے میں کام چھوڑ کر اٹھنا اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ اس نے پانی کا خیال ذہن سے جھٹکا اور قلم کھول لیا۔

لیکن وہ کچھ لکھ نہیں سکا۔ وہ کہانی کے اختتام سے لبالب بھرا ہوا تھا مگر سب کچھ منتشر تھا اور اس کے لئے کہانی کو چھوڑ کر اٹھنا ناگزیر تھا۔

وہ اٹھا اور سب سے پہلے پورے فلیٹ میں سحاب کو ڈھونڈتا پھرا مگر وہ وہاں ہوتی تو ملتی۔ اس نے فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور غٹاغٹ دو گلاس پی گیا۔ حلق تر ہوا تو اسے ارتکاز کی فکر ہوئی۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ارتکاز کے دو عوامل تھے اس کے پاس۔ ایک وی سی آر اور دوسرا وڈیو گیم۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر بچوں کے کمرے کی طرف چل دیا۔ وہاں چھوٹا ٹی وی اور بچوں کا وڈیو گیم موجود تھا۔

اس نے سوئچ آن کیا اور گیم لگایا۔ دو منٹ بعد وہ ٹینک کا گیم کھیل رہا تھا۔



سحاب نے بیگ سے چابی نکال کر بڑی آہستگی سے فلیٹ کا دروازہ کھولا اور دبے قدموں اندر داخل ہوئی لیکن بچوں کے کمرے میں چلنے والے گولوں کی آواز نے اسے بتا دیا کہ صاحب اس وقت ارتکاز حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ وہ مسکرائی۔ اس نے اپنا ہینڈ بیگ ایک طرف رکھا اور سب سے پہلے کچن میں گھس گئی۔ اس نے سوپ کی تیاری کی۔ سوپ کو چولھے پر چڑھانے کے بعد اس نے سیب کی قاشیں بنا کر پلیٹ میں رکھیں اور پلیٹ لے کر بچوں کے کمرے کی طرف چل دی۔

مجیب کھیل میں ایسا منہمک تھا کہ اسے اس کی آمد کا پتہ ہی نہیں چلا۔ وہ بیڈ پر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ "لیں..... یہ سیب کھالیں۔" اس نے کہا۔

"نہیں کھا سکتا۔ دیکھ نہیں رہیں' میرا ٹینک چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے۔"

"عجیب آدمی ہیں آپ۔ کھیل میں بچوں سے زیادہ انہماک ہے آپ کا۔"

مجیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید اس کی بات سنی ہی نہیں۔ سحاب اسے غور سے دیکھتی رہی۔ "کتنی سختی سے جوائے اسٹک پکڑتے ہیں آپ۔ کتنے زور سے بٹن دباتے ہیں۔ ایک گھنٹہ کھیل لیں تو انگوٹھا بھی پچک جائے۔ یہ کام آہستگی سے بھی تو کیا جا سکتا ہے۔" اس نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔

"نہیں کر سکتا۔ میں نہیں کر سکتا۔" مجیب نے دشمن کے ایک ٹینک کو نشانہ بناتے ہوئے کہا۔

"اچھا..... یہ سیب تو کھالیں۔"

"نہیں کھا سکتا۔ دیکھ رہی ہو' کیسی خطرناک صورت حال ہے۔"

"اچھا' منہ کھولیں۔ میں خود کھلا دوں۔"

"منہ بھی نہیں کھول سکتا۔ ٹینک مرجائے گا۔"

"کیا بچپنا ہے بھئی' منہ کھولیں نا۔" سحاب نے سیب کی قاش زبردستی اس کے منہ میں ڈالنے کی کوشش کی۔

"ارے نہیں..... کیا کرتی ہو.....؟" مجیب نے منہ پھیرنے کی کوشش کی اور اس دوران میں اس کا ٹینک دشمن کا نشانہ بن گیا۔ اس نے جھنجلا کر جوائے اسٹک ایک طرف پھینک دی۔ "بہت ڈسٹرب کرتی ہو تم۔"

"سوری بھئی۔ اچھا' اب سیب تو کھا لیجئے۔"

"اب تو کھاؤں گا ہی۔ کیا یہ نقصان بھی کروں۔" مجیب نے سیب کی قاش منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا یہ بتائیں۔ کھیل جیسا ارتکاز کہانی میں کیوں نہیں ہوتا آپ کا؟" سحاب نے کہا۔

"اس لئے کہ کھیل کو میں انجوائے کرتا ہوں اور کہانی کا ماحول جب بہت tense ہو جائے' کرداروں کے دکھ ناقابل برداشت محسوس ہونے لگیں تو مجھے خوف آنے لگتا ہے۔ میں وہاں سے نکل بھاگنا چاہتا ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ ذرا دیر اور ٹھہروں گا تو یہ میرے لئے جان لیوا ثابت ہو سکتے ہیں۔"

"tension تو کھیل میں بھی ہوتی ہے۔" سحاب نے اعتراض کیا۔

"ہاں مگر یہ احساس رہتا ہے کہ وہ real life tension نہیں ہے۔ تصوراتی ہے اور اس کی کوئی حقیقی اہمیت نہیں ہے۔"

"تو یہ بات تو کہانی پر بھی صادق آتی ہے۔"

"نہیں۔ میرے نزدیک ایسا نہیں ہے۔ میرے لئے تو کہانی کی فضا' اس کا ماحول live ہوتا ہے..... جیتا جاگتا اور حقیقی۔" مجیب نے کہا۔ "اس لئے جہاں کہانی میں شدید ٹینشن ہو' وہاں میں چھوٹے چھوٹے وقفوں میں لکھتا ہوں۔ لکھتا ہوں اور بھاگتا ہوں۔ ریلیکس کرتا ہوں اور پھر لکھتا ہوں۔ لکھتا ہوں اور پھر بھاگتا ہوں....."

"یہاں تک کہ بھاگتے بھاگتے تھک جاتا ہوں۔" سحاب نے ہنستے ہوئے اس کی بات پوری کر دی۔

"ہاں' یہی بات ہے۔" مجیب نے کہا۔ اچانک اسے یاد آیا کہ ابھی ذرا دیر پہلے

سحاب گھر میں نہیں تھی۔ "یہ بتاؤ' تم چلی کہاں گئی تھیں؟" اس نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

"میں بینک گئی تھی۔"

"کیا ضروری تھا۔ مجھے ایسے مرحلوں میں اس طرح چھوڑ کر مت جایا کرو۔ میں پانی کے لئے چلاتا رہا۔ آخر خود اٹھ کر پینا پڑا۔"

"ضروری تھا۔ بجلی کے بل کی ادائیگی کی آخری تاریخ تھی آج۔ بل ادا نہ ہوتا تو بجلی کٹ جاتی۔ بجلی کٹ جاتی تو بڑی مصیبت ہوتی۔ میں آپ کی پہلی پکار پر پانی لاتی تو آپ گلاس دیوار پر دے مارتے۔ چلاتے..... مجھے گرم پانی نہ پلایا کرو۔ بجلی کٹ جاتی تو آپ پورے گھر میں دیوانہ وار ٹہلتے اور بڑبڑاتے..... گھر میں روشنی بھی ہے اور ہوا بھی۔ مگر مجھ سے لکھا نہیں جاتا۔ یہ کیا مصیبت ہے۔ کیا پنکھے کی آواز کی لے پر کام کرتا ہوں میں۔" سحاب نے اس کی نقل اتاری۔

مجیب ہنسنے لگا۔ "واہ بھئی..... تم اداکارہ ہوتیں تو غضب کی ہوتیں۔"

"مگر رول صرف آپکا ہی کر سکتی تھی۔ اداکاری کی صلاحیت نہیں ہے مجھ میں۔"

مجیب سنجیدہ ہو گیا۔ "تم بہت اچھی ہو سحاب!" اس نے سحاب کا ہاتھ تھام لیا۔

"تم نہ ہوتیں تو میں اتنا اچھا لکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ ہر چیز سے..... ہر مسئلے سے بچا رکھا ہے تم نے۔ بچوں کے اسکول کا کوئی معاملہ ہو یا کسی بل کی ادائیگی یا گھر کا کوئی کام۔ تم خود ہی نمٹا لیتی ہو۔"

"بس جناب! زیادہ خوشامد کی ضرورت نہیں۔" سحاب نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

"مجھے کچن بھی دیکھنا ہے۔ بچے آنے والے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بھی کام میں لگتا ہوں۔" مجیب بھی اٹھ گیا۔



تینوں بچے گھر آئے تو گھر آوازوں سے بھر گیا!

تینوں کے اپنے اپنے معمولات تھے' جن میں بس بستوں سے چھٹکارا پانا ہی مشترک تھا۔ بستے سے چھٹکارا پاتے ہی چار سالہ غالیہ کچن میں جا گھسی۔ "امی مجھے کچھ دیں۔ بہت بھوک لگی ہے۔"

"سب تیار ہے۔ ابھی لگاتی ہوں۔" سحاب نے کہا۔ "لیکن اچھے بچوں کو اسکول سے آتے ہی یونیفارم اتار کر ہاتھ منہ دھونا چاہئے۔ چلو' میں تمہارا ہاتھ منہ دھلاؤں۔"

"امی' پہلے کچھ کھلائیں۔ بہت بھوک لگی ہے۔" غالیہ نے ضد کی۔

"میں نے کہا نا' پہلے کپڑے بدلتے ہیں پھر ہاتھ منہ دھوتے ہیں۔ اس کے بعد کھانا۔" سحاب اس کی انگلی تھام کر اسے کچن سے باہر لے آئی۔

باہر چھ سالہ حامد بستے سے نجات پاتے ہی فریج کھولے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹھنڈے پانی کی بوتل تھی۔ "کتنی بار منع کیا ہے کہ آتے ہی ٹھنڈا پانی نہ پیا کرو۔" سحاب نے اسے ڈانٹا۔ "طبیعت خراب کرنے کا سامان کرتے ہو۔ اور دروازہ بند کرو فریج کا۔"

"امی..... بہت پیاس لگی ہے۔" حامد نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔

"پانچ منٹ رک جاؤ پھر پانی پی لینا۔" سحاب نے کہا اور غالیہ کا ہاتھ تھام کر اسے باتھ روم کی طرف لے گئی۔

آٹھ سالہ شاہد جوتے اور موزے اتارنے میں مصروف تھا۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی وہ ابو کی اسٹڈی کی طرف چلا گیا۔ "السلام علیکم ابو۔"

"وعلیکم السلام بیٹے۔" لکھتے ہوئے مجیب نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔

"ابو..... پتہ ہے آج اسکول میں کیا ہوا؟"

"بیٹے' اس وقت میں بہت مصروف ہوں۔ بعد میں بیٹھ کر بات کریں گے۔ ٹھیک ہے؟"

"جی ابو۔" شاہد نے کہا اور کمرے سے چلا گیا۔

مجیب نے سر جھکایا اور تیزی سے لکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ حامد اتنی جلدی جان نہیں چھوڑے گا۔

ہوا بھی یہی۔ پانچ منٹ بعد حامد کمرے میں آیا۔ "ابو..... ادھر دیکھیں۔ دیکھیں نا۔"

"تمہیں سلام کرنا نہیں آتا بیٹے۔" مجیب نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ اسے جملہ پورا

کرنے کی مہلت مل گئی تھی۔ اس کا قلم چلتا رہا۔

حامد نے سلام کر کے ہاتھ بڑھایا تو وہ جملہ پورا کر چکا تھا۔ اس نے بیٹے سے ہاتھ ملایا۔ "بیٹے باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔ اس وقت میں کام کر رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے ابو۔ میں بات بعد میں کر لوں گا۔" حامد نے کہا۔ مجیب نے سکون کا سانس لیا لیکن اس کا سکون عارضی ثابت ہوا۔ "لیکن ابو' میں آپ کو دو چیزیں دکھانا چاہتا ہوں۔"

"وہ بھی بعد میں دیکھ لوں گا بیٹے۔"

"نہیں ابو۔ یہ دونوں چیزیں تو دیکھنی ہی ہوں گی پھر میں چلا جاؤں گا۔"

مجیب نے بادل نخواستہ سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ بیٹے کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ "اچھا دکھاؤ۔"

"ایک تو یہ سلیبس ہے امتحان کا۔" حامد نے چار صفحوں کا کتابچہ اسے دکھایا۔ مجیب نے اس کتابچے کو دیکھا لیکن وہ ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکا۔ اس کا ذہن تو کہانی میں الجھا ہوا تھا۔ "بہت خوب۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "بہت تگڑا سلیبس ہے۔ بس تم آج سے..... بلکہ ابھی سے پڑھائی شروع کر دو۔"

"اور دوسری چیز یہ دیکھیں۔ مجھے اسٹار ملا ہے۔"

مجیب نے بیٹے کے ہاتھ کی پشت پر بنے اسٹار کو دیکھا اور اس کے ہاتھ کو چوم لیا۔ "گڈ بوائے۔ ویل ڈن۔" اس نے کہا۔ "اب جا کر کھانا کھاؤ۔"

حامد گیا تو مجیب نے سکون کی سانس لی۔ ابھی ایک مرحلہ اور باقی تھا مگر وہ اتنا مشکل نہیں تھا۔ مشکل ترین مرحلہ گزر چکا تھا۔ وہ پھر کہانی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ باہر کی آوازوں سے پتہ چلتا تھا کہ دسترخوان لگ رہا ہے۔ گویا بچے کھانے میں مصروف ہونے والے تھے۔

وہ پرسکون ہو کر لکھنے لگا۔ قلم بڑی روانی سی چل رہا تھا۔ ایک منٹ بعد دروازہ کھلا۔ سحاب اندر آئی۔ اس کے ہاتھ میں پیالی تھی۔ پیالی اس نے میز پر رکھ دی اور خود سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ "یہ پی لیجئے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

مجیب نے سر کو تفہیمی جنبش دی مگر اس کا ہاتھ نہیں رکا۔ ذا دیر بعد اس نے پیالی

اٹھا کر ایک گھونٹ لیا تو اسے اچھو ہو گیا۔

"کیسی بے پروائی کرتے ہیں۔" سحاب نے کہا۔ "ناک پکڑ کر اوپر دیکھیں۔"

مجیب بری طرح کھانس رہا تھا۔ تاہم اس نے بیوی کی ہدایت پر عمل کیا۔ ذرا دیر میں حالت سنبھل گئی۔ البتہ چھوٹے چھوٹے ٹھسکے اب بھی لگ رہے تھے۔ "یہ..... یہ کیسی چائے ہے۔" اس نے اٹکتے اٹکتے احتجاج کیا۔

"یہ چائے نہیں بے پروا آدمی۔ سوپ ہے۔" سحاب نے بھنا کر کہا۔

"تو تمہیں پہلے ہی خبردار کر دینا چاہئے تھا مجھے۔" مجیب نے فریاد کرنے والے انداز میں کہا۔ "اور سوپ مجھے پسند ہی نہیں۔ مجھ سے نہیں پیا جاتا۔"

"ہاں..... کوئی فائدہ مند چیز کیوں پی جائے گی۔ چلیں پی لیں۔" سحاب کے لہجے میں تحکم تھا۔

"نہیں بھئی۔ یہ میرے بس کا نہیں۔"

"پی لیں۔ نہیں تو سگریٹ بھی نہیں پینے دوں گی۔ پیکٹ ہی اٹھا کر لے جاؤں گی۔"

مجیب نے اسے گھور کر دیکھا لیکن جان لیا کہ عافیت سوپ پی لینے ہی میں ہے۔

پانچ منٹ بعد سحاب خالی پیالی لے کر کمرے سے چلی گئی۔

دس منٹ بعد غالیہ کمرے میں آئی۔ اس نے سلام کیا۔ مجیب نے جواب دے کر اس سے ہاتھ ملایا۔ "کیا پروگرام ہے بٹیا کا؟" اس نے پوچھا۔

"آپ کی گود میں بیٹھوں گی ابو۔"

"میں کام کر رہا ہوں بیٹا۔"

"میں آپ کو تنگ نہیں کروں گی۔ بولوں گی بھی نہیں۔ بس گود میں بیٹھوں گی۔"

مجیب مسکرایا۔ "تو آ جاؤ۔"

غالیہ چڑھ کر گود میں بیٹھ گئی۔ وہ کام میں مصروف ہو گیا۔ لڑکیاں ہوتی ہی نرم ہیں۔ مجیب نے سوچا۔ یہ ہمیشہ ہوتا تھا۔ غالیہ کام کے دوران میں بھی دس پندرہ منٹ کے لئے اس کی گود میں بیٹھ جاتی تھی لیکن ڈسٹرب کبھی نہیں کرتی تھی۔ اس کے باوجود کہ دو بھائیوں کی بہن ہونے کے ناتے وہ بھی لڑکا ہی بن گئی تھی۔ گڑیوں سے کھیلنا

اسے بالکل پسند نہیں تھا۔ گڑیوں سے زیادہ وہ گنوں میں دلچسپی لیتی تھی۔ لڑکیوں والے کپڑے بھی وہ بس اس کی محبت اور مروت میں پہن لیتی تھی ورنہ اسے پینٹ شرٹ پہننا اچھا لگتا تھا۔ اس کے باوجود اندر کی نرمی نہیں دبی تھی۔

بیٹی کے متعلق سوچتے ہوئے مجیب کا دل ایک عجیب سی نرماہٹ اور طمانیت سے بھر گیا۔ ہاتھ اور تیز چلنے لگا۔

کوئی پندرہ منٹ بعد عالیہ کسمسائی۔ "اب کیا بات ہے بٹیا؟" مجیب نے پوچھا۔

"ابو' میں بھائیوں کے ساتھ جا کر کھیل لوں۔"

"ضرور بیٹا' جاؤ۔"

عالیہ بھی چلی گئی۔ مجیب کا قلم چلتا رہا۔ ذرا دیر بعد سحاب نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ "کھانا نہیں کھائیں گے؟"

مجیب نے چند لمحے سوچا۔ بھوک تو بہت زور کی لگ رہی تھی لیکن اس موڑ پر خود سے کہانی کو چھوڑنا ٹھیک نہیں تھا۔ اس نے سوچا' اب جو کہانی کے بوجھ سے گھبرا کر اٹھوں گا تو کھانا کھا لوں گا۔ "ذرا دیر بعد کھاؤں گا۔" اس نے سحاب سے کہا۔

سحاب نے آہستگی سے دروازہ بند کیا اور چلی گئی۔

مجیب نے کہانی کی ٹینشن سے گھبرا کر قلم بند کیا تو سوا تین بجے تھے۔ اس نے باہر نکل کر سحاب سے کہا۔ "لاؤ بھئی..... کھانا کھلاؤ۔"

سحاب بھی اس کی ساتھ کھانا کھانے بیٹھی تو اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تم نے کھانا نہیں کھایا اب تک؟"

"بھوک ہی نہیں تھی۔" سحاب نے کہا۔

"یہ مت کیا کرو پلیز۔ میرے لئے بوجھ ہو جاتا ہے۔ کہانی قریب الختم ہوتی ہے تو میں بالکل بے ترتیب ہو جاتا ہوں۔ تم کھانا کھا لیا کرو۔"



اب شاہکار ڈائجسٹ کا اگلا شمارہ آنے تک فرصت ہی فرصت تھی مگر پچھلے شمارے میں شائع ہونے والی مجیب انور کی کہانی کا طلسم ٹوٹ ہی نہیں رہا تھا۔ عجیب جیتی جاگتی فضا تھی اس کہانی کی کہ صفورہ گھر کے تمام کام کاج کرتی' ہر ایک سے باتیں کرتی مگر اسی فضا میں رہ کر۔ وہ اس سے باہر نکل ہی نہیں پا رہی تھی۔

شام کو گھر کے کام سے نمٹ کر رات سونے تک اس کے پاس کافی وقت ہوتا تھا۔ وہ مطالعے کی عادی تھی لیکن اب اس سے کچھ پڑھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ وہ بس اس کہانی کے بارے میں سوچتی رہی..... اور سوچے سوچتے اس کی ذہنی رو کہانی کے خالق کی طرف مڑ جاتی۔ وہ مجیب انور کے بارے میں سوچنے لگتی۔ سوچتی تو وہ پہلے بھی تھی مگر اب وہ گہرائی میں سوچتی تھی۔ اس کا تجسس بہت بڑھ گیا تھا۔

شاہکار ڈائجسٹ اور مجیب انور سے یہ تعلق تین سال پرانا تھا۔ تین سال پہلے وہ پاکستان گئی تھی۔ وہاں لاہور میں اس کے تایا رہتے تھے۔ لاہور میں ابتدا میں تو وہ بہت خوش رہی۔ شاید اس لئے کہ گھومنے پھرنے کا خوب موقع ملا تھا۔ صابر بھائی نے تمام تاریخی مقامات دکھائے مگر اس کے بعد اس کا دل گھبرانے لگا۔

بیس دن ہو گئے تو اس نے اماں سے کہا۔ "اماں..... اب واپس چلیں نا۔"

اماں تو ہکا بکا رہ گئیں۔ "اتنے برس بعد تو آنا نصیب ہوا ہے اور کیا پتہ' اگلی بار موقع ملے نہ ملے۔ تین مہینے کا ویزا ہے تین مہینے گزار کر ہی چلیں گے۔"

"میرا دل نہیں لگ رہا ہے اماں۔"

یہ باتیں بھابی نے بھی سن لی تھیں۔ شام کو صابر بھائی گھر آئے تو بھابی نے ان سے کہا۔ "صفورہ کا دل نہیں لگ رہا ہے۔"

صابر بھائی بہت مہربان اور شفیق آدمی تھے۔ انہوں نے فوراً اسے پکڑ لیا۔ "کیا بات ہے۔ تمہارا دل کیوں نہیں لگتا یہاں؟"

"بھائی....وقت گزارنا ہی مشکل ہو جاتا ہے یہاں۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"تو گھر میں وی سی آر موجود ہے۔ فلمیں دیکھو ڈٹ کر۔"

"یہ فلمیں تو ہم وہاں سینما میں بھی دیکھ سکتے ہیں بھائی مگر دیکھنا پسند نہیں کرتے۔" وہ بولی۔ "آپ کو شاید برا لگے لیکن یہاں جس طرح بھارتی فلمیں دیکھی جاتی ہیں' مجھے بہت رنج ہوتا ہے اس سے۔ میرا تصور تو پاکستان کے بارے میں کچھ اور تھا۔"

صابر بھائی کھسیا گئے۔ "آخر نکلیں نا ہندوستانی۔" انہوں نے نرم لہجے میں بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ طنز کیا۔

"جی نہیں۔ بھارت میں رہنے والے مسلمان پاکستان سے جتنی محبت کرتے ہیں' اس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔" اس نے بڑے جوش سے کہا۔ "دل دکھتا ہی تو اپنائیت سے شکایت کرتے ہیں۔ وہاں کوئی پاکستان پر ایسا طنز کرے' جس کا جواب نہ بن پڑے تو بڑی اذیت ہوتی ہے۔ ابھی سونیا گاندھی نے کیسا زہر اگلا تھا انہی فلموں کے حوالے سے۔ انہیں فخر ہے کہ انہوں نے ثقافتی اعتبار سے پاکستان کو فتح کر لیا ہے۔ وہاں کے گانے یہاں زبان زد عام ہیں۔ اب تو یہاں وہ الفاظ بھی بولے جانے لگے ہیں' جو ہندی فلموں میں استعمال ہوتے ہیں۔"

صابر بھائی کو سونیا گاندھی کا بیان یاد تھا۔ وہ شرمندہ ہو گئے۔ "خیر' اب ایسا بھی نہیں ہے۔"

"مجھے تو بہت افسوس ہوا ہے صابر بھائی۔ یہ قومی حمیت ہے کہ بھارت کی جائز تعریف بھی بری لگتی ہے مگر بھارتی فلمیں بھی نہیں چھوڑی جاتیں۔ اب تو آپ کا قابل فخر ٹیلی وژن بھی بھارتی چینلز کی نقل کر رہا ہے۔ بلندی سے پستی میں آ گرا ہے۔ یہ احساس کمتری کمایا ہے آپ لوگوں نے۔"

"ارے بھئی' تم تو سیاسی لیڈر بن گئیں....."

"نہیں بھائی' بات بس اتنی سی ہے کہ ہم بھارتی مسلمان تو پاکستان کو اپنی آخری امید سمجھتے ہیں۔ ہمیں کوئی پریشانی ہو تو ہم پاکستان کے لئے استحکام اور سربلندی کی دعا کرتے ہیں۔ پاکستان کی سربلندی ہماری سربلندی ہے مگر یہاں یہ حال ہے کہ بھارت کی ثقافتی یلغار کے سامنے سرنگوں بیٹھے ہیں۔"

"تم نے تو بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ بھائی دن بھر کی محنت کے بعد تھکا ہارا آدمی شام کو گھر واپس آئے تو کہیں جانے کی ہمت نہیں ہوتی نا اور تازہ دم ہونے کے لئے تفریح ضروری ہے۔ سو گھر بیٹھ کر ایک فلم دیکھ لیتے ہیں اور کیا کریں؟"

"کیوں؟ مطالعہ نہیں کر سکتے؟"

"مطالعہ؟" صابر بھائی کا منہ کھل گیا۔ "مطالعہ کون کرتا ہے یہاں؟ کتابیں ہی اتنی مہنگی ہیں۔"

"تو جو قوم مطالعے کو چھوڑ کر گھٹیا فلمیں دیکھے گی' اس کا کیا حال ہو گا۔"

"وہی ہو گا جو ہے۔" اس بار صابر بھائی کے بجائے بھابی نے جواب دیا۔ ان کے لہجے میں صابر بھائی کے لئے ملامت تھی۔

"تو تمہیں کتابیں چاہئیں نا؟" صابر بھائی نے گھبرا کر موضوع بدلا۔

صابر بھائی اسے کتابیں لا کر دینے لگے مگر اسے مایوسی ہوئی۔ کتابیں اچھی بھی تھیں۔ مگر ایسی بھی تھیں کہ کم از کم وہ ان کی وجہ اشاعت سمجھنے سے قاصر تھی پھر ایک دن صابر بھائی اس کے لئے شاہکار ڈائجسٹ لے آئے۔ اس نے پڑھا اور بہت متاثر ہوئی۔ خاص طور پر مجیب انور کی کہانی نے تو اس کے دل کو چھو لیا۔

"حیرت ہے کہ تم نے ڈائجسٹ پہلے کبھی نہیں پڑھا۔" صابر بھائی بولے۔ "حالانکہ ہمارے ہاں چھپنے والی ہر کہانی فوراً ہی بھارت کے کسی نہ کسی ڈائجسٹ میں شائع ہو جاتی ہے۔"

"جی' مجھے معلوم ہے۔ یہ بھی بھارتی پبلشرز کا احسان ہے کہ وہ مصنف کا نام تبدیل نہیں کرتے۔ میں بھارتی ڈائجسٹ اس لئے نہیں پڑھتی کہ مجھے چوری اور بددیانتی سے سخت نفرت ہے۔" صفورہ نے گہری سانس لے کر کہا۔ "مگر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ ڈائجسٹوں میں چھپنے والی کہانیوں کا معیار اتنا اچھا ہوتا ہے۔"

اس کے بعد پاکستان میں قیام کے دوران میں صفورہ کو جتنے بھی پرانے شاہکار ڈائجسٹ مل سکے' اس نے پڑھ ڈالے۔ واپسی کے موقع پر اس نے صابر بھائی سے وعدہ لیا کہ وہ ہر ماہ باقاعدگی سے شاہکار ڈائجسٹ بھجواتے رہیں گے اور انہوں نے یہ وعدہ نبھایا بھی تھا۔

سو اب مجیب انور کی کہانیاں شوق سے پڑھتے پڑھتے وہ خود مجیب انور کے بارے میں بہت سنجیدگی سے بہت گہرائی سے سوچنے لگی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ کوئی جذباتی قسم کی کچی عمر کی لڑکی نہیں تھی کہ صرف تحریر کی وجہ سے ایک ایسے رائٹر کی محبت میں گرفتار ہو جاتی' جسے اس نے دیکھا بھی نہیں تھا۔ اردو ادب میں ایم اے کئے ہوئے بھی اسے چھ سال ہو چکے تھے۔ اگر ابا نے اجازت دے دی ہوتی تو وہ اب تک ڈاکٹریٹ کر چکی ہوتی۔ اس کی عمر اب تیس سال کی تھی۔

مجیب انور کے بارے میں تجسس بیدار ہوا تو اس نے بے حد منطقی انداز میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کے پاس حوالہ صرف اس کی تحریر' اس کے اسلوب کا تھا مگر یہ کوئی چھوٹا اور کمتر حوالہ ہرگز نہیں تھا۔ شخصیت آدمی کی تحریر میں ضرور آتی ہے۔ اس سے کوئی بچ نہیں سکتا۔

مسہری پر لیٹے لیٹے اس نے سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنے عکس کو دیکھا۔ اگلے ہی لمحے اپنے چہرے کی جگہ اسے ایک مردانہ چہرہ نظر آنے لگا مگر وہ خد و خال سے محروم تھا اور خد و خال اسے ہی کھوجنے تھے۔

اس کے ذہن میں پہلے سوال نے سر اٹھایا۔ مجیب انور کی عمر کتنی ہو گی؟ اس بات کی بہت زیادہ اہمیت نہیں تھی۔ عمر اس کی کچھ بھی ہو سکتی تھی۔ پچھلے دس سال سے وہ برابر لکھ رہا تھا۔ لکھنے والوں کو منظر عام تک آنے میں خاصا وقت لگتا ہے۔ کم ہی خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں کہ کم عمری میں ہی چھپنے لگیں۔ اگر مجیب انور نے چالیس کی عمر سے بھی لکھنا شروع کیا تھا تو اب وہ پچاس کا ہو گا۔ فنکاروں کے لحاظ سے پچاس سال زیادہ عمر نہیں ہوتی۔

اسی لمحے اس نے اپنے عکس کو دیکھا۔ وہ خود ستائی کے بغیر پوری سچائی سے کہہ سکتی تھی کہ وہ پچیس سے زیادہ کی ہرگز نہیں لگتی۔ کوئی کاٹھی ہی ایسی ہوتی ہے کہ اس پر عمر کا اثر ہی نہیں ہوتا پھر اس نے ایسے لوگ بھی دیکھے تھے' جو کم عمری میں بڑے لگتے رہے اور جیسے جیسے عمر بڑھی' تازہ دم ہوتے گئے۔ کم عمر لگنے لگے۔ کیا پتہ' مجیب انور بھی ایسا ہی ہو۔

پھر یہ بھی تھا کہ مجیب انور بے حد تواتر سے چھپتا تھا اور شاید اس [illegible] زیادہ تواتر

سے لکھتا تھا اور جس طرح کہانیاں وہ لکھتا تھا' وہ سطحی ہرگز نہیں ہوتی تھیں۔ وہ بہت گہرائی میں سوچ کے' محسوس کر کے لکھی جاتی تھیں۔ ان میں ایسا سحر ہوتا تھا کہ پڑھنے والا اس کا اسیر ہو جاتا تھا۔ کرداروں کی کیفیت پڑھنے والے پر طاری ہو جاتی تھی۔ اس ایک بات سی کئی باتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اس سے مجیب انور کی شخصیت پر روشنی پڑتی تھی۔ یقینی طور پر وہ بہت حساس اور دردمند انسان تھا۔ اس کے سینے میں ایک محبت بھرا دل تھا کیونکہ محبت اس کا خاص موضوع تھا۔ اس کا مشاہدہ غضب کا تھا۔ اس کی کہانیوں کی جزئیات اس کی گواہی دیتی تھیں اور اس کا تخیل بے حد زرخیز تھا۔ اتنا زرخیز کہ جہاں وہ تخیل لکھتا ہو گا' پڑھنے والے کو اس پر بھی حقیقت کا گمان گزرتا ہو گا اور وہ یقیناً شدت کا آدمی ہو گا۔

یہاں پہنچ کر صفورہ رکی اور اس نے خیالی چہرے میں خد و خال بھرنے شروع کیے۔ خواب دیکھتی ہوئی گہری خوب صورت اور حساس آنکھیں' جن میں مقابل کو اندر تک گہرائی میں دیکھنے کی صلاحیت ہے۔ ان کے اوپر تیکھی بھویں' کشادہ پیشانی' جسے چھدرے ہوتے ہوئے بالوں نے اور کشادہ کر دیا ہے۔ کھڑی ناک' خود داری کا نشان۔ متناسب جبڑے' چھوٹی مگر مضبوط ٹھوڑی' بھرے بھرے ہونٹ' جن کے گوشے نیچے جھکے ہوئے ہیں۔

خیالی چہرہ مکمل ہو گیا۔

اب دوسرے پہلو سے کچھ رنگ دیکھنے تھے۔ اس قدر involve ہو کر اتنا زیادہ لکھنے والے کے پاس تو اپنے لئے بھی وقت نہیں ہوتا ہو گا۔ گویا وہ بے پروا ہو گا۔ شیو بڑھا ہوا' لباس بے ترتیب۔ اس کے بیوی بچے بھی ہوں گے۔ وہ یقیناً ان سے محبت کرتا ہو گا لیکن اظہار کا موقع نہیں ملتا ہو گا۔ بیوی بچے اس سے شاکی رہتے ہوں گے۔ ایسی مصروفیت میں سوشل لائف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ بہت لوگوں سے محبت کرنے کے باوجود خود محبت سے محروم ہو گا۔

اب ایک مکمل خاکہ صفورہ کے سامنے تھا۔ اچانک اس کا دل اس زور سے دھڑکا کہ وہ خود بھی چونک اٹھی۔ ایک ثانئے میں اسے احساس ہوا کہ اسے پہلی نظر میں محبت ہو گئی ہے۔ محبت ایک ایسے خاکے سے جو اس نے خود بنایا تھا۔۔۔۔ اپنے تصور کی

مدد سے۔ لیکن اس خاکے کا نام مجیب انور تھا۔ اب چاہے وہ حقیقت میں اس خاکے سے مختلف ہو۔ مگر وہ اس سے محبت کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔

"میں جان گئی کہ تم محبت سے محروم ہو۔" اس نے آئینے میں نظر آنے والے مردانہ عکس سے کہا۔ "لیکن فکر نہ کرو۔ میں اتنی محبت کروں گی تم سے.... اتنی محبت کہ تم سیراب ہو جاؤ گے اور میری محبت کبھی ختم نہیں ہو گی۔"

اس نے اٹھ کر پیڈ اور قلم سنبھالا اور مجیب انور کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ خط وہ شاہکار ڈائجسٹ کی معرفت پوسٹ کر سکتی تھی۔



سر میں خوب اچھی طرح تیل لگانے کے بعد سحاب نے مجیب سے پوچھا۔ "درد کچھ کم ہوا؟"

"نہیں بھئی۔ آنکھ کے ڈھیلے میں شدید درد ہے۔" مجیب نے کراہتے ہوئے کہا۔

"اور کنپٹی سے ہوتا ہوا گردن تک آ رہا ہے۔"

"ہو سکتا ہے کہ گردن میں جھٹکا آیا ہو۔ ایک طرف سر کر کے پورا دن لکھتے رہے ہیں۔"

"ممکن ہے۔" مجیب نے بے دلی سے کہا۔

"اچھا... اٹھ کر بیٹھیں۔ میرے پاس کسی کا بخشا ہوا عمل ہے گردن کے لئے۔"

"چھوڑو نا۔ آپ ہی ٹھیک ہو جائے گا۔"

"آپ اٹھیں تو۔"

سحاب کے اصرار پر مجیب اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سحاب نے اسے ایک خاص انداز میں بٹھایا۔ "دیکھیے گا' ابھی ڈگڈگی بجنے کی سی ہلکی آواز آئے گی اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"آواز۔" مجیب نے گھبرا کر کہا۔ "کہیں گردن ہی نہ توڑ دینا میری۔"

"اپنی گردن سے زیادہ عزیز ہے آپ کی گردن۔" سحاب نے کہا۔

"آدمی سے چیزیں وہی ٹوٹتی ہیں' جن کی زیادہ پروا ہو اسے۔"

"اچھا... اب فضول باتیں نہ کریں۔"

سحاب کچھ پڑھنے لگی۔ اس نے ایک ہاتھ مجیب کے سر پر اور دوسرا ٹھوڑی کے نیچے رکھا اور ہلکا سا جھٹکا دیا۔ "مجھے تو کوئی آواز نہیں آئی۔" مجیب نے بے حد طمانیت سے کہا۔

"آواز کہاں سے آئے گی۔ کچھ ہوا ہی نہیں۔" سحاب نے بھنا کر کہا۔ "جسم کو ڈھیلا چھوڑیں نا۔"

"ڈھیلا ہی تو چھوڑا ہوا ہے۔"

سحاب نے کئی بار کوشش کی لیکن بات بنی نہیں۔ اسے غصہ آنے لگا۔ "آپ ریلیکس نہیں کر سکتے۔"

"کرتا تو ہوں۔"

"بالکل نہیں کرتے۔ جسم ہر وقت تنا رہتا ہے۔ ستار کے تار کی طرح۔ یہ تو بہت خراب بات ہے۔ اعصاب کو سکون دیتے ہی نہیں آپ۔"

"اپنے اختیار میں تھوڑا ہی ہے۔" مجیب نے گہری سانس لے کر کہا۔ "کسی دن ستار کے بہت تنے ہوئے تار کی طرح ٹوٹ بھی جاؤں گا۔"

سحاب نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسی بات نہ کیا کریں۔ فرصت میں خود کو پرسکون رکھنے کی کوشش کیا کریں۔ جسم کو آزاد چھوڑ دیا کریں۔"

"کوشش تو کرتا ہوں مگر بنتا نہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ اعصاب بہت کمزور ہو چکے ہیں۔"

"کوئی وجہ؟ کوئی خوف ہے آپ کو۔"

مجیب چند لمحے سوچتا رہا۔ "ہاں' شاید خوف ہی ہے اور بچپن سے ہے۔ میں hurt ہونے سے بہت ڈرتا ہوں۔ جذباتی طور پر بھی اور جسمانی طور پر بھی اور شاید ہر وقت خود کو دونوں طرح کے خطرات کی زد میں محسوس کرتا ہوں۔ چنانچہ اعصابی اور جسمانی' دونوں طرح کے تناؤ کا شکار رہتا ہوں۔"

"دیکھیں.... کوئی نقصان پہنچنا ہی ہے تو اس سے آپ بچ نہیں سکتے لیکن یوں زیادہ نقصان پہنچتا ہے۔ خوف ایسی دیمک ہے' جو آدمی کو اندر ہی اندر چاٹ جاتی ہے۔"

"جانتا ہوں۔ بچنے کی کوشش کرتا ہوں مگر بچ نہیں پاتا۔" مجیب نے لیٹتے ہوئے

کہا۔ "بس اب سو جاؤں گا۔ درد بھی کم ہو گیا ہے۔"

سحاب اسے دیکھتی رہی۔ مجیب نے بہت سختی سے آنکھیں بھینچ لی تھیں..... اس بچے کی طرح جو خود کو سوتا ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ "آنکھیں بھی اتنی سختی سے بند کی ہیں۔" وہ بولی۔ "ہر کام بہت سختی سے کرتے ہیں آپ۔ قلم پر بھی گرفت اتنی سخت ہوتی ہے کہ انگوٹھا پچک جاتا ہے۔"

"یہ سختی نہیں' شدت ہے اور میں شدت پسند ہوں۔" مجیب نے آنکھیں بند کئے کئے کہا۔

"عجیب شدت پسندی ہے۔"

"جس کو چاہا ہے اسے شدت سے چاہا ہے فراز
سلسلہ ٹوٹا نہیں ہے درد کی زنجیر کا"

"لائیں..... انگوٹھا دکھائیں۔" سحاب نے کہا اور اس کے دبے ہوئے انگوٹھے کو سہلانے لگی۔ لیکن یہ بات واضح تھی کہ جیسے ہی اس نے مجیب کے انگوٹھے کو چھوا' اس کا جسم تن گیا تھا۔ "میرا شوہر لمس سے بھی خوفزدہ ہے۔" اس نے افسردگی سے سوچا۔ "شاید اسی کو hyper sensitivity کہتے ہیں۔"

انگوٹھے کو سہلاتے سہلاتے اس نے پوچھا۔ "کہانی کتنی رہ گئی ہے؟"

"انشاء اللہ کل دوپہر تک مکمل ہو جائے گی۔" مجیب نے نندا سی آواز میں کہا۔

سحاب چند لمحے خاموش رہی پھر اس نے پوچھا۔ "کل دفتر جائیں گے؟"

اس بار کوئی جواب نہ ملا۔ مجیب سو چکا تھا۔ یہ بھی ایک عجیب بات تھی۔ ایک منٹ کے اندر وہ سو جاتا تھا..... اور اس کی نیند بہت گہری ہوتی تھی۔ شاید اللہ نے یہ کرم نہ فرمایا ہوتا تو وہ اپنی حساسیت اور خوف کے ہاتھوں بہت پہلے مرچکا ہوتا۔



کمال احمد نے ایک نظر اپنے سامنے رکھے مسودے کو دیکھا اور پھر نظریں اٹھا کر مجیب انور کو دیکھا۔ "کہانی مکمل ہو گئی؟"

"جی ہاں جناب۔"

کمال احمد چند لمحے خاموش رہے۔ یہ ان کا خاص انداز تھا۔ مجیب انور اس کا مطلب خوب سمجھتا تھا۔ بالآخر کمال احمد نے کہا۔ "یہ کہانی ڈھائی ماہ میں مکمل ہوئی ہے۔"

"جی کمال صاحب۔"

"Is'nt it too much."

"میں اس سے مطمئن ہوں کہ میں اسے جتنا اچھا لکھ سکتا تھا' اس سے کم اچھا نہیں لکھا ہے۔"

"پھر بھی مجیب صاحب....." کمال احمد کے لہجے میں ہلکی سی خفگی تھی۔

"آپ جانتے ہیں کمال صاحب کہ میں کہانی کے دوران میں کہیں آنا جانا پسند نہیں کرتا کہ ارتکاز ختم ہو جاتا ہے مگر کہیں کہیں مجبور ہو جاتا ہوں۔ درمیان میں میرے ہم زلف کینیڈا سے پانچ سال بعد آئے تھے۔ ان سے ملنے جانا پڑا۔ وہاں سے جو سلسلہ ٹوٹا تو بیس دن میں قلم کھولے بیٹھا رہا لیکن کچھ لکھ نہیں سکا۔"

"آپ خود سوچیں' یہ پروفیشنل اپروچ تو نہیں ہے۔"

"گستاخی معاف کمال صاحب' آپ اس بات کو یوں کہیں کہ یہ کمرشل اپروچ تو نہیں ہے کیونکہ پروفیشنل اپروچ تو یہی ہے۔" مجیب نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "پروفیشنل ہونے کے ناتے مجھے کہانی کی بہتری کو ترجیح دینی تھی۔ جلد بازی کرتا تو ایک اچھی کہانی تباہ ہو جاتی۔"

"چلیں' یونہی سہی۔" کمال احمد نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "ڈائجسٹ بھی تو کمرشل ہی ہوتا ہے۔ مجھے ہر ماہ ایک مخصوص تاریخ پر پرچہ مارکیٹ میں دینا ہوتا ہے۔ ہم ٹائم فیکٹر کو نظرانداز تو نہیں کرسکتے۔ آپ ایک کے بجائے دو کہانیاں دیں تو مجھے زیادہ خوشی ہو گی۔"

"اور مجھے فائدہ بھی ہو گا۔" مجیب نے جلدی سے کہا۔ "میری آمدنی دگنی ہو جائے گی۔ اب آپ سوچیں کہ کم لکھنے میں نقصان آپ کا نہیں' میرا ہے۔ اس دور میں کون ہے' جو زیادہ پیسہ نہیں کمانا چاہتا مگر میں یہ قربانی معیار کی خاطر دیتا ہوں۔"

"نقصان میرا بھی ہے مجیب صاحب۔" کمال احمد نے زور دے کر کہا۔ "ضرور تو

کے تحت آپ ایڈوانس بھی تو لیتے ہیں۔ کم لکھنے کی وجہ سے وہ برابر نہیں ہو پاتا۔"

مجیب لاجواب ہو گیا۔ وہ چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔ "آپ نے ہمیشہ مجھے عزت دی' ضرورت پڑنے پر میری مدد کی۔ آپ کے بڑے احسانات ہیں مجھ پر۔ میرے لئے کہانی پر سمجھوتہ کرنا بہت مشکل ہے لیکن آپ کا حکم ٹالنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے۔" وہ کہتے کہتے رکا۔ "آج آپ مجھے حکم دے دیجئے کہ مجھے معیار کو بھول کر زود نویسی اختیار کرنی ہے۔ زیادہ سے زیادہ کہانیاں لکھنی ہیں۔ شاید اس کے بعد میں یہ سمجھوتا کر سکوں مگر آپ کا حکم ضروری ہے۔"

کمال احمد اس بار خاصی دیر خاموش رہے پھر وہ مسکرائے۔ "نہیں مجیب صاحب۔ میں یہ بات نہیں کہہ سکتا۔ آپ بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ میں اس کی ناقدری تو نہیں کر سکتا پھر اب آپ ذاتی طور پر بھی مجھے عزیز ہیں۔ آپ لکھتے رہیئے۔ اللہ مالک ہے۔"

"میں شکر گزار ہوں آپ کا۔" مجیب انور کے لہجے میں سچائی تھی۔



سحاب قالین پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے دس بارہ خط رکھے تھے۔ ایک خط اس کے ہاتھ میں تھا' جسے وہ پڑھ رہی تھی..... مجیب گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ وہ سحاب کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔

سحاب نے خط پڑھنے کی بعد تہ کر کے لفافے میں رکھا اور گہری سانس لی۔ "آپ کی فین میل بہت بڑھ گئی ہے۔"

"اللہ کا شکر ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اب میں دلوں تک پہنچنے لگا ہوں۔" مجیب نے کہا۔ "یہ خیال ہی بے حد تقویت بخش ہے میرے لئے کہ ملک کے گوشے گوشے میں موجود ایسے لوگ' جنہوں نے کبھی میری تصویر تک نہیں دیکھی' میری زندگی اور صحت کے لئے دعا کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی دعائیں تو یقیناً سچی ہی ہوں گی۔"

"جی ہاں۔ یہ تو ہے۔"

"کیا بات ہے؟ تم کچھ پریشان ہو۔"

"نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ دراصل میں کچھ سوچ رہی تھی۔"

"کیا سوچ رہی تھیں؟"

"بتاؤں گی نہیں۔ شاید آپ کو اچھا نہ لگے۔"

"واہ.... ایسی کیا بات ہے۔ اب تو بتانی پڑے گی۔" مجیب نے آگے بڑھ کر سحاب کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ وہ اب بھی ہچکچا رہی تھی۔ "بتاؤ نا۔" مجیب نے اصرار کیا۔

"غلط نہ سمجھئے گا مگر میرے خیال میں آپ کی فین میل اب بہت خطرناک ہوتی جا رہی ہے۔"

مجیب نے چونک کر سحاب کو دیکھا..... اور بہت غور سے دیکھا "وہ کیسے؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"نسوانی خطوط کا تناسب بہت بڑھ گیا ہے اور بڑھتا جا رہا ہے۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"پڑتا تو نہیں لیکن پڑ بھی سکتا ہے۔" سحاب نے کہا۔ "اس لئے کہ اب فین میل میں لو لیٹرز بھی آنے لگے ہیں۔"

"پگلی ہو تم تو۔" مجیب نے پیار سے اس کے رخسار پر چپت لگائی۔ "لو لیٹرز میں ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ ارے..... لوگ میری تحریر سے پیار کرتے ہیں۔ میرے وجود سے نہیں۔ انہیں میرے لکھنے کی طاقت پر محبت آتی ہے' جو اللہ نے مجھے دی ہے۔"

"آپ اس محبت کی طاقت کو ٹھیک طور سے نہیں سمجھتے' جو ایک ان دیکھے انسان کے لئے کسی کے دل میں ابھرتی ہے۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ایک محبت ہی تو ہے' جس کے ہر روپ کو میں سمجھ لیتا ہوں۔ رہی بات لو لیٹر کی تو تم بھی جانتی ہو کہ کچی عمر میں انسان..... خاص طور پر لڑکیاں کتنی محبت پرست ہوتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ محبت کا ایک خزانہ ہوتا ہے ان کے پاس۔ کسی سے محبت نہ کر پائیں تو محبت سے ہی محبت کر بیٹھتی ہیں اور وہ معصوم ہوتی ہیں.... بے حد پاکیزہ اور معصوم۔ دیکھو نا' معصیت تو قربت میں ہے۔ دوری میں تو صرف معصومیت ہے۔ آج جو معصوم لڑکی مجھ سے محبت کر رہی ہے' اس کے لئے میں بس ایک افسانوی کردار ہوں۔ آنے والے دنوں میں اسے حقیقی زندگی میں کسی سے محبت ہو جائے گی اور وہ عملی زندگی گزارنے لگے گی۔"

"لیکن ان میں سے کسی کی محبت اتنی گہری بھی تو ہو سکتی ہے کہ مرتے دم تک ختم نہ ہو۔" سحاب نے اعتراض کیا۔

"تو وہ تو بہت عظیم محبت ہوئی نا۔ کوئی کسی سے نہ کبھی ملے' نہ اسے دیکھ پائے' پھر بھی زندگی بھر اس سے محبت کرتا رہے تو یہ تو محبت کی معراج ہوگی۔"

"اور آپ کو بھی کسی سے ایسی محبت ہو سکتی ہے۔"

"بالکل ہو سکتی ہے۔" مجیب نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مگر وہ اس محبت سے بالکل مختلف ہوگی' جو مجھے تم سے ہے۔"

"لیکن آپ کو یوں محبت کیسے ہو سکتی ہے۔"

مجیب چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ "فرض کرو' کوئی لڑکی مجھے ایسا خط لکھتی ہے' اس طرح محبت کا اظہار کرتی ہے' جو میرے دل کو چھو لے۔ اس کے نتیجے میں مجھے اس سے محبت ہو سکتی ہے۔ محبت تو میری کمزوری ہے۔ میں محبت کی نفی کبھی نہیں کر سکتا۔ محبت کو رد کرنا میرے بس کی بات نہیں۔"

"تو آپ کیا کریں گے؟" سحاب نے پوچھا۔ "آپ براہ راست خط لکھنے والے فین کو پہلے خط کا جواب ضرور دیتے ہیں۔"

"میں جواب دوں گا اور سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ بتاؤں گا کہ وہ ایسا حال ہے' جس کے سامنے مستقبل کا لمبا راستہ ہے۔ جوانی کی امنگیں ہیں اور زندگی کی نئی نویلی خوشیاں ہیں اور میں وہ حال ہوں' جس کے پیروں میں ماضی کی طویل اور بھاری زنجیر ہے اور جس کے سامنے تھوڑے ہی فاصلے پر زندگی کی منزل ہے.... یعنی موت۔ میں اسے سمجھاؤں گا کہ میں اپنی تحریر میں جتنا خوبصورت' پرکشش اور جوان نظر آتا ہوں' حقیقت میں ویسا نہیں ہوں پھر بھی اگر وہ مجھے دیکھے بغیر یونہی دور رہ کر مجھ سے محبت کرے تو یہ اس کا مجھ پر احسان ہو گا۔ میرا سفر آسان ہو جائے گا۔ محبتیں تو مسافت کو ہلکا اور سفر کو آسان کر دیتی ہیں۔ میں عمر بھر اپنی خوشیوں میں' دکھوں میں اور دعاؤں میں اسے یاد رکھوں گا۔"

"اور فرض کرلیں' کوئی لڑکی اظہار محبت بھی کرتی ہے اور اپنا پتہ بھی نہیں دیتی۔ تو آپ کیا کریں گے؟"

مجیب انور نے غور سے بیوی کو دیکھا لیکن سحاب کے چہرے پر معصومیت تھی اور لہجے میں سادگی۔ وہ کوئی طنز نہیں کر رہی تھی۔ مجیب انور نے سر جھکایا اور ایک گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ وہ اس لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا' جس نے سچ مچ اسے ایسا ہی خط لکھا تھا.... ایک نامکمل خط۔ وہ ایک ایسی بے بس اور معصوم لڑکی کا خط تھا' جو اظہار کو سستا پن سمجھتی تھی مگر محبت کی شدت نے بے بس کر کے اسے خط لکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے خط لکھا تھا اور اسے نامکمل چھوڑ کر ایک نوٹ لکھا تھا.... "یہ اس خط کا پہلا حصہ ہے۔ دوسرا آپ اپنی مرضی سے پڑھ سکیں گے۔ مجھے شاہکار ڈائجسٹ کے ذریعے ہاں یا نہیں کا اشارہ دیں کہ کوئی اور نہ سمجھ سکے۔ آپ ہاں کا اشارہ دیں گے تو میں خط کا دوسرا حصہ پوسٹ کر دوں گی ورنہ نہیں۔"

"کہاں کھو گئے؟" سحاب نے کہا۔

مجیب بری طرح چونکا۔ "کہیں نہیں۔ تمہارے مفروضے پر غور کر رہا تھا۔ یہ کتنا دور از کار ہے۔" اس نے جھوٹ بولا۔ "لیکن اگر ایسا ہو تو میں اس لڑکی کی عظمت کو سلام کروں گا' جس کا تحفظ ناموس کا احساس محبت سے کم طاقتور نہیں۔ کیونکہ ایسی لڑکی محبت سے مجبور ہو کر ہی خط لکھے گی.... جھجک جھجک کر.... سہم سہم کر اور اس کی محبت کو میں عظیم محبت سمجھوں گا۔ لڑکپن کی حماقت اور کچی عمر کا شاخسانہ نہیں۔ میرے دل میں بڑی قدر ہو گی اس کی لیکن میں اشارتاً اسے جواب نہیں دوں گا۔ ہاں' میں اس کے لئے دعا کروں گا کہ اسے ہمیشہ سچی خوشیاں ملیں۔ اللہ اسے آبرومندانہ زندگی عطا فرمائے۔ بس اس کے سوا میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

"اور اگر ایسی کوئی لڑکی خود چل کر آپ کے پاس آ جائے؟" سحاب نے ایک اور مفروضہ گھڑا۔

اب کے مجیب جھنجلا گیا۔ "کیا بات ہے؟ تم میرے کردار سے واقف ہو۔ جانتی ہو کہ میں کس فطرت کا آدمی ہوں۔"

"برا نہ مانیں۔ کردار بھی اللہ کی مہربانی ہی ہے۔ پہلے درجے میں اللہ ترغیبات اور آزمائشوں سے آدمی کو یکسر محفوظ فرماتا ہے۔ دوسرے درجے میں ترغیبات اور آزمائشوں کے طوفان بلاخیز کے سامنے قدموں کو کردار کی استقامت عطا فرماتا ہے۔ انسان کو کردار

پر کبھی غرور نہیں کرنا چاہئے۔ ایک کمزور لمحے میں کردار اور ایمان سب تہس نہس ہو کر رہ جاتا ہے۔"

مجیب لرز کر رہ گیا۔ "میں توبہ کر رہا ہوں۔ واقعی، میں نے غلط بات کی۔ اللہ مجھے معاف کرے۔" اس نے کہا اور چند لمحے سوچتا رہا۔ "لیکن اس صورت میں تمہاری یہ پریشانی بے سبب ہے اور استفسارات بلاجواز ہیں۔"

"یہ بھی ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ لیکن اللہ جانتا ہے کہ میں پریشان نہیں ہوں۔ آپ لکھتے ہیں تو آپ کے پرستار بھی ہوں گے اور وہ آپ سے محبت بھی کریں گے۔ مجھے تو اس پر فخر ہوتا ہے۔ لوگوں کی دعاؤں میں آپ کی وجہ سے میں اور بچے بھی تو شامل ہوتے ہوں گے۔ اس احساس میں بڑی طمانیت ہے۔"

بات ختم ہو گئی۔ وہ سونے کے لئے لیٹ گیا لیکن آناً فاناً سو جانے والے مجیب کو اس رات نیند نہیں آ رہی تھی۔ ایک خلش اسے ستا رہی تھی۔ اس نے وہ خط بیوی کو کیوں نہیں دکھایا؟ کیا وجہ تھی اس کی۔۔۔؟

وہ خط اسے چار دن پہلے ملا تھا لیکن عجیب بات یہ تھی کہ اس لفافے پر نظر پڑتے ہی اسے غیر معمولی پن کا احساس ہونے لگا۔ اس نے لفافے کو پلٹ کر دیکھا۔ اس پر بھیجنے والے کا نام اور پتہ نہیں تھا مگر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی پھر بھی اس کی چھٹی حس مسلسل اسے ٹھوکا دے رہی تھی کہ یہ کوئی معمولی خط نہیں ہے۔

اس نے لفافہ چاک کر کے خط نکالا اور کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ پہلی ہی سطر سے اس کی جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی اور جیسے جیسے اس کی نگاہ آگے بڑھتی گئی اس پر ایک سحر سا طاری ہوتا گیا۔ وہ کوئی عام خط نہیں تھا۔ وہ تو ایک طوفانی محبت کا اظہار تھا۔ لفظوں کی روح بول رہی تھی کہ لکھنے والی بے بس ہے، مجبور ہے۔ لکھنا نہیں چاہتی لیکن کوئی طاقت اس سے بہ جبر لکھوا رہی ہے۔ وہ اپنے لفظوں میں رو رہی تھی کہ آج میں بے وقعت ہوتے جا رہی ہوں۔ آج میں ایک عام اور حقیر لڑکی بن کر رہ جاؤں گی۔ اس لئے کہ محبت کا اظہار اس زمانے میں اتنا عام ہو گیا ہے کہ اس سے ہلکے پن اور سستے پن کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا لیکن بہت مجبور ہو کر لکھ رہی ہوں۔۔۔۔

خط پڑھتے پڑھتے وہ محبت جیسے خط سے نکلی اور مجیب کے اندر سما گئی۔ اس کی

رگ و پے میں دوڑنے لگی۔ عجیب حال ہو گیا اس کا اور وہ لفظوں سے کھیلنے والا آدمی تھا۔ جانتا تھا کہ لفظ بے جان ہوتے ہیں۔ وہ بولنے لگیں، حدت دینے لگیں تو سمجھ لو کہ جذبوں کی آنچ پر پکائے گئے ہیں۔

خط پڑھنے کے بعد بھی دیر تک وہ اس کے سحر میں کھویا رہا۔ کیسی ندامت، کیسی بے بسی، کیسی عاجزی تھی اس خط میں۔ کیسی کیسی کیفیتیں تھیں۔ اسے اس ان دیکھی لڑکی پر بے تحاشا پیار آیا مگر اس نے اس خط کو اپنی فین میل کی دراز میں خطوں کے درمیان رکھ دیا۔ سحاب کو بھی نہیں پڑھوایا۔ حالانکہ وہ اس کے نام پر آنے والا ہر خط پڑھتی تھی۔ اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "میں تمہاری اس محبت کو اپنے اندر بہت سنبھال کر رکھوں گا گڑیا۔ ایسی محبتیں تو زندگی کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ تمہاری محبت مجھے طاقت اور سہارا دے گی۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھولوں گا۔ جو محبت لفظوں سے نکل کر وجود میں دوڑنے لگے، اسے کبھی کوئی بھول بھی نہیں سکتا۔

اس نے وہ خط سحاب کو نہیں پڑھوایا۔ اسے ڈر تھا کہ خط کی شدت سحاب کو مجروح کر دے گی اور ہو سکتا ہے کہ اس کی زندگی پر بھی اثر انداز ہو۔ محبت کے معاملے میں عورت بہت تنگ نظر ہوتی ہے۔

مگر اب وہ سوچ رہا تھا۔۔۔۔خود کو ٹٹول رہا تھا۔ کیا واقعی بات اتنی ہی ہے؟ یا یوں ہے کہ اس بے حد خوبصورت محبت کو اس نے بے حد ذاتی اثاثہ سمجھ کر اپنے اندر چھپا لیا ہے کیونکہ وہ اسے کسی کے ساتھ شیئر نہیں کرنا چاہتا۔ اسی پہلو پر سوچتے سوچتے اسے نیند آ گئی۔



بارہ بجے سحاب نے چائے کی پیالی لا کر میز پر رکھی۔ لکھتے لکھتے مجیب کو احساس ہوا کہ چائے کی پیالی رکھنے کے بعد بھی سحاب وہیں کھڑی ہے۔ اس نے سر اٹھا کر سحاب کو دیکھا۔ "کیا بات ہے؟"

"آج ریحانہ کی مہندی ہے۔" سحاب نے کہا۔

"اوہ، مجھے تو یاد ہی نہیں تھا۔ اتنا قریبی رشتہ ہے۔ وہاں تو جانا ہی ہے۔"

"تو چلیں نا۔ کہانی ابھی شروع کی ہے۔ ڈسٹرب تو نہیں ہوں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" مجیب نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم چلی جاؤ بچوں کو لے کر۔ یہ تو خالص نسوانی تقریب ہوتی ہے۔ میں کیا کروں گا جا کر۔"

"ارے، مرد بھی جاتے ہیں مہندی میں۔ سب سے زیادہ ہنگامہ تو لڑکے ہی کرتے ہیں۔"

"میں لڑکا تو نہیں ہوں۔" مجیب نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم چلی جانا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں چار بجے چلی جاؤں گی۔" سحاب بولی۔ "آپ چائے پی لیں۔"

مجیب کہانی میں کھو گیا۔ درمیان میں وہ کھانے کے لئے اٹھا تو سحاب بچوں کو تیار کرنے میں مصروف تھی۔

چار بجے سحاب نے چائے کا تھرموس میز پر رکھا۔ "تھرموس بھر دیا ہے۔ پیالی رکھ دی ہے۔ اب میں جاؤں؟"

مجیب کو اس پر پیار آ گیا۔ "جاؤ۔ گیٹ سے ہی ٹیکسی لے لینا۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہو گی۔"

پھر بھی مجیب نے اسے جاتے دیکھا تو اسے اس پر ترس آنے لگا۔ سحاب کے کندھے پر بیگ تھا، جس میں اس کے اور بچوں کے وہ کپڑے تھے جو انہیں تقریب میں پہننا تھے۔ ضرورت کی اور چیزیں بھی ہوں گی۔ دوسرے ہاتھ میں اس کا ہینڈ بیگ تھا پھر تینوں بچے، ایسے کہیں جانا آسان تو نہیں تھا۔

"اچھا۔۔۔ جا رہی ہوں۔ اپنا خیال رکھئے گا۔" سحاب نے کہا۔

"ہمیشہ شرمندگی ہوتی ہے مجھے۔ اس طرح اکیلے بھیج دیتا ہوں تمہیں۔"

"کوئی ضرورت نہیں شرمندگی کی۔ مجھے آپ کے مزاج کا پتہ ہے۔ میں چاہتی بھی نہیں کہ آپ کو کوفت ہو اور اکیلے جانے میں مجھے کوئی پریشانی بھی نہیں ہو گی۔ یہاں گیٹ سے ٹیکسی لوں گی اور وہاں گھر کے سامنے اتروں گی۔"

مجیب محبت پاش نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ "تم بہت اچھی بیوی ہو سحاب۔" اس نے زیر لب کہا پھر بلند آواز میں بولا۔ "اچھا خدا حافظ۔"

وہ سحاب سے کہنا چاہتا تھا کہ رات کو ہر قیمت پر واپس آ جائے لیکن یہ کمزوری کا اظہار تھا جو اسے پسند نہیں تھا۔

سحاب اور بچوں کے جانے کے بعد گھر پر ایسا سکوت طاری ہو گیا کہ اس کا دل گھبرانے لگا۔ لکھنے کا انہماک قائم ہونے میں خاصی دیر لگ گئی، مگر بالآخر وہ لکھنے میں منہمک ہو گیا۔



مختار دفتر میں داخل ہوا تو ولی محمد کو دیکھ کر چونکا۔ ولی محمد ڈاک کا انبار سامنے میز پر رکھے اتنا ہی مصروف تھا' جتنا ایک گھنٹہ پہلے تھا۔ مختار اس کی طرف بڑھ گیا۔ "ارے ولی محمد! تم اسٹیشنری نہیں لائے۔ پتہ بھی ہے' چار بج گئے ہیں۔" اس نے کہا۔

ولی محمد نے چونک کر سر اٹھایا۔ "ابھی تک خط ہی نہیں نمٹے۔" اس نے بے بسی سے کہا۔

"تم سست ہو گئے ہو۔" مختار نے کہا۔

"جی نہیں۔ دو باتیں ہوئی ہیں۔ ایک تو ڈاک بڑھ گئی ہے۔ دوسرے میں جس تیزی اور آزادی سے خط کھولتا تھا' اب نہیں کھول سکتا۔"

"کیوں بھئی؟"

"اب ذاتی خط بہت آنے لگے ہیں۔ ان کی وجہ سے احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ اب آنکھیں بند کر کے خط نہیں کھول سکتا۔"

"ہاں' یہ تو ہے۔" مختار نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ وہ خود بھی خطوط میں دلچسپی لینے لگا۔ "ذاتی خط زیادہ تر مجیب صاحب کے ہیں۔"

"جی ہاں۔ اکا دکا کسی اور کا بھی ہوتا ہے۔"

"یہ تو خاصے زیادہ ہیں۔" مختار نے الگ رکھی ڈھیری کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجیب صاحب کی ڈاک بہت تیزی سے بڑھی ہے۔"

"ابھی تو اور نکلیں گے مختار صاحب!"

"چلو... میں بھی ہاتھ بٹا دیتا ہوں تمہارا۔"

مختار بھی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور خط چھانٹنے لگا۔ "ایک ترکیب بتاؤں صاحب۔" ولی محمد نے کہا "رسالے میں مجیب صاحب کا پتہ چھاپ دیں۔ لوگ براہ راست گھر کے پتے پر انہیں خط لکھ دیں گے۔ ہم مصیبت سے بچ جائیں گے۔"

"نہیں چھاپا جا سکتا۔" مختار نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "لوگ خط لکھنے کے بجائے سیدھے ان کے گھر پہنچنے لگیں گے۔"

"تو کیا ہوا؟"

"گدھے ہو تم پھر مجیب صاحب کہانی لکھیں گے یا ان لوگوں کو بھگتیں گے۔ وہ تو ویسے ہی کم لکھتے ہیں۔"

"صاحب۔ اگر کوئی ذاتی خط غلطی سے کھل جائے تو؟"

"ہرگز نہیں کھلنا چاہئے۔" مختار نے سخت لہجے میں کہا۔ "دیر لگ جائے۔ پر یہ غلطی نہ کرنا۔ یہ اخلاقاً بھی بری بات ہے اور بڑے صاحب اسے بالکل پسند نہیں کرتے۔"

خط چھانٹتے چھانٹتے مختار چونکا۔ اس نے ایک خط کھینچ کر دیکھا۔ "ارے..... یہ تو انڈیا سے آیا ہے۔ ذاتی ہے.... مجیب صاحب کے نام۔ بشیر کو بلاؤ اور آج کی ڈاک آج ہی بھجوا دو' مجیب صاحب کو۔"

"اتنی جلدی کیا ہے صاحب۔" ولی محمد نے کہا۔

"یہ کوئی ضروری خط معلوم ہوتا ہے۔"

○

کال بیل کی تیسری گھنٹی نے مجیب کو چونکا دیا۔ اس نے میز پر رکھے ٹائم پیس میں وقت دیکھا۔ سات بجے تھے۔ سحاب اتنی جلدی واپس نہیں آ سکتی تھی۔ سات بجے تو مہندی کی تقریب کے شروع ہونے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

وہ دروازہ کھولنے کے لئے اٹھ ہی رہا تھا کہ چوتھی گھنٹی بجی۔ اس نے جلدی سے جا کر دروازہ کھولا۔ دروازے پر دفتر کا میسینجر بشیر کھڑا تھا۔ اس نے اس کی طرف سات آٹھ خط بڑھائے۔ "یہ آپ کے خط ہیں مجیب بھائی۔"

"شکریہ بشیر۔ آؤ... چائے پلاؤں تمہیں۔"

"نہیں مجیب بھائی۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ اپنے پاؤں میں چکر ہے۔ شہر کے تین مختلف کونوں میں کام ہیں۔ نمٹاتے نمٹاتے رات ہو جائے گی۔"

بشیر چلا گیا۔ مجیب دروازہ بند کر کے اندر چلا آیا۔ اسٹڈی میں آ کر اس نے خط میز

پر رکھے اور کہانی کی طرف متوجہ ہوا مگر دو مکالمے ہی لکھے تھے کہ اس کی نظر انڈیا والے لفافے پر پڑ گئی۔ اس کا ہاتھ رک گیا۔ اس کا تجسس بھڑک اٹھا۔ میرا خط.... اور انڈیا! اس نے لفافے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے سوچا۔

لفافہ ہاتھ میں لے کر اس نے ستائشی نظروں سے تحریر دیکھی۔ تحریر کے حروف متناسب تھے اور ان سے نفاست کا اظہار ہو رہا تھا۔ اس پر لکھنے والے کی شخصیت کا بہت اچھا تاثر مرتب ہوا تھا۔ اس نے لفافے کو پلٹ کر دیکھا۔ وہاں لکھنے والے کا نام پتہ موجود نہیں تھا۔ انڈین ڈاک خانے کی مہر بھی مٹی مٹی سی تھی پھر بھی الہ آباد کا نام پڑھا جا سکتا تھا۔

مجیب کو عجیب سا احساس ہونے لگا۔ ایک اور ویسا ہی خط؟ اس نے گھبرا کر سوچا۔ پھر خود ہی بڑبڑایا۔ "ضروری تو نہیں۔"

اس نے لفافہ چاک کر کے خط نکالا۔ خط پڑھنے سے پہلے اس نے پورے صفحے کا جائزہ لیا۔ وہ ہینڈ رائٹنگ کا قائل ہو گیا۔ بہت خوبصورت اور پختہ تحریر تھی۔ پھر خط نے اس کے اندازے کی تصدیق کر دی۔ لکھنے والی پڑھی لکھی اور سمجھ دار لڑکی تھی۔

یہ خط اپنے تصمیم کے اعتبار سے اسی خط جیسا تھا' جسے اس نے سحاب سے چھپا لیا تھا لیکن انداز اور لب و لہجے میں اس خط سے بالکل مختلف تھا۔ اس سے لکھنے والی کی خود اعتمادی کا اظہار ہو رہا تھا لیکن معصومیت اور شدت میں یہ اس خط کا پاسنگ بھی نہیں تھا۔ شاید اسی لئے یہ اس پر اس طرح اثر انداز نہیں ہوا۔ اس نے سکون سے خط کو پڑھا پھر دوبارہ پڑھنے بیٹھ گیا۔ عجیب خط تھا وہ......

بے حد واجب الاحترام مجیب صاحب!

السلام علیکم!

امید ہے' خیریت سے ہوں گے۔ آپ کو ایسے خط ملتے رہتے ہوں گے پھر بھی میرا خیال ہے کہ میرا خط آپ کو حیران کرے گا۔ میں ایسے خط لکھنے والی نہیں' ایک خاص ضرورت کے تحت لکھ رہی ہوں۔ آپ کی ایک امانت میرے پاس ہے' جس کی اطلاع آپ کو دینی ہے اور وہ امانت ہے آپ کی محبت' اس کا اظہار اپنی خاطر ضروری تھا۔ اس لئے یہ خط لکھ رہی ہوں۔ شاید آئندہ کبھی نہ لکھوں۔

مجھے آپ سے ایسی محبت ہے جو کبھی کم نہیں ہو گی اور نہ ہی ختم ہو گی۔ یہ کوئی جذباتی بات نہیں' وقتی جذبہ نہیں۔ اس لئے کہ آپ ان دیکھے ہونے کے باوجود میرے لئے اجنبی نہیں۔ آپ کی تحریریں آپ کی شخصیت اور کردار کی آئینہ دار ہیں۔ میرا دعویٰ ہے کہ آپ کی باطنی شخصیت مجھ پر پوری طرح روشن ہے اور وہی میری محبت کا سبب ہے۔ اس کے باوجود اتمام حجت کے لئے کہ لوگ کہتے ہیں' ظاہری شخصیت کو شامل کئے بغیر محبت کا دعویٰ کرنا حماقت بلکہ جھوٹ ہے' میں نے اپنے تصور کے زور پر آپ کا ایک شخصی خاکہ بنایا اور اسے دیکھا۔ اس کے بعد بھی میری آپ سے محبت کم نہیں ہوئی۔ لہٰذا اس کے بعد اس محبت کا اظہار ضروری ہو گیا۔ سو کر رہی ہوں۔

مگر پہلے میں آپ کے اس شخصی خاکے سے متعلق بتا دوں جو میں نے بنایا تھا۔ اس کے مطابق آپ کی عمر پینسٹھ سال ہے۔ سانولا جھلسا ہوا رنگ' چہرے پر چیچک کے چھوڑے ہوئے داغ۔ رخسار اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی۔ بڑے ہونٹ اور چوڑی ناک۔ تنگ پیشانی' قد پانچ فٹ دو انچ۔ چال میں خفیف سی لنگڑاہٹ۔

آپ شاید یہ پڑھ کر ہنسیں گے لیکن میں نے یہ خاکہ بنا کر تصور میں آپ کو اس کے مطابق دیکھا۔ یہ وہ بدترین خاکہ تھا جو میں بنا سکتی تھی۔ یہ میری محبت کی آزمائش تھی۔ مگر میں سرخرو ہوئی۔ میری محبت اتنی ہی شدید رہی۔ گویا آپ اس روپ میں بھی میرے لئے محبت کے قابل ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ آپ جیسے بھی ہوں' اس سے بہتر.... بہت بہتر ہوں گے۔

اب اپنا تعارف کرا دوں۔ میں غیر شادی شدہ ہوں۔ عمر کے اکتیس ویں سال میں ہوں۔ ایم اے اردو کرنے کے بعد گھر میں فارغ بیٹھی ہوں۔ متوسط گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ ہمارا گھر الہ آباد میں ہے۔ دیکھنے میں ایسی ہوں کہ اگر آپ کے پرستاروں کا ہجوم ہو اور اس میں اکثریت مردوں کی ہو تو بھی شاید آپ کی نظر مجھ پر نہیں پڑے گی۔ پڑے تو فوراً ہٹ جائے گی۔ آپ دوسری نظر نہیں ڈال سکیں گے۔ رہی باطنی شخصیت تو اس کا اندازہ آپ کو میری تحریر سے ہو جائے گا۔ بس شاید میری سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ میں آپ سے بے اندازہ محبت کرتی ہوں۔

آپ یقیناً شادی شدہ ہیں۔ آپ کے بچے ہیں۔ آپ بہت اچھے شوہر اور بہت

اچھے باپ ہیں۔ مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہئے۔ حتیٰ کہ اس خط کا جواب بھی نہیں۔ میں آپ کو اور آپ کی زندگی کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی۔ سچی محبت کرنے والے تکلیف پہنچاتے بھی نہیں ہیں۔ لہٰذا آپ اطمینان سے میرے اس خط کو اور مجھے اسی لمحے بھلا دیجئے۔ آئندہ کبھی آپ کو پریشان نہیں کروں گی مگر ہمیشہ آپ کے لئے دعائیں کرتی رہوں گی۔

فقط

(جو نام پسند ہو وہ مجھے دے دیں)

مجیب نے خط تہ کر کے لفافے میں رکھ دیا۔ کیسا عجیب خط ہے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ یہ وہ محبت ہے' جسے صحیح معنوں میں محبت کہا جا سکتا ہے مگر میں...... مجیب انور' محبتیں لکھنے والا...... کیا میں کسی سے ایسی محبت کر سکتا ہوں۔ شاید نہیں بلکہ یقیناً نہیں مگر دنیا میں لوگ محبت کی اہلیت رکھتے ہیں۔

وہ بڑے اہتمام سے چائے کی پیالی دھو کر لایا مگر تھرموس خالی ہو چکا تھا اور چائے کی طلب بے حد شدید تھی۔ وہ کچن میں گیا۔ چائے بنا کر ایک پیالی میں انڈیلی اور باقی تھرموس میں پھر وہ دوبارہ اسٹڈی میں آ گیا۔

چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے وہ محبت کے بارے میں سوچتا رہا۔ خط کو اس نے اٹھا کر دراز میں ڈال دیا مگر وہ سوچ رہا تھا کہ اس محبت پر تو بہت اچھی کہانی لکھی جا سکتی ہے۔

وہ سوچتا رہا اور اس کے ذہن میں ایک کہانی کا خاکہ سا بنتا گیا۔ وہ اس کی تفصیل اس کاغذ پر نوٹ کرتا گیا۔ ساتھ ساتھ وہ بڑی طمانیت سے سر ہلاتا رہا۔ وہ یقیناً ایک شاہکار کہانی ہو گی۔ وہ سوچ رہا تھا۔

وہ اسی میں الجھا رہتا لیکن بھوک کے احساس نے اسے چونکا دیا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ نو بج رہے تھے۔ وہ اٹھ کر کچن میں گیا۔ دو منٹ کی تلاش کے بعد اسے سینڈوچ مل گئے جو سحاب اس کے لئے بنا کر رکھ گئی تھی۔ وہ پیٹ پوجا میں مصروف ہو گیا۔

کھانے کے بعد اس نے چائے پی اور ٹی وی لاؤنج میں ہی ادھر سے ادھر چہل

قدمی کرنے لگا۔ ذرا دیر بعد وہ میز پر آ کر بیٹھ گیا لیکن کہانی سے دھیان ہٹ چکا تھا۔ وہ ایک لفظ بھی نہ لکھ سکا۔ اس نے فائل نما کلپ بورڈ بند کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ پورے فلیٹ میں گھومتا پھرا۔ جہاں روشنی نہیں تھی' وہاں اس نے روشنی کر دی۔ اب وہ بے چین تھا' خالی گھر بہت برا لگ رہا تھا اور بچے یاد آ رہے تھے۔ گھبراہٹ بڑھی تو اس نے فلیٹ کا مرکزی دروازہ کھول دیا۔ البتہ لوہے کے گیٹ کو بند کر دیا۔

دس بجے اسے جھنجلاہٹ شروع ہو گئی۔ سحاب پر غصہ آنے لگا کہ وہ اب تک کیوں نہیں آئی لیکن اسے فوراً ہی اپنی نامعقولیت کا احساس ہو گیا۔ مہندی کی تقریب سے واپسی رات بارہ بجے سے پہلے تو ممکن ہی نہیں بلکہ دو بھی بج سکتے ہیں۔

بات درست تھی لیکن اس سوچ کے نتیجے میں ایک اور سوال سانپ کی طرح پھن کاڑھ کر کھڑا ہو گیا۔ اتنی رات کو سحاب بچوں کو لے کر کیسے آئے گی؟ پھر اس سوال کے پیچھے ایک اور بے حد خوفناک سوال نے سر ابھارا۔ اگر سحاب رات کو آ ہی نہ سکی تو کیا ہو گا؟

اس آخری سوال کے کئی جواب تھے اور ایک سے بڑھ کر ایک خوفناک۔ اس کے جسم سے پسینہ پھوٹنے لگا۔ گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ اس کا ذہن بس....تو کیا ہو گا.... کی تکرار کئے جا رہا تھا اور کیا ہو گا' یہ وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

گھبرا کر وہ بچوں کے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے گیم میں ڈسک لگائی اور اپنا من پسند کھیل کھیلنے لگا لیکن اس کا دھیان کھیل میں نہیں تھا۔ ہر بار گیم اوور ہو جاتا۔ وہ تیسرے اسٹیج سے آگے نہیں بڑھ پا رہا تھا۔ اسے نتیجے میں جھنجلاہٹ ہونے لگی۔

اچانک اسے ایک خیال نے لرزا دیا۔ اگر پولیس آ گئی تو؟ اس نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا ہے اور لوہے کے گیٹ کی سلاخ والی کنڈی کو اندر ہاتھ ڈال کر بہ آسانی کھولا جا سکتا ہے۔ وہ گھر میں اکیلا ہے۔ پولیس اسے لے جائے گی تو کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ اسے کہاں لے جایا گیا ہے۔ گویا کوئی اس کی مدد نہیں کر سکے گا۔

اس نے گیم چھوڑا اور لپک کر ٹی وی لاؤنج میں آیا۔ اس نے فلیٹ کا مرکزی دروازہ بند کر دیا مگر دروازہ لاک کرنے کے بعد اسے ایک اور فکر لاحق ہو گئی۔ فرض کرو' میں یہاں بیٹھے بیٹھے قدرتی موت مر جاتا ہوں تو کیا ہو گا۔ کسی کو پتہ بھی نہیں

چلے گا۔ صبح سحاب آئے گی اور بیل دے دے کر عاجز آ جائے گی۔ سب لوگ اکٹھا ہوں گے مگر دروازہ کھولنے.... بلکہ تالا توڑنے میں انہیں کتنی دشواری پیش آئے گی۔ مرکزی دروازہ بند ہونے کی وجہ سے گیٹ کی کنڈی کھولنا ممکن نہیں ہو گا۔ جیسے تیسے وہ کھول بھی لیں تو مقابلہ مرکزی دروازے کے ڈبل لاک سے ہو گا اور اتنی دیر میں اس کی لاش سے بدبو اٹھنے لگے گی....

یہ سوچتے سوچتے وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ نہیں بھئی' مرکزی دروازہ کم از کم ڈبل لاک نہیں ہونا چاہئے۔ اس نے اٹھ کر لاک کی چٹکی نیچے گرائی۔ اب دروازہ ڈبل لاک نہیں تھا۔ مجھے یہ سب سوچنے کے بجائے خود کو بہلانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اس کے اندر بہت دھیمی' کمزور آواز ابھری۔ اس نے اٹھ کر ٹی وی اور وی سی آر کو آن کیا اور اپنی پسندیدہ گیت مالا کی کیسٹ لگا دی پھر گاؤ تکئے سے ٹیک لگا کر اس نے ٹی وی اسکرین پر نظریں جما دیں۔

اس گیت مالا کا ایک ایک گانا اسے بے حد پسند تھا لیکن اس وقت وہ پوری طرح متوجہ نہیں تھا۔ لہٰذا لطف نہیں آ رہا تھا۔ یہ احساس بھی تھا کہ ذہن میں کوئی اہم خیال چبھ رہا ہے۔ وہ مچھلی کا شکار کھیلنے والوں کی طرح ڈور میں کانٹا اور چارا لگا کر اسے ذہن کے پانی میں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ وہ دعا ہی کر سکتا تھا کہ ستانے والے خیال کی مچھلی بس فوراً ہی پھنس جائے گی۔ ٹی وی اسکرین اب اسے نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔

جھٹکا سا لگا۔ شاید مچھلی پھنس گئی تھی۔ اس نے اپنے خیال کو پڑھا۔ اس کا جی چاہا کہ سر پیٹ لے۔ یہ بات تو اسے پہلے ہی سوچ لینی چاہئے تھی۔ سنگل لاک کے ساتھ بھی وہی دشواریاں پیش آتیں جو ڈبل لاک کے ساتھ پیش آنی تھیں۔ وہ پھر اٹھا۔ اس نے ناب کو گھمایا۔ کھٹکا لاک سے باہر آیا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے چٹکی کو اوپر کر دیا۔ لاک کا کھٹکا اندر ہی رہ گیا۔ اب کوئی بھی صرف ہینڈل گھما کر دروازہ کھول سکتا تھا۔

صرف چند منٹ سکون سے گزرے ہوں گے کہ اب وہ اس بات پر پریشان ہونے لگا کہ صرف ہینڈل گھمانا ہے۔ دروازہ کوئی بھی کھول سکتا ہے۔ فوراً ہی اس کے شعور نے دلیل دی کہ اس سے پہلے مداخلت کار کو لوہے کے گیٹ کی کنڈی کھولنی ہو گی اور

یہ آسان کام نہیں۔

وہ پھر اطمینان اور اضطراب کے درمیان معلق کیفیت میں....ٹی وی اسکرین کی طرف متوجہ ہو گیا مگر اضطراب کے اژدہے نے دھیرے دھیرے اطمینان کو نگلنا شروع کر دیا۔ اب یہ کیفیت پوری طرح اس پر حاوی ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے شعوری طور پر دلیل کے زور پر اسے توڑنے کی کوشش شروع کر دی۔ ایسے میں وہ باقاعدہ مکالمے بازی کرتا تھا۔ اپنے اندر کے دونوں فریقوں کے مکالمے وہ خود ہی ادا کرتا تھا۔

"او بھائی' پولیس تمہیں گرفتار کرنے کیوں آئے گی۔" شعور نے دلیل دی۔ "تم کوئی مجرم تو ہو نہیں۔"

"تو پولیس مجرموں کو کب پکڑتی ہے یہاں۔ مجرم کو جاتا دیکھ کر تو منہ پھیر لیتے ہیں پولیس والے۔ وہ تو مجھ جیسے شریفوں کو پکڑتے ہیں۔" اندر کے خوف نے کہا۔

"تمہیں پکڑ کر انہیں کیا ملے گا؟"

"روح کو لذت' ذہن کو سکون اور وحشت کو شکار۔"

"پاگل ہو تم تو' تمہارا تعلق پریس سے ہے۔ وہ فوراً چھوڑ دیں گے تمہیں۔"

"ایسے چھوڑنے والے ہوں تو پکڑیں ہی کیوں۔"

"چلو۔ پکڑ بھی لیں۔ تو کمال صاحب تمہیں چھڑا لیں گے۔ وہ تمہیں اندر رہنے دیں گے کیا؟"

"پولیس کے تشدد سے واقف نہیں تم۔" وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ "کمال صاحب کی کارروائی سے پہلے تو میں مرچکا ہوں گا۔ جانتے ہو' میں تو ایک تھپڑ بھی نہیں سہ سکتا۔"

"یہ بات پولیس والے بھی سمجھ لیتے ہیں۔" شعور نے نہایت اطمینان سے کہا۔

"ارے بھائی' اگر انہوں نے میرے ساتھ مقابلہ کر لیا تو۔"

"تم سے تو وہ جعلی ترین پولیس مقابلہ بھی نہیں کر سکتے۔" شعور نے حقارت سے کہا۔ "چہ پدی چہ پدی کا شوربہ۔"

"تفتیش کہاں ہوتی ہے پولیس مقابلے کی کہ پتہ چلے اصلی تھا یا جعلی۔" خوف نے بھنا کر جواب دیا۔

"اچھا تو جہنم میں جاؤ۔" شعور کو بھی غصہ آ گیا۔ "مرنا ہے تو خیالی پولیس مقابلے میں ہی مر جاؤ۔ مجھے کیا۔"

یہ سن کر خوف خوفزدہ ہو گیا۔ "چھوڑو یار' جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ گیت مالا دیکھو۔ بارہ بج رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں سحاب اور بچے آ جائیں گے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

خوف نے آنکھیں موند لیں اور وہ گیت مالا دیکھنے لگا مگر ساڑھے بارہ بجے اونگھتے ہوئے خوف نے آنکھیں کھولیں' انگڑائی لی اور تازہ دم ہو گیا۔ "کیا کر رہے ہو تم؟" اس نے مجیب کے کان میں سرگوشی کی۔ "یہاں ایک پولیس ہی کی نعمت نہیں۔ دہشت گرد بھی ہوتے ہیں اور ڈاکو بھی۔"

مجیب ایک دم سے تن کر بیٹھ گیا۔ واقعی یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ دہشت گردوں نے اگر لوہے کے گیٹ میں ہاتھ ڈال کر ہینڈل گھمایا تو دروازہ کھل جائے گا پھر اگر وہ دہشت گرد ہوئے تو وہیں سے فائرنگ کر کے اس کا کام تمام کر دیں گے اور اگر ڈاکو ہوئے تو اطمینان سے گیٹ میں ہاتھ ڈال کر گیٹ کھولیں گے اور اندر گھس آئیں گے اور پھر..... وہ پھر کانپنے لگا۔ نہیں بھئی' دروازہ تو لاک ہی کر دینا چاہئے۔

مگر اب اس کا شعور بھی خوف کی چیرہ دستیوں پر بری طرح برہم ہو چکا تھا۔ اس نے ڈپٹ کر کہا۔ "بیٹھے رہو۔ دہشت گرد ہوئے اور تم نے درواہ نہیں کھولا تو وہ فائرنگ سے دروازے کے پرخچے اڑا دیں گے۔ بساط ہی کیا ہے اس دروازے کی۔"

"پھر بھی' اتنی رات کو دروازہ تو لاک ہونا ہی چاہئے۔" خوف منمنایا۔

لیکن اب شعور پوری طرح آمادۂ ستم تھا۔ "اور تم اندر ہارٹ اٹیک سے مر گئے تو پڑے نجانے کب تک سڑتے رہو گے۔"

مجیب کانپنے لگا مگر اب خوف بھی دلیل بازی پر اتر آیا تھا۔ "مرنے کے بعد سڑ بھی گئے تو تمہیں کیا فرق پڑے گا۔ البتہ زندگی میں گولیاں کھانا اور تشدد سہنا تکلیف دہ ہے۔"

مجیب نے جھپٹ کر نہ صرف دروازہ ڈبل لاک کیا بلکہ اوپر کی چٹخنی بھی چڑھا دی۔ اب وہ قدرے مطمئن تھا۔

ایک بج کر دس منٹ ہو گئے تو اسے یقین ہو گیا کہ سحاب اب نہیں آ سکے گی۔ تین بچوں کی ساتھ اتنی رات کو اکیلے آنا مذاق تو نہیں۔ خدایا.... اب یہ رات کیسے گزرے گی۔ وہ بڑبڑایا۔ خوف نے بے ساختہ جواب دیا۔ "رات نہیں گزرے گی۔ اس سے پہلے تم گزر جاؤ گے۔"

اس بار شعور نے دوسری پالیسی اختیار کی۔ "تو کیا ہوا۔ موت تو برحق ہے۔ گزرنا ہے تو گزر جاؤ گے۔ اس سے کیا ڈرنا۔"

مجیب نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ واقعی موت سے کیا ڈرنا۔

وہ اٹھ کر بیڈ روم میں گیا مگر لیٹنا تو درکنار وہاں اس سے بیٹھا بھی نہیں گیا۔ وہ دو تکئے اٹھا کر ٹی وی لاؤنج میں لے گیا۔ تکئے رکھنے کے بعد اسے خیال آیا کہ وہ عین دروازے کے سامنے لیٹ رہا ہے۔ اس نے جلدی سے تکئے ہٹا کر سائیڈ میں رکھے۔ اب اگر کوئی دروازے پر فائرنگ کرے گا تو گولی مجھے نہیں لگے گی۔ اس نے سوچا۔

وہ لیٹ کر سونے کی رسمی کوشش کرتا رہا۔ جانتا تھا کہ نیند آ ہی نہیں سکتی۔ سوا دو بجے گھنٹی بجی تو وہ اچھل پڑا۔ اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ دروازے تک گیا اور میجک آئی سے جھانکا۔ باہر اندھیرا تھا اور کچھ ہیولے سے نظر آ رہے تھے۔ پھر بھی اس نے سحاب کو پہچان لیا۔ شاہد اور حامد اس کی انگلی تھامے کھڑے تھے مگر یہ دیکھ کر اس کے اوسان جواب دینے لگے کہ عالیہ ایک مرد کی گود میں ہے۔

"اوہو..... یہ تو کوئی دہشت گرد ہے۔" خوف نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔" وہ بڑبڑایا۔ "دروازہ تو کھولنا ہی پڑے گا۔ میرے بیوی بچے یرغمال بن گئے ہیں تو کیا میں دروازہ بند کر کے بیٹھا رہوں گا۔"

اس نے لرزتے ہاتھ سے اوپر کی چٹخنی گرائی۔ چٹخنی نیچے کر کے ڈبل لاک کھولا پھر ناب گھما کر دروازہ کھولا۔ لوہے کا گیٹ اب بھی بند تھا۔

اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ "سمیع بھائی آپ؟" اس نے جلدی سے لوہے کا گیٹ کھولا۔ "آیئے۔"

اگلے ہی لمحے ٹی وی لاؤنج آوازوں سے بھر گیا۔ عالیہ سو رہی تھی۔ سمیع نے اسے کارپٹ پر لٹا دیا۔ "بھئی اتنی دیر ہو گئی تھی کہ سبھی رک گئے تھے۔" سمیع نے

بتایا۔ "لیکن یہ سحاب ضد کرتی رہیں کہ ہر حال میں جانا ہے۔ ان کے بہانے ہم بھی نکل آئے۔"

"ہم؟" مجیب نے حیرت سے سمیع کو دیکھا۔

"ہاں بھئی شازیہ اور بچے باہر ٹیکسی میں بیٹھے ہیں۔ چوکیدار نے ٹیکسی کو اندر نہیں آنے دیا۔"

"کیوں؟" مجیب نے سوالیہ نظروں سے سحاب کو دیکھا۔

"وہ کہتا ہے' بارہ بجے کے بعد کوئی باہر کی گاڑی اندر نہیں آسکتی اور کسی اجنبی کو بھی وہ گھسنے نہیں دے گا۔"

"کمال ہے۔" مجیب نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"سیکیورٹی کا بہت اچھا انتظام ہے یہاں۔" سمیع نے کہا۔ "اچھا۔۔۔اب میں چلتا ہوں۔"

"بھائی۔۔۔ چائے تو پی لیں۔"

"شازیہ باہر بیٹھی ہے۔ وقت بھی اتنا زیادہ ہو چکا ہے پھر کبھی سہی۔"

مجیب نے بڑی گرم جوشی سے اس سے ہاتھ ملایا۔ "میں بتا نہیں سکتا کہ کتنا احسان مند ہوں آپ کا۔"

"ایسی کیا بات ہے بھائی۔ یہ سحاب بہن ہے ہماری۔"

سمیع چلا گیا۔ مجیب عالیہ کو گود میں اٹھا کر بیڈ روم میں لے گیا۔ شاہد اور حامد بھی اس کے پیچھے چلے آئے۔ وہ اس سے لپٹ کر لیٹ گئے۔ سحاب باتھ روم سے نکلی تو اس نے پوچھا۔ "دروازہ بند کیا آپ نے؟"

"نہیں۔" مجیب نے بے پروائی سے کہا۔ "یہاں آتا ہی کون ہے۔"



تین بج چکے تھے مگر مجیب ابھی تک جاگ رہا تھا۔ سحاب کی بانہیں اب بھی اس سے لپٹی ہوئی تھیں۔ وہ سو چکی تھی لیکن سونے سے پہلے وہ کسی ننھے سے بچے کی طرح اسے لپٹا کر دلاسے دیتی رہی تھی۔ "پتہ ہے' سب منع کر رہے تھے۔ روک رہے تھے مگر مجھے پتہ تھا کہ آپ رات بھر نہیں سو سکیں گے' ڈرتے رہیں گے۔ اسی لئے اتنی

رات کو بھی واپس چلی آئی۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"جانتا ہوں سحاب۔ تم سے اچھی بیوی روئے زمین پر کوئی ہے ہی نہیں۔"

"مجھے بنائیں نہیں۔ بس اب یہ بچپنا چھوڑ دیں۔"

"اپنے بس میں ہو تو کون ایسی چیز رکھتا ہے اپنے پاس۔" اس نے آہ بھر کے کہا تھا۔

اور اب وہ سوچ رہا تھا' کڑھ رہا تھا کہ وہ ایسا کیوں ہو گیا ہے۔ بارہ سال پہلے تک وہ ایسا تو نہیں تھا۔

اسے یاد تھا کہ وہ بہت نڈر بھی تھا اور سیلانی بھی۔ ان دنوں شہر بھی جنت کا نمونہ ہوا کرتا تھا۔ رات کے دو بجے کہیں بھی نکل جاؤ' نہ کسی پولیس والے کا خطرہ' نہ کسی چور لٹیرے کا ڈر اور وہ خوب گھومتا پھرتا تھا۔ چودھویں کی رات وہ کلفٹن ضرور جاتا اور رات دو تین بجے سے پہلے وہاں سے کبھی نہ چلتا۔ صدر تک پیدل آتا۔ کبھی ڈر نہیں لگتا تھا مگر پھر وقت بدلنے لگا۔ وقت نے محتاط تو ضرور کر دیا۔ خوف زدہ نہیں۔

پھر بارہ سال پہلے وہ واقعہ پیش آیا' جس کے اثرات اب تک نہیں مٹ سکے تھے۔

وہ بہت حساس تھا۔ نازک مزاج تھا۔ تھانوں سے تو اسے اس وقت بھی ڈر لگتا تھا' جب کسی قسم کے خوف میں مبتلا نہیں تھا۔ یہاں تک کہ سرکاری ملازمت ملی تو پولیس ویری فیکیشن کا مسئلہ اٹھا۔ اس وقت بھی اس نے تھانے جانے سے انکار کر دیا۔ پیسے زیادہ دے دیئے لیکن کیریکٹر ویری فیکیشن گھر بیٹھے ہی کرا لی۔ تھانے کسی دور میں بھی دارالسکون نہیں رہے مگر ان دنوں تھانوں کا تصور اتنا بھیانک بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ تھانوں سے گھبراتا تھا۔

بارہ سال پہلے والد کے انتقال کے بعد وہ بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ ایسے میں وہ رات آئی' جس نے اس کے دل میں خوف کا بیج بہت گہرائی میں بو دیا۔ اس شام اس کا خالہ زاد بھائی اشفاق اس سے ملنے کے لئے آیا اور رات اس کے پاس ہی رک گیا۔ وہ اشفاق سے بہت محبت کرتا تھا۔ رات دیر تک وہ باتیں کرتے رہے پھر الگ الگ کمرے میں سو گئے۔

کال بیل کی مسلسل آواز سے اس کی آنکھ کھلی تو چار بج رہے تھے۔ اس نے سوچا' اس وقت کون آگیا۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لگتا تھا' کوئی بری خبر سننے کو ملے گی۔ وہ دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے پر گیا۔ دروازہ کھلتے ہی چھ سات دیو قامت مرد اندر گھس آئے۔ "آپ۔۔۔ آپ کون لوگ ہیں؟" مجیب نے پوچھا۔

ان میں سے ایک استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ "ہمارا تعلق سی آئی اے سے ہے۔" وہ بولا۔

مجیب حیران رہ گیا۔ "سی آئی اے؟ مگر میرے گھر میں کیوں؟"

"اشفاق آیا ہے آپ کے ہاں؟"

"جی ہاں۔ دوسرے کمرے میں سو رہا ہے۔"

وہ سب دوسرے کمرے کی طرف لپکے۔ مجیب بھی ان کے پیچھے پیچھے گیا۔ ان میں سے دو آدمی سوئے ہوئے اشفاق پر گنیں تانے کھڑے تھے اور دو نے دیکھتے ہی دیکھتے اشفاق کے پہلو پر ٹھوکریں مارنا شروع کر دیں۔ "ارے۔۔۔ ارے۔۔۔ یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" مجیب چلایا لیکن درحقیقت وہ خوف زدہ ہو چکا تھا۔

ٹھوکریں لگتے ہی اشفاق گھبرا کر جاگا۔ اب وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ "اٹھ جا شہزادے۔۔۔ اور ہمارے ساتھ چل۔" ایک ٹھوکر مارنے والے نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"لیکن اس کا قصور کیا ہے؟ کیا کیا ہے اس نے؟" مجیب نے لرزتی آواز میں پوچھا۔

"یہ ڈکیتیاں کرتا رہا ہے۔ ڈاکوؤں کے ایک گروہ کا سرغنہ ہے یہ۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ میرا خالہ زاد بھائی ہے۔"

اس پر سب کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ "سرجی۔۔۔ میرے خیال میں تو یہ بھی گروہ میں شامل ہے۔" ان میں سے ایک نے مجیب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ اس سے مخاطب تھا' جس نے اب تک مجیب کے ہر سوال کا جواب دیا تھا۔ وہ شاید اس ٹیم کا انچارج تھا۔

"لو نہیں۔۔۔ یہ بندہ تو شریف لگتا ہے۔" انچارج بولا۔

"سرجی' میری مانیں تو اسے بھی لے چلیں۔"

یہ سن کر مجیب صحیح معنوں میں پہلی بار دہشت زدہ ہوا۔ یہ خیال ہی روح فرسا تھا کہ وہ اسے بھی لے جا سکتے ہیں اور واقعی' انہیں روکنے والا کون تھا وہاں۔

"میں نے کہا نا' نہیں۔" انچارج نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں بلا وجہ ہاتھ ڈالنے کا قائل نہیں ہوں۔"

مگر وہ دیو ماننے والا نہیں تھا۔ اس نے مجیب کو مزید دہشت زدہ کرنے والا ایک مزید نکتہ اجاگر کیا۔ "اور سرجی' چھترول کے بعد اس نے اس شریف بندے کا نام بھی اگل دیا تو۔۔۔؟" اس نے اشفاق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"جب کی جب دیکھیں گے۔" انچارج نے کہا۔ "بس اب چل دو۔"

وہ لوگ اشفاق کو لے گئے۔ مجیب نے فوراً اپنی خالہ کو فون کیا۔ انہیں سب کچھ پہلے ہی سے معلوم تھا۔ اس لئے کہ پہلے چھاپہ ان کے گھر پر پڑا تھا اور انہوں نے ہی چھاپہ مار ٹیم کو بتایا تھا کہ اشفاق شاید اسکے ہاں ہو گا۔

مجیب کا خوف اور پریشانی سے برا حال تھا۔ اس نے سنا تھا کہ تھانوں میں بڑے خطرناک ٹارچر سیل ہوتے ہیں اور پھر یہ تو معاملہ ہی سی آئی اے کا تھا۔ ساڑھے چھ بجے وہ گھر سے نکل آیا۔ اسے اشفاق کی فکر تھی۔ وہ سیدھا سی آئی اے سینٹر پہنچا۔ وہ انچارج سے مل کر بات کرنا چاہتا تھا لیکن انچارج کا نام اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ بس صبح کے ریڈ کا حوالہ دے سکتا تھا۔

جن کانسٹیبلوں سے وہ پوچھ رہا تھا' انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا پھر ان میں سے ایک بولا۔ "لوئے' آج تو انسپکٹر معین ہی نئے پنچھیوں کو پکڑ کر لائے ہیں۔ یہ انہی کا پوچھ رہا ہے۔"

دوسرے نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ "وہ ادھر ہیں۔۔۔ مہمان خانے میں۔" اس نے ایک بند دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "دروازہ کھولو اور اندر جا کر مل لو۔"

مجیب نے دروازہ کھولا۔ وہ جہنم کا دروازہ ثابت ہوا۔ اس میں بند کرنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ مہمان خانہ دراصل ٹارچر روم تھا۔ چھ سات لڑکے وہاں الٹے لٹکے

ہوئے تھے اور ان پر بدترین تشدد کیا جا رہا تھا۔ ان میں اشفاق بھی تھا اور تشدد سہنے والوں کی چیخیں... خدا کی پناہ!

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا رہا۔ نہ وہ ہل سکتا تھا نہ آنکھیں بند کرنے پر اس کا اختیار تھا۔ اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ اس کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکل رہی ہیں۔

شاید ان آوازوں ہی کی وجہ سے انسپکٹر معین اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے جلدی سے لوہے کا پائپ ایک طرف رکھا اور مجیب کی طرف آیا۔ "آپ یہاں کہاں آ گئے۔" اس نے بے حد تہذیب سے کہا۔ "چلیں... باہر چلیں۔" پھر اسے احساس ہوا کہ وہ خود چلنے کے قابل نہیں ہے۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے باہر راہداری میں لے آیا اور ایک بینچ پر بٹھا دیا۔

مجیب کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ انسپکٹر نے کانسٹیبل کو اس کے لئے چائے لانے کا حکم دیا اور خود اس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔ "آپ کیوں پریشان ہوتے ہو؟"

"میرے بھائی کو کتنا مار رہے ہو تم لوگ۔" مجیب نے فریاد کرنے والے انداز میں کہا۔

"مارنا تو پڑتا ہے۔ ورنہ ساتھیوں کے نام کیسے بتائیں گے۔ کہاں کہاں کیا کیا کچھ کیا' کیوں بتائیں گے؟"

"میرا بھائی ایسا نہیں مگر اتنی مار پر تو آدمی وہ اعتراف بھی کرلے جو اس نے نہیں کیا ہو۔"

انسپکٹر بڑی بے رحمی سے ہنسا۔ "جو خراب لائن میں آتا ہے' اس کی چمڑی آپ ہی مضبوط ہو جاتی ہے۔ یہاں سے باہر جائے گا تو دوستوں کو ہنس ہنس کر بڑے فخر سے یہاں کی کہانی سنائے گا۔ آپ کو اس دنیا کا نہیں پتہ۔ آپ گھر جاؤ۔"

اتنی دیر میں کانسٹیبل نے چائے کا گلاس لا کر مجیب کو تھما دیا۔ مجیب نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دو ہزار روپے نکالے جو وہ گھر سے خاص طور پر لے کر چلا تھا۔ وہ اس نے انسپکٹر کی طرف بڑھائے۔

"یہ کس لئے؟"

"تم کچھ بھی کر لو۔ بس اسے مارو نہیں۔"

انسپکٹر عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ "ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے۔ ابھی تو کہانیاں نکلوائی ہیں اس سے پھر یہ مرحلہ بھی آئے گا مگر کیس اس سے بہت زیادہ کا ہے۔"

"میں اسے چھوڑنے کو نہیں' صرف نہ مارنے کو کہہ رہا ہوں۔"

"میں نے کہا نا۔ اس کی ضرورت نہیں۔ آپ گھر جاؤ۔ میرا ٹائم خراب مت کرو۔" انسپکٹر نے کہا اور پلٹ کر دوبارہ مہمان خانے میں چلا گیا۔

مجیب نے جیسے تیسے چائے پی' گلاس بنچ پر رکھا اور باہر نکل آیا مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے اندر ایک بہت بڑی کیمیائی تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ ہاں' بس اسٹاپ پر اترنے کے بعد پیدل اپنے گھر جاتے ہوئے اچانک ہی اسے اس کا پتہ چل گیا۔ ہوا یوں کہ وہ اپنی گلی سے کچھ ہی دور تھا کہ اسے گلی سے نکلتی ہوئی پولیس کی موبائل دکھائی دی۔ اسے دیکھتے ہی اس کا دل بری طرح دھڑکا۔ فوری رد عمل یہ ہوا کہ اس نے پلٹ کر مخالف سمت میں چلنا شروع کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ موبائل والے اسے اٹھانے کے لئے اس کے گھر آئے تھے مگر خوش قسمتی سے وہ ابھی وہاں پہنچ ہی نہیں سکا تھا۔ اس لئے وہ ناکام واپس جا رہے تھے۔

موبائل اس کے پاس سے گزر گئی۔ وہ لرزتے جسم کے ساتھ اسی طرف چلتا رہا۔ وہ اب گھر نہیں جا سکتا تھا۔ وہاں وہ غیر محفوظ تھا کیونکہ وہ پولیس کو مطلوب تھا اور اس کی معقول وجہ تھی۔ اشفاق نے مار پیٹ اور تشدد سے بچنے کے لئے ہو سکتا ہے اس کا نام لے دیا ہو اور اگر ایسا نہ بھی ہوا ہو' تب بھی پولیس کے پاس اس پر ہاتھ ڈالنے کی معقول وجہ موجود ہے۔ اشفاق اسی کے گھر سے تو گرفتار کیا گیا تھا۔ اسے شریک جرم سمجھا جا سکتا تھا۔

یہ اس دہشت کا نقطہ آغاز تھا جس نے آج تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ کئی مہینے وہ دوسروں کے گھروں میں رہتا پھرا۔ اسے یرقان ہو گیا۔ پولیس سے خوف آنے لگا۔ تنہائی سے خوف آنے لگا پھر وہ موت کے خوف میں مبتلا ہو گیا' جس کے متعلق سن کر وہ کبھی ہنستا تھا... "موت سے کیا ڈرنا۔ اسے تو جب آنا ہے' آئے گی اور کوئی

روک نہیں سکے گا۔۔۔" مگر اب وہ اس سے بھی خوفزدہ تھا۔

سال بھر میں یہ تمام خوف قدرے کم ہوئے۔ خوش قسمتی سے شادی بھی ہو گئی۔ یعنی تنہائی کا مسئلہ حل ہو گیا مگر اس نے سحاب کو کبھی ایک رات بھی میکے نہیں ٹھہرنے دیا۔ سحاب کو اس نے سب کچھ بتا دیا تھا۔

شاید وہ خوف بالکل مٹ جاتا اور وہ نارمل آدمی بن جاتا لیکن اس کے بعد شہر کے حالات مسلسل بگڑتے گئے۔ خوف و دہشت کی فضا بنتی گئی۔ ایسی فضا کہ جس میں نارمل لوگ بھی نفسیاتی مریض بن گئے۔ جبکہ وہ تو پہلے ہی دہشت کا ڈسا ہوا تھا۔ ایسے میں شفا کیا ملتی۔

"تم اتنے نازک اور حساس کیوں ہو؟" ایک دن اس کے ایک دوست نے کہا تھا۔

"خود کو بدل لو۔ ورنہ زیادہ دن نہیں چلو گے۔ اس ملک میں اب نزاکت کی کوئی گنجائش نہیں۔"

"مگر اللہ نے مجھے نزاکت دے کر اسی ملک میں پیدا کیا ہے۔" اس نے جواب دیا تھا۔ "اور دیکھنا' ایک دن یہاں نزاکت فکر کی بڑی قدر ہو گی۔ وہ یہاں پروان بھی چڑھے گی انشاء اللہ۔ ہاں' یہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت میں موجود نہ ہوں۔"

اور اب صبح کے چار بجے وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی ایسا ہی ہو گا؟



صفورہ توے پر روٹی ڈال ہی رہی تھی کہ ٹھٹک گئی۔ دروازہ پوری قوت سے کھولا گیا اور اس سے زیادہ طاقت سے بند کیا گیا پھر اندر کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی دھمک سنائی دی۔ صفورہ کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ اب وہ یہ علامات پہچاننے لگی تھی۔

اماں باہر آنگن میں بیٹھی ترکاری چھیل اور کاٹ رہی تھیں۔ صفورہ سمجھ گئی کہ طوفان کا مرکز وہ چارپائی ہی ہو گی' جس پر اماں بیٹھی ہیں۔ اس نے دم سادھ لیا اور ہمہ تن سماعت ہو گئی۔

آنگن میں بیٹھی ناظورہ بیگم نے پہلے دھماکے پر ہی سر اٹھایا۔ داخل ہونے والے سفیان احمد ہی تھے۔ انہوں نے دروازہ اور زور سے بند کیا اور گویا پاؤں پٹختے ہوئے چارپائی کی طرف بڑھے۔ ناظورہ بیگم نے ترئی اور چھری تھالی میں رکھ دی اور ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

سفیان احمد چارپائی کے قریب آئے مگر بیٹھنے کی بجائے فوراً ہی پلٹ گئے۔ بہت تھوڑے فاصلے کے درمیان انہوں نے یوں ٹہلنا شروع کر دیا' جیسے کوئی پنجرے میں بند شیر مشتعل ہو کر ٹہلتا ہے۔

ناظورہ بیگم انہیں بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ انداز سے لگتا تھا کہ وہ شدید غصے میں ہیں لیکن ان کے چہرے پر وہ سرخی اور تمتماہٹ نہیں تھی جو شدید غصے میں ان کے چہرے پر دوڑنے لگتی تھی۔ اس کے برعکس ان کا چہرہ فق ہو رہا تھا۔ رنگت راکھ جیسی ہو گئی تھی۔

اندر باورچی خانے میں' اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے صفورہ نے توے پر پڑی روٹی کو پلٹ دیا۔ اس کے باوجود وہ ایک طرف سے جل گئی تھی۔ "اب اس روٹی کا تو اللہ ہی حافظ ہے۔" اس نے زیر لب کہا۔

باہر ناظورہ بیگم نے بہت دھیمی آواز میں سفیان احمد کو پکارا۔ "سنیں۔۔۔ بیٹھ جائیں

نا۔"

"کیا بیٹھ جاؤں؟" سفیان احمد پھنکارے۔ "بس یہ جی چاہتا ہے کہ زیر زمین ہو جاؤں۔"

"اللہ نہ کرے۔" ناظورہ بیگم دہل گئیں۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔ "آئیں۔۔۔ بیٹھیں تو۔"

سفیان احمد نے کوئی جواب نہ دیا۔ ناظورہ بیگم نے بڑھ کر ان کا ہاتھ تھام لیا۔

"آئیں نا۔"

"چھوڑو میرا ہاتھ۔" سفیان احمد نے بری طرح ان کا ہاتھ جھٹکا مگر چارپائی کی طرف چل دیئے۔ ناظورہ بیگم اندر چلی گئیں۔ واپس آئیں تو ان کے ہاتھ میں تکیہ تھا۔ سفیان احمد اب دوسری چارپائی پر بیٹھ چکے تھے۔ ناظورہ بیگم نے سرہانے کی سمت سلیقے سے تکیہ رکھ دیا پھر وہ دوسری چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ ترکاری کی تھالی کو انہوں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔

"لیٹ جائیں۔" انہوں نے شوہر سے کہا۔ انہوں نے غور سے دیکھا۔ سفیان احمد کے جسم میں انہیں تھرتھری نظر آئی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئے تھے، جیسے بہت نڈھال ہو چکے ہوں۔

"کیا ہوا؟" ناظورہ بیگم نے تشویش سے پوچھا۔ ان کے لہجے میں خدشوں کی پھنکار تھی۔ "کیا پھر کوئی۔۔۔؟"

اندر باورچی خانے میں صفورہ نے توے سے روٹی اتار کر چولہے کی آنچ بہت دھیمی کر دی تھی۔ "خوامخواہ کے سوال جواب، بے کار کا سسپنس۔" وہ دانت پیستی ہوئے بڑبڑائی۔ مگر پھر اس کا پورا وجود جیسے صرف سماعت بن کر رہ گیا۔ ابا کا اگلا جواب بہت اہم تھا۔

باہر سفیان احمد نے جیسے آہ کے روپ میں جواب دیا۔ یوں جیسے کسی کی موت کی اطلاع دے رہے ہوں۔ "ہاں بیگم۔"

"کون؟" ناظورہ بیگم نے ڈری ڈری سرگوشی میں پوچھا۔

"رضیہ۔۔۔"

"رضیہ نے شادی کر لی۔" باہر سفیان احمد نے اپنی بات پوری کی۔

اندر باورچی خانے میں صفورہ سن۔۔۔ بالکل گم صم بیٹھی تھی۔ بات کی سنگینی اب آہستہ آہستہ اس پر کھل رہی تھی۔ رضیہ اس کی سہیلی تھی۔۔۔ سب سے قریبی سہیلی۔ اس کا اثر مجھ پر کس طرح پڑے گا۔ اس کا ذہن بہت تیزی سے سمجھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

"شادی؟" ناظورہ بیگم نے کھوئے کھوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"ہاں۔ رضیہ نے کاش نرائن سے۔۔۔"

سفیان احمد بات پوری نہ کر سکے۔ ناظورہ بیگم نے تیز لہجے میں ان کی بات کاٹ دی۔ "کیا کفر بکتے ہیں آپ؟ نہیں جانتے کہ شادی کیا ہوتی ہے۔"

سفیان احمد صدمے میں تو پہلے ہی تھے اور کھسیا گئے۔ "قانوناً تو یہ شادی ہی کہلائے گی۔"

"اس قانون سے ہمارا کیا تعلق۔ ہمارا قانون تو شریعت ہے۔"

"وہ اس سیکولر ملک میں نہیں چلتی۔۔۔"

"نہ چلتی ہو مگر ہمیں تو اس کے مطابق زندگی گزارنی ہے اور اس سے ہمیں کوئی نہیں روک سکتا۔"

"بے شک لیکن اس کے خلاف زندگی گزارنے والوں کو ہم نہیں روک سکتے۔ اسے قانون کہتے ہیں۔"

باورچی خانے میں بیٹھی صفورہ گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ جذباتیت! نری جذباتیت!! اس نے دل میں سوچا لیکن یہ بھی کہیں کہیں کام آتی ہے۔ اب اس وقت مسئلہ اتنا سنگین نہیں رہا، جتنا ہے۔ علمی مسئلہ بن گیا۔ بحث سنگینی کے احساس کو کم کر دے گی اور نسبتاً کافی پہلے قرار آ جائے گا۔ بس ایک ہلکی سی خلش رہ جائے گی۔۔۔ اور زندگی جاری رہے گی۔

باہر ناظورہ بیگم لاجواب ہو گئیں۔ "ہاں، ہم اسے دوسروں پر لاگو نہیں کر سکتے۔" انہوں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ "لیکن۔۔۔"

"لاگو تو وہ نہیں کر سکے، جنہوں نے الگ خطہ زمین لیا تھا اس کے لئے۔۔۔ اور جن

کے راستے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں۔ وہاں کون سا شریعت کا نظام چل رہا ہے۔"

سفیان احمد کے لہجے میں طنز سے زیادہ دکھ تھا۔

ناظورہ بیگم کو پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ "لیکن فرد تو اپنے اوپر نافذ کر سکتا ہے اسے... اور کرنا چاہئے۔"

"میں بھی یہی کہتا ہوں لیکن ملکی قانون کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ ملکی قانون اگر ایک غیر شرعی معاہدے کو شادی کا نام دیتا ہے تو وہ شادی......"

"پھر وہی شادی۔" ناظورہ بیگم نے بھنا کر کہا۔

"میں شادی کہہ رہا ہوں' نکاح نہیں۔" سفیان احمد کو بھی طرارہ آ گیا۔ "شادی کا مطلب ہے خوشی۔"

"میں نے آپ سے لغات پڑھ کر سنانے کو نہیں کہا۔" ناظورہ بیگم کی آواز بلند ہو گئی۔ "اور اگر یہ شادی یعنی خوشی ہے۔ تو بھائی عبدالجبار کے گھر جا کر دیکھئے کہ ان کے گھر میں خوشیاں منائی جا رہی ہیں یا صف ماتم بچھی ہے۔ انہیں مبارک دینے کی ہمت ہے آپ میں۔ اگر یہ خوشی ہے تو میں ان کے گھر مٹھائی لے کر جاؤں اور فاطمہ آپا کو مبارک باد دوں؟"

سفیان احمد لاجواب ہو گئے۔ ان کے کندھے جھک گئے۔ "تو میں ہی کون سا خوش آیا ہوں یہ خبر لے کر۔ آپ نے بحث شروع کر کے رنگ ہی بدل دیا بات کا۔ لفظ پکڑ کر بیٹھ گئیں آپ۔ آپ کے خیال میں جو کچھ ہوا' وہ میں اپنے گھر میں قبول کر سکتا ہوں۔" وہ اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ "میں تو ڈرتا ہوں اس دن سے......"

ناظورہ بیگم بوکھلا گئیں۔ "کیا کرتے ہیں؟ بچی اندر ہے..... باورچی خانے میں۔ سنے گی تو کیا کہے گی۔"

"میں چاہتا ہوں کہ وہ سن لے۔ سنے اور جان لے کہ وہ میرے سر پر لٹکی ہوئی تلوار بن گئی ہے۔ میری راتوں کی نیند اور دن کا سکون حرام ہو گیا ہے اس کی خاطر۔ کیسے سسکتی ہوئی زندگی گزار رہا ہوں میں۔"

"اچھا..... آپ اندر چلیں۔" ناظورہ بیگم نے اٹھتے ہوئے کہا۔

باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی صفورہ نے سکون کی سانس لی۔ اس نے چنگیری میں

رکھی ہوئی روٹیاں گنیں۔ سات روٹیاں..... مزید روٹیاں پکانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بھائی کے سوا آج کوئی کھانا نہیں کھائے گا۔ سلمیٰ بھی نہیں کھائے گی۔ اماں اور ابا کا بھی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ گویا دوپہر کے سالن سے کام چل جائے گا۔ سالن بنانے کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ آنگن میں جا کر کٹی اور بے کٹی ترئی کی تھالی لے آئی۔ تھالی پر اس نے کپڑا ہلکا سا بھگو کر رکھ دیا۔

وہ آنگن میں جا کر بیٹھنا اور گہری گہری سانسیں لینا چاہتی تھی لیکن ڈر تھا کہ وہاں کسی وقت اماں یا ابا سے سامنا ہو جائے گا اور یہ وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی۔ چنانچہ باورچی خانے ہی میں بیٹھی رہی۔

اب وہ رضیہ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ رضیہ اور وہ بچپن میں ساتھ کھیلی تھیں۔ تعلیم میں بھی ہر قدم پر ان کا ساتھ رہا تھا۔ انہوں نے ایک دوسرے سے دل کی بات کبھی نہیں چھپائی تھی اور رضیہ بھی اس کی طرح ہندوؤں سے اس معاملے میں خاص طور پر نفرت کرتی تھی۔ رضیہ ہمیشہ یہی کہتی تھی کہ کسی ہندو سے شادی کرنے کے مقابلے میں وہ مرجانا قبول کر لے گی پھر اس نے ایسا کیوں کیا؟ اور کیا تو اسے بتایا کیوں نہیں۔ ابھی پرسوں ہی تو ان دونوں کی ملاقات ہوئی تھی مگر رضیہ نے اسے نہیں بتایا۔ اب یہ تو ممکن نہیں کہ اس نے چند گھنٹوں میں اچانک شادی کا پروگرام بنا لیا ہو۔

صفورہ کا جی چاہا کہ رضیہ سے پوچھے کہ اس نے ایسا کیوں کیا لیکن وہ جانتی تھی کہ اب وہ شاید رضیہ سے کبھی نہیں مل سکے گی۔ اس اہم سوال کا جواب اسے کبھی معلوم نہیں ہو سکے گا۔ اس کا جواب اسے خود ہی تلاش کرنا ہو گا۔ یہ امر کچھ دشوار بھی نہیں تھا۔ اس کے اور رضیہ کے درمیان بہت سی قدریں مشترک تھیں۔ دونوں ہم عمر تھیں۔ ایک جیسی تعلیم یافتہ تھیں۔ ایک جیسے مضامین تھے ان کے۔ ایک ہی طبقے سے تعلق تھا ان کا۔ سوچنے کا انداز مشترک تھا۔ تاریخ سے دونوں کو لگاؤ تھا۔

تو پھر رضیہ سے ایک ان ہونی کیوں سرزد ہوئی؟ صفورہ نے سوچا اور وہ میرے لئے ابھی تک ان ہونی ہی ہے لیکن رضیہ بھٹک سکتی ہے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ میں..... اس سے آگے اس سے کچھ سوچا نہیں گیا۔ اسے خیال آیا کہ وہ ابا کے سر پر لٹکتی ہوئی تلوار ہے..... اور اسے گرنے سے بچنا ہے..... ہر حال میں۔ اطمینان بخش

بات یہ تھی کہ فی الحال اس کے اندر کوئی تحریک نہیں تھی گرنے کی لیکن بظاہر رضیہ کے اندر بھی ایسی کوئی تحریک نہیں تھی۔

اب اس بات کا پتہ چلانا بہت ضروری ہو گیا تھا کہ رضیہ نے اس قدر ناقابل قبول اور مکروہ سمجھوتہ کیوں کیا۔ اس کا ایک ہی واضح جواب اس کے ذہن میں آیا تھا۔ فرسٹریشن! لیکن اس کی وضاحت اور اس سے متعلق جزئیات اور تفصیلات بھی ضروری تھیں۔ وہ کہاں سے آئیں گی؟ کیسا فرسٹریشن تھا وہ؟ کیا اس پر بھی طاری ہو گا؟ کیا وہ بھی اس کے سامنے ہار جائے گی۔۔۔؟ خدانخواستہ۔ اس نے جلدی سے اضافہ کیا۔ ہاں، اگر وہ اس فرسٹریشن کو سمجھ لے گی تو اس سے لڑ بھی سکتی ہے۔

مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا!



ٹی وی اسٹیشن کی عمارت میں واقع کانفرنس روم میں ایک بے حد اہم اجلاس ہو رہا تھا۔ ایم ڈی اس کی صدارت کر رہا تھا۔

"یہ درست ہے کہ مجھے چارج سنبھالے ایک ماہ بھی نہیں ہوا ہے۔" ایم ڈی کہہ رہا تھا۔ "لیکن اتنے عرصے میں، میں ہر پروڈیوسر کی کارکردگی کا جائزہ لے چکا ہوں۔ پچھلے ایک سال میں کس نے کتنا کام کیا، میں نے دیکھ لیا اور جو دیکھا، بے حد شرم ناک ہے۔۔۔ تم لوگوں کے لئے۔" اس نے الزام دینے والے انداز میں انگلی اٹھائی اور اسے ایک سرے سے آخری سرے تک لہراتا چلا گیا۔ "میں تمہیں کھلی اور واضح تنبیہہ کر رہا ہوں۔ یہ ٹی وی کارپوریشن ہے، یتیم خانہ نہیں۔ یہاں تمہیں تنخواہ دی جاتی ہے، وظیفہ یا اعزازیہ نہیں۔ تنخواہ کے بدلے کام کرنا ہوتا ہے۔۔۔ کام۔ اب وقت آگیا ہے کہ کام کر کے دکھاؤ یا استعفا دے کر نکل لو۔"

ایک سینئر پروڈیوسر تمتمایا ہوا چہرہ لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ ہم سے اس طرح بات نہیں کر سکتے۔۔۔"

"او شٹ اپ۔" ایم ڈی کی دہاڑ سے کانفرنس روم گونج اٹھا۔ "تم جانتے ہی نہیں کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں تم سے نہ صرف اس طرح بات کر سکتا ہوں بلکہ ابھی تمہیں اٹھوا کر اس ہال سے باہر پھنکوا سکتا ہوں۔ میں نے یہ عہدہ حرام خوری کے لئے

قبول نہیں کیا ہے۔ میں وہ اختیارات لے کر آیا ہوں، جن کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں اس اہم ادارے کی عزت بحال کرنے آیا ہوں۔۔۔"

سینئر پروڈیوسر کا چہرہ یوں سپید پڑ گیا جیسے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی نہ رہا ہو۔ اس نے خفت آمیز نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر سر جھکائے ہوئے دروازے کی طرف چل دیا۔

"ٹھہر جاؤ۔" ایم ڈی کی آواز کوڑے کی طرح لہرائی "دروازہ بند ہے۔ میری مرضی کے بغیر تم باہر بھی نہیں جا سکتے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر شخص اچھی طرح میری بات سن اور سمجھ لے تاکہ بعد میں کوئی شکایت نہ ہو کسی کو۔ واپس آؤ اور بیٹھ جاؤ۔" اس کے لہجے میں تحکم تھا۔

سینئر پروڈیوسر تھکے تھکے قدموں سے واپس آیا اور اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

"یزدانی! تمہیں میرا لہجہ اس لئے برا لگا کہ تم عزت دار ہو۔ تمہارا بڑا نام ہے۔"

اب ایم ڈی نرم لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "لیکن تم بھول رہے ہو کہ نام اور عزت دونوں کام سے ملتے ہیں۔ پچھلے ایک سال میں تم نے دو پٹے ہوئے سیریل کے سوا کیا دیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ ایسے میں تم عزت کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں رکھتے۔"

کانفرنس روم میں سناٹا طاری تھا۔

"میں بھی جانتا ہوں اور تم سب کو بھی یاد رکھنا چاہئے کہ تم میں سے بیشتر پہلے کیا تھے اور اب کیا ہیں۔" ایم ڈی نے مزید کہا۔ "یزدانی، تم معمولی درجے کی اسٹیج کے اداکار اور ہدایت کار تھے۔ اپنا گھر بھی تمہیں یاد ہو گا اور یہ بھی کہ زیادہ تر تم پیدل ہی سفر کرتے تھے۔ آج تم بڑا نام ہو۔۔۔ ناظم یزدانی۔ اب تمہارے نیچے کار ہوتی ہے۔ اور تمہیں کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ یہ سب کچھ تمہیں اسی ادارے سے ملا ہے۔۔۔ ٹی وی سے۔۔۔ یہیں تم نے کام کرنا سیکھا۔ ورنہ تم آج بھی وہی تیسرے درجے کے اسٹیج ڈائریکٹر ہوتے۔ تم احسان فراموش ہو۔ اب تم ٹی وی اسٹیشن کام کرنے کے لئے نہیں، صرف یہ سوچنے کے لئے آتے ہو کہ باہر کی کوئی پروڈکشن کیسے پکڑی جائے۔ ٹی وی سے کام اور ساکھ سمیت جو کچھ حاصل کیا ہے، اسے باہر کیسے کیش کرایا جائے۔۔۔"

یزدانی کا ضبط جواب دے گیا۔ "ہم باہر کیوں کام کرتے ہیں، یہ کبھی سوچا آپ

نے۔ اس مہنگائی کے دور میں تنخواہ میں گزارہ ہو سکتا ہے اور باہر پرائیویٹ پروڈکشن میں کتنا معاوضہ ملتا ہے ہمیں' یہ معلوم ہے آپ کو۔"

"معلوم ہے اور اس کا جواب بھی ہے میرے پاس۔" ایم ڈی نے سرد لہجے میں کہا۔ "اگر تمہارے ساتھ بے انصافی ہو رہی ہے تو استعفیٰ لکھو۔ میں اسی وقت منظور کر لوں گا۔ پھر ذرا باہر جا کر اپنی وقعت دیکھو۔ پھر میں دیکھوں گا کہ کون تمہیں تیس ہزار فی قسط معاوضہ دیتا ہے۔ کوئی نہیں دے گا۔ ناظم یزدانی.... ہونہہ.... مائی فٹ۔ تمہاری وقعت ہے تو صرف ٹی وی کی وجہ سے۔ تم سے اچھے.... بہت اچھے سابق پروڈیوسرز دھکے کھاتے پھر رہے ہیں۔ کام نہیں ملتا انہیں۔ تمہیں ایک قسط کا تیس ہزار ملتا ہے تو اس لئے کہ تم کارپوریشن کے وسائل استعمال کرتے ہو پرائیویٹ پروڈکشن کے لئے.... اسٹاک شاٹس یہاں سے چراتے ہو۔ یہاں کی سہولیات سے استفادہ کرتے ہو۔ آئی سمجھ میں۔ نہیں آئی تو لاؤ' استعفیٰ دو۔" وہ کہتے کہتے رکا۔ "مگر تم نہیں دو گے۔ ذرا یاد کرو۔ شہزاد خلیل کے دور میں ہمارا ٹی وی ایشیا میں نمبرون اور دنیا میں ممتاز تھا۔ تم اس وقت کام کرنا سیکھ رہے تھے اور ان میں سے بیشتر اس وقت یہاں تھے ہی نہیں۔ جانتے ہو' کیوں اتنی ساکھ تھی ہماری۔ ہمارے اس وقت کے پروڈیوسرز کو کام سے عشق تھا۔ انہیں تو وہ سہولتیں میسر بھی نہیں تھیں جو آج تمہارے پاس موجود ہیں مگر تمہیں کام سے محبت بھی نہیں۔ عشق تو بہت دور کی بات ہے...."

"یہ غلط ہے۔ ہمیں بھی اپنے کام سے محبت ہے۔" یزدانی چلایا۔

"جس وقت تم نے ٹی وی کی تنخواہ اور پرائیویٹ پروڈکشن کی بات کی تو ثابت کر دیا کہ تمہیں کام سے محبت نہیں۔ صرف دولت کا حصول تمہارا مطمح نظر ہے۔ تم کس منہ سے کام سے محبت کی بات کرتے ہو اور ذرا یہ تو بتاؤ کہ باہر جا کر کون سا تیر مارا ہے تم نے۔ ایک سے بڑھ کر ایک گھٹیا سیریلز اور ڈرامے۔ کام سے محبت ہوتی تو اپنے کام پر کسی ایسے شخص کا نام دے سکتے تھے' جسے پروڈکشن کی اے بی سی کا بھی پتہ نہیں جس کے پاس صرف پیسہ ہے۔ یہ ہے تمہارا کام اور کام سے محبت۔"

"وہاں سہولتیں کہاں ہیں؟" یزدانی نے مدافعانہ لہجے میں کہا۔

"مگر پیسہ ہے۔ اس لئے وہاں گھٹیا کام بھی کر لیتے ہو۔ یہاں سہولتیں ہیں' وسائل

ہیں' سب کچھ ہے مگر پیسہ نہیں۔ اس لئے کام نہیں کرتے۔ کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟"

اس بار یزدانی کو بھی سانپ سونگھ گیا۔

"اب جبکہ میں نے یزدانی صاحب کو مطمئن کر دیا ہے تو شاید آپ سب سے بات کر سکتا ہوں۔" ایم ڈی نے ایک ایک چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں جو کچھ کہہ رہا ہوں' اس ادارے کی اور اس کے ہر کارکن کی بہتری کے لئے کہہ رہا ہوں۔ اس میں آپ بھی شامل ہیں۔ پہلے جب یہاں سہولتوں کا فقدان تھا' پروڈکشن بہت سستی پڑتی تھی اور معیار بہت اچھا تھا۔ کوئی مسابقت بھی نہیں تھی۔ لہٰذا بزنس بہت آتا تھا۔ اب پروڈکشن بہت مہنگی ہے۔ سیٹلائٹ کا دور ہے۔ مشتہرین دوسرے چینلز کا رخ کر رہے ہیں۔ کیونکہ ہمارے پروگرام کم ہی دیکھے جاتے ہیں۔ بزنس بہت کم ہو گیا ہے اور مسلسل کم ہو رہا ہے۔ کارپوریشن اخراجات بھی پورے نہیں کر پا رہی ہے۔ خسارہ حکومت کو پورا کرنا پڑتا ہے۔ پھر موجودہ وزیر اعظم نے کرپشن کو جڑ سے اکھاڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ.... ٹی وی کارپوریشن کو قومی معیشت پر بوجھ نہیں دیکھنا چاہتے۔ بہت پرکشش آفرز موجود ہیں۔ کارپوریشن کو کانٹریکٹ پر دیا جا سکتا ہے' لیکن تم لوگوں کو آخری موقع دینے کے لئے مجھے مکمل اختیارات کے ساتھ یہ عہدہ دیا گیا ہے۔ ذرا خود سوچو' صرف یہاں کے سو کے لگ بھگ پروڈیوسرز ہیں مگر کارکردگی دیکھو۔ ستر سے زائد ایسے ہیں جن کا کوئی بڑا پروگرام آج تک آن ائر نہیں گیا۔ یہی حال دوسرے سینٹرز کا بھی ہے۔ تو ایسے لوگ بلاوجہ کا بوجھ ہیں کارپوریشن پر اور میں یہ بوجھ برداشت نہیں کروں گا۔ اتار پھینکوں گا۔ یاد رکھو' سفارش سے نوکری مل تو سکتی ہے لیکن اس کا صرف اس زور پر قائم رہنا ضروری نہیں۔ وقت بدل رہا ہے۔ اس کے تقاضے سمجھو۔ کارپوریشن کانٹریکٹ پر چلی گئی تو نئی انتظامیہ بھی صرف کام کرنے والوں کو رکھے گی۔ چنانچہ خود کو سدھار لو۔ یاد رکھو' تم جو کچھ بھی ہو' صرف کارپوریشن کی وجہ سے ہو۔ یہ ایک انسٹی ٹیوٹ ہے جو تربیت دیتا ہے۔ کام کرنے والوں کو بڑا بناتا ہے۔ ورنہ باہر سے آج تک کوئی بڑا پروڈیوسر کیوں نہیں آیا۔ اور اگر کسی کو شبہ ہے تو وہ کارپوریشن سے ناتا توڑ کر باہر قسمت آزمائے۔ حقیقت سامنے آ جائے گی۔ ہم تمام بے

کار اور بددیانت لوگوں کو نکال دیں گے۔ خواہ ان کا کتنا ہی بڑا نام ہو۔ ہمیں معلوم ہے کہ یہاں کام سے عشق کرنے والے بھی موجود ہیں۔ ہم نئے لوگ بھرتی کریں گے اور ان کی تربیت کریں گے۔ کارپوریشن پہلے سے بہتر کارکردگی دکھائے گی۔ آخری بات یہ کہ اب کوئی باہر کی پروڈکشن نہیں کرے گا۔ ہمیں پتہ چل گیا تو فوراً نکال دیں گے۔ اس سلسلے میں خصوصی احکامات کل جاری کر دیئے جائیں گے۔ اس سے زیادہ اور اس سے بہتر طور پر میں نہیں سمجھا سکتا۔ بس یہ یاد رہے کہ ہمیں بہت کم وقت میں بہتری دکھانی ہے۔ ہمارے پاس زیادہ مہلت نہیں ہے۔"

دیر تک خاموشی رہی۔ ایم ڈی متوقع نظروں سے ایک ایک کو تکتا رہا۔ بالآخر زاہد شکیل اٹھا۔ "میں کچھ کہنا چاہتا ہوں سر۔"

"فرمایئے۔ آپ بلاشبہ کام سے عشق کرنے والے پروڈیوسرز میں سے ہیں۔"

"شکریہ سر۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سب سے زیادہ دیکھے جانے والے اور بزنس لانے والے پروگرامز ڈرامے ہیں۔ خواہ وہ سیریل ہو' سیریز ہو یا لانگ پلے۔"

"میں آپ سے متفق ہوں۔"

"اور ڈرامے کی لئے مضبوط کہانی اور مربوط اسکرپٹ بنیادی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر کچھ کیا ہی نہیں جا سکتا۔"

"یہ بھی درست ہے۔"

"لیکن لکھنے والوں اور پرفارمرز دونوں کے معاوضے بہت کم.... بلکہ بے کشش ہیں۔ ان معاوضوں کے ساتھ ہمیں کوئی اچھی امید نہیں رکھنی چاہیے۔"

"ذرا وضاحت کیجئے۔"

"اسکرپٹ لکھنے والے جتنے بھی ہیں' پارٹ ٹائمر ہیں۔ ان کی دوسری مصروفیات ہیں' دوسرے پروفیشن ہیں۔ بس وہ شوقیہ.... اور شہرت کے لئے لکھتے ہیں۔ اس لئے کم لکھتے ہیں۔ ہماری ضرورت زیادہ ہے اور ہمارے معاوضے کی وجہ سے کوئی اس کام کو فل ٹائم نہیں کر سکتا۔ لہٰذا بدلتے ہوئے تقاضوں کے تحت ہمیں معاوضوں کو پرکشش بنانا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ اس سلسلے میں اپنی سفارشات مجھے بھجوایئے۔" ایم ڈی نے

کہا۔ "مگر یاد رکھئے' ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں کم وقت میں بڑی تبدیلی کی توقع کر رہا ہوں آپ سب سے۔"

اجلاس برخاست ہوا تو بیشتر کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔



کہانی اوسط رفتار سے مگر بے حد ہمواری کے ساتھ تکمیل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ چنانچہ پچھلے دو ہفتوں سے بچے بہت خوش تھے۔ مجیب انہیں باقاعدگی سے وقت دے رہا تھا اور خوب دے رہا تھا۔ ایک بہت اچھا سا معمول بن گیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ان دنوں وہ بہت سویرے بیدار ہو جاتا تھا۔ بچے ساڑھے سات بجے اسکول جاتے۔ وہ ان کے ساتھ ناشتہ کرتا اور ان کے جاتے ہی کام شروع کر دیتا۔ ٹھیک ڈیڑھ بجے وہ کام روک دیتا اور اس کے بعد کام نہ کرتا۔ ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ ایک بجے تک وہ اتنا کام کر لیتا تھا' جتنا عام طور پر وہ پورے دن میں بھی نہیں کر پاتا تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ کہانی کی تھیم بہت سادہ اور غیر پیچیدہ تھی۔ وہ آسانی اور روانی سے لکھ رہا تھا۔ کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی مگر اسے یہ معلوم تھا کہ اس کہانی کا کلائی میکس بہت ستائے گا اور تین چار دنوں میں وہ اس مقام تک پہنچنے والا تھا۔

فرصت کے اس قابل رشک عرصے میں بچوں کے اسکول سے آنے کی بعد وہ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا پھر بچے اسے اپنی ورک بکس لا کر دکھاتے۔ وہ ان سے ہوم ورک مکمل کراتا۔ اس کے بعد وہ ان کے ساتھ بیٹھ کر کارٹون دیکھتا۔ مولوی صاحب بچوں کو پڑھانے کے لئے آتے اور اس دوران میں وہ اپنی دوپہر کی ایک گھنٹے کی نیند لیتا۔ پانچ بجے وہ انہیں پارک لے جاتا۔ سحاب بھی ساتھ ہوتی۔ بچے جھولے جھولتے' پھسلنیوں پر چڑھتے اترتے اور وہ اور سحاب بینچ پر بیٹھے بے فکری سے وہ باتیں کرتے رہتے' جن کا موقع کم ہی ملتا تھا۔ ایسے ہی موقعوں پر سحاب اس کی سوشل معلومات کو اپ ڈیٹ کرتی تھی۔

پارک سے واپس آ کر ایک گھنٹہ پڑھائی کا ہوتا پھر بچے ویڈیو گیم کھیلتے۔ اس دوران میں وہ مطالعہ کرتا۔ یہاں تک کہ سونے کا وقت ہو جاتا۔ عام دنوں میں بچوں کے پیچھے بھاگنا پڑتا تھا اور وہ سونے سے بچتے تھے لیکن اس عرصے میں وہ خود اس کے

پاس آ جاتے۔ "ابو۔۔۔ سوئیں گے نہیں۔"

سونے میں ان کی دلچسپی کا سبب یہ تھا کہ مجیب اس نئے معمول میں ہر روز انہیں سوتے وقت کہانی سناتا تھا۔ لطف یہ تھا کہ وہ سلسلے وار کہانی تھی اور بچوں کو کچھ زیادہ ہی پسند آئی تھی۔ ہر روز وہ ایک بے حد سنسنی خیز موڑ پر کہانی کو روک دیتا اور اس انداز میں جیسے ڈائجسٹ میں سے پڑھ کر سنا رہا ہو' کہتا۔ "اس سنسنی خیز کہانی کے مزید واقعات کل شب ساعت فرمائیں۔" بچے اس سے سوالات کرتے۔ جواب نہ پا کر وہ خود اندازہ لگانے کی کوشش کرتے کہ آئندہ کیا ہو گا اور یہ اندازہ لگاتے لگاتے سو جاتے۔

"جب آپ اپنی کہانی میں بہت زیادہ الجھ جائیں گے تو کیا ہو گا؟" سحاب پوچھتی۔

"کس کا کیا ہو گا؟ تمہارا؟"

"میرا تو وہی ہو گا جو ہو رہا ہے۔ میں اس سلسلے وار کہانی کی بات کر رہی ہوں جو بچوں کو سناتے ہیں آپ۔"

"آگے کا حال تم سنانا انہیں۔"

"بھئی کہانی تو میں سنا سکتی ہوں مگر یہ سلسلے وار کہانی میرے بس کی نہیں اور میں دیکھ رہی ہوں کہ بچوں کو لت پڑ گئی ہے اس کی۔"

"یہ تو بالکل بھی مشکل نہیں۔ بس چند واقعات گھڑ کر سنائے۔ ایک بینگ نکلا۔۔۔ دھماکا۔۔۔ اور باقی آئندہ۔"

"واقعات ہی نہ سوجھیں تو۔ اب سب کچھ تو سپاہی میاں کے ساتھ ہونا ہے نا۔"

"اس کی ترکیب یہ ہے کہ یہ فرض کر لیں کہ دنیا میں جو بھی واقعہ پیش آتا ہے وہ ہمارے مرکزی کردار سپاہی میاں کے ساتھ پیش آتا ہے۔ اس کے بعد کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ اور اگر پھر بھی واقعات نہ سوجھیں تو منظر کشی پر زور دے کر چھوٹی سی بات کو پھیلا دو۔ مگر منظر کشی ایسی ہو اور اتنا سسپنس اور تھرل ہو کہ بچوں کو اپنی سانسیں رکتی محسوس ہونے لگیں۔"

"مجھے تو لگتا ہی کہ اس کے بعد شاید میں خود بھی کہانی لکھنے لگوں گی۔"

"ممکن ہے۔ میں خود بچوں کو کہانی سناتے ہوئے کہانی کے بارے میں بہت کچھ سیکھتا ہوں۔"

اس شام پارک سے واپس آتے ہوئے ننھی عالیہ نے بڑے لاڈ سے کہا۔ "ابو۔۔۔ آج فالودہ کھلائیں نا۔"

"ہاں ابو اور چکن بھی۔" حامد بولا۔

"ابو' میں پزا کھاؤں گا۔" شاہد نے فرمائش کی۔

"ٹھیک ہے۔ آج کھانا باہر کھائیں گے۔" مجیب نے کہا۔ بچوں نے خوشی سے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔

وہ زینے پر ہی تھے کہ فون کی گھنٹی کی آواز سنائی دی۔ "میں دیکھتا ہوں۔ فون ہے کسی کا۔" مجیب نے کہا اور چابی ہاتھ میں لئے زینوں پر لپکا۔ دروازہ کھول کر وہ فلیٹ میں داخل ہوا۔ فون تک پہنچتے پہنچتے وہ ہانپنے لگا۔ ریسیور اٹھا کر اس نے ہیلو کہا۔

"کیا بات ہے۔ بھاگ کر آ رہے ہو؟"

"اوہ طاہر۔۔۔ ہاں بھئی' ہم لوگ گھر میں نہیں تھے۔ فون کی گھنٹی کی آواز سن کر میں بھاگا ہوا آیا ہوں۔"

"مصروفیت کیا ہے آج کل؟"

"وہی حال ہے پرانا مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"ملنے آنا چاہتا تھا۔" دوسری طرف سے طاہر نے کہا۔

"تو چلے آؤ۔ تمہیں میری مصروفیت سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ویسے بھی تمہیں دیکھے بہت دن ہو گئے ہیں۔"

"اکیلا نہیں ہوں گا میں۔ ایک پروڈیوسر صاحب ہوں گے۔"

"خیریت؟" مجیب کے لہجے میں حیرت تھی۔ "ٹی وی پروڈیوسر مصنفین کی پیچھے کب سے بھاگنے لگے۔"

"کل سے۔" طاہر نے مزے لے کر کہا۔ "ایم ڈی نے بہت تگڑی جھاڑ پلائی ہے۔ جان پر بنی ہوئی ہے سب کی۔ تو آ جاؤں؟"

مجیب ہچکچایا۔ "یار پچھلے تجربے سے میں بڑا مایوس ہوا ہوں۔ میرا خیال ہے' وقت ہی ضائع ہو گا۔"

"نہیں بھئی۔ تم جانتے ہی ہو کہ صغیر بلال کیسا کام کرنے والا پروڈیوسر ہے۔"

مجیب ایکسائیٹڈ ہو گیا۔ "اس کا کام تو واقعی مجھے پسند ہے۔ کچھ امید بندھ رہی ہے۔"

"تو پھر آ جاؤں نا۔"

"آج تو نہیں۔ آج میں بچوں کو لے کر جا رہا ہوں۔ کل مغرب کے بعد کسی بھی وقت آ جانا۔"

"ٹھیک ہے پھر کل ملاقات ہو گی۔"

"ابو..... کب چلیں گے؟" حامد نے پوچھا۔

"تم لوگ پڑھ لو پھر چلیں گے۔"



کمال احمد نے میز پر رکھے ہوئے خطوط کے پلندے کو دیکھا اور پھر مختار کو جو سامنے والی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ "یہ سب کیا ہے؟" انہوں نے خطوط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "میں نے تم سے صرف وہ خطوط مانگے تھے، جن میں مجیب انور کے انٹرویو کی فرمائش کی گئی ہے۔"

"یہ سب وہی خطوط ہیں جناب۔" مختار نے کہا۔

"یہ سب..... اتنے سارے؟" کمال احمد کے لہجے میں بے یقینی تھی۔ "اچھا..... یہ کتنے عرصے کے خط ہیں؟"

"پچھلے چھ ماہ کے اور یہ چند نمائندہ خطوط ہیں۔ یہ آپ پڑھ لیجئے۔" مختار نے ہاتھ میں موجود چار خط ان کی طرف بڑھائے۔

کمال احمد نے ایک ایک کر کے وہ چاروں خط پڑھے۔ وہ کسی سوچ میں گم ہو گئے پھر انہوں نے سر اٹھا کر مختار کو دیکھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرے خیال میں مجیب صاحب کا انٹرویو ہمیں شائع کرنا چاہئے۔"

کمال احمد پھر سوچ میں گم ہو گئے۔ "مشکل بات ہے۔" انہوں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"مسئلہ کیا ہے سر؟"

"شاہکار میں کسی کا انٹرویو کبھی شائع نہیں ہوا۔ نہ میرے خیال میں اس کی گنجائش

ہے۔" کمال احمد نے پرخیال لہجے میں کہا۔

"جی ہاں، یہ تو ہے۔ لیکن روایت شکنی کو سراہا بھی خوب جاتا ہے۔"

"نہیں۔ ایسے بات نہیں بنے گی۔" کمال احمد نے کہا۔ وہ اب بھی سوچ رہے تھے۔ اچانک ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ مسکرائے۔ "ہاں، یہ ممکن ہے بلکہ بہت اچھا رہے گا۔ مجیب انور کے انٹرویو کو ہم اپنے دوسرے پرچے میں شائع کریں گے۔"

مختار کا حیرت سے منہ کھل گیا۔ "یعنی کاجل میں۔" انہوں نے بے ساختہ کہا۔

"لیکن وہ تو خواتین کا پرچہ ہے۔"

"ہاں، ہے۔ تو پھر؟"

"میں نہیں سمجھتا کہ کاجل کے قارئین کو مجیب صاحب سے کوئی دلچسپی ہو گی۔"

"دونوں پرچوں کی ریڈر شپ کا ایک حصہ مشترک بھی ہو گا۔" کمال احمد نے کہا۔

"پھر یہ بھی سوچئے کہ کاجل چھوٹا پرچہ ہے۔ اسے اس انٹرویو سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔"

مختار چند لمحے سوچتا رہا پھر مسکرایا۔ "ٹھیک کہتے ہیں آپ۔ ہم پبلسٹی کریں گے۔ مجیب انور کے پرستار، اس انٹرویو کے لئے وہ شمارہ ضرور خریدیں گے۔"

"اور اگر وہ شمارہ جاندار ہوا تو ایسے لوگ بھی ہوں گے جو اس کے مستقل قاری بن جائیں گے۔"

"جی ہاں۔ بالکل ٹھیک ہے۔"

"بس، یہ ٹھیک ہے۔ کاجل کا شمارہ پانچ تاریخ کو آئے گا اور آج....." کمال احمد نے ٹیبل کیلنڈر پر نظر ڈالی۔ "آج 11 تاریخ ہے۔ میں اسما صدیقی کو ہدایت کر دوں گا کہ اس شمارے کو میٹر کے اعتبار سے مضبوط ترین بنائے۔ شاہین کو مجیب انور کے انٹرویو کے لئے بھیجیں گے۔" وہ کہتے کہتے رکے۔ "مگر سوالات میں ترتیب دوں گا۔"

"جی ٹھیک ہے لیکن....."

"لیکن کیا؟"

"میں نے مجیب صاحب سے کہا تھا۔ انہوں نے ہنس کر ٹال دیا۔ کہنے لگے، انٹرویو شو بزنس والوں ہی کے اچھے لگتے ہیں۔ مجھے تو معاف ہی رکھیے۔"

"وہ مجھے انکار نہیں کریں گے۔ آپ تیاری کرلیں۔ اب آپ جائیں۔"

مختار کمرے سے چلا گیا تو کمال احمد نے پیڈ اپنے سامنے کھینچا اور قلم سنبھال لیا۔ وہ جلد از جلد وہ سوال ترتیب دے لینا چاہتے تھے جو مجیب انور سے پوچھے جانے تھے۔



اس روز مجیب انور کا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔ صغیر بلال بہت اچھا پروڈیوسر تھا۔ لیکن مجیب ٹی وی کی دنیا میں جو کچھ دیکھ چکا تھا' اس کے بعد اسے کسی سے کوئی اچھی امید نہیں رہی تھی اور شام کو صغیر بلال اس سے ملنے آ رہا تھا۔ کون جانے' اس کی اپروچ بھی وہی ہو لیکن وہ طاہر کو انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ طاہر اس کا بچپن کا دوست تھا۔ بے حد مخلص' بے حد محبت کرنے والا اور وہ ہمیشہ اس کے کام بھی آیا تھا۔

پچھلی بار طاہر ہی کی بدولت وہ ٹی وی میں ان ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ ہوا تو کچھ نہیں مگر ٹی وی اسٹیشن پر رلنے کے اس عرصے میں اس نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ وہ بھی ایک عجیب ہی کہانی تھی۔

ان دنوں وہ ذہنی جمود کا شکار تھا۔ دو مہینے ہو گئے تھے اور وہ کچھ بھی نہیں لکھ سکا تھا۔ لکھنے والوں پر ہی موقوف نہیں' ہر پروفیشن میں آدمی پر ایسا وقت آتا ہے جیسے ایک بہت اچھا کرکٹر کھیلنا بھول جاتا ہے اور مسلسل کم اسکور پر آؤٹ ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح وہ لکھنا بھول گیا تھا اور وہ بری طرح ڈپریس تھا۔ معاشی حالات ابتر ہونے لگے تھے۔ وہ عدم تحفظ کے احساس کا بری طرح شکار ہو چکا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اگر یہی کیفیت رہی تو کیا ہو گا۔ کیا اسے کوئی ملازمت تلاش کرنی ہو گی۔

ایسے میں ایک دن طاہر اس سے ملنے آ گیا۔ اسے صورت حال کا پتہ چلا تو بولا۔

"یار' تم ٹی وی کے لئے کیوں نہیں لکھتے؟"

"ٹی وی کے لئے؟" مجیب نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "ٹی وی کے لئے کون لکھنے دے گا مجھے؟"

"اب وہ بات نہیں۔ ڈش کی وجہ سے مسابقت بہت بڑھ گئی ہے۔ پروڈیوسرز لکھنے والوں کی تلاش میں پھر رہے ہیں۔"

"مگر بھائی' مجھے تو اسکرپٹ کی الف بے بھی نہیں معلوم۔"

"تم کل گیارہ بجے ٹی وی اسٹیشن آ جاؤ۔ میں تمہیں ملواؤں گا اور اسکرپٹ

رائٹنگ پر کئی کتابیں رکھی ہیں میرے پاس۔ وہ بھی لے لینا۔"

مجیب انور بہت پہلے فلمی ماحول کو دیکھ چکا تھا اور گھبرا کر وہاں سے بھاگا تھا۔ مگر ٹی وی کے بارے میں اس کا امیج مختلف تھا۔ وہ اگلے روز طاہر کے پاس چلا گیا۔ طاہر نے اسے عمر اختر سے ملوایا۔ عمر جونیئر پروڈیوسر تھا اور اس نے کبھی کچھ پروڈیوس بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ وہاں بڑی توپ چیز تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس کا تعلق اسکرپٹ ڈیپارٹمنٹ سے تھا۔ وہ جس چیز کو رد کر دیتا' وہ آن ائر جا ہی نہیں سکتی تھی۔

عمر بڑے تپاک سے ملا۔ مجیب کے لئے چائے منگوائی اور بڑی خوش اخلاقی سے باتیں کرتا رہا۔ "تو آپ کہانیاں لکھتے ہیں؟" چائے کے دوران میں اس نے کہا۔

"جی ہاں۔"

"تو لکھنا کیوں چھوڑ دیا؟"

"چھوڑا نہیں۔ بس لکھا نہیں جا رہا ہے۔" مجیب نے بتایا۔

"جو کہانیاں چھپ چکی ہیں' ان میں سے کوئی ایسی ہے جسے ڈرامائز کیا جا سکے؟" عمر نے پوچھا۔

"ہاں۔ میری زیادہ تر کہانیاں ایسی ہی ہیں۔"

"کوئی کہانی سنائیے۔"

مجیب نے بڑے اعتماد سے تین کہانیوں کے خاکے سنا دیئے۔ اسے یقین تھا کہ عمر بہت متاثر ہو گا لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ عمر نے شاہانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"نہیں مجیب صاحب! نہیں چلیں گی۔ یہ کہانیاں ٹی وی پر نہیں چل سکتیں۔"

"کوئی وجہ بھی ہو گی؟"

"مختصر سی وجہ ہے.... ٹی وی کی پالیسی۔"

"وضاحت نہیں کریں گے آپ؟"

"دیکھئے.... بہت کچھ ہم ٹی وی پر نہیں دکھا سکتے۔" عمر نے گہری سانس لے کر کہا۔ "ہم کرائم نہیں دکھا سکتے۔ گھوڑے نہیں دکھا سکتے۔ مرد اور عورت کی قربت نہیں دکھا سکتے۔ کسی بھی طرح' کسی بھی انداز میں عورت کی تذلیل اور توہین نہیں دکھا سکتے... کسی خاص پروفیشن سے تعلق رکھنے والے کردار نہیں دکھا سکتے۔ جیسے کہ حجام'

قسائی' دھوبی وغیرہ۔"

"تو میں کوئی نیشاسی سناؤں آپ کو؟" مجیب نے جل کر کہا۔

"وہ لوگ دیکھنا پسند نہیں کریں گے۔" عمر نے نہایت اطمینان سے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کا وقت ضائع کیا۔" مجیب اٹھنے لگا۔

"بیٹھ جائیے۔ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔" عمر نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

"طاہر میرا بہت اچھا دوست ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں آپ کے لئے کچھ نہ کروں۔ میں آپ کو چند انگلش فلموں کے نام لکھوا رہا ہوں۔ انہیں دیکھیں۔"

"مجھے کرنا کیا ہو گا؟"

"انہیں دیکھیں اور سین ٹو سین اپنے ماحول میں ڈھال لیں۔ اس طرح اسکرپٹ میں کوئی جھول نہیں ہو گا اور فوراً ہی منظوری مل جائے گی۔"

"لیکن میں ایسا کیوں کروں۔" مجیب نے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "جبکہ میں اوریجنل لکھ سکتا ہوں۔"

عمر نے بدمزگی سے اسے دیکھا۔ "یہاں اسکرپٹ کیا' پائلٹ پروگرام تک مسترد ہو جاتے ہیں۔ خیر' آپ کی مرضی۔ اچھا' ایسا کریں' بقرعید کے لئے کوئی پلے سوچیں۔ بہت مختلف اپروچ ہونی چاہئے۔ ہم لکیر نہیں پیٹنا چاہتے۔"

یہ سن کر مجیب کی امید پھر بندھی۔ "ٹھیک ہے۔ میں آئیڈیا ڈویلپ کر کے آؤں گا آپ کے پاس۔"

اسی روز طاہر نے اسے صداقت علی سے ملوا دیا۔ صداقت علی کو ایک آئیڈیا بھی پسند آ گیا۔ "بس جی آپ اسے لکھ دیں۔ اس میں گنجائش بھی بہت ہے۔ یہ سیریل تو ہم جب تک چاہیں' چلا سکتے ہیں۔"

مجیب خوش ہو گیا۔ بات بن رہی تھی۔

"بس یہ خیال رکھیں کہ Hilarious کامیڈی ہونی چاہئے۔"

"لیکن صداقت صاحب' یہ مزاحیہ نہیں' طنزیہ کہانی ہے۔" مجیب نے احتجاج کیا۔

"اسے بھول جائیں آپ۔ بس یہ یاد رکھیں کہ ہمیں پورے پچیس منٹ لوگوں کو ہنسانا ہے۔۔۔ اتنا کہ وہ بے حال ہو جائیں۔ ان کے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔"

مجیب کچھ کہنے ہی والا تھا کہ طاہر نے جلدی سے کہا۔ "آپ بے فکر ہو جائیں صداقت صاحب۔ کام ہو جائے گا۔"

وہ صداقت کے کمرے سے نکلے تو مجیب طاہر پر برس پڑا۔ "عجیب ہونق آدمی ہو۔ کہانی کا پتہ نہیں' خوامخواہ ہامی بھر لی۔"

"کہانی کا مجھے کچھ نہیں پتہ مگر یار میری بات گرہ میں باندھ لو۔ اس صداقت کو پکڑ کر رکھو۔ جیسا یہ کہے' ویسا لکھو۔ ایک بار ان ہو جاؤ پھر من مانی کرنا۔"

"لیکن یار' کہانی میں مزاح کی گنجائش نہیں۔"

"تو نکالو۔ رائٹر کس بات کے ہو تم۔ ہاں۔۔۔ یہ اسکرپٹ والی کتابیں لے لو تم۔"

مجیب اگلے روز سے مصروف ہو گیا۔ وہ مصروفیت سہ جہتی تھی۔ وہ کتابوں سے یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسکرپٹ کیا ہوتا ہے اور اسے کیسے لکھا جانا چاہئے۔ دوسری طرف وہ بقرعید کے لئے آئیڈیا سوچ رہا تھا۔ تیسری طرف وہ اپنی طنزیہ کہانی میں مزاح نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے دن رات ایک کر دیئے۔

دس دن بعد وہ سیریل کی پہلی قسط لے کر صداقت علی کے پاس پہنچا۔ صداقت علی نے اسکرپٹ پڑھا۔ مجیب اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا لیکن اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

اسکرپٹ پڑھنے کے بعد صداقت نے سر اٹھایا۔ "مکالمے بہت اچھے لکھے ہیں آپ نے۔ یہ بڑی اہم بات ہے۔"

مجیب نے سکون کی سانس لی۔ "شکریہ۔"

"لیکن سچویشنز نکالنے میں آپ مار کھا گئے۔" صداقت بولا۔ "اور یہ زیادہ اہم بات ہے۔"

"مزاح تو میں زبردستی ڈال رہا ہوں۔ کہانی کو تو دیکھیں۔۔۔"

"کہانی کو ایک طرف رکھ دو یار میں کہتا ہوں hilarious کامیڈی ہونی چاہئے۔ لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ جائیں ہنس ہنس کر۔"

مجیب خاموش بیٹھا رہا۔ وہ بہت بدمزہ ہوا تھا۔ یہاں تو کہانی اٹھا کر ایک طرف رکھی جا رہی تھی۔ یعنی بنیاد غائب۔۔۔

"دیکھو۔۔۔ ٹیمپو بھی فاسٹ ہونا چاہئے۔" صداقت نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ "

پچیس منٹ میں کم از کم اٹھارہ سین نکالو۔ اب ایسا کرو کہ میں تمہیں scenario لکھواتا ہوں۔ اس کے مطابق قسط لکھ لاؤ۔ میں چاہتا ہوں کہ جلد از جلد پائلٹ بنا کر منظوری لے لوں۔"

مجیب کہنا چاہتا تھا کہ آپ خود ہی لکھ لیں لیکن وہ خاموشی سے scenario لکھنے بیٹھ گیا۔ کچھ اپنی ضرورت کا خیال تھا' کچھ طاہر کی دوستی کا۔

وہ اٹھنے لگا تو صداقت نے کہا۔ "بس دو دن میں لکھ لو۔ میں کاسٹ فائنل کر کے اگلے ہفتے ریکارڈنگ کا شیڈول بنا رہا ہوں۔"

طاہر نے یہ روداد سنی تو بولا۔ "یہ اور بھی اچھا ہے۔ کام پکا ہو گیا۔ اب وہ اسکرپٹ ریجیکٹ نہیں کر سکتا۔ مبارک ہو۔"

مجیب نے دو دن میں پہلی قسط مکمل کر لی مگر لکھنے کے دوران میں اسے کوفت بہت ہوئی۔ خوش قسمتی سے اسے بقر عید پلے کا آئیڈیا بھی سوجھ گیا تھا۔ اگلے روز وہ ٹی وی اسٹیشن گیا تو بہت پرامید تھا۔ اس نے اسکرپٹ صداقت کے سامنے رکھ دیا۔ صداقت نے اسکرپٹ پڑھ کر طمانیت سے سر ہلایا۔ "یہ ہوئی نا بات۔ اب ہم دوسری قسط کا scenario بنا لیتے ہیں۔ آپ لکھیں۔"

مجیب لکھنے لگا مگر صداقت کو کچھ سوجھ نہیں رہا تھا۔ اچانک اس نے کہا۔ "مون ٹری دیکھتے ہیں آپ؟"

"یہ کیا بلا ہے؟"

"اسٹار سے ایک پروگرام آتا ہے۔"

"میرے ہاں ڈش نہیں ہے۔"

صداقت نے ترحم آمیز نظروں سے اسے دیکھا اور مون ٹری کی کہانی سنانے کے بعد بولا۔ "اس کا یہ سیکونس لے کر دوسری قسط میں ڈالو۔ لوگوں کا برا حال ہو جائے گا ہنس ہنس کر۔"

مجیب نے اسکرپٹ اپنی طرف کھینچ لیا۔ "مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ لوگ اس حال کو پہنچ گئے۔ کبھی آپ جاپان سے ایوارڈ لے کر آتے تھے اور اب آپ نقالی کر رہے ہیں۔ یہ بھی نہیں سوچا آپ نے کہ ڈش اب بہت عام ہے۔ بیشتر لوگ مون ٹری

دیکھتے ہوں گے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" صداقت نے بے پروائی سے کہا۔

"آپ کو نہیں پڑتا ہو گا۔ مجھے پڑتا ہے۔ میں اس انداز میں کام نہیں کر سکتا۔"

"آپ خوامخواہ touchy ہو رہے ہیں۔"

"جب آپ میری کہانی پر سیریل بنا ہی نہیں رہے ہیں تو اسکرپٹ خود ہی لکھ لیجئے یا کسی اور سے لکھوا لیں۔" وہ اسکرپٹ اٹھا کر کمرے سے نکل آیا۔

شاید وہ دن ہی خراب تھا۔ عمر اختر نے بقر عید پلے کا آئیڈیا سن کر اسے ستائشی نظروں سے دیکھا اور بولا۔ "بہت ہی پاور فل آئیڈیا ہے۔ ایسا پاور فل آئیڈیا میں نے پہلے کبھی نہیں سنا۔" مجیب کی باچھیں کھل گئیں لیکن اگلے ہی لمحے اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ "لیکن یہ چلے گا نہیں۔"

"کیوں؟" مجیب نے دھماکے سے سنبھل کر پوچھا۔

"بہت مختلف ہے یہ۔"

"آپ نے کہا بھی یہی تھا۔"

"مختلف اپروچ سے میری مراد یہ نہیں تھی۔" عمر نے جلدی سے کہا۔ "ذرا سوچو تو۔ لوگوں کا تو رو رو کر برا حال ہو جائے گا۔ خوشی کے موقع پر ہم رلائیں اپنے ناظرین کو۔"

"لیکن اس کا اینڈ ہیپی ہے۔" مجیب نے صفائی پیش کی۔ اس نے اپنے اس آئیڈیئے سے بڑی امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔

"اینڈ دیکھے گا کون..... اس سے پہلے ہی لوگ چینل بدل چکے ہوں گے۔"

"لیکن میں نے اس میں قربانی کی صحیح روح پیش کی ہے۔"

"نہیں بھائی' یہ بقر عید پلے ہے ہی نہیں۔ قربانی کی روح کسی کو نہیں سمجھنی۔ لوگ تفریح چاہتے ہیں۔ ہنسی کے ذریعے دن بھر کی ٹینشن دھو ڈالنا چاہتے ہیں۔"

"یعنی بقر عید پلے مزاحیہ ہونا ضروری ہے اور مزاح کے لئے بکروں کا مذاق اڑانا' ان کی دل آزاری کرنا ضروری ہے پھر آپ نے مختلف اپروچ کی بات کیوں کی تھی۔"

"اس سے میرا مقصد اور تھا۔ جیسے مشینی بکرا لے لیا ہے کسی نے جو رات بھر میں

میں کرتا ہے۔ بقر عید کے دن وہ صاحب بکرے کا سوئچ آف کر کے اسے اسٹور میں بند کر دیتے ہیں۔ اب سوچیں' کیسی کامیڈی نکلے گی اس میں۔"

"یہ تو قربانی کے نام پر فراڈ ہوا۔" مجیب نے تپ کر کہا۔ "اور پیغام یہ ہوا کہ قربانی کا مقصد پڑوسیوں کو دکھانا ہے کہ ہم قربانی کر رہے ہیں۔"

"آپ سیریس کیوں ہو رہے ہیں۔ بھائی' لوگ جو دیکھنا چاہتے ہیں' ہم وہی تو دکھائیں گے انہیں۔"

اب مجیب ہٹنے کے نہیں' بحث کرنے کے موڈ میں تھا۔ "آپ کو یہ گمان کیوں ہے کہ آپ ہی لوگوں کو سمجھتے ہیں۔ کیا ہر شخص آ کر بتاتا ہے آپ کو کہ وہ کیا دیکھنا چاہتا ہے۔"

"ہم خطوط سے اندازہ لگاتے ہیں۔"

یہ جواب مجیب پہلے بھی کہیں سن چکا تھا۔ اس نے کہا۔ "مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ ٹی وی والوں کو فلم والوں سے مختلف ہونا چاہئے تھا۔"

"کیوں؟ دونوں تقریباً ایک ہی چیز ہیں۔"

"صرف اس لئے کہ دونوں کا تعلق اسکرین سے ہے؟" مجیب نے تیز لہجے میں کہا۔ "فلم بنانے والے کو فکر ہوتی ہے کہ لوگوں کی پسند کا خیال رکھے۔ وہ بارہ مسالے کی چاٹ بنانے میں حق بجانب ہے کہ فلم پر لاکھوں اپنی جیب سے لگا رہا ہے اور پھر اسے لوگوں کو گھروں سے نکال کر سینما ہال تک لانا ہے۔ تاکہ نہ صرف اس کا سرمایہ واپس آئے بلکہ منافع بھی ہو۔ آپ کے ساتھ تو یہ مسئلہ نہیں۔ آپ تو لوگوں کے گھروں میں گھسے بیٹھے ہیں۔ آپ انہیں اچھی چیز دکھائیں گے تو وہ دیکھیں گے...."

"وہ دیکھیں گے نہیں۔ ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبائیں گے اور ڈش ٹی وی دیکھنا شروع کر دیں گے۔"

"وہ تو اب بھی دیکھ رہے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ یہاں صرف گھڑے ہوئے مفروضوں پر کام چل رہا ہے۔" یہ کہہ کر مجیب باہر نکل آیا۔

ٹی وی سے اسے نقصان نہیں ہوا۔ فائدہ ہی پہنچا۔ بقر عید چلے کے آئیڈیے پر اس نے شاندار کہانی لکھی اور ڈائجسٹ میں دوبارہ ان ہو گیا مگر ٹی وی سے اس کا دل

ہی برا ہو گیا۔ حالانکہ وہ ایک بہت روشن مستقبل اور بڑا اسکوپ رکھنے والی فیلڈ تھی۔

اور اب مشہور پروڈیوسر صغیر بلال اس سے ملنے....

فون کی گھنٹی نے یادوں کا سلسلہ توڑ دیا۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف کمال احمد تھے۔ "مجیب صاحب کیسے ہیں آپ؟"

"اللہ کا شکر ہے جناب!"

"میں نے اس لئے فون کیا ہے کہ ہمیں آپ کا انٹرویو چھاپنا ہے...."

مجیب نے خاصی بحث کی لیکن کمال احمد نے اسے قائل کر لیا۔ "آپ کے قارئین جاننا چاہتے ہیں آپ کو۔ یہ ان کی خوشی ہے۔ اسے کیسے رد کر سکتے ہیں آپ؟"

لیکن تصویر کے معاملے میں مجیب اڑ گیا۔ "نہیں کمال صاحب' تصویر نہیں۔"

"اس میں کیا حرج ہے؟"

"پرستار امیج بناتے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ امیج کا ٹوٹنا بے حد تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میں کسی کو یہ تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا۔"

"لیکن ایسی بات بھی نہیں...."

"پلیز کمال صاحب! آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کی بات نہیں ٹال سکتا۔ مجھے مجبور نہ کریں۔"

"چلیں ٹھیک ہے۔ یہ معاملہ بعد میں بھی دیکھیں گے۔ کل گیارہ بجے شاہین آپ کے پاس آئے گی۔ انٹرویو کے لئے...."

"ٹھیک ہے جناب!"

ریسیور رکھ کر مجیب سوچ میں ڈوب گیا۔ صغیر بلال ہی کیا کم تھا کہ یہ دوسری مصیبت بھی نازل ہو گئی۔



"میں تو بھئی پاور فل کہانی اور بہت اچھے اسکرپٹ کے بغیر کام میں ہاتھ ہی نہیں ڈالتا۔" صغیر بلال نے کہا۔

"لیکن یہ دونوں چیزیں آسانی سے کہاں ملتی ہیں۔" مجیب بولا۔ طاہر خاموش تماشائی کی حیثیت سے بیٹھا تھا۔

"مجھے مل جاتی ہیں۔ عام طور پر اچھی کہانی اور اسکرپٹ چل کر میرے پاس آ
ہیں۔ شاید اس کی وجہ میری ساکھ ہے پھر میں جستجو بھی کرتا ہوں۔"

"بہت اچھی بات ہے۔ اپنے کام سے لگن اور عشق ہو تو آدمی جستجو کرتا ہی ہے خلاف مزاج بھی بہت کچھ برداشت کرلیتا ہے۔"

"آپ کے پاس بھی میں اسی لئے آیا ہوں۔" صغیر نے کہا۔ "سنا ہے کہ آپ بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ اچھا اور ایسا کہ ڈرامائی عنصر بھی بہت طاقت ور ہے۔"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ بس میں لکھ رہا ہوں۔"

"کوئی کہانی سنایئے مجھے۔" صغیر نے فرمائش کی۔

"سناؤں؟" مجیب نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا پھر اس نے اٹھ کر کتابوا
کی الماری میں سے کچھ ڈائجسٹ منتخب کر کے نکالے۔ ڈائجسٹ لے کر وہ صغیر کے پا
چلا آیا۔

"یہ میری وہ کہانیاں ہیں' جن پر میرے خیال میں بہت اچھا ڈراما بن سکتا ہے آپ انہیں پڑھ لیں۔ کوئی پسند آ جائے تو پھر اس پر بات کرلیں گے۔"

اب کے خالی خالی نظروں سے دیکھنے کی باری صغیر بلال کی تھی۔ "یہ تو بہت ل
کام ہو جائے گا۔ آپ مجھے ون لائن سنادیں۔"

"سوری صغیر صاحب' سنانے کے معاملے میں' میں بہت کچا ہوں۔" مجیب
معذرت کی۔

"ارے ایسا بھی کیا۔ آپ سنائیں تو۔"

"میں کہانی نویس ہوں' قصہ گو نہیں۔" مجیب نے بمشکل لہجے کو تلخی سے بچایا۔

"میں کہانی نہیں' خاکہ سننا چاہ رہا ہوں۔" صغیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مگر مجھے سنانا نہیں آتا۔ سنانے والا ہوتا تو میں لکھنے میں کیوں جان مارتا۔"

"اچھا چلیں۔ ون لائن لکھ دیں مجھے۔"

"کیسے لکھ دوں۔ میں خلاصہ نویس بھی نہیں ہوں۔" مجیب کے لہجے میں بے
تھی۔ "پھر خاکے سے آپ کہانی کی strength کا اندازہ کیسے لگائیں گے۔"

"میں اندازہ لگالوں گا۔" صغیر نے بے حد اعتماد سے کہا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے لگالیں گے۔ صغیر صاحب ازل سے اب تک ایک ہی کہانی کہی اور لکھی جا رہی ہے۔ بس ٹریٹ مینٹ اور جزئیات ہی کہانی کو ایک دوسرے سے الگ کرتی ہیں اور یہ دونوں چیزیں نہ خاکے میں سما سکتی ہیں نہ ون لائن سنانے میں۔"

"فیلڈ میں کام کرتے کرتے تجربہ ہو جاتا ہے۔" صغیر نے بے حد تحمل سے کہا۔

مجیب نے بے بسی سے طاہر کو دیکھا۔ وہ خود ملتجیانہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"مجیب لکھ دو نا۔ پلیز۔" وہ بولا۔

مجیب نے کاغذ قلم سنبھالا اور لکھنا شروع کیا لیکن بہت سوچی سمجھی تفصیل سے لکھنے والے کے لئے کہانی کا خاکہ لکھنا تقریباً ناممکن تھا پھر بھی وہ طاہر کی مروت میں کوشش کر رہا تھا۔

"یہ دراصل ایک طے شدہ طریق کار ہے۔" صغیر بلال نے کہا۔ "ایک سیریل کی منظوری کئی مرحلوں میں ہوتی ہے۔ میں رائٹر سے ون لائن سنوں گا۔ یہ پہلا مرحلہ ہے۔ ون لائن مجھے پسند آئی تو میں اس سے ون لائن لکھواؤں گا۔ وہ ون لائن جی ایم کے پاس جائے گی۔ جی ایم اور پروگرام منیجر کو وہ پسند آ گئی تو اسے ہر ماہ ہونے والی جنرل منیجرز کانفرنس میں پیش کیا جائے گا۔ وہاں وہ منظور ہو گئی تو گویا پہلی قسط کی منظوری مل گئی۔ رائٹر پہلی قسط لکھے گا۔ میں پائلٹ پروگرام ریکارڈ کروں گا۔ وہ اسلام آباد سے منظور ہو گیا تو گویا سیریل منظور....."

مجیب نے لکھتے لکھتے سر اٹھایا۔ "صغیر صاحب' آپ پی ٹی وی ہی کے لئے کام کرتے ہیں نا؟"

اس بار صغیر کو اس کی بات بری لگی۔ "جی ہاں اور سب یہ بات جانتے ہیں۔ میں نے کبھی کوئی پرائیویٹ پروڈکشن نہیں کی۔"

"میں دراصل پی ٹی وی کے وسائل کی وجہ سے پوچھ رہا ہوں۔" مجیب نے وضاحت کی۔ "مجھے ان میں سے کسی مرحلے پر کوئی اعتراض نہیں۔ کارپوریشن کا طریقہ کار ہے۔ کوئی کیا کر سکتا ہے لیکن کارپوریشن کے پاس وسائل کی کمی نہیں۔ کارپوریشن کو کم از کم دو آسامیاں بڑھانی چاہئیں۔ ایک قصہ گو کی اور دوسری خلاصہ نویس کی۔ یہ

کام رائٹر سے لینا بہت بڑی زیادتی ہے۔ ہمارے ڈائجسٹ میں تو اگر کسی سلسلے وار کہانی لکھنے والے سے گزشتہ قسطوں کے خلاصے کی فرمائش کر دی جائے تو وہ خلاصہ لکھنے کے بجائے آخری قسط لکھ کر ایڈیٹر کو تھما دے گا اور سلسلہ وار کہانی لکھنے سے ہمیشہ کے لئے تائب ہو جائے گا۔"

صغیر کا منہ بن گیا۔ مجیب پھر لکھنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ صغیر نے طاہر کی طرف دیکھا مگر وہ دانستہ ڈائجسٹ پڑھنے میں منہمک ہو گیا تھا۔

ذرا دیر بعد مجیب نے خاکہ مکمل کر کے صغیر کی طرف بڑھایا۔ "یہ لیجئے جناب ون لائن۔" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ "لیکن میں پھر کہوں گا کہ آپ پوری کہانی پڑھ لیں تو زیادہ بہتر رہے گا۔"

صغیر نے بغیر کچھ کہے لکھا ہوا صفحہ لیا اور پڑھنے لگا۔ پڑھنے کے بعد اس نے سر اٹھایا تو اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔ "اس میں کہانی کہاں ہے؟ یہ تو سفر نامہ ہے۔" اس نے کہا۔

"یہ کہانی ہے۔۔۔ لو اسٹوری اور یہ سفر نامہ بھی ہے۔ گویا یہ بے حد متحرک بھی ہے۔ یہ ایک اور ایڈوانٹیج ہے۔ باقی بات یہ ہے کہ ٹریٹ مینٹ اور واقعات کی جزئیات نے اسے بے حد پاورفل بنا دیا ہے مگر وہ ون لائن میں نہیں سما سکتیں۔"

"مجھے تو اس میں کہانی ہی کہیں نظر نہیں آتی۔" صغیر بلال نے ہٹ دھری سے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ اس صورت میں اس پر ڈراما نہیں بن سکتا۔ کاش آپ کہانی پڑھ لیتے۔"

"میرے پاس اتنا وقت کہاں ہے؟ مصروفیت بے پناہ ہے۔ اپنی سوشل لائف تک تو ختم ہو چکی ہے۔"

"میرے خیال میں پروڈیوسرز کے لئے ہر حال میں مطالعہ ضروری ہے۔ مطالعے کے بغیر وہی کچھ پروڈیوس کیا جا سکتا ہے جو آج کل ہو رہا ہے۔ مطالعے کے لئے ضرور وقت نکالیں۔ چاہے کچھ عرصے کے لئے پروڈکشن سے ہاتھ اٹھانا پڑے۔ مطالعہ بھی آپ کے کام کا حصہ ہے۔"

"میں بڑی امید لے کر آیا تھا۔" صغیر نے مایوسی سے کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ مایوس ہوئے لیکن یہ کہانی آپ کسی قصہ گو کو پڑھوا کر اس سے سنیں اور خلاصہ نویس سے اس کی ون لائن لکھوائیں تو شاید اتنی مایوسی نہ ہو مگر سب سے بہتر یہی ہے کہ خود پڑھنے کا وقت نکالیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں پڑھوں گا۔" صغیر نے ڈائجسٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ "مجھے افسوس ہے کہ آپ کا وقت برباد ہوا۔"

"مجھے آپ کے وقت کا افسوس ہے۔" مجیب نے کہا۔ وہ انہیں دروازے تک رخصت کرنے گیا۔ واپس آتے ہوئے اسے یقین تھا کہ صغیر بلال کہانی ہرگز نہیں پڑھے گا۔ ٹی وی نے جو پوری قوم کو مایوس کر رہا تھا' آج اسے دوسری بار مایوس کیا تھا۔



صفورہ کو ان دنوں بس ایک ہی الجھن پریشان کر رہی تھی۔ اس الجھن کا ایک نام بھی تھا.... رضیہ! رضیہ نے پرکاش نرائن سے.... ایک ہندو سے سول میرج کیوں کی۔ جبکہ وہ ہندوؤں کو سخت ناپسند کرتی تھی۔ وہ خود کو ان سے حالت جنگ میں تصور کر سکتی تھی اور جبکہ وہ جانتی تھی کہ یہ شرعاً ناجائز ہے۔ گناہ کبیرہ سے بڑھ کر گناہ کبیرہ ہے۔ پوری زندگی کو حرام کر لینے کے مترادف ہے۔ گناہ کی کیچڑ سے بھرے کنوئیں میں سرتاپا لتھڑ کر زندہ رہنے کا نام ہے پھر اس نے ایسا کیوں کیا؟

اور وہ دونوں ایک ہی انداز میں سوچنے والی تھیں۔ تو کیا کسی دن اسی طرح وہ بھی ہتھیار ڈال دے گی؟ یہ خیال ہی اس کے لئے روح فرسا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایسا نہیں ہو گا لیکن یہ سمجھنا ضروری تھا کہ رضیہ نے ایسا کیوں کیا۔ تا کہ وہ اس طرح کی صورت حال سے دوچار ہو تو اس سے شعوری طور پر لڑ سکے۔

ویسے تو اس کے سامنے ترغیب آئی تھی.... اور بہت پہلے آئی تھی۔ سریش آنند سے وہ پہلی بار کالج میں ملی تھی۔ وہ اس کا کلاس فیلو تھا اور بنیادی طور پر اچھا لڑکا تھا۔ خوش شکل بھی تھا اور کردار کا بھی اچھا تھا۔ پڑھائی کے معاملے میں بہت سنجیدہ تھا۔

صفورہ کو معلوم تھا کہ کلاس میں لیکچر کے دوران میں سریش اسے کن نظروں سے دیکھتا ہے لیکن اس کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور غیر اہم بات کو وہ آگے بڑھانا بھی نہیں چاہتی تھی۔

مگر ایک دن لائبریری میں بات آگے بڑھ ہی گئی۔ سریش اس کے پاس ہی آ بیٹھا تھا۔ "صفورہ، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم مجھ سے گریز کیوں کرتی ہو۔" اس نے بلا تمہید کہا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔" صفورہ نے بے نیازی سے کہا۔

"مگر میں نے واضح طور پر محسوس کیا ہے۔"

"غلط محسوس کیا ہے آپ نے۔"

"تو پھر مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں تم؟"

"آپ نے دیکھا ہو گا کہ میں بہت کم آمیز ہوں۔ لڑکوں کی تو بات ہی اور ہے۔ میری تو لڑکیوں سے بھی دوستی نہیں۔ رضیہ کے سوا میں کسی سے نہیں ملتی۔"

"لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے بات کرو۔" سریش جھجکنے لگا لیکن اس نے بات پوری کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ "تم مجھے اچھی لگتی ہو۔"

صفورہ نے اسے کڑی نظروں سے دیکھا اور سخت لہجے میں بولی۔ "بس اس بات کو یہیں ختم کر دیجئے۔ مجھے آپ میں کوئی دلچسپی نہیں اور میں مزید کچھ سننا نہیں چاہتی۔"

"دیکھئے.... شاید آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں۔"

"میں غلط نہیں سمجھ رہی ہوں لیکن صحیح سمجھنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں اور آپ دو مختلف دنیاؤں کے انسان ہیں اور رہیں گے۔"

"لیکن...."

"پلیز۔" صفورہ نے تیز لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ "آپ مجھ سے کبھی کوئی امید وابستہ نہیں کیجئے گا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور لائبریری سے نکل آئی۔

سریش نے اس کے بعد بھی بارہا اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے ہر کوشش کو ناکام بنا دیا۔

ابھی تین سال پہلے یونیورسٹی کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی تقریب میں سریش سے آخری ملاقات ہوئی۔ رضیہ اس تقریب میں نہیں آئی تھی۔ سریش خاص طور پر اس کے پاس آ کر بیٹھا۔ "صفورہ جی، کیسی ہیں آپ؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"آج تو میں آپ سے بات کر سکتا ہوں۔ آپ کے پاس بیٹھ سکتا ہوں۔"

"ضرور لیکن میں وہ وجہ جاننا چاہوں گی جس کے تحت آپ یہ بات زور دے کر کہہ رہے ہیں۔"

"دو سال پہلے میں نے شادی کر لی تھی۔"

"مبارک ہو۔"

"لیکن میں آپ کے بارے میں اب بھی اسی انداز میں محسوس کرتا ہوں۔"

"اس میں کوئی حرج نہیں۔ احساسات پر کسی کا اختیار کب ہوتا ہے۔"

سریش اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ "اگر آپ نے میری ذرا بھی حوصلہ افزائی کی ہوتی تو میں مذہب تبدیل کر لیتا۔"

"مذہب کی تبدیلی گھر یا لباس کی تبدیلی نہیں ہوتی کہ کسی کی خاطر بھی کر لی۔" صفورہ نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔ "اور جب جی چاہا' پرانے کپڑے پہن لئے۔ یہ تبدیلی بھی اس وقت ہوتی ہے' جب اندر سے آتی ہے اور اس تبدیلی کے پیچھے کوئی غرض نہیں ہوتی۔"

سریش کھسیا گیا۔ "آپ کچھ بھی کہیں۔ میں آپ کی خاطر کچھ بھی کر سکتا ہوں۔"

"آدمی کو سب سے پیارا اپنا آپ ہوتا ہے۔ آپ اپنی بہتری کے لئے راستہ تک تو درست نہیں کر سکتے۔ کسی اور کے لئے کیا کریں گے۔"

"پتہ نہیں' آپ کیا کہہ رہی ہیں۔" سریش جھنجلانے لگا۔

"مذہب کی تبدیلی تلاش حق کے نتیجے میں اور خلوص دل سے ہو تو سود مند ہوتی ہے۔ لیکن خود غرضی کے تحت اور کسی کے حصول کی خاطر ہو تو میں اسے بہت گھٹیا سمجھتی ہوں۔ کوئی شخص صرف میری خاطر مسلمان ہو جائے تو میں اس سے کوئی تعلق رکھنا پسند نہیں کروں گی۔"

آج تین برس بعد بھی وہ پوری سچائی سے کہہ سکتی تھی کہ اس کے نظریات نہیں بدلے ہیں لیکن یہ الجھن اسے ستا رہی تھی کہ اس جیسی سوچ رکھنے والی رضیہ کو کس بات نے بدلنے پر مجبور کر دیا۔

اچانک اسے خیال آیا کہ اس میں اور رضیہ میں بہرحال ایک فرق ہے۔ وہ ایم اے کر کے گھر بیٹھ گئی۔ بابا نے اسے ملازمت نہیں کرنے دی۔ جبکہ رضیہ نے بی ایڈ کیا اور اسکول میں ملازمت کر لی۔ کیا رضیہ کی مجبوری کا سبب یہ فرق ہے؟ مگر اس کا جواب رضیہ ہی دے سکتی تھی۔۔۔ اور اس سے ملنا ناممکن تھا۔

اس الجھن پر سوچتے سوچتے اس کی نظر شاہکار ڈائجسٹ کے تازہ شمارے پر پڑ گئی۔ رسالے کو آئے تین دن ہو چکے تھے لیکن اس نے اسے کھول کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

جس الجھن میں وہ گرفتار تھی' وہ اسے کچھ کرنے ہی نہیں دے رہی تھی۔ کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ کچھ پڑھنے میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔

اس وقت اس نے بے اختیار ڈائجسٹ اٹھا لیا۔ فہرست میں دیکھا۔ مجیب انور کی کہانی موجود تھی۔ اس نے کہانی نکالی اور اسے یونہی سرسری پڑھنے لگی۔ سوچا تھا کہ بعد میں پڑھے گی مگر اسے پتہ بھی نہیں چلا اور کہانی نے اسے پکڑ لیا۔ وہ کہانی کے ساتھ بہتی گئی۔

اچانک وہ ٹھٹک گئی۔ وہ جملہ ہی ایسا تھا کہ ٹھوکر کی طرح لگا اور وہ رکنے پر مجبور ہو گئی۔ پوری کہانی اس کے ذہن سے محو ہو گئی۔ بس وہ دو جملے ہی یاد رہ گئے۔ اس نے انہیں دوبارہ پڑھا' سہ بار پڑھا۔

مجیب انور نے لکھا تھا۔۔ انسان محض اپنے انسان ہونے کی وجہ سے ہار جاتا ہے۔ اور جب وہ جیتتا ہے تو اسی۔۔۔۔ لئے وہ کائنات کی سب سی بڑی فتح ہوتی ہے۔ صفورہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ یہ جملے اس کے لئے لکھے گئے ہیں۔ یہ اس سوال کا جواب ہیں' جس نے آج کل اسے الجھن میں مبتلا کر رکھا ہے مگر دشواری یہ تھی کہ وہ ان جملوں کو ان کی روح تک سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

اس نے جھنجلا کر ڈائجسٹ بند کیا اور ایک طرف رکھ دیا۔



مجیب کو حیرت ہوئی۔ کیونکہ شاہین مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے آ گئی تھی۔ "یہ نہ سمجھنا کہ مجھے کوئی اعتراض ہے۔" اس نے شاہین سے کہا۔ "لیکن میں تمہاری گیارہ بجے آمد کی توقع کر رہا تھا۔"

"میں یہ سوچ کر جلدی چلی آئی کہ سوال نامہ آپ کو دے دوں تا کہ آپ انٹرویو کے لئے تیاری کر لیں۔" شاہین نے سوال نامہ اس کی طرف بڑھایا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں گھڑ کر جواب دینا پسند نہیں کرتا۔" مجیب نے کہا۔ "لیکن ایک فائدہ ہو گیا۔ بچے پونے دو بجے واپس آتے ہیں اور ان کی موجودگی میں بات کرنا۔۔۔ خاص طور پر ریکارڈ کرنا بہت دشوار ہو گا۔" اس نے شاہین کے پورٹیبل ٹیپ ریکارڈر کی طرف اشارہ کیا۔ "اس لئے میرا مشورہ ہے کہ فوراً کام شروع کر دو۔"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔"

"میں آپ لوگوں کے لئے چائے لاتی ہوں۔" سحاب بولی۔

"میرا خیال ہے' وہاں بیٹھا جائے' جہاں آپ کام کرتے ہیں۔" شاہین نے کہا۔

"ضرور۔" مجیب نے کہا اور اسے اپنی اسٹڈی میں لے آیا۔ شاہین نے ٹیپ ریکارڈر میز پر رکھ دیا۔

"بس..... شروع کر دو۔" مجیب نے دعوت دی۔

شاہین چند لمحے اپنے ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ کارروائی کرتی رہی پھر اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے مجیب صاحب..... پہلے یہ بتائیں کہ آپ نے کیسے اور کیوں لکھنا شروع کیا؟"

"ایک دن میرے ذہن میں ایک جملہ گونجا۔ میں نے اسے نظرانداز کیا تو وہ چبھنے لگا۔ ایسا تھا' جیسے اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا ہو..... بلکہ اس پر اصرار کر رہا ہو۔ تنگ آ کر میں نے اسے کاغذ پر لکھ لیا۔ لکھنے کے بعد جو میں نے اسے پڑھا تو وہ مجھے مصرع لگا..... اور اس کے نامکمل ہونے کا احساس بھی ہونے لگا۔ چنانچہ میں نے اس کی مناسبت سے دوسرا جملہ سوچا لیکن خیال رکھنے کی کوشش کی کہ وہ ردھم میں پہلے جملے جیسا ہو۔ اس وقت نہ مجھے بحروں کا پتہ تھا نہ اوزان کی تمیز مگر میرے اندر کوئی حس بتا رہی تھی کہ دونوں جملوں..... یا مصرعوں میں ہم آہنگی ہے پھر ایک عجیب کیفیت مجھ پر طاری ہو گئی۔ میں لکھتا رہا۔ یہاں تک کہ غزل ہو گئی۔ میں نے اپنے ایک بزرگ کو وہ غزل دکھائی۔ وہ شاعر تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ غزل ہی ہے اور بحر میں ہے۔ میرے اصرار کے باوجود انہوں نے اصلاح نہیں دی۔ ان کا کہنا تھا کہ میں پیدائشی شاعر ہوں۔ مشق سخن کے نتیجے میں مضمون اور خیال خود سنور جائے گا۔ اصلاح کی ضرورت نہیں۔ یوں میں باقاعدگی سے شعر کہنے لگا مگر میرا رجحان نظم کی نہیں' غزل کی طرف تھا اور میں آمد کے بغیر شعر نہیں کہتا تھا۔"

"یہ آمد کیا ہوتی ہے؟" شاہین نے پوچھا۔

مجیب کھو سا گیا۔ "ایک عجیب سی..... بے حد خوبصورت مگر کرب ناک کیفیت ہوتی ہے۔" اس نے کہا۔ "کیسے سمجھاؤں۔ حبس دیکھا ہے نا تم نے۔ آسمان پر گھٹا چھائی ہوتی ہے۔ ہوا تھم جاتی ہے۔ ہر طرف سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ بس یہی کیفیت دل

میں اور پورے وجود میں ہوتی ہے۔ میں ایسے میں قلم کھول کر' کاغذ سامنے رکھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ مگر کچھ نہیں سوجھتا تھا۔ ذہن بالکل خالی ہوتا تھا۔ اس حبس کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ دس منٹ میں ٹوٹے گا یا دس گھنٹے میں اور برسات کے انتظار کا وہ عرصہ بہت کربناک ہوتا تھا۔ بس یہ ہے کہ حبس ٹوٹتا تو اس کرب کی تلافی ہو جاتی تھی۔ جیسے اچانک بارش شروع ہوتی ہے' ایسے ہی مصرعوں کی آمد شروع ہو جاتی تھی۔ دوسرا مصرع البتہ مجھے سوچنا پڑتا تھا۔ ہاں آمد کے بعد ذہن..... اور اپنا اندر بہت خوبصورت ہو جاتا تھا' جیسے بارش کے بعد کوئی بہت حسین باغ۔"

"مگر نثر کیسے شروع کی آپ نے؟"

اسی لمحے سحاب چائے اور بسکٹ لے آئی۔ مجیب سوچ رہا تھا۔ "ایک دن ایک خیال مجھے ستا رہا تھا۔ اتنا وسیع تھا وہ کہ دو مصرعوں میں کسی طرح سما ہی نہیں رہا تھا۔ میں جھنجلاتا رہا اور جب میرا بس نہ چلا تو میں نے اسے نثر میں لکھ ڈالا۔ وہ میری نثر کا آغاز تھا پھر مجھے اس میں لطف آنے لگا۔ جب بھی کوئی خیال مجھے بے بسی میں مبتلا کرتا' میں اسے نثر میں لکھ لیتا۔"

"یہ گویا کہانی کا آغاز تھا۔"

"ارے نہیں۔" مجیب نے جلدی سے کہا۔ "وہ کہانی ہرگز نہیں ہوتی تھی۔ ایک شاعرانہ خیال تھا' جسے میں شاعرانہ انداز میں لکھ لیتا تھا۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتا مگر میرا گمان ہے کہ وہ بڑی خوبصورت نثر ہوتی تھی۔ اس میں نہ کوئی واقعہ ہوتا تھا' نہ کردار اور نہ کردار نگاری..... مگر وہ لکھ لکھ کر مجھے یہ خیال آیا کہ میں کہانی لکھ سکتا ہوں پھر میں نے کہانی سوچ کر لکھی۔ کئی ایک لکھیں۔ وہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں تھیں۔ وہ میں بس اپنی خوشی کے لئے لکھتا تھا۔ نہ وہ کبھی چھپیں نہ میں نے کبھی کسی کو پڑھائیں۔"

"کیوں؟ آدمی لکھتا ہے تو کسی کو دکھاتا بھی ہے۔"

"مجھے اعتماد نہیں تھا خود پر..... اور اپنی صلاحیت پر۔"

"تو پھر آپ نے کہانی لکھنا کیوں شروع کیا؟"

"پرندے کیوں اڑتے ہیں؟ اور مچھلیاں کیوں تیرتی ہیں؟" مجیب نے بے ساختہ

پوچھا۔ پھر بولا۔ "میرے لئے لکھنا اتنا ہی فطرتی ہے جیسے پرندوں کے لئے اڑنا اور مچھلی کے لئے تیرنا۔ میں کبھی لکھے بغیر نہیں رہ سکا اور مجھے مطالعے کا بہت شوق تھا۔ اردو ادب کے بعد میں انگریزی کی طرف متوجہ ہوا۔ لکھنے کا اعتماد تو تھا نہیں مگر ترجمہ میں نے بہت اعتماد سے کیا۔"

"مگر آپ چھپنے سے ڈرتے تھے؟"

"ہاں۔ میں ریجیکٹ ہونے سے ڈرتا تھا۔ اب بھی ڈرتا ہوں۔ اس لئے کہانی کبھی کسی رسالے کو نہیں بھیجی۔"

"پھر یہ رکاوٹ کیسے دور ہوئی؟"

"جو میں کہوں، اسے خود ستائی نہ سمجھنا۔ جو کچھ اچھا ہے، اللہ کی طرف سے ہے۔ اس نے مجھے محبت کا عجیب جذبہ دیا۔ مجھے ان دیکھے لوگوں پر محبت آتی ہے۔ شاید اس لئے کہ جو لوگ نظروں کے سامنے ہوتے ہیں، وہ محبت کی ناقدری کرتے ہیں اور محبت کے اہل ثابت نہیں ہو پاتے پھر یہ لوگ مجھے گھٹن میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اس گھٹن کو دور کرنے کے لئے میں اپنی محبت کے ساتھ دور دور پہنچنا چاہتا ہوں۔ میں جب انگریزی کی کوئی کہانی پڑھتا اور وہ مجھے اچھی لگتی تو میرا جی چاہتا کہ ساری دنیا کو پڑھواؤں۔ میں اپنے دوستوں، ملنے والوں سے فرمائش کرتا کہ یہ کہانی پڑھو مگر سب یہ کہہ کر معذرت کر لیتے کہ پڑھی ہی نہیں جائے گی۔ یوں مجھے ترجمہ کرنے کی امنگ ملی۔ میں نے ترجمہ کیا۔ اب یہ خواہش ہوئی کہ اسے چھپواؤں تاکہ وہ ان دیکھے لوگوں تک پہنچے۔ ریجیکٹ ہونے کا خوف تو تھا مگر دوسروں کے ساتھ ایک خوبصورت کہانی شیئر کرنے کی خواہش اس سے زیادہ طاقتور تھی۔ جو لوگ انگریزی نہیں پڑھ سکتے، میں انہیں بھی کہانی پڑھوا سکتا تھا۔ اس لئے میں نے ہمت کی اور بالآخر چھپنے لگا۔"

"اور اب آپ بہت زیادہ اور بہت محبت سے پڑھے جاتے ہیں۔" شاہین نے کہا۔

"اللہ کی عنایت ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ زبان سے، عمل سے اور تحریر سے اس کا شکر ادا کرتا رہوں۔ صلاحیت بھی اس نے دی۔ حالات بھی اس نے سازگار کئے اور لوگوں تک پہنچنے کے لئے وسائل بھی اسی نے فراہم کئے۔ اسی لئے میں ہمیشہ اچھے سے اچھا لکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"کہانی کیسے لکھتے ہیں آپ؟"

"بغیر انسپائریشن کے نہیں لکھتا۔ لکھ ہی نہیں سکتا۔" مجیب نے کہا۔ "اخبار میں چھپا ہوا کوئی واقعہ بھی مجھے متاثر کر سکتا ہے اور اپنا مشاہدہ بھی۔ کسی شخص کی کوئی بات، کوئی عمل مجھے اکساتا ہے کہ اسے سب کو بتایا جائے۔ یوں وہ میری کہانی کا کردار بن جاتا ہے۔ جو تھوڑا سا دیکھا ہوتا ہے، اسے میں تخیل کے زور پر آگے بڑھاتا ہوں اور کہانی بننے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔"

"آپ بلاشبہ بہت مقبول ہیں۔ لیکن کچھ لوگ شکایت کرتے ہیں کہ آپ کی کہانیوں کا ٹیمپو بہت سست ہوتا ہے۔"

مجیب چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ "ٹیمپو کسی طے شدہ رفتار کا نام نہیں۔ چاہے کوئی اس سے اختلاف کرے لیکن میرا نظریہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں ہر کہانی کی اپنی ڈیمانڈ ہوتی ہے۔ کہانیوں کا بھی انسانوں جیسا مزاج ہوتا ہے۔ کوئی کہانی تند و تیز ہوتی ہے.... بھڑکتی آگ جیسی۔ کوئی کہانی دھیمے سروں میں بہنے والی ہوتی ہے۔ کوئی دھیرے دھیرے سلگنے والی۔ لکھنے والے کی کامیابی یہ ہے کہ وہ کہانی کو اس کی ضرورت کے مطابق ٹیمپو اور ٹریٹ مینٹ فراہم کرے۔ اس صورت میں کہانی ایک تاثر چھوڑے گی اور تا دیر یاد رہے گی۔ اس میں فرق ہو گا تو کہانی نقش بر آب ثابت ہو گی اور کوئی دیرپا تاثر نہیں چھوڑے گی۔ روایتی تیز ٹیمپو کے ساتھ کردار نگاری ممکن ہی نہیں۔ میں اس کی مثال فطرت سے دوں گا۔ دریائے کنہار پہاڑی دریا ہے، بے حد تند، پرشور، بہاؤ ایسا کہ سامنے آنے والی ہر چیز کو بہا کر لے جائے لیکن چوڑائی ایسی کہ بس ایک ندی جیسا اور ہمارا دریائے سندھ ہے۔ اس کی اپنی رفتار ہے۔ اگر ہم کو قدرت حاصل ہو جائے اور ہم دونوں کی جگہیں تبدیل کر دیں تو پتا ہے، کیا نتیجہ نکلے گا۔ سندھ کنہار.... کی رفتار سے بہے گا تو نہ صرف کنارے کی بستیاں ہڑپ کر جائے گا بلکہ کنہار کی حدوں سے بھی آگے آ کر شہر کے شہر تباہ کر دے گا اور کنہار سندھ کی جگہ بہے گا تو چند ہی دن میں سوکھ جائے گا۔ زمینیں بنجر ہو جائیں گی۔ کہانی لکھنا گراں پری ریس میں حصہ لینا نہیں، جہاں ڈرائیور کا کام صرف آگے اور پیچھے کی گاڑیوں پر نظر رکھتے ہوئے ٹاپ اسپیڈ میں گاڑی چلانا ہے۔ ایسا ڈرائیور کبھی نہیں بتا سکتا کہ وہ کس

کس مقام سے گزرا ہے اور کہاں کوئی قابل دید چیز تھی۔"

"میں آپ کی بات سمجھ گئی۔" شاہین نے کہا۔ "لیکن اس کے ساتھ ہی
اعتراض سامنے آتا ہے۔ وہ یہ کہ آپ کے ہاں تفصیلات اور جزئیات نگاری بہت
ہے۔"

"یہ درست ہے اور میں اسے ضروری سمجھتا ہوں۔ سرسری طور پر لکھا جائے
کہانی کا خلاصہ لکھا جائے تو بڑی سے بڑی کہانی بہت چھوٹی ہوتی ہے پھر یہ جو
اصول ہے کہ ہر عمل کا رد عمل' عمل کی طاقت کی مناسبت سے ہوتا ہے۔ تو اسی
کے تحت پڑھنے والا بالکل اسی طرح پڑھتا ہے' جیسے لکھنے والے نے لکھا ہوتا ہے۔
کہانی سرسری انداز میں لکھوں گا تو پڑھنے والے اسے سرسری طور پر پڑھیں گے۔
دور میں فلم اور ٹی وی کی وجہ سے پڑھنے والے کم رہ گئے ہیں۔ وجہ؟ فلم اور
بصری میڈیا ہے۔ سب کچھ نظر کے سامنے ہوتا ہے۔ دیکھنے والا بڑی آسانی سے
اس میں شامل کر لیتا ہے۔ اس ماحول کا حصہ بن جاتا ہے۔ اس کے لئے تخیل
ضرورت نہیں ہوتی اور میرے خیال میں جن لوگوں کے تخیل زرخیز ہیں' ان کی
میڈیا سے تسلی نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ اس دور میں بھی مطالعہ کرتے ہیں۔"
سانس لیتے' زندگی کے دکھوں اور خوشیوں سے چھلکتے کردار' جزئیات سے
حقیقت جیسے مناظر اور زندگی جیسا تحرک نہ صرف کہانی کی فضا بناتے ہیں بلکہ
کے لئے آکسیجن کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ پڑھنے والا صرف پڑھتا نہیں' صفحات
دروازے سے گزر کر کہانی میں شامل ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ آکسیجن نہ ملے
گھٹنے کی وجہ سے گھبرا کر باہر بھاگتا ہے مگر صرف پڑھنا اسے بے کیفی میں مبتلا کرتا
آکسیجن موجود ہو تو وہ کرداروں کے ساتھ متحرک رہتا ہے۔ انہیں محسوس کرتا ہے
کے ساتھ ہنستا' روتا اور سب کچھ کرتا ہے اور مطالعے کے دوران میں دنیا و ما فیہا
بے خبر ہو کر کہانی کا حصہ بن جاتا ہے پھر کہانی بہت اچھی ہو تو وہ اسے کبھی
بھولتا۔" مجیب نے گہری سانس لی۔ "میرا خیال ہے' اسی لئے میری کہانیاں زیادہ
جاتی ہیں۔ میری کہانیوں کی فضا میں پڑھنے والوں کے لئے آکسیجن موجود ہوتی ہے
اس کے لئے خاص طور پر کوشش کرتا ہوں۔"

"لکھتے وقت آپ کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟"

"میں گم ہوتا ہوں..... کہانی کے ماحول میں' اس کی فضا میں۔ میں کاغذ قلم لئے
کرداروں کے درمیان موجود ہوتا ہوں اور میں صرف ناظر اور سامع نہیں ہوتا کہ جو
کچھ دیکھوں اور سنوں' وہ لکھ لوں۔ میں ان سبھوں کو شدت سے محسوس کرتا ہوں۔
ن پر جو گزرتی ہے' وہ مجھ پر بھی گزرتی ہے۔ ان کے رونے سے پہلے میں روتا ہوں۔
ان کے بوجھوں تلے پہلے میں دبتا' کراہتا ہوں۔ ان کی خوشیاں پہلے مجھے بالیدگی بخشتی
یں۔ ان کے پچھتاوے پہلے میرے ذہن میں ڈنک مارتے ہیں۔ میں کوشش کرتا ہوں
ہ ہر کردار کی فطرت کو' اس کے مزاج کو' اس کے طرز فکر کو اور طرز عمل..... غرض
س کی مکمل شخصیت کو سمجھوں' خود پر طاری کروں پھر سوچوں کہ کسی خاص صورت
ل میں اس کا رد عمل کیا ہو گا۔ تب اسے لکھوں۔" اس نے پھر گہری سانس لی۔ "
ں نے پہلے ہی کہا نا کہ جیسے میں لکھوں گا' پڑھنے والے ویسے ہی پڑھیں گے۔ جو لکھتے
ت مجھے رونا آئے گا' وہ پڑھتے وقت میرے قارئین بھی روئیں گے۔ جو کچھ لکھتے
ت میرا سینہ خوشی سے بھر جائے گا' وہ پڑھتے وقت میرے قارئین بھی خوشی سے
نے لگیں گے۔ اسی لئے تو میرا اپنے قارئین سے دکھ سکھ کا رشتہ ہے۔ اسی لئے تو وہ
اور میں انہیں دعاؤں میں یاد رکھتا ہوں۔"

"کبھی ایسا بھی ہوتا ہو گا کہ آپ اس فضا میں' منظر میں نہ جا سکیں۔ اس میں
ل نہ ہو سکیں۔ اس وقت کیا ہوتا ہے؟" شاہین نے پوچھا۔

"ہوتا ہے..... ایسا ہوتا رہتا ہے۔ کہانی کے ماحول سے' کرداروں سے رابطہ ٹوٹ
ہے۔" مجیب نے کہا۔ "اور یہ ایسا ہوتا ہے جیسے چالیس چوروں کے غار کا دروازہ
ہو اور کھل جا سم سم کے جادوئی الفاظ میں بھول گیا ہوں۔ ایسے میں بڑی بے بسی
اس ہوتی ہے۔ میں بے سود ناب گھماتا ہوں دروازے کی۔ دروازہ پیٹتا ہوں۔ اگرچہ
تا ہوں کہ اس طرف کوئی دروازہ کھولنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ کبھی کبھی دروازے
سر ٹکرانے کی نوبت تک آ جاتی ہے۔"

"پھر آپ کیا کرتے ہیں؟"

"قلم کھولے صبح سے شام تک' بعض اوقات کئی کئی دن بیٹھا رہتا ہوں..... کہ

کب مجھے کھل جا سم سم یاد آئے' دروازہ کھلے اور میں اندر جا کر لکھنا شروع کروں
اس عرصے میں مجھ سے کوئی اور کام بھی نہیں ہوتا۔ وہ وقت ضائع ہی ہوتا ہے۔"

سحاب پھر چائے لے آئی۔ شاہین نے ٹیپ ریکارڈر کو روک دیا۔ "بھابی' چائے لے آئی ہیں۔" اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے' پہلے چائے پی لیں۔ بہت بوجھل ہو گئے ہیں آپ۔"

"ٹھیک ہے۔" مجیب نے کہا۔ وہ پرسکون نظر آنے لگا۔



گھٹا ایک دم سے گھر کر آئی اور شدید حبس ہو گیا۔ صفورہ کمرے میں بیٹھی مجیب انور کی کہانی پڑھ رہی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مجیب انور کی کہانی وہ ایک نشست میں نہیں پڑھ پائی تھی۔ اب تک تین چار وقفے آ چکے تھے مگر اس نے سوچا تھا کہ اس کہانی ختم کرکے ہی اٹھے گی۔

وہ کہانی میں ایسے ہی کھوئی ہوئی تھی کہ موسم بدلنے کا پتہ ہی نہیں چلا لیکن بہت طاقتور ہوتے ہیں۔ کوئی کہیں بھی گم ہو' وہ تبدیلی کا احساس دلا دیتے ہیں۔ صفورہ کو بھی اچانک ہی احساس ہوا کہ جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ نکلا ہے۔ اس نے نظر اٹھا کر چھت کے پنکھے کو دیکھا جو پہلے کی طرح چل رہا تھا۔

"پھر یہ اچانک کیا ہوا؟" اس نے خود کلامی کی۔ اس نے کھڑکی کا پردہ سرکا کر دیکھا تو اندھیرا نظر آیا۔ اس کا مطلب تھا گھٹا.... اور بہت کالی گھٹا.... اس کا دل خوشی سے بھر گیا۔ وہ اٹھی اور ڈائجسٹ لے کر کمرے سے نکل آئی۔

"آنگن میں کرسی ڈال کر وہ بیٹھی مگر پسینے سے نجات نہیں ملی۔ اس نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ وہاں گہری سیاہ گھٹا تھی۔ ہوا بالکل بند تھی۔ آنگن میں کھڑے درخت کا پتا تک ساکت تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ بارش ہو گی اور خوب ہو گی۔

اس نے کہانی پڑھنے کی کوشش کی لیکن پڑھا ہی نہیں گیا۔ یہ بارش کا موسم عجیب ہوتا ہے۔ آدمی کو نارمل نہیں رہنے دیتا۔ یوں لگتا ہے' جیسے ایمرجنسی نافذ ہے۔ کسی کو کیا اچھا لگتا ہے اور کیا برا' وہ ڈائجسٹ بند کرکے بیٹھی سوچتی رہی۔ اچانک اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر ایک موٹی.... بے حد موٹی بوند آ کر گری

اس کے دیکھتے ہی دیکھتے یوں پھیل گئی' جیسے موٹے کھردرے کاغذ پر روشنائی پھیل جاتی ہے۔ وہ اسے حیرت اور مسرت سے دیکھ ہی رہی تھی کہ ٹپ سے دوسری بوند گری۔ یہ پہلی بوند سے زیادہ موٹی تھی۔ اس نے چہرہ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور اسی وقت جیسے آسمان میں کوئی فوارہ سا کھل گیا۔ بارش اتنی تیز تھی کہ سنبھلنے سے پہلے ہی اس کا چہرہ تر ہو گیا بلکہ وہ اچھی خاصی بھیگ گئی۔ وہ تیزی سے اٹھ کر برآمدے کی طرف بھاگی۔ پھر اسے ہاتھ میں موجود ڈائجسٹ کا خیال آیا۔ وہ کمرے کی طرف لپکی۔ ڈائجسٹ کمرے میں رکھ کر وہ واپس آئی تو موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔

آنگن میں جس کرسی پر بیٹھی تھی وہ وہیں پڑی بھیگ رہی تھی۔ اماں باورچی خانے میں تھیں۔ کرسی کو دیکھتیں تو یقیناً چیختیں۔ وہ جلدی سے کرسی اٹھانے کے لئے بڑھی۔ بارش اتنی تیز تھی کہ کرسی اٹھا کر برآمدے تک لاتے لاتے وہ تربتر ہو گئی۔ اس نے کرسی برآمدے میں رکھی اور اس پر بیٹھ گئی۔ اب وہ بھیگ ہی چکی تھی تو اس سے کیا فرق پڑتا تھا کہ کرسی بھیگی ہوئی ہے یا سوکھی ہے۔

"صفورہ.... سلمیٰ۔ آنگن میں پڑی چیزیں سمیٹ لی ہیں کہ نہیں۔" باورچی خانے سے اماں نے پکارا۔

صفورہ گھبرا گئی۔ سلمیٰ کمرے میں تھی۔ "اماں.... آنگن میں کچھ نہیں ہے۔" وہ جلدی سے چلائی۔ اسے یہ فکر تھی کہ اماں دروازے پر نہ آ جائیں۔ آئیں گی تو اسے بھیگا دیکھ کر بہت ناراض ہوں گی۔

ہائے.... کیسا مزہ آتا تھا بارش میں نہانے میں۔ اس نے سوچا اور اسے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ کیسا بے فکرا ہوتا ہے بچپن کا عرصہ۔ بارش کا موسم آتا اور گھٹا چھاتی تو بچے گھروں سے نکل کر کیسے گاتے.... اللہ میاں پانی دو.... سو برس کی نانی دو۔ لڑکے ننگے جسموں پر مٹی ملتے۔ بڑی بوڑھیاں کہتی تھیں کہ یہ بارش کو بلانے کا ٹوٹکا ہے اور واقعی بارش ہو جاتی تھی۔ مٹی سے کیسی سوندھی سوندھی خوشبو اٹھتی۔ بچے بارش میں نہاتے۔ مائیں چلاتیں۔ "ارے کم بختو! پہلی بارش میں نہیں نہاتے۔ بیماری کا گھر ہوتا ہے پہلی بارش کا پانی۔" حالانکہ اس وقت ان کو پتہ بھی نہیں تھا کہ pollution کیا بلا ہوتی ہے پھر بچوں کو پکڑنے کے بہانے وہ خود بھی بھیگ جاتیں۔

صفورہ کو یاد تھا کہ بچپن میں نہانا کتنا اچھا لگتا تھا۔ وہ تو دیوانی ہی ہو جاتی تھی بارش میں۔ سلمیٰ بھی خوب بھیگتی تھی مگر وہ نازک طبع تھی۔ ذرا دیر میں اسے چھینکیں آنے لگتیں۔ اماں ہنس کر کہتیں۔۔۔۔ میری مینڈکی کو زکام ہو گیا۔

مگر لڑکپن آتے آتے پابندیاں شروع ہو گئیں۔ اسی لئے تو لڑکیوں کو بڑا ہونا اچھا نہیں لگتا۔ ٹھیک سے سانس بھی لینے نہیں دیا جاتا۔۔۔۔ وقت کا ریاضی داں موسم بہار جسم کے سادہ کاغذ پر جیومیٹری کا عمل شروع کرتا ہے تو ماؤں کی نیندیں اچٹنے لگتی ہیں۔ باپ اپنے سایوں سے بھی بھڑکنے لگتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سادہ کاغذ خوبصورت خطوط دائروں اور قوسین سے بھر جاتا ہے۔ تب یکلخت آزادی سلب ہو جاتی ہے اور تحکم میں لپٹی ہوئی ہدایتوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی نشریات کا آغاز ہوتا ہے۔ دوپٹا اوڑھنے کی تربیت اور چلنے پھرنے' اٹھنے بیٹھنے' لیٹنے' سونے کی۔۔۔۔ حتیٰ کہ ہنسنے کی تہذیب کی جانے لگتی ہے۔ لڑکیوں کی سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ یہ راتوں رات کیا افتاد آ پڑی ہے ان پر۔ وہ اس افتاد میں ایسی الجھتی ہیں کہ کبھی کبھی جسم کا تو احساس ہی نہیں رہتا اور شاید ماؤں کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔ ادھر گہری سانس لی اور ادھر اماں چلائیں۔ "نگوڑی دوپٹا تو ٹھیک سے رکھ لے۔" اور یہ سن کر صفورہ کو تین سال پہلے کا وہ وقت یاد آ جاتا جب اسے کھانسی کی شکایت ہو گئی تھی۔ ادھر وہ کھانستی اور ادھر اماں پکارتیں۔ "منہ پہ ہاتھ تو رکھ لے' جراثیم اڑ کر دوسروں کو لگتے ہیں۔" اور وہ سوچتی کہ دوپٹا بھی [illegible] جراثیم کو روکتا ہے۔ کوئی جراثیم کش چیز ہے۔

بارش میں نہانے پر پہلی بار پابندی لگی تو سلمیٰ نے بڑی خاموشی سے قبول کر لی لیکن صفورہ نے بڑا واویلا کیا۔ "اس میں کیا برائی ہے اماں؟" اس نے پاؤں پٹخ کر کہا۔

"میں جو منع کر رہی ہوں۔" اماں بولیں۔ "اس کے بعد تفتیش کی گنجائش ہے کوئی؟"

"مگر میرا دل چاہتا ہے اماں۔"

"ضروری نہیں کہ جو دل چاہے' وہ کیا بھی جائے۔" اماں نے سخت لہجے میں کہا۔

"میں پہلے بھی نہاتی تھی۔"

"پہلے کی بات اور تھی۔ اب تو بڑی ہو گئی ہے۔"

"تو میں دوپٹا سر پر لے کر نہاؤں گی اماں۔"

اس پر اماں کو ہنسی آ گئی۔ "پاگل ہے تو تو۔ اس میں دوپٹا کہاں سے آ گیا۔ دوپٹا بے چارہ کیا کر سکتا ہے پانی کے سامنے۔"

"مجھے یہ بتاؤ اماں کہ برائی کیا ہے نہانے میں؟" وہ بدستور ڈٹی رہی۔

"برائی ہے۔ تبھی تو منع کرتی ہوں۔" اماں نے جھنجلا کر کہا پھر خود کلامی کے انداز میں بولیں۔ "کورے پنڈے کو بارش کا پانی راس نہیں آتا۔"

صفورہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا مگر اس نے الجھن بھرے لہجے میں پوچھا۔ "کیوں اماں؟"

"بھید کھل جاتے ہیں۔ حجاب اٹھ جاتا ہے۔"

صفورہ کو یاد تھا کہ اس دن کے بعد اماں نے اسے کبھی بارش میں بھیگنے نہیں دیا تھا مگر وہ الجھتی رہی تھی۔ اماں کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ اس طرح جیسے عجیب انور کی بات وہ نہیں سمجھ سکی تھی کہ انسان صرف اپنے انسان ہونے کی وجہ سے ہار جاتا ہے۔

لیکن آج میں بارش میں بھیگ ہی گئی۔۔۔۔ جی بھر کے نہ سہی' بھیگی تو۔ اس نے دل میں سوچا۔ بہرحال یہ موسم عجیب ہوتا ہے۔ اماں بھیگنے کو لاکھ منع کریں لیکن آم کی ڈال پر جھولا ڈالتی ہیں۔ ہمیں جھولا جھولنے کو کہتی ہیں۔ ساون کے گیت گاتی ہیں اور فاطمہ خالہ کے ہاں جانے کو منع نہیں کرتیں کہ ان کا آنگن بہت بڑا ہے۔ وہاں محلے بھر کی لڑکیاں جمع ہوتی ہیں۔ پینگیں بڑھائی جاتی ہیں۔ لڑکیاں ہوں یا عورتیں' ساون کے گیت گاتی ہیں۔ پکوان تلے جاتے ہیں۔

یہ سب سوچتے سوچتے اسے پھر ایک الجھن ستانے لگی۔ یہ ساون کے گیتوں میں بابل کو کیوں یاد کیا جاتا ہے۔ کیا اس میں بابل بہت یاد آتا ہے۔ یہ کیا ماں کو پکارا جائے۔۔۔۔ کہا جائے کہ بھیا کو مجھے لینے کے لئے بھیجو۔ ساون آیا ہے۔ کیا ساون کا لطف سسرال میں نہیں' میکے میں ہوتا ہے مگر نہیں۔۔۔۔ یہ تو نہیں ہو سکتا۔ جو لڑکیاں بابل ہی میں ہوں' ان کے دل میں پینگیں کیوں اٹھتی ہیں۔ بارش ہوتے دیکھ کر من کے اندر کوئی کلا سا پھوٹتا ہے اور آن کی آن میں درخت بن جاتا ہے پھر وہاں' اس کی شاخ

میں جیسے کوئی جھولا ڈال دیتا ہے اور دل اس جھولے میں بیٹھ کر آسمان کو چھونے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ پینگیں اور بڑھاؤ سکھی۔۔۔ اور۔۔۔۔اور اتنی بڑھاؤ کہ قدم آسمان کو چھو لیں اور اندر کیسی رم جھم سی ہوتی ہے۔ جذبے جیسے من کی سکھیاں ہوں' کیسے چھم چھم ناچتے ہیں' پر سمجھ میں نہیں آتے۔ ایک بے نام سا لطف آتا ہے۔ ایک غیر محسوس سی لذت وجود کی زمین میں چشمے کی طرح پھوٹتی ہے اور سرشاری بن کر پورے وجود میں دوڑنے لگتی ہے مگر ایک ہلکا سا کھٹ مٹھا خوف بھی ستاتا ہے۔ ایک میٹھی سی کسک دل میں چٹکیاں لیتی ہے۔ کسی کمی کا احساس دلاتی ہے۔

یہ سب مجھے کیوں ہوتا ہے۔ میں تو بابل کے گھر میں بیٹھی ہوں۔ اس کے دل سے بات نکلی نہیں تھی۔ وہ جھنجلانے لگی۔ اتنی بڑی ہو گئی مگر سوالات ایسے ستاتے ہیں' جیسے وہ بچی ہو اور جواب ایک کا بھی نہیں ملتا۔

پانی کی بوچھاڑ چہرے سے ٹکرائی تو وہ چونکی۔ اب ہوا بھی چلنے لگی تھی۔ یا شاید بارش کا رخ بدلا تھا۔ بہرحال چہرے سے ٹکرانے والے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے نے جلا کر دکھایا تھا۔ اس کی جھنجلاہٹ دھل گئی - ہر سوال مٹ گیا۔ صرف تازگی کا احساس رہ گیا۔ وجود میں جیسے خوشیوں کی ننھی منی پریاں چھم چھم ناچنے لگیں۔

اس نے خوش ہو کر ہاتھ باہر برآمدے کی طرف بڑھایا۔ بارش اور تیز ہو گئی تھی۔ ہاتھ پر ٹھنڈی ٹھنڈی کیف آگیں کنکریاں سی برس رہی تھیں۔ بغیر کسی وجہ کے کھلکھلا کر ہنس دی۔

اسی لمحے اماں نے باورچی خانے سے پکارا۔ "صفو۔۔۔ سلمٰی۔۔۔۔کوئی ہے۔ ذرا چٹنی پیس دو۔ میں پکوان تل رہی ہوں۔"

صفورہ کمرے کی طرف رخ کر کے سلمٰی کو آواز دینے والی تھی کہ رک گئی۔ اس نے بارش کی رفتار کو دیکھا اور فیصلہ کر لیا۔ بھیگنے کا موقع مل رہا ہے تو کیوں ضائع کیا جائے۔ "آئی اماں۔" اس نے پکارا۔

آنگن میں جا بجا پانی کے چھوٹے چھوٹے تالاب بن گئے تھے۔ وہ دھیرے دھیرے محتاط قدم اٹھاتی' نیچے کے پانی سے بچتی اور برستے پانی میں بھیگتی باورچی خانے کی طرف بڑھی۔ اس کا من پسند نتیجہ نکلا۔ باورچی خانے تک پہنچتے پہنچتے وہ شرابور ہو گئی۔

اماں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تو ہڑبڑا گئیں۔ "ارے صفو' تو تو بھیگ گئی۔"

"بارش بہت تیز ہو رہی ہے اماں۔"

"تو سر پر کچھ لے کر آنا چاہئے تھا۔"

"خیال ہی نہیں رہا۔" اس نے معذرت کی۔

"تو جا یہاں سے۔ سلمٰی کو بھیج دے۔ تو تو باورچی خانے میں پانی ہی پانی کر دے گی۔"

"چٹنی پیسنے میں دو منٹ لگیں گے اماں۔"

"تو جا کر کپڑے بدل اور سلمٰی کو بھیج دے۔ اس سے کہنا' سر پر کچھ لے کر آئے۔"

صفورہ نے سکون کی سانس لی اور جلدی سے باورچی خانے سے نکل آئی۔ سبج سبج قدم بڑھاتی وہ صحن سے گزری۔ برآمدے میں پہنچ کر اس نے سلمٰی کو پکارا۔ سلمٰی آئی تو اس نے اماں کی ہدایت اسے منتقل کر دی۔ "تم تو بالکل بھیگ گئی ہو آپا؟" سلمٰی نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بے خیالی میں ایسے ہی چلی گئی تھی باورچی خانے۔" اس نے جواب دیا۔

سلمٰی باورچی خانے میں چلی گئی تو اسے بے فکری ہو گئی۔ آج برسوں کے بعد وہ بارش میں بھیگی تھی۔۔۔۔ اور خوب بھیگی تھی۔ اب وہ اس کیفیت سے لطف لے سکتی تھی۔ وہ برآمدے سے ہاتھ باہر نکال کر بیٹھی برسوں پرانے بھیگنے کے آخری تجربے کو یاد کرتی رہی۔

گرمی سے زمین اور جسم ایک ہی طرح تپتے ہیں۔۔۔۔ اور بارش کا پانی ہمیشہ' ہر موسم میں ٹھنڈا ہوتا ہے۔ سرما کی بارش میں تو خیر بھیگنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ زمین سے بھی ٹھنڈک کی لپٹیں اٹھتی ہیں مگر سخت گرمی کے بعد بارش عجیب کام دکھاتی ہے۔ زمین بارش کا پانی اور اس کی ٹھنڈک جذب کر کے اپنی تپش باہر نکالتی ہے اور اس کے بعد ٹھنڈک سی ہو جاتی ہے۔ یہی حال جسم کا ہوتا ہے۔ صفورہ کو یاد تھا' خوب بھیگنے کے بعد ٹھنڈک کا بہت خوبصورت احساس ہوتا تھا۔ وجود کی ساری گرمی دھل جاتی تھی۔

صفورہ نے اچانک ہی ہاتھ کھینچ لیا۔ اسے احساس ہوا کہ ہاتھ برف جیسا سرد ہے۔ سن ہونے کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ اس نے دوسرے ہاتھ سے بارش میں والے ہاتھ کو چھوا۔ وہ واقعی بہت سرد ہو رہا تھا۔ بات سمجھ میں آنے والی تھی موسم گرما کی پہلی بارش نہیں تھی۔ اس موسم میں بارش پہلے بھی ہو چکی تھی۔

اس نے بھیگے ہوئے ہاتھ سے پیشانی کو اور پھر رخسار کو چھوا پھر وہ ہاتھ کو گردن تک لے گئی۔ وہ بری طرح چونکی لیکن چونکنے کی وجہ اس کی سمجھ میں فوراً آئی۔ کوئی بات تھی ضرور پھر بات سمجھ میں آئی تو وہ حیران رہ گئی۔ اس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ جسم بھی بھیگا ہوا تھا مگر ہاتھ کی طرح جسم سرد نہیں تھا۔ رخسار گردن تک دہکنے کا احساس ہو رہا تھا۔ ایسا کیوں ہے؟

وہ ساکت رہ گئی۔ جیسے سانس لینا بھی بھول گئی ہو۔ وہ آگہی اور ادراک کے تھے۔ برسوں پہلے کی طرح آج اسے ٹھنڈ کیوں نہیں لگ رہی ہے؟ اس کا وجود آتش دان کی طرح کیوں دہک رہا ہے؟ یہ سب کیا ہے؟

یہ سب سوال ذہن میں چبھ رہے تھے۔ وہ ساکت و صامت بیٹھی تھی کہ ایک اور ادراک ہوا۔ وجود میں ناقابل فہم فتنے سر اٹھا رہے تھے۔ وہ اس کے لئے بھی تھے اور ناقابل فہم بھی مگر وہ پورے یقین سے کہہ سکتی تھی کہ وہ خوبصورت سہی' مگر ہیں فتنے ہی۔ شورش سطح پر تھی۔ جسم کی زمین پر جیسے طوفان رہے تھے.... آندھیاں چل رہی تھیں اور اس کی وجہ سے وجود کی دور دراز تاریک گلیوں میں بھی کھلبلی مچ گئی تھی۔ جذبے ہراساں پھر رہے تھے.... پناہ کی میں اور کچھ اجنبی جذبے' جن کی موجودگی تک کا اسے علم نہیں تھا' اچانک منہ گئے تھے۔

اس کا بارش کے سرد پانی میں ٹھٹھرا ہوا ہاتھ حرکت میں تھا کہ اچانک پتھر گیا۔ اس کا پورا جسم لرزنے لگا۔ پہلی بار اسے جسم کا احساس ہوا۔ ورنہ اماں ہمیشہ اسے وجود ہی پڑھایا تھا۔ لفظ جسم وہ کبھی سنتی' پڑھتی یا کہتی تو ذہن میں ہوتا۔ جیسے جسم وجود کا مترادف ہو مگر آج جسم اسے چیخ چیخ کر بتا رہا تھا کہ میں دو ریاستوں پر مشتمل سلطنت کا ایک حصہ ہوں.... ایک خود مختار ریاست' جسے اس

پورے حقوق نہیں دیئے جاتے اس لئے کہ وہ وفاق نے غصب کر رکھے ہیں۔

سو وہ جسم جسے اماں نے دھکیل کر لاشعور میں بند کر کے اس کے دروازے پر لعنت کا تالا لگا دیا تھا' بھیگ کر پہلی بار اپنی مکمل موجودگی کا احساس دلا رہا تھا۔ اپنی جغرافیائی حقیقتوں سے شعور کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

اس نے گھبرا کر سر جھکایا اور اپنے بھیگے ہوئے سراپا کو دیکھا۔ ایک دم سے اسے حیا آ گئی۔ اللہ.... ایسے میں ابا یا بھائی آ جائیں تو؟ وہ گھبرا کر اٹھی اور کمرے کی طرف چلی مگر کمرے تک پہنچتے پہنچتے اس کی سمجھ میں آ گیا کہ اماں بارش میں بھیگنے سے کیوں منع کرتی تھیں۔

اس نے بدلنے کے لئے کپڑے نکالے اور باتھ روم میں گھس گئی۔ کپڑے بدل کر باہر نکلی تو وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گئی۔ اب کے آئینے نے اسے چونکا دیا۔ آئینے میں اپنا آپ پہلی بار کچھ اجنبی اجنبی مگر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ تو یہ ہوں میں؟ اس نے قدرے حیرت سے سوچا۔ کیا میں خوبصورت ہوں؟ ذہن نے فوراً اثبات میں جواب دیا مگر حسن کی کبھی خود ستائی سے تسلی نہیں ہوتی۔

اب وہ بے یقینی سے سوچ رہی تھی کہ اگر وہ حسین ہے تو کبھی کسی نے اس کی تعریف کیوں نہیں کی۔ ہاں.... سریش نے ضرور اسے حسین کہا تھا مگر اس سے اسے خوشی نہیں ہوئی تھی۔

وہ اداس ہو گئی لیکن پھر بھی بیٹھی آئینے میں اپنا سراپا دیکھتی رہی۔ خود کو اس طرح اس انداز میں دیکھنا ایسا تھا' جیسے کوئی کسی ایسے بے حد اپنے سے پہلی بار ملے جسے پہلے کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔ کسی کمی کا احساس اسے بری طرح ستا رہا تھا۔

پنکھا اسی رفتار سے چل رہا تھا' جیسے وہ حبس میں چل رہا تھا۔ اب اسے ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر پنکھے کی رفتار کم کی اور بیڈ پر دراز ہو گئی۔ کچھ عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں مندتی چلی گئیں۔ لمحوں میں وہ سو گئی۔

شعور کا پہرے دار بے خبر تھا مگر لاشعور کروٹ تک نہیں بدل رہا تھا۔ وہ بے حد اٹلا تھا۔ نہیں چاہتا تھا کہ عین موقع پر دھر لیا جائے۔ ذرا دیر بعد وہ اٹھ کر دبے پاؤں اٹھا اور سوتے ہوئے پہرے دار شعور کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے کمیونیکیشن

روم پر قبضہ کر لیا۔ اسے ایک بے حد اہم پیغام اپنے بے خبر مالک تک پہنچانا تھا اور اس کے لئے خواب سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں تھا۔



صفورہ ایک جنگل میں کھڑی تھی اور موسلا دھار بارش ہو رہی تھی!

وہ محض اندازے ہی سے کہہ سکتی تھی کہ وہ جنگل ہے۔ اس لئے کہ اس نے جنگل پہلے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ وہ وہاں بہت دیر سے تھی۔ شروع میں تو وہ بہت شوق سے بارش میں نہاتی رہی۔ وہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔ وہ اکیلی تھی۔ اس کے کپڑے شرابور ہو گئے۔ پھر اچانک اسے بیک وقت بھوک اور سردی کا احساس ہوا۔ وہ ادھر ادھر گھومتی پھری کہ شاید کھانے کی کوئی چیز مل جائے مگر اس جنگل میں پھل دار درخت نہیں تھے۔ ہاں' ایسی جھاڑیاں تھیں' جن پر بیری سے ملتے جلتے جنگلی پھل لگے تھے لیکن اسے ان کو چھونے کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ کھانا تو بہت دور کی بات تھی۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ زہریلے نہیں ہیں اور ایسے معاملات میں تجربہ نہیں کیا جاتا۔ وہ بھٹکتی پھری مگر کھانے کے لئے کچھ بھی نہیں ملا۔

پھر سردی کا احساس اور شدید ہو گیا۔ بھیگا ہوا لباس اس کا لباس تھا اور وہ لباس سے پیچھا چھڑا بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے پاس اور کپڑے تھے ہی نہیں۔ ادھر بارش رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اس پر ایک مصیبت اور آ گئی۔۔۔ سامنے ہی اچانک اسے ایک گرگٹ نظر آیا۔ اس کی جسامت غیر معمولی تھی۔ وہ پل پل رنگ بدلتے ہوئے' اپنی گول گول آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ خوفزدہ ہو گئی۔ ذرا دیر میں اسے اندازہ ہو گیا کہ ایک وہ گرگٹ ہی نہیں' دوسرے حشرات الارض بھی شاید بارش سے گھبرا کر اپنے اپنے بلوں سے نکل آئے ہیں۔۔۔ اور پناہ کی تلاش میں ہیں۔ ان میں سانپ بھی تھے' چھپکلیاں اور گرگٹ بھی اور مکڑے جیسی چیزیں بھی۔ وہ بھوک اور سردی دونوں کو بھول گئی۔ اب اس کا خوف سے برا حال تھا۔ وہ اتنی خوفزدہ تھی کہ اس کے لئے چیخنا بھی ممکن نہیں رہا تھا' خوف کے علاوہ مکروہ حشرات الارض کو دیکھ کر اسے گھن بھی آ رہی تھی۔

اچانک دور سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز۔۔۔ سنائی دینے لگی۔ ابھی تک گھوڑا نظر نہیں آیا تھا لیکن آواز بتدریج قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی امید بندھی مگر فوراً ہی یہ خیال ستانے لگا کہ گھوڑا سوار کے بغیر ہوا تو کیا ہو گا۔ اس نے دل میں دعا مانگی کہ اس وقت اسے کسی انسان کی مدد کی ضرورت ہے۔

پھر گھوڑا نمودار ہوا۔ یہ دیکھ کر اسے قرار سا آ گیا کہ گھوڑے پر کوئی سوار ہے۔ گھڑ سوار نے اسے دیکھ لیا تھا اور تیزی سے گھوڑا دوڑاتے ہوئے اسی طرف آ رہا تھا۔ جیسے جیسے وہ قریب آتا گیا' اس کے خد و خال نمایاں ہوتے گئے۔

کہانیوں اور خوابوں میں اس طرح کی صورت حال میں آنے والا عام طور پر کوئی بے حد وجیہہ اور خوبرو شہزادہ ہوتا ہے لیکن یہاں ایسا نہیں تھا۔ وہ شخص لباس سے قدیم کہانیوں کا کوئی لکڑہارا لگتا تھا۔ صورت شکل معمولی سے کچھ کم ہی تھی۔ جسمانی اعتبار سے بھی وہ بس یونہی سا تھا۔ بس اس میں ایک ہی خوبی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے پاس گھوڑا تھا۔۔۔ اور گھوڑا بھی نہایت شاندار اور خوبصورت۔

مگر صفورہ کو ایک لمحے کے لئے بھی مایوسی نہیں ہوئی۔ الٹا وہ بے تاب ہو گئی کہ وہ جلد از جلد اس کے پاس پہنچ جائے۔

گھڑ سوار نے اس کے چہرے کو دیکھا جو خوف اور دہشت سے بگڑ کر رہ گیا تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے گھوڑے کی راسیں کھینچیں اور پھرتی سے نیچے اتر آیا۔ گھوڑے کو کسی درخت سے باندھنے کا خیال چھوڑ کر وہ پہلے اس کی طرف لپکا۔

صفورہ اس سے یوں لپٹی' جیسے کوئی ڈوبنے والا تنکے کو پکڑتا ہے۔ اس کا جسم بری طرح لرز رہا تھا اور اسے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔

گھڑ سوار تسلی دینے والے انداز میں اس کے کندھے تھپکنے لگا۔ "کیوں ڈر رہی ہو؟"

"دیکھ نہیں رہے' یہاں ہر طرح کے کیڑے' مکڑیاں' گرگٹ اور سانپ ہیں۔"

گھڑ سوار نے ادھر ادھر دیکھا اور بے پروائی سے بولا۔ "تو پھر؟"

"مجھے خوف بھی آ رہا ہے اور گھن بھی آ رہی ہے۔"

"گھن نہیں آنی چاہئے۔ زندگی میں بہت سی گھناؤنی حقیقتوں کو قبول کرنا پڑتا

ہے۔" گھڑ سوار نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ "اور خوفزدہ ہونا بے وقوفی ہے۔"

صفورہ نے سر اٹھا کر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔

"اس لئے کہ ان میں سے کوئی چیز تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ کم از کم براہ راست تو ان کے لئے یہ ممکن نہیں۔" گھڑ سوار نے اس کی نظروں کے سوال کا جواب دیا۔ "ان میں اتنی طاقت نہیں کہ تمہارا کچھ بگاڑ سکیں لیکن تم ان سے ڈرو گی تو خود کو ضرور نقصان پہنچا لو گی مگر وہ نقصان بھی تمہیں خود سے پہنچے گا۔"

اسی لمحے صفورہ نے درخت سے لٹکتے ہوئے سانپ کو دیکھا اور چلانے لگی۔ گھڑ سوار نے اس کی نظروں کے تعاقب میں اوپر دیکھا اور بڑی بے پروائی سے سانپ کو پکڑ کر ایک طرف اچھال دیا۔ "یہ صرف دیکھنے کا سانپ ہے۔ ورنہ کیچوے سے زیادہ بے ضرر ہے۔"

صفورہ حیرت سے سانپ کو دیکھتی رہی۔ سانپ تیزی سے رینگتا ہوا ایک قریبی جھاڑی میں گم ہو گیا۔

"مگر تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" گھڑ سوار نے پوچھا۔

صفورہ نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ "یہ سوال تو مجھے تم سے کرنا چاہئے۔ یہ میرا جنگل ہے۔ میں روز اپنے جنگل میں گھومتی پھرتی ہوں۔"

"یہ تمہارا جنگل ہے؟" گھڑ سوار کے لہجے میں حیرت تھی۔ "تو پھر یہ تمہارا روز کا معمول ہو گا۔ ڈر کیوں رہی ہو؟"

صفورہ پھر سہم گئی۔ "اس طرف میں پہلی بار آئی ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "اس طرف جہاں میں روز گھومتی ہوں' اونچے اونچے خوبصورت درختوں کے جھنڈ ہیں۔ چشمے اور تالاب ہیں۔ پھولوں سے سجے سنورے باغ ہیں' جہاں ہر رنگ کے خوبصورت پرندے اور تتلیاں ہیں اور جنگل میں تمام خوبصورت جانور ہیں۔۔۔ ہرن' بارہ سنگھے' جنگلی بکریاں وغیرہ۔" اس نے رک کر ایک گہری سانس لی۔ "آج میں زیادہ آگے بڑھ آئی۔ جانے کس دھن میں تھی کہ پتہ ہی نہیں چلا۔ بارش میں بھیگتے بھیگتے یہاں تک آ گئی۔ یہاں یہ سب دیکھ کر ڈر لگنے لگا۔"

گھڑ سوار ہمدردانہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "تمہیں کچھ پتہ ہی نہیں۔" اس

نے کہا۔ "اپنی زمین سے ایسی بے پروائی نہیں برتنی چاہئے۔ جھاڑیاں اگنے ہی نہیں دینی چاہئیں۔ جھاڑیاں ہوں گی تو حشرات الارض بھی ہوں گے۔ جھاڑیاں ہی تو انہیں پناہ دیتی ہیں۔ اسی لئے تو یہ زمین سے چپکے رہتے ہیں۔ خود سوچو' جھاڑیوں سے ویرانی کا تاثر بنتا ہے۔ دل گھبراتا ہے۔ درخت جتنے اونچے ہوں گے' اتنی ہی کشادگی اور وسعت کے مظہر ہوں گے۔" وہ کہتے کہتے رکا۔ "اپنی زمینوں کا خیال رکھو اور پہلی فرصت میں جھاڑیاں اور مکڑی کے جالے صاف کرو۔ ورنہ پوری زندگی ڈرتے ہوئے گزارو گی۔"

مفورہ کا خوف اچانک ہی دور ہو گیا۔ جیسے کوئی جادو ہو گیا ہو۔ خوف دور ہوتے ہی سب سے پہلے اسے یہ احساس ہوا کہ وہ اجنبی گھڑ سوار سے لپٹی کھڑی ہے۔ ایک لمحے کو اسے حجاب آیا۔ اس کے کپڑے اب بھی بھیگے ہوئے تھے۔

مگر اگلے ہی لمحے اس کے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔ یہ سب کچھ اسے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اتنا اچھا کہ وہ چاہتی تب بھی تو اس سے دور نہ ہو پاتی۔ گھڑ سوار کو بھی نجانے کیسے بدلی ہوئی صورت حال کا احساس ہو گیا۔ اس نے اسے بہت غور سے دیکھا اور بولا۔ "تم بے حد خوبصورت عورت ہو۔ خیالوں جیسی حسین۔"

وہ شرمائی بھی اور خوش بھی ہوئی۔ پہلی بار کسی نے اس کے حسن کی تعریف کی تھی۔ جسم کہیں کہیں سے آنچ دے کر جا بجا اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگا مگر پھر اسی لمحے اسے اپنی بھوک اور پیاس یاد آگئی۔ خوف جو مٹ گیا تھا۔

گھڑ سوار اب بھی اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ "کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے بہت بھوک لگی ہے.... اور پیاس بھی۔" مفورہ نے بتایا۔

گھڑ سوار چند لمحے سوچتا رہا۔ "اور تمہارا خوبصورت جنگل کتنی دور ہے؟"

"بہت.... بہت دور ہے اور بھوک ایسی ہے کہ میں چند قدم بھی بمشکل چل سکتی ہوں۔"

"تب تو مجبوری ہے۔ جنگلی پھلوں کے علاوہ یہاں کچھ نہیں مل سکتا۔ خیر آؤ میرے ساتھ۔"

مفورہ اس کا ہاتھ تھامے اس کے ساتھ چل دی۔ وہ راستے میں نظر آنے والے

حشرات الارض کو شکار کرتا ہوا چل رہا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد ایک جھاڑی نظر آئی۔

"لو.... یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔" گھڑ سوار نے جھاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ تو میں نے بھی دیکھے تھے۔" مفورہ نے بے دلی سے کہا۔ "مگر ڈر کے مارے کھانے کی ہمت نہیں ہوئی۔"

گھڑ سوار نے جھک کر بہت ساری بیریاں توڑ لیں۔ "یہ زہریلی نہیں ہیں۔ ان میں طاقت بھی بہت ہوتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ان میں پیاس بجھانے کی صلاحیت بھی زبردست ہے۔" اس نے ایک بیری مفورہ کی طرف بڑھائی۔

مفورہ ہچکچا رہی تھی۔ وہ بیری لینے کے لئے ہاتھ بڑھاتی مگر فوراً ہی کھینچ لیتی۔

"اب کیا بات ہے؟"

"یہ دیکھنے میں بھی اچھی نہیں ہیں۔ گھن آ رہی ہے مجھے۔"

"ارے.... کچھ بھی نہیں۔" گھڑ سوار نے بے پروائی سے کہا۔ "اوپر کانٹوں کی وجہ سے لگ رہا ہو گا۔ اوپر کا چھلکا اتار دیتا ہوں۔ اندر سے یہ مکھن جیسی نرم اور رس والی ہو گی۔"

مفورہ کا جی متلانے لگا۔ "نہیں.... نہیں میں نہیں کھا سکتی۔"

"تمہاری مرضی۔" گھڑ سوار نے کہا پھر وہ مزے سے بیریاں کھانے لگا۔ مفورہ کے پیٹ میں بھوک سے اینٹھن ہو رہی تھی جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کمزوری کا احساس بھی بہت زیادہ تھا۔ لگ رہا تھا' اب وہ ہل بھی نہیں سکے گی۔ آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے دائرے ناچ رہے تھے۔

"تم کیا چاہتی ہو؟" گھڑ سوار نے پوچھا۔

"کاش.... کاش.... تھوڑا سا گوشت کہیں سے مل جاتا۔"

"کہو تو صحرائی چھپکلیاں مار کر بھون دوں تمہارے لئے۔ ماچس ہے میرے پاس۔"

اس بار مفورہ کو قے ہو گئی لیکن نکلا کچھ نہیں۔ نکلتا تو جب کہ پیٹ میں کچھ ہوتا۔ لیکن اس قے نے اسے اور نڈھال کر دیا۔ "گندی باتیں مت کرو۔" اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

گھڑ سوار اب کچھ سوچ رہا تھا۔ اچانک اس نے کہا۔ "یہاں سوؤروں کے سوا کچھ

بھی نہیں۔"

صفورہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ حرام ہے مگر کمزوری اتنی بڑھ گئی تھی کہ بولنا ممکن ہی نہیں تھا۔

"انسان کا پہلا مذہب اپنی بقا ہے۔" گھڑ سوار پر خیال لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "بھوک سب سے بڑی حقیقت ہے۔ ضرورت سب سے بڑا قانون ہے۔ کامیاب مذہب وہی ہے' جس نے جبلی تقاضوں کو تحفظ دیا۔ نہ انہیں بالکل آزاد چھوڑا۔ نہ ان کو یکسر ممنوع قرار دیا۔"

پیٹ کی اینٹھن اتنی شدید ہو گئی تھی کہ لگتا تھا جان لیوا ثابت ہو گی۔ صفورہ نے بے بسی سے ہاتھ بڑھایا۔ گھڑ سوار نے کچھ بیریاں اس کی طرف بڑھا دیں۔ صفورہ نے چھلکے اتارے اور کراہت سے کھانا شروع کیا مگر ان کا ذائقہ بہت اچھا تھا.... یا پھر بھوک کی وجہ سے اچھا لگ رہا تھا۔ وہ کھاتی گئی۔ یہاں تک کہ پیٹ میں مقید نکیلے پنجے والی بھوک کو قرار آ گیا۔

"اب پیاس لگ رہی ہے۔" صفورہ نے اس بار قدرے پر سکون لہجے میں کہا۔

"ان بیریوں سے ہی کام چلاؤ۔"

"میرے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں۔" صفورہ نے فریاد کی۔

"یہاں تو بارش کے پانی کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

"یہ تو میں نہیں پی سکتی۔"

"تمہارے تصورات کچھ اچھے نہیں ہیں۔" گھڑ سوار نے ملامت بھرے لہجے میں کہا۔ "تمہیں زندہ رہنا ہی نہیں آتا۔"

اسی وقت بارش پھر شروع ہو گئی۔ یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ صفورہ نے آسمان کی طرف چہرہ کیا اور منہ کھول دیا۔ پیاس تو نہیں بجھی مگر حلق ضرور تر ہو گیا۔ حلق میں کانٹے پڑنے کا احساس بھی نہیں رہا۔

"چلو.... اب درخت کے نیچے چلو۔" گھڑ سوار نے کہا۔

دونوں ایک گھنے درخت کے نیچے جا کھڑے ہوئے۔

انسانی فطرت ہے کہ بہت سی تکلیفیں ہوں تو سب سے بڑی تکلیف کے سامنے

باقی دب جاتی ہیں اور بڑی تکلیف رفع ہو جائے تو چھوٹی تکلیفیں سر اٹھاتی ہیں۔ اب خوف' بھوک اور پیاس دور ہو چکے تھے تو سردی نے اسے ستانا شروع کر دیا۔ تھرتھری چڑھ گئی اور ہاتھ نیلے ہو گئے۔

گھڑ سوار نے ہمدردی سے اسے دیکھا۔ "سردی لگ رہی ہے؟"

صفورہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ گھڑ سوار نے اسے خود سے لپٹا لیا۔ سردی کا احساس دور ہوا اور ایک سرگیں سی بے خودی اس پر طاری ہو گئی۔ اب بارش' گھڑ سوار کا قرب اور گرد و پیش کا ماحول سبھی کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی تھی اس پر۔ اسے واضح طور پر احساس ہو رہا تھا کہ اپنے اندر جو کمی اسے محسوس ہوتی تھی' وہ بھی دور ہو گئی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ سمجھنے کی اس کے پاس فرصت نہیں تھی۔

گھڑ سوار اب اسے بڑی نرمی اور محبت سے چھو رہا تھا اور صفورہ کے پورے جسم میں کرنٹ سا دوڑ رہا تھا۔ جہاں گھڑ سوار کا ہاتھ لگتا' وہاں روشنی سی ہو جاتی اور جیسے لذت کے جزیرے وجود پاتے۔

دیر تک وہ اسی درخت کے نیچے کھڑے رہے.... زمان و مکان کی فکر سے بے نیاز' صفورہ سرشاری کی کیفیت کے باوجود سوچ رہی تھی.... بہت کچھ سمجھ رہی تھی۔ تو یہ ہوتا ہے کسی کی قربت کا جادو۔ یہ کمی ہوتی ہے تو ہر چیز میں کمی لگتی ہے۔ ساون بھی ساون نہیں لگتا۔ خود اپنے آپ میں بھی کوئی غیر معمولی بات نظر نہیں آتی۔

اس نے سر اٹھا کر گھڑ سوار کو بہت غور سے دیکھا۔ حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو وہ ایک بے حد عام مرد تھا۔ عام حالات میں شاید وہ اس پر دوسری نظر بھی نہ ڈال پاتی۔ مگر ضرورت کی نظر سے دیکھتی تو وہ بے حد پرکشش نظر آتا۔ بات صرف اتنی تھی کہ جذبوں کے اس جنگل میں اس کے سوا.... کوئی تھا ہی نہیں۔ تحفظ کا واحد احساس اسی کے دم سے تھا اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس عام سے آدمی کا لمس بہت خاص تھا....

"وہ تو بھگوان کی کرپا سے میں آ گیا۔ ورنہ تمہارا کیا ہوتا۔"

کچھ دیر تک تو اس کی بات کی معنویت صفورہ کے شعور تک پہنچ ہی نہیں سکی۔ وہ

جس کیفیت میں تھی' وہ آسانی سے ٹوٹنے والی نہیں ہوتی۔ وہ اس کے سینے سے لگی کھڑی سر اٹھائے اسے دیکھتی رہی۔ "وہی ہوتا جو ہو رہا تھا۔" اس نے بے دھیانی میں کہا۔

"بھگوان بڑا دیالو ہے۔ سب کی رکھشا کرتا ہے۔"

اس بار صفورہ کو شاک لگا۔ اس نے جھٹکے سے گھڑ سوار کو پیچھے ہٹایا اور شعلہ بار نظروں سے اسے دیکھا۔ ماحول کا جادو ایک ہی لمحے میں ٹوٹ گیا تھا۔ "تم.... تم ہندو ہو؟" اس نے الزام دینے والے انداز میں انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ اس کا لہجہ بے حد خراب تھا۔

"ہاں' میں ہندو ہوں مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"تم نے مجھے چھونے کی جرات کیسے کی؟" وہ غصے میں آپے سے باہر ہو رہی تھی۔

"تم بھول رہی ہو کہ خود ہی مجھ سے لپٹی تھیں۔" گھڑ سوار نے سرد لہجے میں کہا پھر نرم لہجے میں بولا۔ "اور تمہیں میری ضرورت تھی۔ اب بھی ہے۔"

"ضرورت کی وجہ سے کوئی ہندو اس حیثیت میں میرے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔"

"لیکن یہاں میرے سوا کوئی موجود نہیں۔ تمہارے پاس کوئی اور نہیں ہے۔" گھڑ سوار نے پھر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"اگر تم روئے زمین پر آخری مرد ہو' تب بھی میرے لئے قابل قبول نہیں ہو۔" صفورہ نے پھر اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

اب اسے جنگل کی مہیب تنہائی کا ڈر تھا نہ حشرات الارض کا خوف۔ نہ ہی بھوک پیاس' سردی بارش کی کوئی اہمیت تھی۔ وہ پاؤں پٹختی ایک طرف چل دی۔ اچانک گھڑ سوار نے پیچھے سے اسے پکڑا۔ اس نے پلٹ کر اسے دھکیلا۔ "چھوڑ دو مجھے۔ ورنہ میں تمہارا خون پی جاؤں گی۔" وہ غرائی۔

"کیسے پی جاؤں گی میرا خون بہت زہریلا ہے آپا۔" گھڑ سوار نے نسوانی آواز میں کہا اور اس کا ہاتھ تھام کر ہلانے لگا۔

صفورہ چونکی۔ وہ نسوانی آواز سلمیٰ کی تھی۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں تو دیکھا' سلمیٰ اس کا ہاتھ تھام کر ہلا رہی ہے۔ "کیا ہے؟" اس نے جھنجلا کر پوچھا۔

"ارے واہ.... اتنی سی دیر میں سو بھی گئیں اور پھر خون پینے کی دھمکی بھی دے رہی ہو۔"

صفورہ کھسیا گئی۔ "کیا بات ہے؟ کیوں جگایا ہے مجھے۔"

"برآمدے میں دسترخوان بچھا ہے۔ اماں بلا رہی ہیں۔ چل کر پکوان کھا لو۔"

"چلو.... میں منہ دھو کر آتی ہوں۔"

سلمیٰ کمرے سے گئی تو وہ اٹھ کر باتھ روم میں گئی۔ ہاتھ منہ دھوتے ہوئے وہ اس خواب کے بارے میں سوچتی رہی۔ خواب کیا' وہ طلسم کشا تھا۔ ساری گرہیں کھل گئی تھیں۔ سب کچھ سمجھ میں آ گیا تھا۔

پہلی بار اس کی سمجھ میں آیا کہ جسم کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں اور تشنگی کا ہر لمحہ انہیں طاقتور بناتا رہتا ہے اور ان تقاضوں کو بس ایک انسان' ایک مرد کی طلب ہوتی ہے۔ انہیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ وہ مرد ہندو ہے یا مسلمان۔

اس کی سمجھ میں آ گیا کہ رضیہ کیسے ہاری ہو گی۔ اس کے اور رضیہ کے درمیان بہت کچھ مشترک تھا مگر کچھ مختلف بھی تھا۔ وہ ایم اے کر کے گھر بیٹھ گئی تھی۔ ابا نے اسے جاب کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ جبکہ رضیہ نے جاب کر لی تھی۔ وہ اسکول میں پڑھاتی تھی۔ اس کا واسطہ مردوں سے پڑتا رہتا تھا۔ مقناطیس سامنے نہ ہو تو لوہے کو کمزوری کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ مضبوط رہتا ہے لیکن مقناطیس کے حیطہ کشش میں لوہے کا اپنے اوپر کوئی زور نہیں رہتا۔ یہ فطرت ہے۔ وہ خود مردوں سے دور رہنے کی وجہ سے جن جسمانی تقاضوں سے بے خبر رہی' وہ رضیہ کو ستاتے ہوں گے پھر رضیہ نے خود بتایا تھا کہ بھارت اب مسلمانوں کے لئے فرسٹریشن ہی فرسٹریشن ہے۔ کبھی رضیہ کا انکری منٹ روک دیا جاتا تھا۔ کبھی چھٹی منظور نہ ہونے کی وجہ سے تنخواہ ہی روک دی جاتی تھی اور اسے ڈائریکٹریٹ کے چکر لگانے پڑتے تھے اور ہر جگہ واسطہ ہندوؤں ہی سے پڑتا تھا۔ لڑنا ہوتا تو انہی سے اور خوشامد ہوتی تو انہی کی۔ ایسے میں کوئی کتنا عرصہ لڑ سکتا ہے.... دوسروں سے بھی اور خود سے بھی۔

صفورہ نے پہلی بار اس پر خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کو اس قسم کے حالات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ پہلی بار اسے ابا کی دانش مندی پر یقین آیا' جس نے اسے بہت بڑی مشکل سے بچا لیا تھا۔

پھر برآمدے کی طرف جاتے ہوئے جسمانی تقاضوں کے حوالے سے اسے مجیب انور کی لکھی ہوئی وہ بات بھی سمجھ میں آگئی۔ بے شک۔ اس نے زیر لب کہا۔ انسان محض اپنے انسان ہونے کی وجہ سے ہار جاتا ہے اور جب وہ جیتتا ہے تو اسی لئے وہ کائنات کی سب سے بڑی فتح ہوتی ہے۔

اسے معلوم تھا کہ اب وہ سکون سے کہانی پڑھ سکے گی!



ناظمہ تیسری بار کمرے میں آئی۔ صابر اب بھی "کاجل" پڑھ رہا تھا۔ اس بار اس سے رہا نہیں گیا۔ "یا تو کچھ بھی نہیں پڑھتے تھے یا اب خواتین کے رسالے پڑھنے شروع کر دیئے آپ نے۔" اس نے تیز لہجے میں کہا۔

صابر نے چونک کر اسے دیکھا۔ "اب ایسا بھی نہیں ہے۔ مجیب انور کی وجہ سے شاہکار تو میں پہلے ہی پڑھنے لگا تھا۔"

"مگر یہ کاجل....."

"یہ بھی مجیب انور کی وجہ سے ہی پڑھ رہا ہوں۔" صابر نے کہا۔ "اس شمارے میں انٹرویو چھپا ہے اس کا۔"

"تو یہ تو صفورہ کو بھی بھیجنا چاہئے۔ وہ تو فین ہے مجیب انور کی۔"

"بھیج دیں گے۔" صابر نے بے زاری سے کہا۔ "اس وقت تو مجھے پڑھنے دو۔ مزہ کرکرا نہ کرو۔" ناظمہ جانے لگی تو اس نے پکارا۔ "ایک پیالی چائے ہی پلا دو۔"

ناظمہ چلی گئی اور وہ انٹرویو کی طرف متوجہ ہو گیا۔

س: کچھ لوگ شکایت کرتے ہیں کہ آپ کی کہانیوں کے کردار نہایت غیر حقیقی ہوتے ہیں..... یعنی فرشتے اور آپ اپنی کہانیوں میں وہ تصوراتی ماحول پیش کرتے ہیں' جس کا حقیقت سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہوتا۔ اس سلسلے میں آپ کیا کہتے ہیں؟

ج: اس سوال کے جواب میں دو جواب دوں گا۔ پہلی بات یہ کہ میں اس سے اتفاق

نہیں کرتا کہ معاشرے میں اچھے اور مثالی لوگ نہیں ہیں۔ میرے خیال میں تو یہ معاشرہ ان لوگوں کے دم سے ہی چل رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں اور میں نے دیکھا ہے کہ میری کہانیوں کے کرداروں سے بھی اچھے لوگ ہمارے ہاں موجود ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی تعداد کم ہے..... بہت کم اور ان میں سے ہر ایک کا ایک محدود حلقہ ہے۔ اس لئے ان کی موجودگی کا پتہ نہیں چلتا۔ دوسرے عام زندگی میں لوگوں کا واسطہ برے لوگوں ہی سے پڑتا ہے۔ اس لئے وہ اچھائی پر یقین کھو بیٹھے ہیں۔ اب جہاں تک تعلق ہے تصوراتی ماحول کا تو بی بی' خالص تخیل تو کوئی چیز ہی نہیں۔ آدمی کی سوچ' اس کا تخیل محدود ہے..... بہت محدود ہے۔ وہ اسی چیز کا تصور کر سکتا ہے جو درحقیقت کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ اگر موجود نہیں ہے تو ممکن ضرور ہے۔ آپ ایجادات کی مثال لیں۔ ایجاد تخیل ہی سے شروع ہوتی ہے۔ اللہ ایک ایسا تصور موجد کو عطا کرتا ہے' جس کو عملی صورت میں ڈھالنا ممکن ہوتا ہے۔ یوں کچھ ایجاد ہوتا ہے۔ آپ مصوروں کی بات کریں۔ شاید ان کے تخیل اس سے زرخیز ہوتے ہیں مگر آج تک کسی مصور نے کوئی چہرہ' کوئی منظر ایسا پینٹ نہیں کیا جو کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں موجود نہ رہا ہو۔ یہ صفت تو صرف اور صرف اللہ کی ہے کہ وہ ناموجود چیزوں کو بھی سوچ لیتا ہے اور صرف سوچتا نہیں' بنا بھی دیتا ہے۔ اس کے خیالات اور صورت گری میں صرف ایک کن کا فاصلہ' صرف ایک کن کا وقفہ ہے۔ وہ اپنی اس صفت میں سے ایک معمولی سا جزو کسی انسان کو دے دیتا ہے اور کبھی تخیل کی سمت میں قوت عمل بھی عطا کر دیتا ہے۔ یہ کرم ہے اس کا۔ میرے نزدیک تخیل ہی اللہ کی تلقین ہے کہ ایسا اچھا کرو۔ یہ ممکن ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ انسان اس سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ جو ماحول اور کردار میں لکھتا ہوں' یا تو وہ حقیقت میں موجود ہے۔ یا پھر ہم لوگ ان کرداروں جیسے بن کر وہ ماحول تخلیق کر سکتے ہیں۔ نہ کریں تو یہ ہماری بدقسمتی ہے۔

اب میں آتا ہوں جواب کے دوسرے حصے کی طرف۔ میرے خیال میں آدمی کی فطرت ہے کہ کہانی پڑھتے وقت وہ خود کو اس کے مرکزی کردار کی جگہ رکھتا ہے۔ آپ خوب سوچ کر یہ بتائیں کہ کیا آپ بھی ایسا کرتی ہیں؟

(انٹرویور کا جواب: جی ہاں۔ شاید ہر شخص ایسا ہی کرتا ہے۔)

فرض کریں کہ میں اپنی کسی کہانی میں ایک بے حد بلند کردار لڑکی کو لکھتا ہوں اور وہ پڑھنے والے کو live لگتی ہے اور بے حد پاور فل ہے۔ پڑھتے ہوئے وہ کردار آپ پر طاری ہو جاتا ہے۔ تو کیا آپ اس کی کچھ مثبت خصوصیات اپنا نہیں لیں گی۔ کیا کوئی مرد میرے ہیرو کو پڑھنے کے بعد یہ نہیں سوچے گا کہ کاش میں ایسا ہوتا۔ ایک نہیں' میرے خیال میں ہزاروں افراد ایسا سوچیں گے۔ تو ان میں.... اچھا سے اچھا بننے کی خواہش پروان چڑھی نا؟ کیا یہ مثبت نتیجہ نہیں ہے کہانی کا؟ پھر آگے بڑھیئے ان ہزاروں میں چند ایسے بھی ہوں گے جو اس کردار سے کچھ مثبت خوبیاں اپنا لیں گے۔ تو یہ عملی بہتری نہیں ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ ایسا ہوتا ہے۔ اگر میری کہانی کسی ایک پڑھنے والے کو اصلاح کے راستے پر پہلا قدم رکھنے پر اکسا دے تو میرے نزدیک یہ بہت بڑی بات ہوئی۔ یہ اللہ کا کرم ہوا مجھ پر۔

س : آپ کی کہانیوں میں مذہب کا حوالہ ضرور ہوتا ہے۔ ہر کہانی میں اللہ بھی ہوتا ہے۔

ج : کیوں نہ ہو۔ اس کے بغیر کچھ ممکن ہی نہیں۔ نہ میرا' آپ کا' سب کا وجود' نہ یہ معاشرہ۔ جب وہ ہر جگہ موجود ہے تو اس کا ذکر بھی ہو گا۔ نہ کریں تو ہم بدنصیب ہوئے۔ میرا ایمان ہے' جسے میں اپنے پڑھنے والوں کو بھی منتقل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ ہم جس کام میں بھی اللہ کو شامل کرتے ہیں' اس کا انجام بخیر ہوتا ہے۔ اگر ہم اس کے ذکر کو سانسوں میں شامل کر لیں تو زندگی کا انجام بھی بخیر ہو گا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے یہ چیز مجھے دی۔

س : اور آپ شکر پر بھی بہت زور دیتے ہیں۔

ج : جی ہاں۔ شاید یہ آسان ترین عبادت ہے.... کم از کم اپنے ابتدائی مرحلے میں۔ اور اس کا نتیجہ بھی بہت اچھا ہے پھر شکر کے سوا ہم کم از کم اور کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ اس لئے کہ شکر نہ کرنا بڑی پریشانیاں لاتا ہے۔

س : شکر ابتدائی مرحلے میں آسان ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آگے جا کر بہت مشکل ہو جاتا ہے؟

ج : جی ہاں۔ زبانی شکر تو بہت آسان ہے پھر عمل سے اور اس کے بعد استفاوے

سے شکر اور اس کے بعد ایک ریاضت ہے.... بہت کڑی ریاضت۔ سادہ سا کلمہ ہے الحمد للہ۔ مطلب یہ کہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔ زبان پر رواں یہ چھوٹا سا کلمہ اندر اتارنے کے لئے بہت مشکل ہے۔ یہ کائنات کی سب سے بڑی حقیقتوں میں سے ہے کہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں اور یہ سچ ہے۔ اگر آپ مجھ سے کہیں کہ میں بہت اچھی کہانی لکھتا ہوں۔ تو درحقیقت یہ تعریف اللہ کے لئے ہے' جس نے مجھے لکھنے کی صلاحیت دی' پھر اس کے لئے سازگار ماحول عطا فرمایا' چھپنے کا موقع فراہم کیا اور اچھا لکھنے کا جذبہ اور ارتکاز عطا فرمایا۔ اب اگر اللہ عنایت کرے اور یہ کلمہ بندے کے اندر اتر جائے تو وہ اپنی تعریف سنتے وقت یہی سوچے گا کہ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں اور کسی کی تعریف کرتے وقت بھی ذہن میں الحمد للہ ہی کو رکھے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے معاشرے میں انفرادی اور اجتماعی خرابیوں کا سبب یہی ہے کہ ہم نے اپنے معاملات سے اللہ کو الگ کر دیا ہے۔ ہم اس کی رسی تھام لیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں یہی پیغام دیتا ہوں۔ اپنے پڑھنے والوں کو۔

س : قارئین کو شکایت ہے کہ آپ وقتاً" فوقتاً" ہلکی کہانیاں بھی دیتے ہیں۔

ج : وہ میری مجبوری ہے۔ کبھی اپنے انداز کی کہانیاں لکھتے لکھتے میں اتنا بوجھل ہو جاتا ہوں کہ لگتا ہے' سانس رک جائے گی' کچھ ہو جائے گا مجھے۔ ایسے میں وہ بوجھل پن اتارنے کو ہلکی کہانیاں لکھتا ہوں۔ تاکہ بوجھل کہانیاں لکھنے کے لئے پھر تازہ دم ہو جاؤں۔ یہ میرے قارئین کی بے پایاں محبت ہے کہ ایسی کسی تحریر پر کسی اور کو تو وہ داد دے سکتے ہیں لیکن مجھ سے یہ توقع نہیں رکھتے اور برا مانتے ہیں مگر میں کیا کروں۔ بہت محسوس کر کے خود پر طاری کر کے لکھتا ہوں۔

س : یعنی کردار کا دکھ آپ کو اپنا لگتا ہے۔ وہ روتا ہے تو آپ روتے ہیں۔ رلا دینے والی سچویشن لکھتے وقت آپ کا کیا حال ہوتا ہے؟

ج : آپ ہنسیں گی۔ ایسی سچویشن لکھتے وقت میں بہت روتا ہوں.... اور لکھنے کے بعد بھی روتا ہوں۔ سوچیں تو' میں خود نہ رو سکا تو پڑھنے والے پر کیا اثر ہو گا اور پھر کہانی چھپنے کے بعد قارئین کے خط آتے ہیں.... میں سخت دل آدمی ہوں۔ کبھی کسی بات پر آنکھیں بھی نہیں بھیگتیں مگر فلاں موقع پر آپ نے رلا دیا.... وغیرہ وغیرہ۔

س: وطن کی محبت آپ کی کہانیوں کا ایک خاص جزد ہے۔ اس کی وجہ؟

ج: سیدھی سی بات ہے۔ مجھے پاکستان سے عشق ہے۔ کبھی کبھی مجھے اس پر خود بھی حیرت ہوتی ہے کیونکہ میں جگہوں سے' مقامات سے جذباتی وابستگی رکھنے والا آدمی نہیں ہوں۔ آبائی گھر فروخت کرتے ہوئے مجھے ذرا سا ملال نہیں ہوا۔ جہاں بچپن' لڑکپن اور جوانی گزری' وہ علاقہ میں نے بغیر کسی دکھ کے چھوڑ دیا اور آج تک اس کی یاد بھی نہیں آئی مگر پیسہ کمانے کے لئے بھی ملک چھوڑ کر جانا میں نے کبھی گوارا نہیں کیا۔

س: اس کی کوئی خاص وجہ؟

ج: (ذرا سوچنے کے بعد) یہ ملک رب کریم کی خاص عنایت ہے۔ اس پر جتنا شکر ادا کریں' کم ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ڈیڑھ سو سال پہلے جنگ آزادی کے عرصے میں مجذوب خوش خبری سناتے تھے کہ ایک ایسا ملک وجود میں آنے والا ہے' جہاں اللہ کی حکومت ہو گی جو اسلام کا گہوارہ ہو گا۔ تو یہ ملک اللہ کی رضا سے بنا ہے اور اس کا کوئی مقصد بھی ہے۔ اس ملک کا قیام ایک معجزہ ہے۔

س: آپ کے خیال میں یہ مثالی مملکت ہے؟ اسلام کا گہوارہ ہے؟

ج: (ذرا سوچنے کے بعد) ابھی تو نہیں ہے۔

س: تو مجذوبوں کی وہ خوش خبری کیا مجذوبوں کی بڑ تھی؟

ج: جی نہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک میں بھی یہی سوچتا رہا تھا پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ خوش خبری سنائے جانے کے تقریباً سو سال بعد یہ وجود میں آیا تھا اور اس ملک کو بنے ہوئے پچاس سال ہوئے ہیں۔ شاید وہ وقت قریب ہے۔ ممکن ہے دور ہو' اللہ جانے۔ مگر میرا ایمان ہے کہ ایسا ضرور ہو گا۔ احیائے اسلام کے زریں دور میں یہ ملک بہت اہم کردار ادا کرے گا۔ شاید اس ملک کو اللہ نے قائم ہی اسی لئے رکھا ہے۔ ورنہ پچاس سال کی تاریخ دیکھ لیں۔ جتنی کوششیں پاکستان کو ختم کرنے کی باہر سے کی گئیں' اس سے زیادہ اندر سے ہوئیں۔ ہم خود...... ہم میں سے ہر ایک اسے توڑنے کی' نقصان پہنچانے کی کوششیں کرتا رہا۔ اب بھی ہر سطح پر یہ کوششیں جاری ہیں مگر یہ ملک قائم ہے اور انشاء اللہ قائم رہے گا۔ یہ سچ ہے کہ مسلمان اس وقت خوار و زبوں ہیں.... اور جتنے ہیں' وہ بھی بیشتر بس نام کے مسلمان ہیں مگر یہ ساری نشانیاں اسلام کی سربلندی کی

گواہی دیتی ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ ابھی اور برا حال ہو گا۔ معاش کی خاطر ایمان بیچ دینا عام ہو جائے گا۔ اہل ایمان بہت تھوڑے رہ جائیں گے پھر وہ اسلام کا پرچم بلند کریں گے اور مٹھی بھر ہونے کے باوجود ساری دنیا پر چھا جائیں گے اور پاکستان انشاء اللہ اسلام کا ہراول دستہ ہو گا۔ میں اپنی کہانیوں میں اسی لئے اچھائی کا درس دینے کی کوشش کرتا ہوں میں چاہتا ہوں کہ میں اور میرے پڑھنے والے دعا کریں کہ اللہ اپنی رحمت سے ہمیں استقامت عطا فرمائے اور ہم ان مٹھی بھر اہل ایمان میں شامل ہوں اور ہم صرف دعا نہ کریں' حتی المقدور اللہ کی دی ہوئی توفیق سے فائدہ اٹھا کر اچھے عمل کریں۔ خود کو برے سے برے وقت کے لئے تیار کریں۔ تاکہ آزمائش کی گھڑی میں اللہ کی تائید کی وجہ سے سرخرو رہیں۔

س: آپ کے خیال میں جو آپ لکھتے ہیں' وہ ادب ہے؟

ج: میں اس بحث میں کبھی نہیں پڑتا۔ میں جو اچھا سمجھتا ہوں' وہی لکھتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اللہ مجھ سے ایک بڑا کام لے رہا ہے۔ اب اگر کوئی اسے ادب سمجھے تو یہ اس کی نوازش۔ ادب نہ سمجھے تو مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہاں تو ابھی تک ادب کی تعریف ہی طے نہیں کی جا سکی۔ نہ اس کے دائرہ کار کا تعین ہو سکا ہے۔ تو میں اس بحث میں الجھ کر اپنے کام سے کیوں منہ موڑوں۔ میرے لئے ادب میں مقام سے بڑھ کر میرے قارئین کی ستائش اور دعائیں ہیں۔

س: آپ کا اپنے قارئین کے لئے کوئی پیغام؟

ج: بس یہی کہ گرد و پیش سے مایوس ہو کر اسی رنگ میں رنگ جانا بدترین شکست ہے۔ ہم معاشرے کو نہیں بدل سکتے۔ ہاں خود کو' اپنے گھر کو بدل کر تبدیلی کا آغاز کر سکتے ہیں۔ برائیوں سے گھبرا کر بساط بھر بھلائی کو نہ چھوڑیں۔ بھلائی کا اجر اللہ دیتا ہے جو سب سے زیادہ دینے والا ہے اور برائی کو تو آخر ہارنا ہی ہے اور میں یہ پیغام دینا چاہتا ہوں کہ پتہ نہیں' وہ وقت ہماری زندگی میں آئے یا نہ آئے لیکن اس وقت کے لئے اللہ سے توفیق مانگ کر خود کو تیار کرتے رہئے۔ کتنی بڑی سعادت ہو گی اگر آپ اور میں اسلام کا بول بالا کرنے والے مٹھی بھر اہل ایمان میں شامل ہوں۔

صابر نے ڈائجسٹ بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

بارش کی جھڑی جمعرات سے لگی تھی اور بقول اماں کے جمعرات سے پہلے رکنے والی نہیں تھی۔ پچھلی بار کی بارش نے پنڈورا کا بکس کھول دیا تھا۔ تمام فتنے باہر نکل آئے تھے۔ سب کچھ اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔ برسات کی رم جھم میں دل پینگیں لیتا۔ باہر پپیہا پی ہو' پی ہو پکارتا تو دل میں ہوک اٹھتی۔ اس کا کوئی پی تھا ہی نہیں۔ وہ کسے پکارے۔

آٹھ دن اسی قیامت میں گزرے۔ برسات کی بھیگی رات میں اسے اپنا بستر اجنبی اجنبی لگتا۔ وہ خود کو کھویا کھویا سا محسوس کرتی۔ اسے لگتا کہ جیسے وہ کہیں اور کی چیز ہے' جو غلطی سے کہیں اور رکھ دی گئی ہے۔ نیند بھی کم ہی آتی۔ دراصل اسے خواب سے بھی ڈر لگنے لگا تھا۔

برسات کے اس عرصے میں اس کا دل کسی کام میں نہیں لگتا تھا۔ حد یہ کہ پڑھنے میں بھی دھیان نہیں تھا۔ بس اندر بھیگی بھیگی خواہشیں سر اٹھاتی تھیں اور اب ان سے نظریں چرانا بھی آسان نہیں تھا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ خوفزدہ تھی۔ سب سے زیادہ خوف اسے یہ سوچ کر آتا تھا کہ اس کے پاس دفاع کے لئے کوئی ڈھال بھی نہیں۔ وہ کیا کرے گی۔ کیا بنے گا اس کا۔ بس یہ طے ہے کہ اسے ہارنا نہیں ہے۔ کسی قیمت پر بھی نہیں۔

بدھ کو اماں نے اعلان کیا۔ "بس اللہ کے حکم سے کل آسمان کھل جائے گا۔"

برآمدے میں بیٹھی صفورہ نے یہ سن کر آسمان کی طرف دیکھا۔ کالی گھٹا کے تیور کچھ اور ہی کہہ رہے تھے۔ آسمان پر کہیں ہلکے رنگ کا چھینٹا بھی نہیں تھا۔

اس رات صفورہ نے پھر تقریباً وہی خواب دیکھا۔ وہی جنگل تھا' وہی برسات' وہی کیفیات۔ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ پیاس بھی ستا رہی تھی۔ سردی بھی لگ رہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ حشرات الارض سے اسے پہلے کی طرح خوف نہیں آ رہا تھا۔ اسے

یقین تھا کہ وہ اسے نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ ہاں' وہ خود کو نقصان پہنچا سکتی ہے اور اسے اس سے بچنا ہے۔

بالکل ویسے ہی گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ اور گھڑسوار آتا نظر آیا۔ اتنے فاصلے سے اسے اس کے نقوش نظر نہیں آ رہے تھے۔ بہرحال وہ اسے دیکھتی رہی۔

گھڑسوار نے بھی اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ اس کی طرف آ رہا تھا۔

فاصلہ ذرا کم ہوا تو صفورہ نے دیکھا کہ گھڑسوار نے آنکھوں سے نیچے اپنے چہرے پر رومال باندھ رکھا ہے۔ اس کا دل گھبرانے لگا۔ کیا پھر ویسا ہی کچھ ہونے والا ہے۔

گھڑسوار نے اس کے قریب پہنچ کر گھوڑے کی راسیں کھینچ لیں پھر وہ گھوڑے سے اتر کر اس کی طرف آیا۔ "تم کون ہو؟ اس برسات میں اکیلی یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"یہ میرا جنگل ہے۔" صفورہ نے اکڑ کر کہا۔ "تم بتاؤ کہ تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میں ایک آزاد آدمی ہوں اور یہاں بیر بہوٹیاں اور جگنو پکڑنے کے لئے آیا ہوں۔"

صفورہ کو اس کا جواب بہت اچھا لگا۔ "تم جگنو پکڑ لیتے ہو؟" اس نے حیرت سے کہا۔ "مجھے بھی دو گے؟"

"ضرور.... لیکن فوراً ہی چھوڑ دینا۔ روشنی کو اپنے لئے قید کر کے نہیں رکھتے۔ ورنہ روشنی مرجاتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں بس ایک پل انہیں مٹھی میں رکھوں گی پھر چھوڑ دوں گی۔"

گھڑسوار بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "ارے.... تمہارے تو ہونٹ نیلے ہو رہے ہیں۔ سردی لگ رہی ہے تمہیں۔" اس نے کہا اور صفورہ کی طرف بڑھا۔

"اے.... وہیں رک جاؤ۔" صفورہ نے بھڑک کر کہا۔

گھڑسوار رک گیا اور مستفسرانہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ "تم ڈاکو ہو کیا؟ یہ ڈھاٹا سا کیوں باندھ رکھا ہے تم نے؟" صفورہ نے کہا۔

گھڑسوار نے چہرے پر بندھا ہوا کپڑا ہٹا دیا۔ "خود دیکھ لو۔ میں ڈاکو نہیں ہوں۔

مجھ سے مت ڈرو۔ میں تمہیں سردی سے بچاؤں گا۔ تمہیں تحفظ فراہم کروں گا۔"

"پہلے یہ بتاؤ' تم ہندو تو نہیں ہو۔"

گھڑ سوار اور حیران ہوا۔ "نہیں بھئی' میں مسلمان ہوں۔"

"ثابت کرو۔"

اب کے گھڑ سوار کو غصہ بھی آ گیا۔ "اے لڑکی' کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟"

"پلیز' سمجھنے کی کوشش کرو۔" صفورہ کے لہجے میں التجا تھی۔ "دیکھو' کسی کے چہرے پر نہیں لکھا ہوتا کہ وہ مسلمان ہے یا ہندو ہے اور میں دھوکا نہیں کھانا چاہتی۔"

"تو میں تمہیں چھ کلمے سنا دیتا ہوں۔" گھڑ سوار نے کہا اور کلمے سنانے لگا۔

"چھ کلموں کی کیا ضرورت ہے۔" صفورہ نے اس ٹوکا۔

"پہلے دو کلمے تو کوئی غیر مسلم بھی سنا سکتا ہے۔ میں تمہیں چھ کے چھ سنا دیتا ہوں۔"

اب صفورہ.... گھڑ سوار کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اسے جانا پہچانا لگا۔ اسی وقت زور سے بجلی کڑکی اور وہ ڈر کر گھڑ سوار سے لپٹ گئی۔

"ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔" گھڑ سوار نے نرمی سے اسے الگ کر دیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" صفورہ نے پوچھا۔

"مجیب انور۔"

وہ حیران رہ گئی پھر اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ چہرہ اسے جانا پہچانا کیوں لگ رہا تھا۔ خود اسی نے تصور میں اسے تراشا تھا اور شاید اسی لئے وہ اسے پہچان نہیں پا رہی تھی۔ حقیقت تو نہیں تھی لیکن تصور میں اجاگر کئے گئے نقوش مٹ بھی جاتے ہیں۔

وہ اسے محبت پاش نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اب اسے کوئی خوف نہیں تھا۔ وہ ہر اعتبار سے محفوظ تھی۔

"ایسے کیوں دیکھ رہی ہو مجھے؟"

"ایسے ہی دیکھ سکتی ہوں۔ آپ تو وہ ہیں' جس سے مجھے محبت ہے۔"

وہ حیران نظر آنے لگا۔ "کمال ہے۔ میرا خیال ہے' ہم پہلی بار ملے ہیں۔"

"آپ پہلی بار ملے ہوں گے۔ میں تو آپ سے بارہا مل چکی ہوں.... آپ کی

ملاقاتوں کے ذریعے۔"

"اوہ.... یہ بات ہے۔"

اب وہ جھجک رہی تھی۔ "آپ مجھے سہارا دے سکتے ہیں؟ تھام سکتے ہیں مجھے؟ دیکھئے' انکار نہ کیجئے گا پلیز۔"

وہ اسے غور سے دیکھ رہا تھا پھر وہ مسکرایا۔ "کیوں نہیں۔ تم مجھے اچھی لگی ہو۔ میں تمہیں ہر پریشانی سے بچاؤں گا۔"

مجیب انور نگاہوں میں وارفتگی لئے اس کی طرف بڑھ ہی رہا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔

وہ چند لمحے چت لیٹی چھت کو دیکھتی رہی پھر اس نے سر گھما کر جانے پہچانے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ اس لمحے اپنا کمرا اسے بہت برا لگا۔ وہ اس کی زندگی کا پہلا خواب تھا' جس کا ٹوٹنا اسے بہت برا لگا تھا۔ طبیعت مکدر سی ہو کر رہ گئی۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دوسرے پلنگ پر سلمیٰ بے خبر سو رہی تھی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس کا دوبارہ سونے کو جی ہی نہیں چاہا۔ اتنا اچھا خواب دیکھنے کے بعد اول تو جاگنا ہی اچھا نہیں لگتا اور جاگ جائیں تو دوبارہ سونا اچھا نہیں لگتا۔

وہ لیٹ کر خواب کے.... اور پھر مجیب انور کے بارے میں سوچتی رہی۔ مجیب انور سے محبت تو اسے پہلے ہی ہو چکی تھی۔ وہ دنیا کا واحد مرد تھا' جس کے بارے میں اس نے سب کچھ کھوجنا' جاننا چاہا تھا مگر کچھ دیر پہلے کے خواب نے اس سے ایک عجیب رشتہ استوار کر دیا تھا۔ تحفظ کا رشتہ۔ وہ ہر ترغیب' ہر نفسانی تقاضے کے مقابلے میں اس کی ڈھال بن گیا تھا۔

"اے اللہ.... زندگی میں ایک بار' صرف ایک بار ہی سہی' مجھے مجیب انور سے ضرور ملا دینا۔" اس نے دل کی گہرائیوں سے دعا کی۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ نہ میں اس سے مل کر کبھی مایوس ہوں گی اور نہ ہی کبھی کوئی شکایت کروں گی۔



اس روز مجیب گھر کا سودا سلف خریدنے بازار گیا ہوا تھا۔ ایسا کم ہی ہوتا تھا.... اور جب بھی ہوتا تھا تو وہ لدا پھندا واپس آتا تھا۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا کہ وہ محض چند چیزیں

خریدنے کے ارادے سے نکلتا مگر بازار میں دسیوں ایسی چیزیں بھی خرید لیتا جو اس کی فہرست میں شامل نہیں ہوتی تھیں۔ اس روز بھی یہی ہوا۔ سامان بہت زیادہ ہو گیا اور فاصلہ کم ہونے کے باوجود اسے ٹیکسی کرنی پڑی۔

بلڈنگ کے چوکیدار نے اسے اتنا بوجھ اٹھائے دیکھا تو فوراً آگے بڑھ کر سامان اس سے لے لیا۔ سامان دروازے تک پہنچا کر چوکیدار نیچے چلا گیا۔ فلیٹ کا درواہ خلاف معمول کھلا اور ڈرائنگ روم کا دروازہ بند تھا۔ سحاب کچن میں تھی اور بچے کھیل کے کمرے میں۔ مجیب نے سامان کچن میں پہنچایا۔ "کوئی آیا ہے کیا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں.... آپ کے دفتر سے کچھ لوگ آئے ہیں۔ کافی دیر سے انتظار کر رہے ہیں۔" سحاب نے بتایا۔

مجیب ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر اندر گیا۔ وہاں تین افراد بیٹھے تھے۔ صرف ایک ساجد جانا پہچانا تھا۔ وہ دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ دوسرے دو افراد اجنبی تھے۔

اسے دیکھ کر تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

رسمی گفتگو کے بعد ساجد نے ان دونوں کا تعارف کرایا۔ "یہ میرے دوست ہیں.... غفور اور محراب علی۔ آپ کے بہت فین ہیں۔ لاہور سے آئے ہیں۔"

مجیب کسی فین کے روبرو بہت عجیب سا ہو جاتا تھا۔ "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" اس نے رسماً کہا۔ "کیا شغل ہے آپ کا؟"

"میں پبلشنگ کا کاروبار کرتا ہوں۔" غفور نے کہا۔ "اور یہ میرے دوست وکیل ہیں۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔ مجیب نے جا کر دیکھا۔ سحاب چائے اور بسکٹ کی ٹرے لئے کھڑی تھی۔ وہ ٹرے لے کر اندر آیا پھر دروازہ بند کر لیا۔

چائے کے دوران میں صرف مجیب کی کہانیوں پر تبصرے ہوتے رہے۔ لگتا تھا' محراب علی اس کی کہانیاں باقاعدگی سے پڑھتا ہے۔ البتہ غفور اس معاملے میں کورا معلوم ہوتا تھا حالانکہ وہ پبلشر تھا۔

چائے کے بعد غفور نے کہا۔ "مجیب بھائی' ہم صرف آپ کے لئے لاہور سے یہاں آئے ہیں۔ آپ کا پتہ معلوم نہیں تھا۔ چنانچہ شاہکار کے دفتر گئے اور ساجد بھائی

لے کر آئے ہیں۔

مجیب نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسے حیرت تھی کہ صرف اس سے ملنے کے لئے ور سے کراچی آنا کیا معنی رکھتا ہے۔ "فرمایئے.... میں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ ں؟"

"ہم آپ کی کہانیوں کو کتابی شکل میں شائع کرنا چاہتے ہیں۔" غفور نے کہا۔

"یہ ارادہ تو میرا بھی ہے۔ وسائل ہوتے تو شاید اب تک عمل بھی کر چکا ہوتا۔"

یہ سن کر غفور کا منہ اتر گیا۔ "اگر ہمیں اجازت دے دیں تو...."

"دیکھیں.... میں ڈائجسٹ کی کہانیوں کو ڈائجسٹ ہی کے گیٹ اپ میں شائع کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ انہیں بڑے سائز کا خوبصورت کتابی روپ جائے۔ ٹائٹل دیدہ زیب ہو اور گرد پوش کے ساتھ ہو۔"

غفور کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "ہم کتابیں اسی انداز میں چھاپ رہے ہیں۔" اس نے اپنا بیگ کھول کر اپنی شائع کی ہوئی ایک کتاب نکال کر مجیب کی طرف بڑھائی۔ "اور ہماری پہلی کتاب ہے۔ آئندہ کتابیں اس سے بہتر ہوں گی۔"

مجیب انور نے کتاب کا جائزہ لیا۔ بلاشبہ وہ بہت خوبصورت تھی۔ کاغذ بھی عمدہ تھا ر چھپائی بھی۔ چار کلر کا ٹائٹل بھی آرٹ پیپر پر شائع کیا گیا تھا۔ اس نے اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا۔ "یہی کچھ تھا میرے ذہن میں۔"

"تو پھر کیا خیال ہے جناب!"

"اس میں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" مجیب نے بلاجھجک کہا۔ "میں چھاپنے کی زیشن میں نہیں ہوں اور آپ چھاپنا چاہتے ہیں۔ تو بسم اللہ۔"

"بہت شکریہ آپ کا۔ اب مجھے رائیلٹی کے بارے میں بتا دیجئے۔" غفور نے کہا۔

جب سے کام کی بات شروع ہوئی تھی' ساجد اور محراب علی خاموش بیٹھے تھے۔ ب نے ایک نظر ان دونوں کو دیکھا اور بولا۔ "اس سلسلے میں مجھے تو کچھ معلوم یں۔" اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔ "مجھے تو اندازہ بھی نہیں۔"

"پھر بھی.... آپ حکم کریں۔"

"میں نے کہا نا' مجھے تو اندازہ بھی نہیں اور یوں میں کچھ مانگ لوں اور آپ دے

نہ سکیں تو یہ بھی مناسب نہیں ہو گا۔ آپ ہی بتا دیں۔"

"میں جو کچھ کہوں گا' وہ شاید آپ کو بہت کم لگے گا۔"

"بھئی آپ نے اس کتاب کی جو رائیلٹی دی ہے' وہی مجھے بھی دے دیجئے۔"

"ہاں' یہ ٹھیک ہے۔" ساجد نے پہلی بار مداخلت کی۔

غفور نے جیب سے رقم نکالی اور تیس ہزار روپے گن کر مجیب کو دے دیئے۔

"یہ آپ رکھ لیں۔ بعد میں ہم تفصیلات طے کر لیں گے۔ آپ موقع نکال کر لاہور آ جایئے گا۔ وہاں معاہدہ بھی ہو جائے گا۔"

"بھائی' میرے لئے تو وقت نکالنا بہت مشکل ہے۔" مجیب نے احتجاج کیا۔

"وقت نکالیں نا سر۔" محراب علی بولا۔ "ہم لوگوں کو بھی مہمان نوازی کا موقع دیں۔"

"آپ کے تمام اخراجات میرے ذمے ہوں گے سر۔" غفور نے جلدی سے کہا۔

"دیکھیں گے۔" مجیب نے پرخیال لہجے میں کہا۔ "موجودہ کہانی مکمل کرنے کے بعد ممکن ہے میں آ ہی جاؤں۔"

"ہماری عزت افزائی ہو گی جناب۔" غفور نے کہا۔ "اب ہمیں اجازت؟؟"

مجیب انہیں چھوڑنے نیچے تک گیا۔ واپسی میں وہ بہت خوش تھا۔ کہانیوں کی کتابی شکل میں اشاعت اس کا ایک خواب تھا' جس کی تعبیر آج مل گئی تھی۔



اس رات ناظورہ بیگم محسوس کر رہی تھیں کہ سفیان احمد ان سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں۔ وہ سونے کے لئے لیٹ چکے تھے۔ "کوئی خاص بات ہے؟" ناظورہ بیگم نے پوچھا۔

سفیان احمد نے حیرت سے انہیں دیکھا۔ ان کی شادی کو تقریباً چالیس سال ہونے والے تھے مگر انہیں اب بھی اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ ناظورہ یہ کیسے جان لیتی ہیں کہ وہ ان سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ "ہاں' ہے تو۔" انہوں نے بہت آہستہ سے کہا۔

"لیکن ابھی نہیں کر سکتا۔" انہوں نے برابر والے کمرے کی طرف دیکھا۔ وہاں روشنی ہو رہی تھی۔ وہ بچیوں کا کمرا تھا۔

ناظورہ بیگم نے بھی ان کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ "صفورہ شاید پڑھ رہی ے۔" انہوں نے بھی سرگوشی کی۔

"وہ سو جائے تو بات کریں گے۔"

"لائٹ بند کر دوں؟" ناظورہ بیگم نے پوچھا۔

"ہاں' کر دو لیکن پھر تم سو جاؤ گی۔"

"آپ جانتے ہیں کہ اب میں بات سنے بغیر سو ہی نہیں سکتی۔ نیند ہی نہیں آئے ۔" ناظورہ بیگم کے لہجے میں خفگی تھی۔ انہوں نے اٹھ کر لائٹ بند کر دی اور آ کر نے پلنگ پر لیٹ گئیں۔

برابر والے کمرے میں سلمٰی تو سو چکی تھی۔ صفورہ لیٹی مجیب انور کی کہانی پڑھ ی تھی۔ بہت عرصے سے تو وہ مطالعے کی لذت سے محروم ہی ہو چکی تھی۔

ایک تو وہ پورے ارتکاز اور یکسوئی کے ساتھ پڑھ رہی تھی۔ دوسرے مجیب انور یکطرفہ طور پر اس نئے تعلق کی وجہ سے پڑھنے کا لطف ہی کچھ اور ہو گیا تھا۔ یت کا احساس اس قدر توانا تھا کہ وہ کہانی پر داد بھی خود کو ہی دے رہی تھی۔

بالآخر کہانی ختم ہو گئی۔ صفورہ نے اٹھ کر لائٹ آف کر دی مگر آنکھوں میں نیند کا و نشان تک نہیں تھا۔ وہ بستر پر لیٹ کر کہانی ہی کے بارے میں سوچتی رہی۔ رات آوازیں گہری ہوتی گئیں۔

اچانک اسے ایسا لگا کہ کمرے میں اس کے قریب ہی کسی نے سرگوشی کی ہے۔ وہ واضح نسوانی آواز تھی۔ "اب بتایئے نا۔"

صفورہ نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا مگر کمرے میں سلمٰی کی سوا کوئی نہیں تھا۔ لے ہی لمحے اسے ہنسی آ گئی۔ وہ کہانی کی سوچوں میں یوں کھوئی ہوئی تھی کہ اس کی میں نہیں آیا کہ یہ اماں کی آواز ہے اور اماں بہت دھیمی آواز میں بولی تھیں۔ کچھ اس کی سماعت بہت تیز تھی اور کچھ رات کا سناٹا تھا۔ اس لئے آواز اسے واضح طور نائی دی تھی۔

اسی لمحے اس نے ابا کی جوابی سرگوشی بھی سن لی۔ "ابھی نہیں۔ کیا پتہ' وہ ابھی رہی ہو۔"

اس پر صفورہ کے کان کھڑے ہو گئے۔ کہانی کا طلسم ٹوٹا اور اس نے سمجھ لیا کہ ابا اور اماں کے درمیان اسی کے متعلق کوئی گفتگو ہونے والی ہے۔ اس نے دم سادھ لیا۔

کم از کم پانچ منٹ تک خاموشی رہی مگر رات کے سناٹے میں وہ پانچ منٹ اسے ایک گھنٹے کے برابر لگے۔ اس دوران میں اس کا دھیان پھر کہانی کی طرف چلا گیا مگر سرگوشی کی آواز نے اسے پھر چونکا دیا۔ اس بار ابا بولے تھے۔

"سنو..... آج اشفاق میرے پاس آیا تھا..... دکان پر۔" دوسرے کمرے میں سفیان احمد نے ناظورہ بیگم سے کہا۔

"کون اشفاق؟" ناظورہ بیگم کو کچھ یاد ہی نہیں آ رہا تھا۔

"ارے وہی' اپنا اشفاق قریشی۔"

"اچھا..... وہ....." ناظورہ بیگم نے گہری سانس لی۔ "کس سلسلے میں؟"

"وہ مشتاق کا رشتہ کرنا چاہتا ہے ہمارے ہاں۔"

ایک لمحے کو ناظورہ بیگم کے جی میں آئی کہ فوراً ہی اس خیال کی حوصلہ شکنی کر دیں۔ مگر بات کو انہوں نے نوک زباں پر ہی روک لیا۔ انہیں اچانک خیال آ گیا کہ صفورہ اب اکتیس ویں سال میں ہے۔ ایسے میں کسی رشتے کو یوں مسترد نہیں کیا جاتا پھر بھی انہوں نے بڑی بے دلی سے کہا۔ "ہوں..... اچھا۔"

"لڑکا میرا دیکھا بھالا ہے۔" سفیان احمد ان کی کیفیت سے بے خبر کہہ رہے تھے۔ "صورت شکل کے اعتبار سے انسان کا بچہ ہے۔ عادت و اطوار کا بھی اچھا ہے۔ بظاہر کسی برائی میں بھی نہیں۔ آگے ہماری بچی کے نصیب۔"

سفیان احمد کے لہجے میں ایسی قطعیت تھی کہ جیسے وہ فیصلہ کر چکے ہوں۔ ناظورہ بیگم کا دل ڈوبنے لگا۔ "تعلیم کتنی ہے اس کی؟" انہوں نے دل کڑا کر کے پوچھا۔

"لڑکوں کو تعلیم کہاں راس آتی ہے آج کل۔" سفیان احمد نے آہ بھر کے کہا۔ "کون پڑھاتا ہے لڑکوں کو اور جو پڑھے لکھے ہوں' وہ گھر داماد رکھنے کے ہی لائق ہوتے ہیں۔ اور تم جانتی ہو کہ ہم اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔"

ناظورہ بیگم نے دل ہی دل میں اس کی تائید کی۔ "کرتا کیا ہے؟" انہوں نے بات آگے بڑھائی۔

"ویلڈر ہے۔ ٹھیک ٹھاک کما لیتا ہے۔" سفیان احمد نے بے پروائی سے کہا۔

ناظورہ بیگم سوچ میں پڑ گئیں۔ خاصی دیر تک وہ سوچتی رہیں۔ انہیں اندازہ تھا کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔

"کیا ہوا؟ تم کس سوچ میں پڑ گئیں؟" سفیان احمد نے پر تشویش لہجے میں پوچھا۔

"آپ جانتے ہیں۔" ناظورہ بیگم نے بے دلی سے کہا۔ "صفورہ کبھی نہیں مانے گی۔ ہنگامہ کر دے گی۔"

"کیوں کر دے گی۔" سفیان احمد کی آواز تیز ہو گئی۔ "کیا برائی ہے اس رشتے میں۔"

"دیکھیں جوڑ تو نہیں ہے نا۔" ناظورہ بیگم نے ٹھنڈے میٹھے لہجے میں کہا۔ "تعلیم کا اتنا فرق۔"

"تعلیم سے کیا ہوتا ہے؟"

"سوچ بنتی ہے اور سوچوں کا فرق مزاج کا فرق بن جاتا ہے۔ لڑکا لڑکی کے مقابلے میں احساس کمتری میں مبتلا ہو تو مسئلہ بن جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ بیوی کو زیر کرنے کی کوششوں میں لگا رہتا ہے۔ ایسے میں کوئی خوش رہ سکتا ہے بھلا؟"

سفیان احمد کا بلڈ پریشر بڑھنے لگا۔ "تم لوگ مجھے ختم کر دو گے اسی طرح۔"

ناظورہ بیگم دہل گئیں۔ "اللہ نہ کرے۔ آپ اسے اتنا بڑا مسئلہ کیوں بناتے ہیں۔ اللہ میاں مسبب الاسباب ہے۔ یہ تو نصیب کا معاملہ ہوتا ہے۔"

"میں کیا بناؤں گا۔ مسئلہ تو ہے۔" سفیان احمد نے بھنا کر کہا۔ "تم صفورہ کو چھوڑو۔ اپنی رائے بتاؤ۔"

ناظورہ بیگم سوچ میں پڑ گئیں۔ یہ ڈر الگ تھا کہ سفیان احمد کی طبیعت نہ بگڑ جائے۔ وہ بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ "بھئی..... لڑکا تو ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔ بس ذرا خاندانی اعتبار سے وہ لوگ کمتر ہیں۔"

"مسلمان ہی تو ہیں۔ ہندو تو نہیں ہیں۔" سفیان احمد نے تیز لہجے میں کہا۔

بالآخر ابا کا وہی کمپلیکس بولا۔ دوسرے کمرے میں بستر پر لیٹی صفورہ نے سوچا۔ کتنے خوف زدہ ہیں ابا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن جوڑ کی تو اپنی اہمیت ہے۔" ناظورہ بیگم بولیں۔
"پھر وہی جوڑ کا مسئلہ۔" سفیان احمد جھنجلا گئے۔
"بھئی.... زندگی تو لڑکی کو گزارنی ہے نا۔ اس کے نقطہ نظر سے تو سوچنا پڑے گا۔" ناظورہ بیگم نے کہا۔ "شریعت میں بھی بے جوڑ شادی کو زیادتی قرار دیا گیا ہے اور پھر لڑکی کی مرضی کے خلاف شادی کی تو ممانعت ہے۔"
"یہاں قانون ضرورت کا بھی خیال رکھنا پڑے گا۔ یہ اہتمام وہاں ہو سکتا ہے' جہاں رشتوں کی برسات ہو۔ یہاں تو رشتہ مل جانا ہی بڑی نعمت ہے۔"
"کیسی باتیں کرتے ہیں۔ کوئی قانون شریعت سے آگے نہیں جا سکتا۔" ناظورہ بیگم مذہب کے معاملے میں کوئی لحاظ نہیں کرتی تھیں۔
سفیان احمد کا یہ حال ہوا کہ بس نہیں چلتا تھا' ورنہ اپنے سر کے بال نوچ ڈالتے۔ وہ گنگ ہو کر رہ گئے تھے۔
ان کا حال دیکھ کر ناظورہ بیگم کو ڈر لگنے لگا۔ معاملہ نازک تھا۔ انہوں نے پوچھا۔ "آپ نے کیا کہا اشفاق صاحب سے؟"
"وہ تو کل ہی بیوی کو بھیجنے کا کہہ رہے تھے۔ میں نے کہا' گھر میں بات کر کے کل جواب دوں گا۔"
"تو پھر؟"
"میں تو کل آنے کا کہہ دوں گا۔ اس کے بعد آپ جانیں اور وہ۔ میں انکار کر کے ناشکرا پن نہیں کر سکتا۔" سفیان احمد کے لہجے میں قطعیت تھی۔
"چلیں.... ٹھیک ہے" ناظورہ بیگم نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ وہ دل میں سوچ رہی تھیں کہ صفورہ کو کیسے قائل کریں۔
کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی۔ صفورہ کو ماں پر پیار آنے لگا۔ کتنا سمجھتی تھیں وہ اسے.... اور کتنا خیال رکھتی تھیں اس کا۔ محبت تو ابا بھی بہت کرتے تھے لیکن جہاں بیٹی عزت کے سر پر لٹکی ہوئی تلوار لگنے لگے' وہاں محبت دم سادھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ بہرحال وہ بھی اس کے لئے برا سوچنے والے نہیں تھے۔
خود صفورہ نے بھی اس رشتے کو فوراً ہی مسترد نہیں کیا۔ اس نے مشتاق کو دیکھا

ہوا تھا۔ صورت شکل کے اعتبار سے وہ ٹھیک ٹھاک تھا مگر اس کے لئے شکل و صورت کی اتنی اہمیت نہیں تھی۔ وہ شخصیت کے وقار اور رکھ رکھاؤ کو خوب صورتی پر ترجیح دیتی تھی اور یہاں مشتاق اس کے لئے ناقابل قبول تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس میں مشتاق کا کوئی قصور نہیں۔ کام کے سلسلے میں دن بھر جس طرح کے لوگوں سے اس کا واسطہ پڑتا تھا' اسی طرح کا انداز اپنانے پر وہ مجبور تھا۔ اسی لئے تو پیشے کی اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے پھر سب سے بڑی بات یہ کہ وہ واجبی پڑھا لکھا تھا۔ مڈل بھی پاس نہیں کیا تھا اس نے۔
خاصے غور و خوض کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ مشتاق کو قبول نہیں کر سکتی۔
اسی لمحے مجیب انور کا خیال آیا اور ذہن میں اس سوال نے سر اٹھایا کہ کیا مشتاق کو مسترد کرنے کے پیچھے مجیب انور کی محبت کار فرما ہے۔ وہ اس کا واضح جواب تو نہیں دے سکتی تھی۔ جب دل میں مجیب انور جیسا تعلیم یافتہ' ذہین اور مہذب شخص بسا ہو تو بھلا مشتاق جیسے کسی لڑکے کو پسند کیا جا سکتا ہے۔ وہ نہ ہوتا تو شاید وہ مشتاق کا رشتہ قبول کر لیتی۔
اس سلسلے میں سوچتے سوچتے اس پر بہت کچھ واضح ہو گیا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ وہ مجیب کی محبت میں راسخ ہو چکی تھی۔ ان لمحوں میں اس نے اچھی طرح جان لیا کہ درحقیقت اب کوئی مرد بھی اس کے لئے قابل قبول نہیں رہا ہے.... سوائے مجیب انور کے۔
مگر مجیب انور اس کے لئے بس ایسا خواب تھا' جس کی تعبیر برعکس تھی۔ وہ اسے بھی مل نہیں سکتا تھا تو کوئی بات نہیں۔ دل نے چپکے سے کہا۔ میں بہ آسانی اس کی محبت کے سہارے زندگی گزار سکتی ہوں۔ اس کی محبت مجھے سہارا دے گی تو میں کبھی لڑکھڑاؤں گی نہیں اور ایسی محبت تو بہت عظیم ہوتی ہے۔ قابل فخر محبت!
پھر اسے خیال آیا کہ دنیا میں ناممکن تو کچھ بھی نہیں۔ اللہ تو سب کچھ ممکن بنا سکتا ہے۔ دعا سے تقدیر بھی بدل جاتی ہے۔ وہ بے تاب ہو کر اٹھ بیٹھی۔ قبلہ رو ہو کر اس نے سجدہ کیا اور تڑپتے بھڑکتے لہجے میں گڑگڑانے لگی۔ "اے اللہ' تو ہر چیز پر قادر ہے۔ کسی بھی طرح ہو' کیسے بھی ہو' تو مجیب کا ساتھ' اس کا قرب مجھے عطا فرما دے۔"

میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

وہ مسلسل یہی جملے دہراتی رہی۔ یہاں تک کہ اسے وہ سکون آ گیا جو صرف دعا اور توبہ کی قبولیت کے بعد ملتا ہے۔ اس نے سجدے سے سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا لیکن وہ پرسکون تھی۔ وہ لیٹتے ہی سو گئی۔

مگر اسے دو باتوں کا علم نہیں تھا۔ ایک یہ کہ دعا کرتے وقت انسان کو لفظوں کے معاملے میں بہت محتاط رہنا چاہئے۔ دوسرے یہ کہ روایت ہے کہ دعائے نیم شب زیادہ تر فوراً ہی قبول ہو جاتی ہے۔



صبح اماں بات شروع کرنے کے لئے تمہید ہی باندھ رہی تھیں کہ صفورہ نے صاف جواب دے دیا۔ "اماں.... مجھے نہیں کرنی شادی۔"

اماں حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔ حیرت کی بات تو تھی۔ انہوں نے تو ابھی کچھ کہا بھی نہیں تھا۔

"آپ کی رات کی باتیں میرے کان میں پڑ گئی تھیں۔" صفورہ نے انہیں بتایا۔

"تو پھر تجھے اپنے ابا کا حال بھی معلوم ہو گا۔ خدانخواستہ انہیں کچھ ہو نہ جائے۔"

"کچھ نہیں ہو گا اماں۔ آپ انہیں سمجھائیں۔ وہ مجھ سے جو خطرہ منسوب کرتے ہیں، غلط ہے۔ میرے قدم کبھی نہیں بہکیں گے۔ ایک ایسی مضبوطی ہے میرے پاس۔ میں چاہے ساری عمر شادی نہ کروں۔ ان کی عزت کو کبھی بٹا نہیں لگاؤں گی۔"

"کیسے سمجھاؤں انہیں۔" اماں نے سرد آہ بھر کے کہا۔ "اور کل لڑکے والے رشتہ مانگنے آ جائیں گے۔"

"تو انکار کر دینا اماں۔"

"کیسے انکار کر دوں؟ کوئی جواز بھی تو ہو۔ تیرے ابا تو خون پی جائیں گے میرا۔ یا خود کچھ کر بیٹھیں گے۔"

"میں انکار کر دوں گی اماں۔ آگے جو بھی ہو۔"

اس موقع پر اچانک سلمیٰ بول پڑی۔ ان دونوں کو تو اس کی موجودگی کا احساس بھی نہیں تھا مگر وہ بیٹھی سب گفتگو سنتی رہی تھی۔ "کوئی بات نہیں اماں۔ آپ میرے لئے

ہاں کر دیجئے گا۔ انکار ہو گا' نہ ابا کو غصہ آئے گا۔"

"تمہیں قربانی دینے کی ضرورت نہیں۔" صفورہ نے اس سے کہا۔

"یہ قربانی کی بات نہیں آپا۔ میں حقیقت پسند ہوں۔ تمہاری طرح خیالی دنیا میں تو نہیں رہتی۔" سلمیٰ کے لہجے میں تلخی تھی۔ "ہمارے لئے کسی شہزادے کا رشتہ نہیں آئے گا اور جوں جوں عمر زیادہ ہو گی' رشتے کے امکانات ہی ختم ہوتے جائیں گے۔ میں سوچ سمجھ کر ہاں کر رہی ہوں۔"

اماں نے ایک نظر سلمیٰ کو اور پھر صفورہ کو دیکھا۔ ان کی نظروں میں ایک سوال تھا۔

"اب یہ سلمیٰ جانے اور آپ جانیں۔" صفورہ نے بھی تلخی سے کہا "میں تو اپنا فیصلہ سنا چکی ہوں۔ میں تخیلاتی ہی سہی۔ اپنا کیا آپ بھگتوں گی۔"

"جو جس کا نصیب۔ اللہ بہتر کرے گا۔" اماں نے کہا اور چپ ہو گئیں۔

اس رات سفیان احمد آئے تو ناظورہ بیگم نے چپکے سے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ "چلو' یہی سہی۔" سفیان احمد نے گہری سانس لے کر کہا "آدھا بوجھ تو کم ہو گا۔ ویسے صفورہ نمٹ جاتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔ پتہ نہیں' اس لڑکی کے دماغ میں کیا ہے۔"

"دعا کریں اس کے لئے۔"

"میں تو اسے تعلیم دلا کر پچھتا رہا ہوں۔" سفیان احمد نے کہا پھر بات کا رخ بدلا "اشفاق فوراً ہی شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"جہیز تو مکمل ہی ہے پھر بھی تیاری میں ایک ماہ تو لگے گا ہی۔"

"ٹھیک ہے۔ ایک ماہ بعد کی کوئی تاریخ رکھ لیں گے۔ اگست کا ویزا مل گیا ہے۔ شادی سے نمٹ کر پاکستان چلیں گے۔ ویزا اکتوبر تک کا ہے۔"

"اس بار چھوڑیں۔ خاصا بوجھ ہو جائے گا۔"

"نہیں۔ جانا ضروری ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ صفورہ کے سلسلے میں غفران سے بات کروں گا۔ پاکستان میں ہی کوئی ڈھنگ کا رشتہ مل جائے تو کیا برا ہے۔"

"ہاں' یہ تو ہے۔"

اس رات صفورہ پھر مجیب کو خط لکھنے بیٹھی۔ وہ دل کا ہر بوجھ ہلکا کر دینا چاہتی تھی۔ وہ ایک طویل خط تھا۔



اس روز مجیب انور دفتر گیا تو اسے انڈیا سے آیا ہوا دوسرا خط ملا۔ وہ جان گیا کہ کس کا خط ہے۔ وہ خوب صورت تحریر' وہ خوش نما حروف صرف ایک بار دیکھ کر بھی وہ آج تک نہیں بھول سکا تھا۔

خط ہاتھ میں لیتے ہی اس کا دل عجیب طرح سے دھڑکنے لگا۔ وہ جیسے پھر سے ٹین ایجر ہو گیا۔ وہ خط نہیں' محبت نامہ تھا۔

اس نے چور نظروں سے ولی محمد کو دیکھا لیکن اسے خط دینے کے بعد وہ دوسرے خطوط کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ مجیب دفتر سے نکل آیا۔ قریب ہی ایک بہت اچھا ریسٹورنٹ تھا۔ وہ صرف خط پڑھنے کی غرض سے وہاں جا بیٹھا۔ وہ اس خط کو گھر میں نہیں پڑھنا چاہتا تھا۔

جیسے جیسے وہ خط پڑھتا گیا' اس کی کیفیت عجب ہوتی گئی۔ وہ کوئی عام محبت نامہ نہیں تھا۔ اس خط میں ایک اپیل تھی.... ایک درد بھری پکار تھی۔ سرحد کے اس پار سے کوئی لڑکی پکار رہی تھی.... ہے کوئی حجاج بن یوسف جو ایک بے بس لڑکی کی پکار سنے۔

اس بار لڑکی نے دو الگ الگ حیثیتوں میں خط لکھا تھا۔ ایک ذاتی حیثیت میں اور دوسرے ہندوستان میں رہنے والی ایک عام لڑکی کی حیثیت میں۔ ذاتی طور پر تو وہ اس کی غیر متزلزل محبت کا اعتراف تھا۔ لڑکی کا دعویٰ تھا کہ وہ اس کے سوا کبھی کسی کو نہیں اپنائے گی۔ اس نے لکھا تھا.... مجھے یقین ہے کہ آپ شادی شدہ ہیں۔ آپ کے بچے بھی ہوں گے لیکن پھر بھی.... کاش آپ مجھ سے بھی شادی کر سکتے۔ یہ ایسا ناممکن بھی نہیں.... اور خلاف شرع بھی نہیں۔ اگر ہندوستان کی مسلمان لڑکیوں کی مدد پاکستانی نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا۔

عام حیثیت میں لڑکی نے ایک بے حد گمبھیر مسئلے کی طرف توجہ دلائی تھی۔ مسئلہ

ایسا تھا کہ اس کے بارے میں سوچ کر مجیب انور کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کون تصور کر سکتا ہے کہ کوئی مسلمان لڑکی کسی ملحد شخص سے شادی کرے گی۔ ہندو سے! لیکن ایسا ہو رہا تھا۔

مجیب کو اچانک ہی 72ء کی اخبار جہاں کا ایک شمارہ یاد آ گیا۔ بہت پرانی بات تھی۔ وہ یقین سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ 72ء ہی کا شمارہ تھا۔ بہرکیف یہ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اخبار جہاں کے اس شمارے میں ہندوستان میں مسلمان لڑکیوں کے ہندو مردوں سے شادی کرنے کے رجحان کے بہت بڑھ جانے کے بارے میں ایک فیچر چھپا تھا۔ اس میں اعداد و شمار تک دیئے گئے تھے' جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ مسلمان لڑکیوں کے ہندوؤں سے شادی کرنے کی شرح خطرناک اور تشویش ناک حد تک بڑھ گئی ہے اور اس میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

مجیب نے وہ فیچر نہ پڑھا ہوتا تو شاید اس خط کو زیادہ اہمیت نہ دیتا۔ یہ مسئلہ اسے افسانوی ہی لگتا اور وہ سمجھتا کہ مسئلے کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا ہے۔ ورنہ یہ ممکن ہے لیکن اب تو وہ سوچ رہا تھا کہ 25 سال پہلے یہ مسئلہ اتنا تشویش ناک تھا کہ اس مسئلے پر ایک کثیر الاشاعت ہفت روزے میں فیچر چھپ گیا تو اب کیا حال ہو گا۔ ہے.... جبکہ پاکستان تک بھارت کی ثقافتی یلغار کی زد میں ہے۔ بھارتی فلمیں عام ہو چکی ہیں۔ عام گھرانوں کی لڑکیاں پاکستان میں بھی بہن کو دیدی اور بہنوئی کو جیجاجی بے حد فخر سے پکارتی ہیں۔ تو ہندوستان میں کیا حال ہو گا۔

یہ تو مجیب کو اس لڑکی کے پہلے خط سے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ اس نے اردو میں ایم اے کیا ہے مگر یہ دوسرا خط بتاتا تھا کہ تاریخ بھی اس کا مضمون رہا ہو گا۔ تاریخ پر اس کی گہری نظر تھی اور تاریخ میں مجیب کو بھی خاص دلچسپی تھی۔ اسی لئے اس نے اس خط کو تین بار پڑھا۔ چھوٹے سے ذاتی حصے کو چھوڑ کر وہ خط درحقیقت قوموں کی تاریخ اور مزاج پر ایک طویل اور پرمغز مقالے کی حیثیت رکھتا تھا۔ لڑکی نے آخر میں [illegible] کی تھی کہ وہ اس موضوع پر بھی کبھی قلم اٹھائے۔ اس نے لکھا تھا.... اس خطہ زمین پر مسلمانوں کے وجود کا سبب بس ایک مظلوم لڑکی کی پکار بنی تھی۔

وہ پکار اونچے ایوانوں میں سن گئی' اس پر لبیک کہا گیا اور محمد بن قاسم کو داد رسی

کے لئے بھیجا گیا۔ اگر یہ نہ ہوا ہوتا تو یہاں آج مسلمانوں کا وجود ہی نہ ہوتا اور آج ہزار سال بعد پھر ایک مسلمان لڑکی تڑپ کر پکار رہی ہے۔ کیا اس کی آواز سنی جائے گی۔

مجیب انور نے خط تہ کر کے جیب میں رکھا اور ریسٹورنٹ سے نکل آیا۔ بل وہ پہلے ہی ادا کر چکا تھا۔

گھر پہنچ کر اس نے لڑکی کے پچھلے خط کی طرح اس خط کو بھی خطوط والی دراز میں دوسرے خطوں کے درمیان رکھ دیا۔ چند لمحوں کو اس کا جی چاہا کہ وہ یہ خط سحاب کو پڑھوائے مگر پھر اسے پچھلے خط کو اسے نہ پڑھوانے کے سلسلے میں وضاحت کرنا پڑتی' جو ہرگز آسان نہیں تھا۔ آدمی ایک جھوٹ بول کر سو جھوٹ بولنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اپنی میز پر بیٹھ کر وہ اس مسئلے پر غور کرتا رہا' جس کی نشان دہی لڑکی نے کی تھی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس موضوع پر کہانی ضرور لکھے گا۔ کچھ دیر وہ اس نئی کہانی کے تانے بانے بننے کی کوشش کرتا رہا لیکن کچھ سوجھ ہی نہیں رہا تھا۔

ان دنوں اس نے نئی کہانی شروع ہی کی تھی مگر اب وہ لکھنے بیٹھا تو لکھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ اس کے ذہن پر اس نئی کہانی کا خیال مسلط تھا۔ اس نے سوچا' پہلی کہانی کی تھیم تو مکمل اور محفوظ ہے۔ کیوں نہ پہلے اسی دوسری کہانی کو لکھا جائے جو دماغ پر سوار ہو گئی ہے لیکن اس کی سمجھ میں یہ بھی نہیں آیا کہ کہانی کیا ہو گی۔ کردار کیسے ہوں گے۔ کہانی کا خاکہ بھی اسے نہیں سوجھ رہا تھا۔ بس اسے یہ معلوم تھا کہ اسے کس مسئلے کو اجاگر کرنا ہے۔

چند روز کی کوشش کے نتیجے میں مایوس ہو کر وہ اس کہانی کی طرف متوجہ ہوا جو وہ پہلے ہی شروع کر چکا تھا مگر اس سے لکھا ہی نہیں گیا۔ عجیب مشکل تھی۔ جس کہانی کا خاکہ مکمل تھا' وہ لکھی نہیں جا رہی تھی اور جو وہ لکھنا چاہ رہا تھا' اس کے خد و خال تک واضح نہیں تھے۔

مزید چند روز ضائع کرنے کے بعد وہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ اسے نئی کہانی کے لئے گراؤنڈ ورک مکمل کرنا چاہئے۔ شاید اس کے بعد اس طرف سے مطمئن ہو کر وہ پوری یکسوئی سے اس کہانی کو مکمل کر سکے جو وہ شروع کر چکا ہے۔ اسے قیام پاکستان کے

تاریخی پس منظر کو پوری سفاکی اور سچائی کے ساتھ لکھنا تھا۔ کافی مواد تو اس محبت کرنے والی لڑکی نے فراہم کر دیا تھا پھر ہندوؤں اور ہندوستان کے بارے میں اس کے اپنے نظریات بھی تھے۔

وہ کوئی کہانی تو تھی نہیں کہ وہ محتاط ہو کر لکھتا۔ وہ تو کہانی میں استعمال کرنے کے لئے پس منظر کے نوٹس بنا رہا تھا۔ چنانچہ وہ بڑی روانی سے لکھتا گیا۔ اس کے ذہن میں خیالات کی رفتار بہت تیز تھی۔ صفحات کے صفحات سیاہ ہوتے گئے۔

تاریخ محض ایک مضمون نہیں' جسے امتحان پاس کر کے بس سند مل جائے۔ یہ قوموں کے مزاج اور ان کے تشخص کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ تاریخی واقعات یاد کرنے کے لئے نہیں ہوتے۔ ان کے نتائج اور اثرات مابعد کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ تاکہ ان کی مدد سے حال کے لئے روشنی اور رہنمائی حاصل کی جا سکے۔

قومیں افراد سے بنتی ہیں۔ اچھے برے افراد ہر جگہ ہوتے ہیں لیکن قوموں اور خاص طور پر مذہب کے پیروکاروں کا مزاج صدیوں کے تسلسل سے بنتا ہے اور بہت پختہ اور بہت دیرپا ہوتا ہے۔ کچھ اوصاف' کچھ برائیاں ایسی ہوتی ہیں جو ان کی شناخت ہوتی ہیں۔ کہیں کہیں ان میں تبدیلیاں بھی واقع ہوتی ہیں۔ کبھی ضرورت کے مطابق وہ خود کو تبدیل بھی کرتے ہیں لیکن بنیادی خوبیوں اور خامیوں میں کم ہی فرق پڑتا ہے۔ یہودیوں نے صدیوں کی ذلت اور خواری کے بعد اپنی کاہلی اور بے عملی کو چھوڑ دیا مگر بنیادی طور پر وہ ویسے ہی رہے۔ دولت پر جان دینے اور اسے طاقت سمجھنے والے۔ وعدہ خلافی کرنے والے۔ معاہدہ کر کے اس پر عمل نہ کرنے والے۔ مفاد پر عزت اور غیرت قربان کرنے والے۔ خون میں ملاوٹ پسند نہ کرنے والے۔ خائن اور سود خور۔

برصغیر میں دو بڑی قومیں آباد ہیں۔ اسی لئے دو قومی نظریئے کی بنیاد پر پاکستان وجود میں آیا۔ تاریخ کے آئینے میں مسلمانوں کے خد و خال دیکھیں۔ یہ جذبہ ایمانی سے سرشار ہوں اور اللہ سے رابطہ استوار ہو تو طوفان کی طرح چھا جانے والے لیکن دنیا فتح کرنے کے بعد جشن مناتے ہوئے تمام برائیوں کی طرف مائل ہونے والے۔ کھوکھلے اطمینان کے سائے میں بیٹھ کر بے فکری اور بے عملی کے ہاتھوں بالآخر سب کچھ گنوا دینے والے۔ من پسند ترغیب کے سامنے اپنوں سے' دین سے' اللہ سے غدری کرنے

سے بھی نہیں چوکتے۔ یادداشت کے کمزور مگر بہادر اور شجاع۔ کمزوری کے باوجود طاقت ور کے سامنے ڈٹ جانے والے۔ رحم اور عفو و درگزر سے مالا مال۔ کمزور کا لحاظ کرنے والے مگر اعتدال کا دامن چھوڑے رکھنے والے۔

اور ہندو! بے حد قدیم قوم۔ ان کے عقائد نے اور کثیر تعداد میں دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرنے کی وجہ سے اخلاقی اقدار کے فقدان نے انہیں جو کمزوریاں دیں' وہ صدیوں نے اور پختہ کر دیں۔ بزدلی ان کی فطرت۔ اندر سے کمزور۔ ایسے میں بقا بہت دشوار ہوتی۔ اس احساس نے انہیں عیاری' مکاری اور کینہ پروری بخشی۔ جہاں کوئی طاقت سامنے آئی' انہوں نے بظاہر ہنسی خوشی سمجھوتا کر لیا لیکن دل میں اس کے لئے کینہ رکھا۔ یادداشت پختہ تھی۔ ان کا کینہ کبھی سات پشتوں تک نہیں مٹا۔ ذہن کے سازشی اور منصوبہ ساز تھے۔ بغل میں چھری اور منہ پر رام رام کے عادی۔ جہاں موقع ملا' پیچھے سے وار کر دیا۔ سخت ناقابل اعتبار۔ عورتوں کو کھلونا سمجھنے اور انہیں جنگ میں استعمال کرنے والے۔ کمزور اور نہتوں کے سامنے شیر ہو جانے والے۔

تاریخ کے آئینے میں نظر آنے والے اس کردار کو اس حقیقت نے اور پختہ کر دیا کہ باہر سے حملہ آور آتے رہے اور ہندوؤں کو شکست دے کر ان کی پوتر دھرتی ماتا کو روندتے رہے۔ یہ اس اعتبار سے گوارا تھا کہ حملہ آور آتے اور چلے جاتے مگر پھر مسلمان آئے اور جم کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے صرف زمین فتح نہیں کی۔ اپنے اخلاق اور رواداری سے دل بھی فتح کئے۔ رہی سہی کسر اولیائے کرام نے پوری کر دی۔ مسلمان مٹھی بھر آئے تھے مگر ان کی تعداد بڑھتی گئی اور جتنی ان کی تعداد بڑھی' اتنی ہی ہندوؤں کی کم ہوئی۔ یہاں تک کہ مسلمان ہر اعتبار سے پورے بھارت پر چھا گئے۔ یوں ہندوؤں کا روایتی کردار اور پختہ ہو گیا۔ کمزوری کا توڑ صرف عیاری اور مکاری میں تھا۔ مسلمان ویسے بھی دل کے اچھے اور فیض رساں تھے۔ فائدہ اٹھانے میں کوئی برائی بھی نہیں تھی۔ چنانچہ بڑے بڑے ہندوؤں نے مسلمانوں سے دوستی کی۔ بلکہ انہیں بیٹیاں بھی دے دیں۔ یہ بہت بڑی ذلت تھی۔ بہت بڑا صدمہ تھا۔ اسے وہ کبھی نہیں بھولے۔

تاریخ گواہ ہے کہ ہندوؤں میں اگر راجپوت نہ ہوتے تو شاید آج ہندوؤں کا وجود

نہ ہوتا۔ راجپوت ہندو ہونے کے باوجود بے شمار اعلیٰ صفات کے حامل تھے۔ بہادری' آن پر جان قربان کر دینا اور زبان کا پاس ان کے وہ اوصاف تھے' جن کی ہندوؤں سے امید ہی نہیں کی جا سکتی۔ وہ غیرت اور حمیت سے بھی متصف تھے۔ ان کے کئی سورما بھارت ماتا کو مسلمانوں کی گرفت سے چھڑانے کے لئے اٹھے مگر ناکام ہو کر نیست و نابود ہو گئے۔ ذلت کا بوجھ بڑھتا ہی گیا۔ تعلقات اچھے رکھنے اور مراعات حاصل کرنے کے لئے انہیں اپنی خوب صورت کنیاؤں اور دولت کا خراج مسلمانوں کو ادا کرنا پڑا۔ وہ یہ سب کچھ اپنے بہی کھاتوں میں درج کرتے رہے۔ کھاتے بھرتے گئے۔ بھلایا کچھ بھی نہیں گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو کا بدترین دشمن مسلمان ٹھہرا۔ ہندو کو سب سے زیادہ نفرت مسلمان سے ہے۔ ان کی انا اور نام نہاد غیرت کو سب سے زیادہ زخم مسلمانوں ہی سے لگے ہیں۔

تاریخ نے خود کو دہرایا۔ مسلمان بے فکری' بے عملی اور عیاشی میں پڑ گئے مگر ہندو پھر بھی انہیں زیر نہ کر سکے۔ مسلمانوں کی مملکت سمٹی ضرور لیکن ان کی اہمیت اور مرکزیت پھر بھی ختم نہ ہوئی۔ ایسے میں انگریز تاجر بن کر آئے اور مسلمانوں کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر ملک پر قابض ہو گئے۔

ہندوؤں کو انگریز برے نہیں لگے۔ وہ تو ان کے لئے نجات دہندہ بن کر آئے تھے۔ ہندوؤں کو اپنی روایتی چاپلوسی اور خوشامد سے استفادہ کرتے ہوئے ان سے فائدہ اٹھانا تھا۔ انہیں نہ صرف خود طاقت پکڑنا تھی۔ بلکہ مسلمانوں کو کمزور اور خوار و زبوں بھی کرنا تھا۔ چنانچہ وہ انگریزوں سے قریب ہوئے۔ انہوں نے اپنی وفاداری ثابت کرتے ہوئے انگریز کو یہ باور کرایا کہ مسلمان ان کے لئے خطرناک ہیں۔ اس طرح ایک طرف انہوں نے مراعات حاصل کیں تو دوسری طرف انگریزوں سے بہت کچھ سیکھا۔ انہوں نے تعلیم کی طرف دھیان دیا اور معاشی اعتبار سے مضبوط سے مضبوط تر ہوتے گئے۔ مسلمانوں کا حال برعکس تھا۔ وہ بے خبری اور بدترین مایوسی میں گرفتار تھے۔ انہیں احساس ہی نہیں تھا کہ کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے اور اس کا انجام کیا ہو گا۔

سرسید احمد خاں بلاشبہ برصغیر کی سب سے بڑی شخصیت ہیں۔ وہ نہ ہوتے تو آج شاید تاریخ کچھ اور ہوتی۔ برصغیر کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔ پاکستان نہ ہوتا اور مسلمان

بھارت میں ہندوؤں کے غلام بن کر رہ رہے ہوتے۔ سرسید نے اپنوں کے ہاتھوں بڑی اذیت اٹھائی مگر اللہ کی مہربانی سے وہ مسلمانوں کو بروقت خواب غفلت سے جگانے میں کامیاب ہو گئے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا اور مسلمان تعلیم کی طرف دھیان دینے لگے۔

دوسری جنگ عظیم کے نتیجے میں انگریز کمزور پڑے اور ان کے ہندوستان چھوڑنے کی باتیں شروع ہوئیں۔ ہندوؤں کو اپنے اس خواب کی تعبیر ملتی دکھائی دی جو وہ ایک ہزار سال سے دیکھ رہے تھے' اب بھارت ماتا آزاد ہو گی اور اس پر اس کے بیٹوں کا راج ہو گا پھر وہ مسلمانوں سے گن گن کر بدلے لیں گے۔ سارا حساب چکا دیں گے۔

ہندو مکار اور کینہ پرور ہے مگر اس بار اس میں اعتماد اس بلا کا تھا کہ جو کچھ آزادی کے بعد ہونا تھا' اس نے اس کی جھلکیاں پہلے سے دکھانی شروع کر دیں۔ یہ دیکھ کر آزادی کی جدوجہد میں ان کے ساتھ شانہ بشانہ شریک مسلمان چونکے اور بری طرح چونکے۔ مستقبل کا خاکہ واضح طور پر ان کے سامنے آ گیا۔ یوں دو قومی نظریئے کا تصور پوری قوت سے ابھرا اور برصغیر کی تقسیم ناگزیر ہو گئی۔ انگریز اسے کیا روکتے کہ اکھنڈ بھارت کا خواب دیکھنے والے بھی اسے نہ روک سکے۔

ہندوؤں نے تقسیم ہند کو مجبوراً قبول کر لیا مگر اس یقین کے ساتھ کہ پاکستان چل نہیں پائے گا اور بالآخر وہ اکھنڈ بھارت کے خواب کی تعبیر پا لیں گے۔ تاہم انہوں نے اس سلسلے میں عملی اقدامات بھی کئے۔ انگریزوں سے اپنی قربت اور خوشامد کے زور پر انہوں نے تقسیم ہند میں خوب بے انصافی کرائی اور اس بات کا خاص خیال رکھا کہ پاکستان کو کسی بھی قسم کی مضبوطی میسر نہ آئے تاکہ وہ اسے جلد از جلد زیر کر سکیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ پاکستان کے حصے میں کوئی ترقی یافتہ علاقہ نہیں آیا۔ اسے سب پس ماندہ علاقے ملے۔ پاکستان کو صنعتی مضبوطی' عسکری طاقت اور اسلحہ..... کچھ بھی نہیں ملا۔ یوں ہندوؤں کے بقول لنگڑا لولا پاکستان وجود میں آیا۔

ہجرت کے دوران میں جو خوں ریزی ہوئی' اس میں بھی ہندوؤں کا کردار روایتی تھا۔ انہوں نے سکھوں کو آگے بڑھایا اور ان کے ہاتھوں مسلمانوں کا قتل عام کرایا۔ چنانچہ وہ اپنی اس کارکردگی پر مطمئن اور بے فکر تھے۔ انہیں یقین تھا کہ بہت جلد ان کا

ہندوؤں کا خواب پورا ہو گا۔

ادھر مسلمان اپنے مزاج کے مطابق آزمائش کی گھڑی میں ہمیشہ کی طرح سچے جذبوں سے سرشار تھے۔ تنکا تنکا جوڑ کر آشیانہ بنایا جا رہا تھا۔ مسلمانوں کے لئے ایک نیا قلعہ تعمیر ہو رہا تھا۔

48ء میں بھارت نے پہلی بار پاکستان کی کمزوریوں کو جانچنے کا فیصلہ کیا۔ جو کچھ ہوا' اس سے انہیں شاک ضرور لگا لیکن ان کی خوش فہمی پوری طرح دور نہیں ہوئی۔ تاہم انہوں نے ماضی کا بدلہ لینے کے لئے اپنی عیاری' مکاری اور کینہ پروری کے ہتھیار استعمال کرتے ہوئے کچھ سازشی منصوبوں پر کام شروع کر دیا تھا۔ ان کے دو ہدف تھے۔ پاکستان' اور ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمان۔ پاکستان کے بارے میں ان کے عسکری عزائم تھے۔ یہ کام آسان نہیں تھا لیکن ہندوستان میں رہنے والے مسلمان پوری طرح ان کے رحم و کرم پر تھے۔ اس کے باوجود ان کی روایتی مکاری نے انہیں اس سلسلے میں کھل کر کام نہیں کرنے دیا۔ وہ مسلمانوں کو خبردار بھی نہیں کرنا چاہتے تھے اور اقوام عالم کے سامنے برے بھی نہیں بننا چاہتے تھے۔

چنانچہ تقسیم ہند کے ساتھ ہی بھارت سیکولر ملک قرار پایا۔ یہ ایک نہایت مضحکہ خیز بات ہے۔ جس ملک کی اکثریت ان گنت دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرتی ہو' وہ سیکولر ہو سکتا ہے۔ ہندو مت کی کوئی سنجیدہ تعلیمات ہیں ہی نہیں۔ وہ تو ایک رنگین مذہب ہے' رقص' موسیقی اور جنس جس کا لازمہ ہے۔ چنانچہ اسے عقائد کے پرچار کی ضرورت ہی نہیں۔ ثقافت کی پبلسٹی کے نام پر بھارت کے ابلاغ عامہ کے ادارے یہ پرچار کرتے ہی رہتے ہیں۔ فلمیں بھی ان کا ایک اہم ہتھیار ہیں لیکن سیکولرازم کے دعووں کے باوجود جس تواتر سے مسلم کش فسادات بھارت میں ہوتے رہتے ہیں' وہ ہندوؤں کی صدیوں کی دبی ہوئی نفرت کا ثبوت ہیں مگر بھارت پھر بھی سیکولر کہلاتا ہے۔

ہندوؤں کو گن گن کر بدلے لینے تھے۔ سب حساب چکانے تھے۔ صدیوں سے مسلمانوں کے ساتھ رہنے کے وجہ سے وہ مسلمانوں کی کمزوریوں سے بھی واقف تھے اور اسلام کی مضبوطی اور اس کے شعائر کی اہمیت سے بھی آگاہ تھے۔ معاشی قوت اور معاشی کمزوری کے نتائج سے بھی وہ واقف تھے۔ انگریزوں کے دور میں ہی وہ خود طاقت

پکڑ چکے تھے اور مسلمانوں کو کمزور کرتے رہے تھے۔ یہ تجربہ پہلے ہی سے ان کے پاس تھا۔

سب سے پہلے انہوں نے ہندی کو سرکاری زبان قرار دیا۔ یہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے بہت بڑا دھچکا تھا۔ اس سے ان میں... بد دلی پیدا ہوئی۔ تعلیم کے میدان میں وہ پہلے ہی ہندو سے پیچھے تھے۔ اب اور پیچھے ہونے لگے اور مسلسل ہوتے گئے۔ یہ تو طے تھا کہ دس سال میں وہ ہندی سے بھی ہم آہنگی پیدا کرلیں گے مگر اس وقت تک وہ معاشی اور تعلیمی اعتبار سے بہت پیچھے ہو جائیں گے۔ اس وقت تک ان کا کم از کم ایک نسل کا نقصان ہو چکا ہو گا۔

مسلمان پیسے کے اعتبار سے پہلے ہی کمزور تھے۔ طبعاً" وہ تجارت پیشہ بھی نہیں تھے۔ بھارتی حکومت نے اگلے مرحلے میں ان کے لئے ملازمتوں کا حصول ناممکن بنانے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کے لئے انہوں نے بڑے اعتماد سے میرٹ کے ہتھیار کو استعمال کیا اور کامیاب رہے۔ کیونکہ مسلمان تعلیم کے میدان میں پیچھے ہوتے جا رہے تھے۔ خاص طور پر مسلمان لڑکے بہت بد دل ہو چکے تھے۔ چنانچہ مسلمان تیزی سے غربت' افلاس اور احساس کمتری کی لپیٹ میں آنے لگے۔

معاشرت اور ثقافت کے اعتبار سے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ رقص و موسیقی' جنس اور بے راہ روی ہندو مذہب کا حصہ ہے۔ ان کے ہاں پردے اور حجاب کا تصور نہیں۔ مرد اور عورت کے اختلاط میں کوئی برائی نہیں۔ ہندو مت کی اساس اخلاق پر ہے ہی نہیں۔ جبکہ اسلام اخلاقی بلندی کے اس معیار پر زور دیتا ہے جو انسان کو اعلیٰ و ارفع مقام عطا کرتا ہے۔ اسلامی شہرت کی بنیاد کنبے پر ہے۔ یہاں حیا اور پاکیزگی کی بڑی اہمیت ہے۔ گناہ اور بے راہ روی کے مقابلے میں نکاح بے حد موثر رکاوٹ ہے۔ نکاح اسلامی معاشرت کے اہم ترین ستونوں میں سے ہے۔ اسے گرا دیجئے۔ اسلامی معاشرت خود بخود ختم ہو جائے گی۔ نکاح ایک ایسی اصطلاح ہے' جسے لفظ شادی پر منطبق کرنا درست نہیں۔ شادی تو دنیا کے ہر مذہب میں ہے مگر نکاح ایک ایسا معاہدہ ہے جو صرف مسلمان مرد اور عورت یا مسلمان مرد اور اہل کتاب عورت کے درمیان ممکن ہے۔ یہ ازدواجی زندگی کا لائسنس ہے اور اس تعلق کو دنیا کا سب سے

پاک تعلق بناتا ہے۔

عیار ہندو کا اگلا سوچا سمجھا ہدف نکاح ہی تھا۔ اس کے لئے وہ گراؤنڈ ورک کر چکا تھا۔ بھارتی مسلمانوں میں لڑکوں کی تعداد لڑکیوں کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ گویا ایک عام سا عدم توازن موجود تھا جو بیشتر معاشروں میں موجود ہے لیکن وہاں لڑکیاں تعلیمی میدان میں آگے رہیں۔ ملازمتیں نہ ملنے کی وجہ سے لڑکے تعلیم سے بد دل تھے اور ابتدا ہی سے کسی ہنر کے حصول کی کوشش کرتے تھے۔ بے روزگاری کے پیش نظر والدین کی پالیسی بھی یہی تھی۔ چنانچہ لڑکے تعلیم اور معاشی دونوں اعتبار سے لڑکیوں سے کم تر ہوئے جا رہے تھے۔ یہ بدترین عدم توازن تھا۔ اس کے بدترین نتائج نکلنا تھے مگر ہندو جانتے تھے کہ شریعت ایک ایسی حد ہے' جس کو مسلمان کبھی آسانی سے نہیں پھلانگتا۔ لہٰذا یہ کام تیز رفتاری سے نہیں ہو گا مگر تھوڑا بہت بھی ہو گا تو مسلمانوں کے لئے بہت بھیانک نتائج لائے گا۔ تاریخ میں مسلمان عورتوں کے کافر مردوں سے شادی کی مثالیں موجود نہیں تھیں لیکن ہندوؤں کو یاد تھا کہ عام ہندوؤں کی تو بات ہی کچھ نہیں' غیرت مند راجپوتوں نے بھی مصلحتاً مسلمانوں کو اپنی بیٹیاں دی تھیں۔ اب وہ پہیے کو الٹا چلانا چاہتے تھے۔ بہرحال وہ ایک طویل المیعاد منصوبہ بندی کے تحت کام کر رہے تھے۔

65ء میں بھارت نے پاکستان کو ہڑپ کرنے کی غرض سے پورے اعتماد کے ساتھ فوج کشی کی لیکن منہ کی کھائی پھر بھی انہوں نے اس جنگ سے بہت کچھ سیکھا اور ہمیشہ کے لئے یاد کر لیا۔ انہوں نے جان لیا کہ تعداد اور اسلحے کی برتری کے باوجود وہ پاکستان کو میدان جنگ میں شکست نہیں دے سکتے۔ انہیں اپنے روایتی ہتھیاروں ہی سے لڑنا ہو گا۔ عیاری' مکاری اور کینہ توزی اور مسلمان جب بھی شکست کھائیں گے' اپنے ہی ہاتھوں کھائیں گے۔ انہوں نے فوری طور پر حکمت عملی تبدیل کرلی۔ انہیں نہ صرف مسلمانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا تھا۔ بلکہ ایسی کمزوریاں بھی سونپنا تھیں جو ان کے ایمان چاٹ جائیں۔ انہیں مسلمانوں کو جذبہ ایمانی سے محروم کرنا تھا۔

چنانچہ انہوں نے اپنے وزارت خارجہ کے دفتر میں پاکستان ڈیسک قائم کی اور ایک خفیہ محاذ کھول دیا۔ پروپیگنڈا اس کا خاص ہتھیار تھا۔ وہ سوچی سمجھی سمت میں نپے تلے

قدم اٹھاتے ہوئے بڑھ رہے تھے۔

65ء سے 70ء تک کا عرصہ مسلمانوں کے لئے بہت اچھا تھا۔ ان کا مورال بلند تھا۔۔۔۔ پاکستان میں بھی اور بھارت میں بھی۔ پاکستان صنعتی طور پر ایک مضبوط ملک کی حیثیت سے ابھر رہا تھا۔ اس کی ترقی اور خوشحالی کی مثالیں دی جاتی تھیں۔ بھارت کی کمر توڑ مہنگائی سے اس کا موازنہ کرکے بھارت کا مذاق اڑایا جاتا تھا لیکن بھارتی حکمران نہایت اطمینان سے اپنی نئی جنگی حکمت عملی کے تحت کام کر رہے تھے۔ مسلمانوں کو ہمیشہ عصبیت سے نقصان پہنچا تھا۔ عصبیت کی چنگاری ان کے درمیان موجود تھی۔ صرف اسے ہوا دینی تھی۔ چنانچہ بھارت کی پروپیگنڈا مشینری حرکت میں آ گئی۔ مضبوط لکڑی کے قریب دیمک چھوڑ دی گئی۔

کچھ یوں بھی تھا کہ مسلمان اپنے مزاج کے مطابق منزل پانے کے بعد' فتح حاصل کرنے کے بعد سہل پسند اور سست ہو گئے پھر فتح کے ثمرات انہوں نے ڈپلومیسی میں ناکامی کے ہاتھوں کم کر دیئے۔ انہوں نے یہ بات کبھی نہیں سمجھی تھی کہ ہر کامیابی کے بعد ذمے داری اور محنت کی ضرورت بڑھ جاتی ہے۔ وہ خواب خرگوش میں کھو گئے۔

چنانچہ 71ء کا آخر ان کے لئے تباہی لے کر آیا۔ پاکستان دو نیم ہو گیا۔ دو قومی نظریئے پر شک کیا جانے لگا۔ مسلمان قومیتوں اور گروہوں میں تقسیم ہو کر منتشر ہونے لگے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ پاکستان میں اور بھارت میں مسلمانوں کا مورال خطرناک حد تک نیچے گر گیا۔ قومی سطح پر وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے۔

بھارتی حکمرانوں نے کبھی عسکری فتح کا دعویٰ نہیں کیا۔ انہوں نے واضح طور پر کہا کہ یہ ڈپلومیسی کی فتح ہے لیکن وہ اس فتح کے بعد مسلمانوں کی طرح پرسکون ہو کر نہیں بیٹھے۔ اپنی پالیسیوں کے مثبت نتائج دیکھنے کے بعد ان کا حوصلہ اور بلند ہو گیا تھا۔ اب انہوں نے مزید ہتھیار متعارف کرانے کا فیصلہ کیا اور پاکستان پر ثقافتی یلغار کے لئے تیار ہو گئے۔

72ء کے بعد کا عرصہ وہ عرصہ تھا' جب بھارت میں ان کے اقدامات کے نتائج سامنے آنا شروع ہوئے۔ عدم توازن رنگ لایا۔ آزاد سیکولر ماحول بھی کام دکھا رہا تھا۔ مسلمان لڑکیاں اپنے سے کم تر مسلمان لڑکوں پر ہندوؤں کو ترجیح دینے لگیں۔ ہندو

ہندوؤں کا پرانا حساب برابر ہو رہا تھا۔ تاریخ میں جو کبھی نہیں ہوا تھا' اب ہو رہا تھا۔

ادھر 97ء میں یہ حال ہے کہ بھارت کے ساتھ امن اور بھائی چارے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ کشمیر محض نام کا مسئلہ رہ گیا ہے۔ پاکستان بھارتی فلموں کی سب سے بڑی منڈی بن گیا ہے۔ بچے بڑے گلی گلی بھارتی گانے گاتے پھرتے ہیں۔ جن گانوں پر بھارت میں بھی پابندی لگ جائے' وہ ہمارے ہاں بڑے فخر سے سنے جاتے ہیں۔ ہندی الفاظ کثرت سے استعمال کئے جانے لگے ہیں۔ پی ٹی وی کے ڈرامے میں لفظ رکھیل استعمال کیا جاتا ہے۔ اخلاقی گراوٹ عام ہو گئی ہے۔

دو باتیں واضح ہیں' جنہیں کوئی نہیں سمجھ رہا ہے۔ نہ عوام' نہ ارباب اقتدار۔ پہلی یہ کہ بھارت کبھی میدان میں جنگ نہیں لڑے گا۔ وہ اب پاکستان پر فوج کشی نہیں کرے گا۔ اتنی ہمت ہوتی تو وہ اسلحے کی برتری کے زعم میں اب تک ایسا کر چکا ہوتا اور اگر وہ یہ غلطی کرے گا تو انشاء اللہ اس بار بہت بڑا نقصان اٹھائے گا لیکن وہ ہمارے ساتھ حالت جنگ میں ہے اور ہمیں احساس بھی نہیں۔ ہم شکست کھائے جا رہے ہیں۔ خود کو کمزور کئے جا رہے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ اس بار اسلام اور کفر کی جنگ برصغیر میں ہو گی۔ مسلمانوں کا دشمن نمبر ایک مغرب نہیں' ہندو ہیں۔ ارباب اختیار کو اندر کی گندی سیاستیں چھوڑ کر ملک کے سیاسی' معاشی اور اخلاقی استحکام کے لئے کوشش کرنی چاہئے۔ ورنہ نہ تو انہیں تاریخ معاف کرے گی' نہ اللہ معاف کرے گا۔ ان کے حصے میں روسیاہی کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔ ہمیں ہر لمحہ خود کو حالت جنگ میں سمجھنا ہو گا۔ جہاد ہمارا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ جسمانی بھی اور نفسانی بھی۔ ہم جہاد سے منہ موڑیں گے تو اللہ ہم سے منہ موڑے گا۔

ارباب اختیار اور عوام یاد رکھیں کہ اگلے معرکے میں فتح مٹھی بھر مسلمانوں کی ہو گی۔ گویا اس اسلامی ریاست میں بھی مسلمان مٹھی بھر رہ جائیں گے۔ اگر ہم غور کریں تو اس وقت بھی یہی صورت حال ہے۔ نام کے مسلمان تو کروڑوں میں ہیں مگر شاید سچ کے مسلمان لاکھوں میں بھی نہ ہوں۔ ہر شخص کو کوشش کرنی چاہئے کہ بوقت امتحان وہ بھی ان مٹھی بھر مسلمانوں میں شامل ہو۔ اللہ سے ہدایت مانگتے رہئے۔ بھارتی فلموں

کے نقش قدم پر نہ چلیے۔ ہمارا راستہ اور ہے۔ بھارت سے کبھی دوستی اور بھلائی کی توقع نہ رکھیے۔ یہودیوں کی طرح تاریخ کے آئینے میں اپنی کمزوریوں اور شکست کے اسباب کو دیکھیے اور انہیں دور کیجیے۔

یہاں پہنچ کر مجیب انور نے قلم روکا اور اپنے لکھے ہوئے کو پڑھا۔ اسے اس عبارت کو اپنی کہانی میں جا بجا بکھیرنا اور پھیلانا تھا۔ اسے امید تھی کہ باقاعدہ لکھتے ہوئے یہ سب اور اثر انگیز ہو جائے گا۔

اچانک اسے خیال آیا کہ اصل چیز تو رہ ہی گئی۔ اس بے نام لڑکی کی اپیل۔ یہ درست ہے کہ بھارت میں مسلمان لڑکیوں کے رشتے کا مسئلہ بہت سنگین ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ پاکستانی مسلمانوں کو اس طرف دھیان دینا چاہیے اور بھارتی مسلمان لڑکیوں کو اپنانا چاہیے۔ یہ بھی بجا کہ اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے۔ لیکن معاشی بدحالی کے باعث بعض اوقات یہاں مرد کو ایک شادی ہی دشوار ہو جاتی ہے۔ اس کی اپنی مثال سامنے تھی۔ وہ اچھی آمدنی والا تھا مگر دوسری شادی تو نہیں کر سکتا تھا۔

تو پھر اس مسئلے کا کیا حل تھا؟ وہ سوچتا رہا۔ ایک ہی بات سمجھ میں آتی تھی۔ مسئلے کا حل ہندوستانی لڑکیوں ہی کے پاس تھا۔ وہ ایک خاص قسم کی صورت حال سے دوچار تھیں۔ انہیں عام انداز میں سوچنے سے گریز کرنا چاہیے تھا۔ انہیں جوڑ اور بے جوڑ کو نظر انداز کر کے صرف یہ ذہن میں رکھنا چاہیے تھا کہ بدترین مسلمان بہترین کافر سے ہزار درجے بہتر ہے۔ کیونکہ اس کے ساتھ نکاح ہو سکتا ہے۔ وہ مسلمان لڑکوں کو مسترد کر کے بدترین گناہ کی مرتکب ہو رہی تھیں۔ وہ خود کو گناہ کا بہت آسان ہدف بنا رہی تھیں۔ ایسے میں گمراہی بہت آسان ہو جاتی ہے۔

اب وہ مطمئن ہو گیا تھا کہ مستقبل میں وہ یہ کہانی لکھ سکتا ہے۔ اس نے زیر قلم کہانی پر دھیان دیا۔ ذہن سے بوجھ ہٹ گیا تھا۔ اب قلم بڑی روانی سے چل رہا تھا۔



شادی کے ہنگامے اپنے عروج کو پہنچ کر دم توڑ گئے تھے۔ ابھی سلمیٰ کی رخصتی کو صرف چند منٹ ہوئے تھے اور گھر سناٹے میں ڈوبا لگ رہا تھا۔ حالانکہ ابھی تمام مہمان رخصت بھی نہیں ہوئے تھے۔ اب بھی اچھا خاصا ہنگامہ تھا مگر گزشتہ ہفتے کے ہنگامے کے سامنے تو وہ سناٹا ہی تھا۔

صفورہ نے گہری سانس لی۔ اس کا دل اداس تھا۔ خوشی کے باوجود۔ بعض خوشیاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ اپنے ساتھ اداسی بھی لاتی ہیں۔ سلمیٰ اس کی چھوٹی بہن ہی نہیں سہیلی بھی تھی۔ ابھی وہ رخصت ہوئی تھی اور صفورہ کو ابھی سے اکیلے پن کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ آگے تنہائی کیسے کیسے ستائے گی۔

"ناظورہ بیگم۔۔۔ برتن اور دوسری چیزیں ابھی سے ٹھیک کر کے رکھ دو۔ ڈیکوریشن والا صبح ہی آ جائے گا۔"

یہ ابا کی چہکتی ہوئی آواز تھی۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ ابا اماں سے مخاطب تھے۔ اماں کے چہرے پر اداسی اور آنکھوں میں بھیگی بھیگی چمک تھی لیکن ابا کے چہرے پر خوشی اور طمانیت تھی۔ لہجے میں بھی چہکار تھی۔

عزت کے سر پر لٹکتی ہوئی دو تلواروں میں سے ایک تو کم ہوئی۔ صفورہ نے دل میں سوچا۔ اب ابا کچھ عرصے تو پرسکون رہیں گے۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر مہمان چلے گئے اور گھر واقعی سناٹوں سے بھر گیا۔ جیسے جشن چراغاں کے بعد روشنی بھی تاریکی لگتی ہے۔ ویسے ہی ہنگاموں کے بعد رونق ایک دم غائب ہو جاتی ہے۔ گھر کی چھوٹی چھوٹی آوازیں بھی سناٹے کا حصہ لگنے لگتی ہیں۔

وہ اماں کے ساتھ مل کر گھر سمٹوانے میں لگی۔ ڈیکوریشن کا سامان گن کر ایک طرف رکھ دیا گیا۔ اس کے بعد سب اپنے اپنے بستر پر ڈھیر ہو گئے لیکن جسم بہت زیادہ تھک جائے تو نیند آسانی سے نہیں آتی۔

صفورہ کو یاد آیا کہ پاکستان سے ایک پارسل آیا ہوا تھا' جسے اس نے کھول کر بھی نہیں دیکھا۔ اس نے الماری کھول کر پارسل نکالا۔ وہ صابر بھائی کی طرف سے آیا تھا۔ اس نے لفافہ چاک کیا۔ اندر سے ماہنامہ کاجل کا شمارہ نکلا۔ لوح پر نظر پڑتے ہی صفورہ کو حیرت ہوئی۔ وہ کاجل نہیں پڑھتی تھی اور صابر بھائی۔ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے پھر انہوں نے یہ اسے خاص طو پر کیوں بھیجا۔

مگر سرورق پر جیسے ہی نظر نیچے کی طرف گئی' اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ اسے صابر بھائی پر بے تحاشا پیار آیا۔ اس سے اچھا کوئی تحفہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کا دل ان کے لئے شکرگزاری کے احساس سے بھر گیا۔

سرورق پر جلی حروف میں لکھا تھا.... مشہور مصنف مجیب انور کا تفصیلی انٹرویو اندر ملاحظہ فرمائیں۔

اس نے بے تابی سے فہرست نکال کر اس میں انٹرویو کا صفحہ نمبر دیکھا اور پھر انٹرویو نکالا۔ چند لمحوں بعد وہ انٹرویو میں گم ہو چکی تھی۔

"تم ویسے ہی نکلے' جیسا میں نے سوچا تھا۔" انٹرویو پڑھنے کے بعد اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

اسی وقت اس نے وہ انٹرویو دوبارہ پڑھا۔ اس کے کئی حصے تو اس نے بار بار پڑھے۔ تصویر کی کمی اسے بہت بری طرح محسوس ہوئی تھی۔ اتنے بھرپور انٹرویو کے ساتھ تو تصویر چھاپنی ہی چاہئے تھی۔

اس نے ڈائجسٹ ایک طرف رکھا اور مجیب انور کے بارے میں سوچنے لگی۔ اس شخص کا قرب کس قدر سحرانگیز ہو گا۔

دوسرے کمرے سے آنے والی ابا کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ "اب چلنے کی تیاری کر لو۔" وہ اماں سے کہہ رہے تھے۔

"تو کیا فوراً؟" اماں نے پوچھا۔

"بھئی ویزا تو موجود ہے پھر بھی نکلنے میں وقت تو لگے گا۔ میں نے اشفاق سے کہہ دیا تھا کہ ہم شادی کے پندرہ دن بعد چلے جائیں گے۔ یوں ڈیڑھ مہینہ تو مل ہی جائے گا۔"

"ابھی تو وقت پڑا ہے۔"

"کچھ خریداری وغیرہ بھی کر لو۔"

"رضوان بھی جائے گا؟" اماں نے پوچھا۔

"وہ بھی گیا تو دکان کون سنبھالے گا۔" ابا بولے "پچھلی بار وہ گیا تھا۔ اب کے میں جاؤں گا۔"

کچھ دیر خاموشی رہی پھر ابا نے کہا "ہاں.... اس بار فرقان بھی ہمارے ساتھ جائیں گے۔ انہیں بھی ویزا مل گیا ہے۔"

"اکیلے؟"

"نہیں بھئی۔ بھابی اور چاروں بچیاں بھی ساتھ ہوں گی۔"

"غفران پر بہت بوجھ پڑ جائے گا۔" اماں نے فکر مندی سے کہا۔

صفورہ کی خوشی کی کوئی حد نہیں تھی۔ وہ پاکستان جا رہی تھی.... مجیب انور کے دیس۔ کیا پتہ وہاں اس سے ملاقات ہی ہو جائے مگر یہ سوچ کر اس کا دل بجھ گیا کہ ان کا قیام لاہور میں ہو گا۔ جبکہ مجیب کراچی میں رہتا ہے۔

پھر بھی.... کون جانے۔ دنیا میں ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس نے چپکے سے سوچا۔ اسے خیال بھی نہیں تھا کہ یہ سوچ کس قدر سچی ہے۔ مجیب انور سے اپنی ممکنہ ملاقات کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

خواب میں وہ اس کا منتظر تھا!



وہ دوپہر کا کھانا کھا کر اٹھے ہی تھے کہ مجیب نے بچوں سے کہا۔ "لاؤ بھئی' اپنی اپنی کاپیاں چیک کراؤ۔"

بچے خوشی خوشی اپنے بستوں کی طرف دوڑ گئے۔ برتن سمیٹتے ہوئے سحاب مسکرا دی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ کہانی مکمل ہو گئی ہے۔ اب مجیب کم از کم دو دن خود کو آزاد محسوس کرے گا اور بچوں میں ہی گھسا رہے گا۔

مجیب نے بچوں کی ہوم ورک اور کلاس ورک کی کاپیاں چیک کیں اور ان پر تبصرے کرتا رہا۔ "واہ بھئی' گڈ تو بہت ملتے ہیں تم لوگوں کو۔"

"پھر تو ابو ہمیں انعام ملنا چاہئے۔" حامد بولا۔

"منہ مانگا انعام۔" شاہد نے ٹکڑا لگایا۔

"بالکل ٹھیک۔ انعام منہ مانگا ہی ملے گا۔" مجیب نے کہا۔ "بولو۔ کیا چاہئے۔"

"میں تو کہانی سنوں گی۔" عالیہ نے اس کی گود میں چڑھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ رات کو کہانی سنائیں گے۔"

"نہیں ابو۔ ابھی سنائیں۔"

"دن میں کہانی نہیں سناتے۔" شاہد نے بزرگانہ انداز میں کہا۔ "مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔"

"مسافر نہیں' ماموں۔" حامد نے جلدی سے تصحیح کی پھر اضافہ کیا "شفیق ماموں۔"

مجیب کو ہنسی آ گئی۔ اس نے عالیہ سے کہا "تمہارے بھائی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ کہانی رات کو ہی سنائی جاتی ہے۔" پھر وہ شاہد اور حامد کی طرف متوجہ ہوا "اور اب تم دونوں بھی مانگو۔"

دونوں بچے سوچ میں پڑ گئے۔ شاہد جلد باز تھا۔ انتظار کا قائل نہیں تھا۔ فوری طور پر انعام چاہتا تھا۔ وہ بولا "میں آپ کے ساتھ کیرم کھیلنا چاہتا ہوں۔"

"او کے اور تم؟" مجیب حامد سے مخاطب ہوا۔

"آپ آج مجھے چکن کھلانے لے چلئے۔" حامد نے کہا "اور ہاں۔ میں فالودہ بھی کھاؤں گا۔"

شاہد کا چہرہ اتر گیا۔ یہ انعام تو اس نے جان بوجھ کر نہیں مانگا تھا۔ حالانکہ دل بھی چاہا تھا مگر اس نے سوچا' رات تک کون انتظار کرے اور اب حامد نے یہ انعام مانگ لیا تھا "تو ٹھیک ہے۔ ہم تمہیں اپنے ساتھ کیرم نہیں کھلائیں گے۔" اس نے جل کر حامد سے کہا۔

حامد کو افسوس ہونے لگا۔ کیا اب وہ بیٹھ کر انہیں کھیلتے دیکھے گا۔ یہ تو بہت برا ہوا "چلو ٹھیک ہے۔" اس نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

"میں تمہیں ہمیشہ بتاتا ہوں کہ مل کر رہنے میں فائدہ ہے۔" مجیب نے بچوں سے کہا "تم لوگ سمجھتے ہی نہیں۔"

بچے اسے مستفسرانہ نظروں سے دیکھتے رہے۔

"اگر تم لوگ مل کر رہو تو تم میں سے ہر ایک کو آج تین تین انعام مل سکتے ہیں۔"

"وہ کیسے ابو؟"

"پہلے تم تینوں میرے ساتھ کیرم کھیلو گے۔ ایک انعام ہوا پھر تمہیں میں چکن اور فالودہ کھلانے لے جاؤں گا۔ یہ دوسرا انعام ہوا اور رات کو سوتے وقت تینوں کو کہانی سناؤں گا۔ یعنی تیسرا انعام اور ہر ایک کو تین تین انعام ملیں گے۔"

"واؤ۔" شاہد نے نعرہ لگایا۔ "یہ ٹھیک ہے۔ میں حامد اور عالیہ کو اپنے ساتھ کیرم کھلاؤں گا۔"

"اور میں بھائی اور عالیہ کو دعوت پر لے چلوں گا۔"

وہ کیرم کھیلنے بیٹھ گئے۔ عالیہ مجیب کی ساتھی تھی۔ اسے کھیلنا نہیں آتا تھا "یہ چڑیل تو آپ کو ہروا رہی ہے ابو۔ اسے کھیلنا نہیں آتا۔" شاہد نے کہا۔

"پہلی بات تو یہ کہ اسے غور سے دیکھو۔ یہ چڑیل نہیں' بہت خوب صورت شہزادی ہے اور تمہاری بہن ہے۔" مجیب نے مسکراتے ہوئے کہا "دوسری بات یہ کہ کھیلتی رہے گی تو اسے کھیلنا بھی آ جائے گا۔ شروع میں تمہیں بھی تو نہیں آتا تھا۔"

مولوی صاحب کے آنے تک وہ کیرم کھیلتے رہے پھر بچے مولوی صاحب سے پڑھنے کے لئے بیٹھ گئے۔

رات کو باہر کھانا کھا کر وہ لوگ واپس آئے تو بچے تھک کر نڈھال ہو چکے تھے۔ کہانی سننے کے دوران میں ہی وہ سو گئے۔ مجیب آنکھیں موندے کہانی سنائے جا رہا تھا۔ سحاب نے اسے ٹوکا "کسے کہانی سنا رہے ہیں۔ بچے تو سو چکے ہیں۔"

مجیب نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ شاہد اس سے لپٹ کر سو چکا تھا۔ حامد اور عالیہ سحاب سے لپٹے ہوئے تھے "اوہ۔ بہت تھک گئے تھے نا؟" اس نے کہا۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر سحاب نے پوچھا "کہانی مکمل ہو گئی؟"

"ہاں۔ تم علامات سے بھی نہیں سمجھیں۔"

"سمجھ تو گئی تھی مگر کبھی کبھی آپ درمیان میں بھی تو بچوں کو وقت دے دیتے

ہیں۔"

"سحاب' میں سوچ رہا ہوں کہ نئی کہانی شروع کرنے سے پہلے لاہور ہو آؤں۔ یہ کتابوں کی پبلشنگ کا معاملہ بھی نمٹا لیا جائے۔"

"ضرور ہو آئیں۔ کچھ ہلکے بھی ہو جائیں گے۔"

"صرف تین دن رکوں گا۔" مجیب نے کہا پھر کچھ سوچنے کے بعد بولا "مگر میں اکیلا تو نہیں جا سکتا۔ کیسے رہ سکوں گا میں؟"

سحاب ہڑبڑا گئی "کیا مطلب ہے آپ کا؟ میں تو نہیں چل سکتی آپ کے ساتھ۔"

"کیوں نہیں چل سکتیں؟" مجیب نے بچوں کے سے انداز میں کہا۔

"بھئی بچوں کے اسکول کا مسئلہ ہے۔ ابھی تو اسکول کھلے ہیں۔"

"ہاں' یہ تو ہے۔" مجیب نے فکر مندی سے کہا پھر ذرا دیر بعد بولا "اچھا' ایسا ہے کہ میں شاہد کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"سب سے زیادہ حرج اس کی پڑھائی کا ہو گا۔"

"میں اس کے بغیر رات گزار بھی تو نہیں سکتا۔"

"آپ سے زیادہ اسے کمی محسوس ہو گی۔" سحاب نے کہا "لیکن بھئی' عادت تو چھوٹنی چاہئے۔ آدمی کو بیساکھی کا عادی نہیں ہونا چاہئے اور دیکھ لیجئے گا' شاہد آپ کو مس تو کرے گا لیکن سمجھوتہ کر لے گا۔"

"مگر میں نہیں کر سکتا۔ تم جانتی ہو......"

"بچے نہ بنیں۔ اپنے خوف سے لڑیں گے نہیں تو یہ خوف آپ پر مسلط رہے گا عمر بھر۔"

"بہت لڑتا ہوں مگر ہار جاتا ہوں۔ میں اکیلا رات نہیں گزار سکتا۔"

"تو تنہائی دور کر لیجئے گا۔" سحاب نے شوخ لہجے میں کہا "سنا ہے ہوٹلوں میں رات کے ساتھی بھی مل جاتے ہیں۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو؟" مجیب نے بگڑ کر کہا۔

"برے معنوں میں نہیں کہہ رہی ہوں۔ بھئی آپ کی مجبوری ہے' ضرورت ہے تو پھر کیا حرج ہے اس میں۔ آپ عیاشی کرنے والے تو نہیں ہیں نا۔"

مجیب اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے بہت غور سے سحاب کو دیکھا۔ "تمہیں برا نہیں لگے گا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں آپ کی ضرورت کو سمجھتی ہوں اور مجھے آپ سے محبت ہے۔" سحاب نے کہا پھر ہنسنے لگی۔

"ہنس کیوں رہی ہو؟" مجیب ذرا جھنجلا گیا۔

"اگر آپ یقین دلا دیں کہ آپ دوسری بیوی سے محبت نہیں کریں گے تو میں خود آپ کی دوسری شادی کروا سکتی ہوں۔" اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

مجیب بھی سنجیدہ ہو گیا۔ "میں دوسری شادی کرنے والا ہوں نہیں لیکن اگر ہوئی تو محبت بھی کروں گا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ بیوی سے محبت نہ ہو۔"

"بس تو میں باز آئی۔" سحاب نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا "میں یہ تصور بھی گوارا نہیں کر سکتی کہ آپ کسی اور سے محبت کریں۔"

چند ہی لمحوں میں مجیب سو گیا۔ سحاب جاگتی رہی۔ وہ یہ سوچ کر الجھ رہی تھی کہ کہیں اس کے منہ سے کوئی غلط بات تو نہیں نکل گئی مگر پھر وہ یہ سوچ کر مطمئن ہو گئی کہ اس نے مجیب کو نفسیاتی مضبوطی فراہم کر دی ہے۔ اب شاید اکیلے میں وہ خوف زدہ نہیں ہو گا۔ یہ چیز تو دور ہو جانی چاہئے۔ اگرچہ ایسا کوئی امکان نہیں مگر پھر بھی کبھی ایسا ہو سکتا ہے کہ مجیب کو طویل عرصے گھر سے دور رہنا پڑے۔

اس وقت اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ ایسا ہونے والا ہے!



جانے والی ٹرینوں میں بہت رش تھا۔ مجیب کو ایک ہفتے بعد کی ریزرویشن ملی.... اور وہ بھی شالیمار کی۔ وہ نائٹ ایکسپریس سے جانا چاہتا تھا تاکہ دن میں ہی لاہور پہنچ جائے لیکن اب اسے رات کو پہنچنا تھا۔ وہ لاہور میں اپنی تنہائی کے بارے میں سوچنے سے بچ رہا تھا۔ اب ہر رات سوتے وقت وہ شاہد کو پہلے سے زیادہ مضبوطی سے پکڑ لیتا اور سونے کے دوران میں بھی اس سے لپٹا رہتا۔ سحاب دیر سے سوتی تھی.... اور پھر بچوں پر رضائی ڈالنے کے لئے بار بار جاگتی تھی۔ وہ یہ سب کچھ دیکھتی اور اسے مجیب پر ترس آنے لگتا۔

سفر سر پر سوار ہو تو ایسے میں وہ کام کر ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے تو بس روانگی کا انتظار تھا۔

روانگی میں ابھی دو دن تھے۔ وہ لاؤنج میں بیٹھا بچوں کے ساتھ کارٹون دیکھ رہا تھا کہ اطلاعی گھنٹی بجی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے ایک اجنبی چہرہ تھا۔ آنے والے کی عمر 30 اور 35 کے درمیان تھی لیکن چہرے پر عجیب سی معصومیت اور انداز میں کھلنڈرا پن تھا۔ مجیب نے ایک نظر میں یہ سب کچھ دیکھا "جی۔۔۔ فرمائیے؟"

"مجیب انور صاحب؟" آنے والے کی آواز بھی لڑکوں کی سی تھی۔

"جی۔۔۔ میں ہی ہوں۔"

"میرا نام ایوب ساغر ہے۔ میرا تعلق این ٹی ایم سے ہے۔ میں وہاں اسسٹنٹ پروڈیوسر ہوں۔"

مجیب نے ایک بار پھر اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ اسے کہیں سے پروڈیوسر نہیں لگ رہا تھا "آیئے۔۔۔ تشریف لائیے۔" اس نے کہا۔

وہ اسے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ سحاب سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اسے یقین تھا کہ اب تک اس نے چائے کا پانی رکھ دیا ہو گا "اب فرمائیے۔" اس نے ایوب سے کہا۔

"میں آپ کی ایک کہانی پڑھ کر یہاں آیا ہوں۔" ایوب ساغر نے کہا پھر وہ دیر تک کہانی کی شان میں رطب اللسان رہا۔

مجیب کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کس کہانی کی ہو رہی ہے۔ "مجھے کہانی کا نام تو بتائیے۔" اس نے کہا۔

"اوہ۔۔۔ یہ خیال ہی نہیں آیا مجھے۔" ایوب نے شرمندگی سے کہا "یہ کہانی مجھے انتہائی ایکسائیٹڈ کر دیتی ہے۔ اس کہانی کا نام ہے جناب۔ قرض جاں۔"

مجیب حیران رہ گیا۔ اس نے اپنی کئی کہانیوں کو ڈرامائٹائز کرنے کا سوچا تھا۔ قرض جاں کا بھی اسے ایک بار خیال آیا تھا مگر اس نے یہ سوچ کر اسے ذہن سے نکال دیا تھا کہ اس کہانی پر کون ڈراما بنانے کی ہمت کرے گا۔ اس کا تو اسکرپٹ لکھنا بھی آسان نہیں تھا۔

بہرحال اس نے فوری طور پر اس شخص کے بارے میں اپنی رائے تھوڑی سی تبدیل کر لی۔ کوئی عام پروڈیوسر ڈرامے کے لئے اس کہانی کو پسند نہیں کر سکتا "آپ کو اندازہ ہے کہ ڈرامے کے نقطہ نظر سے یہ کہانی آسان نہیں ہے؟" اس نے کہا۔

"جی ہاں' میں جانتا ہوں کہ یہ کام بہت مشکل ہے مگر میں مشکل پسند ہوں۔" ایوب نے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"صرف مشکل پسند ہونے سے مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔"

ایوب ساغر کا چہرہ تمتما اٹھا "سر' میں دس سال سے اس فیلڈ میں ہوں۔ میرے اندر کام کی لگن ہے۔ این ٹی ایم کے لئے کام کرتے ہوئے میں نے پی ٹی وی کے ہر بڑے پروڈیوسر کو اسسٹ کیا ہے اور میرا مشاہدہ بہت اچھا ہے۔ میں نے ہر پروڈیوسر کی فنی خوبیوں اور خامیوں' دونوں کو بہت غور سے دیکھا ہے۔ خوبیوں کو اپنانے کی اور خامیوں سے بچنے کی کوشش کی ہے۔"

"لیکن آپ نے خود تو کچھ نہیں کیا ابھی۔" مجیب نے اعتراض کیا۔

"ابھی حال ہی میں ایک سیریل مکمل کی ہے میں نے۔" ایوب ساغر نے کہا "کہنے کو میں اس میں بھی اسسٹنٹ ہوں لیکن 80 فیصد کام میں نے کیا ہے۔ یہاں تک کہ ایڈیٹنگ بھی۔ پروڈیوسر صاحب کسی بات پر روٹھ گئے تھے۔ انشاء اللہ اگلے مہینے تک یہ سیریل آن ائر چلا جائے گا۔" اس کے ہاتھ میں جو رجسٹر تھا' وہ اس نے مجیب کی طرف بڑھایا "شاید اس سے آپ کو اندازہ ہو سکے۔"

مجیب نے رجسٹر کھول کر دیکھنا شروع کیا اور متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس میں کنٹی نیوٹی' سین ڈویژن' شاٹ ڈویژن' دن اور رات کے مناظر' سیٹ کے اعتبار سے' کرداروں کے اعتبار سے منظر ناموں کی تقسیم تھی۔ وہ ہر اعتبار سے ایک مکمل کام تھا اور کام کرنے والے کی کمانڈ کو ثابت کرتا تھا۔

مجیب نے رجسٹر بند کر دیا۔ اب وہ صحیح معنوں میں اس جوان شخص سے متاثر ہوا تھا "مجھے تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔"

"شکریہ سر۔" ایوب ساغر نے شرمیلے پن سے کہا۔

"تمہارے نام میں یہ ساغر کیوں لاحق ہوا ہے ایوب؟" مجیب نے اچانک کہا۔

"وہ سر' لڑکپن میں ٹوٹے پھوٹے شعر کہتا تھا۔ تخلص بھی رکھ لیا۔ شعر کہنا تو برسوں پہلے چھوٹ گیا۔ تخلص اب بھی چل رہا ہے۔" ایوب نے شرمیلے لہجے میں کہا۔ شرمیلا پن اس کی فطرت کا حصہ معلوم ہوتا تھا "تو پھر کیا خیال ہے سر؟"

"مجھے تفصیل سے بتاؤ۔"

"یہاں ایک کروڑپتی صنعت کار ہیں۔ خلیل نواز۔ انہوں نے اپنا اسٹوڈیو بنایا ہے' ایکوئپمنٹ خریدا ہے اور باقاعدہ ٹی وی پروڈکشن کا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ پروڈیوسرز میں انہوں نے اب تک صرف مجھے ہائر کیا ہے۔ آپ کی کہانی میں انہیں سنا چکا ہوں۔ انہوں نے منظوری دے دی ہے۔" وہ کہتے کہتے رکا "ایک بات کی میں یقین دہانی کرا سکتا ہوں۔ آپ کو منہ مانگا معاوضہ اور وہ مراعات ملیں گی' جن کا پی ٹی وی کے لئے کام کرتے ہوئے تصور بھی نہیں کر سکتے اور ادائیگی بلا تاخیر ہو گی۔"

ذرا دیر میں معاوضہ بھی طے پا گیا اور معاہدے کی شقوں کے متعلق بھی طے کر لیا گیا "اب ذرا مراعات کے متعلق تو بتاؤ مجھے۔" مجیب نے کہا۔

"آپ کی کہانی کا ماحول مری کے گرد و نواح کا ہے۔ خلیل صاحب کا مری میں بہت بڑا بنگلا موجود ہے۔ آپ جتنا چاہیں' وہاں قیام کر سکتے ہیں۔ چوکی دار بھی موجود ہے اور خانساماں بھی۔"

"مگر اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"ضرورت تو ہے سر۔ لوکیشن سامنے رکھ کر لکھیں گے تو ہمیں ریکارڈنگ میں آسانی ہو گی پھر وہاں کام کرنے کا لطف ہی اور ہو گا۔"

یہ ترغیب مجیب کے لئے بہت بڑی تھی۔ مری میں شاہانہ قیام! "مجھے منظور ہے۔" اس نے کہا "مگر پرسوں میں ایک ضروری کام سے لاہور جا رہا ہوں۔ تین دن بعد لوٹ آؤں گا۔"

"ٹھیک ہے سر۔ میں آئندہ ہفتے آؤں گا۔ اسکرپٹ کے سلسلے میں تجاویز لکھ کر لاؤں گا۔ میرا خیال ہے' ہم لوگ پوری کہانی ڈسکس کر لیں گے۔ کچھ تبدیلیاں میں چاہتا ہوں۔ آپ ان پر غور کر لیجئے گا۔ آخری فیصلہ تو آپ کا ہی ہو گا۔ میرا اندازہ ہے کہ اگلے ماہ آپ مری جانے کی پوزیشن میں ہوں گے۔"

مجیب انور کے لئے یہ بات زیادہ خوشی کی تھی کہ اسکرپٹ کے معاملے میں اسے اتھارٹی تسلیم کیا جا رہا ہے اور وہ آزادانہ کام کر سکے گا۔ "ٹھیک ہے ایوب۔" اس نے کہا۔



صبح بہت سویرے اسٹیشن پہنچنا تھا۔ شاہد کو بہلانا مشکل ہو گیا۔ وہ بار بار یہی کہے جا رہا تھا۔ "ابو' آپ کے بغیر میں کیسے سوؤں گا۔ حامد اور عالیہ تو سو گئے لیکن وہ جاگتا رہا۔ اس کی محبت دیکھ کر مجیب کا دل بھر آیا۔ اسے یہ سفر برا لگنے لگا۔

صبح وہ تیار ہوا۔ اتوار کا دن تھا۔ بچے دیر تک سوتے تھے۔ اس نے سوتی ہوئی عالیہ اور حامد کو پیار کیا۔ شاہد کو لپٹا لیا تو وہ رونے لگا "ابو.... مجھے بھی ساتھ لے چلئے۔"

"بیٹے.... وہ ضد نہیں کرتے جو مانی نہ جائے۔" سحاب نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

"میں تمہارے لئے اڑنے والا جہاز اور کھلونا ٹرین لاؤں گا۔" مجیب نے کہا۔

شاہد چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا "ابو.... وہاں کتابیں بھی ملتی ہیں؟"

"کتابیں؟ کتابیں بہت۔" مجیب نے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

"کہانی کی کتابیں؟" شاہد کے لہجے میں شک تھا۔

"ہاں بیٹے' کہانی کی کتابیں بھی۔"

شاہد کی آنکھیں چمکنے لگیں "بس تو آپ وہاں سے میرے لئے کہانی کی بہت سی کتابیں لائیے گا۔"

"ضرور مگر ایک شرط ہے۔ تم روؤ گے نہیں' امی کو پریشان نہیں کرو گے۔ بلکہ میرے پیچھے امی کا خیال رکھو گے۔"

"پرامس ابو۔" شاہد نے معصومیت سے ہاتھ بڑھایا۔ مجیب نے اس کا ہاتھ تھام کر چوم لیا۔

نیچے سے ہارن کی آواز سنائی دی۔ ٹیکسی والا مقررہ وقت پر اسے لینے آ گیا تھا "اچھا بھئی' اللہ حافظ۔" اس نے بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔

سحاب اور شاہد اسے رخصت کرنے نیچے تک آئے۔



سرحد پار کر کے پاکستان کی حدود میں داخل ہوتے ہی مسافروں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ صفورہ کو سب سے پہلے مجیب انور کا خیال آیا۔ اس نے گہری گہری سانسیں لیں۔ یہ وہ سرزمین تھی' جہاں وہ رہتا تھا۔ اس شہر میں نہ سہی' جہاں وہ جا رہی تھی مگر تھا تو وہ اسی ملک میں اور کون جانے' اس سے ملاقات ہو ہی جائے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی مجیب انور کے بارے میں سوچتی رہی۔ ابا کہہ تو رہے تھے کہ کراچی بھی شاید جائیں۔ اگر لاہور سے اجازت مل گئی تو...... اس صورت میں وہ ڈائجسٹ کے دفتر فون کر کے اس کا پتہ لے لے گی۔

مگر اس نے خود ہی اس خیال کو رد کر دیا۔ وہ اسے ایسے خط لکھ چکی تھی۔ اس کے گھر کیسے جا سکتی ہے۔ یہ تو ممکن ہی نہیں۔ ہو سکتا ہے' مجیب انور نے اس کے خط اپنی بیوی کو بھی پڑھوا دیئے ہوں۔ اس نے انہیں کہاں اہمیت دی ہو گی۔ اس کے پاس تو ایسے خطوط آتے ہی رہتے ہوں گے۔

اب تک اس نے ایک بار بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کے خطوط پر مجیب کا کیا رد عمل ہوا ہو گا۔ یہ حیرت انگیز بات تھی۔ بلکہ اب اس بارے میں سوچتے ہوئے یہ اسے خاصا غیر فطری لگا۔ کیا اس نے محض اپنی بھڑاس نکالنے کی لئے خط لکھا تھا۔ اس لئے کہ اسے کسی مثبت رد عمل کی توقع تو نہیں تھی۔

وہ مایوس ہو گئی۔ وہ تو ایک خواب ہے' جس کی تعبیر ملتی ہی نہیں ہے۔ یہ الگ بات کہ وہ اس سے محبت کرنے پر مجبور ہے اور ہمیشہ کرتی رہے گی اور کیا ضروری ہے کہ زندگی میں محبت کا جواب بھی ملے۔

وہ سوچتی رہی۔ ابا نے اور سب لوگوں نے سرحد پار کرتے ہی گھڑیاں آدھا گھنٹہ پیچھے کر لی تھیں۔ صفورہ مسکرانے لگی۔ پچھلی بار بھی اس نے یہی سوچا تھا کہ پاکستان آ کر زندگی میں آدھا گھنٹہ بڑھ جاتا ہے۔ کون کہتا ہے کہ گیا وقت نہیں آتا۔ آتا ہے۔ ہندوستان سے پاکستان جا کر دیکھو۔ جو آدھا گھنٹہ میں نے وہاں گزارا تھا' وہ مجھے پھر سے گزارنے کا موقع مل رہا ہے۔ پچھلی بار بھی اس کا جی چاہا تھا کہ سرحد پار کرتے ہی وہ ٹرین میں سفر کرنے کے بجائے یہ آدھا گھنٹہ کسی گلشن میں گزارے۔ پوری طرح

استفادہ کرے اس وقت سے لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔

مگر یہی خوشی ہندوستان واپس جاتے ہوئے اداس کر دیتی تھی۔ زندگی میں آدھا گھنٹا کم ہو جاتا تھا۔ وہ آدھا گھنٹا جو ہم نے گزارا ہی نہیں' زندگی سے چپکے سے نکل جاتا تھا۔ اپنے دامن میں دکھ سمیٹے' کچھ لئے بغیر۔ گھڑی ملائے بغیر بھی نہیں رہا جا سکتا۔ آدمی کو تو وقت کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔

ڈبے میں ہلچل سی مچ گئی۔ ٹرین لاہور کے نواحی علاقوں سے گزر رہی تھی۔ لوگ اپنے سامان کو پیک کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ ہر چہرے پر طمانیت اور مسکراہٹ تھی۔ سفر ختم ہو رہا تھا۔ منزل آ رہی تھی۔

چند ہی لمحوں میں گاڑی لاہور اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر پہنچ گئی۔ صفورہ اور اس کی چچا زاد بہنوں نے ہلکا سامان اٹھایا اور ٹرین سے اتر کر پلیٹ فارم پر ذرا ہٹ کر کھڑی ہو گئیں۔ ابا نے قلی سے بات کر لی تھی اور اماں کے ساتھ سامان اتروانے میں مصروف تھے۔

اپنے اتارے ہوئے سامان کے پاس کھڑے ہو کر لڑکیاں ادھر ادھر دیکھتی رہیں۔ اسی وقت سامنے والے پلیٹ فارم پر ایک اور گاڑی رکی۔ مسافر اترنے لگے۔ اس ٹرین کے ایک منظر نے صفورہ کی توجہ کھینچ لی۔ وہ بڑی محویت سے دیکھتی رہی پھر آہستہ آہستہ وہ اس طرف والی ٹرین کے قریب ہوتی گئی۔



ٹرین لاہور پہنچ گئی تھی!

مجیب انور کے پاس صرف ایک بیگ تھا۔ وہ اپنا بیگ لے کر دروازے کی طرف لپکا کہ پہلی فرصت میں اتر جائے مگر وہاں تو دروازے پر تین چار گٹھڑیاں' دو لوہے کے صندوق اور کچھ سامان اس طرح رکھا تھا کہ راستہ بند ہو گیا تھا اور دروازے پر ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے دروازے کا ہینڈل تھام رکھا تھا اور دوسرے سے اپنے سامان کو تھامے ہوئے تھی' جیسے ٹرین سے گرنے سے بچا رہی ہو۔

ٹرین رکنے والی تھی۔ اس کی رفتار بتدریج کم ہو رہی تھی مگر اب بھی اچھی خاصی تھی۔ مجیب اپنا بیگ لئے گٹھڑیوں اور صندوقوں کو پھلانگ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

اسی لمحے ٹرین کو جھٹکا لگا۔ بوڑھی عورت کے ہاتھ سے ہینڈل چھوٹا اور اس کا توازن بگڑ گیا۔ وہ گرنے لگی۔

مجیب نے بغیر سوچے سمجھے عورت کو سنبھالنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے گرتی ہوئی عورت کو سنبھال لیا لیکن خود بری طرح لٹک گیا۔ اس کے کندھے سے بیگ جھول رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے ہینڈل تھام رکھا تھا۔ اس کا پورا جسم باہر تھا۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ ٹرین اور پلیٹ فارم کے درمیان خلا سے بچا رہے۔

ٹرین رکی تو اس کی جان میں جان آگئی۔ اس نے باہر چھلانگ لگائی پھر اس نے بوڑھی عورت کو دیکھا' جس کا چہرہ فق ہو رہا تھا "کیا بات ہے اماں؟ مرنے کا ارادہ ہے؟"

عورت نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔

"خیر' اس وقت تو تمہاری وجہ سے میں مرتے مرتے بچا ہوں۔" مجیب نے کہا۔

عورت کو گویا کھوئی ہوئی آواز مل گئی "اکیلی ہوں پتر۔ اس لئے سامان کی فکر تھی۔"

"کوئی لینے بھی نہیں آئے گا تمہیں؟"

"شاید آ جائے۔ خط تو بھیج دیا تھا میرے بڑے پتر نے۔ پر آج کل کون فکر کرتا ہے ماں باپ کی۔"

"چلو' میں تمہارا سامان اتروا دوں۔"

مجیب انور نے بوڑھی عورت کا سامان اتار کر ایک طرف رکھا۔ اسے احساس بھی نہیں تھا کہ قریب کھڑی ایک خوبصورت لڑکی اسے بڑی توجہ اور دلچسپی سے دیکھ رہی ہے "کوئی آیا نہیں اماں؟" اس نے بوڑھی عورت سے پوچھا۔

"کوئی نظر نہیں آیا۔" عورت کے لہجے میں مایوسی تھی "پر مجھے تو انتظار کرنا ہے۔"

"کیوں اماں؟"

"یہ سب سامان میں نہیں لے جا سکتی اکیلی اور پیسے میرے پاس بالکل نہیں ہیں۔"

"تم فکر نہ کرو اماں۔ یہ تو معلوم ہے نا کہ کہاں جانا ہے؟"

"ہاں۔ دھرمپورے میں گھر ہے میرا۔"

مجیب نے اشارے سے قلی کو بلایا اور سامان اٹھانے کو کہا۔ عورت اسے دعائیں دے رہی تھی۔ قلی نے سامان اٹھایا اور وہ دونوں اس کے پیچھے چل دیئے۔



لٹکی ہوئی پوزیشن میں تو کچھ پتہ ہی نہیں چلا تھا مگر جب ٹرین رکی اور وہ شخص اترا تو صفورہ نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ خوب رو وجیہہ اور خوش لباس شخص تھا۔ آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی۔ چہرے سے اس کی عمر 35 سے زیادہ نہیں لگتی تھی۔ تھوڑے تھوڑے بال کنپٹیوں پر سے سفید تھے جو اس کی وجاہت میں اضافہ کر رہے تھے۔

پھر وہ بولا تو لہجے میں حلیمی تھی۔ آواز بھی بے حد پرکشش تھی اور جو گفتگو اس کے اور بڑھیا کے درمیان ہوئی' اس کے نتیجے میں صفورہ اس سے اور متاثر ہوئی۔ لوگ کہتے ہیں' اخلاقی قدریں ختم ہو رہی ہیں مگر نہیں دنیا میں اچھے انسان اب بھی موجود ہیں اور ہمیشہ موجود رہیں گے۔

وہ اس شخص کو عورت کے ساتھ جاتے دیکھتی رہی۔ وہ جانتی تھی کہ اس شخص کی صورت حافظے میں نقش ہو گئی ہے۔ وہ اسے کبھی بھلا نہیں سکے گی۔

اسی لمحے اسے مجیب انور کا خیال آ گیا۔ کیا وہ بھی ایسا ہی ہو گا.... خوب رو' وجیہہ' پرکشش' خوش اخلاق اور دردمند۔ وہ ایسا ہو نہ ہو' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ تو خاص ہے.... خاص الخاص۔ جیسا بھی ہو' اس سے بھی اچھا لگے گا۔

"صفورہ ... کہاں ہو بھئی؟"

چچا زاد بہن کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پلیٹ فارم پر بھیڑ بہت زیادہ تھی۔ اسے اپنی فیملی کو تلاش کرنے میں چند لمحے لگے پھر وہ ان کی طرف بڑھ گئی۔

"کہاں چلی گئی تھیں؟ اماں نے پوچھا۔

"امی ایک آدمی مرتے مرتے بچا ہے۔ اسے دیکھ رہی تھی۔"

"کیا ہوا تھا؟"

"کوئی بوڑھی عورت ٹرین سے گر رہی تھی۔ وہ بے چارہ اسے بچانے کی کوشش میں خود مرتے مرتے بچا۔"

"آؤ چلو۔"



اسٹیشن سے باہر نکلتے ہوئے صفورہ نے سوچا کہ مجیب انور چاہے جیسا بھی ہو' اس کے لئے دنیا کا سب سے پرکشش مرد ہے اور رہے گا لیکن کاش...... وہ اس شخص جیسا ہو' جسے ابھی میں نے ایک بوڑھی عورت سے حسن سلوک کرتے دیکھا ہے۔

اس نے سوچا بھی نہیں کہ اس دنیا میں کبھی کبھی خواہشیں ہاتھ کے ہاتھ پوری ہو جاتی ہیں!

اسٹیشن سے باہر نکل کر مجیب نے بوڑھی عورت کے لئے ٹیکسی روکی۔ ٹیکسی کا کرایہ اس نے پہلے ہی ادا کر دیا پھر اس نے بوڑھی عورت کو سو کا نوٹ دیا "لو اماں' یہ رکھ لو۔"

"اس کی ضرورت نہیں پتر۔ تو نے پہلے ہی اتنا کر دیا ہے۔"

"کچھ بھی نہیں کیا۔ تمہارے بیٹوں جیسا ہی ہوں میں۔" مجیب نے اصرار کر کے نوٹ اسے دے دیا۔

بوڑھی عورت دعائیں دیتی ہوئی گئی۔ اس کے جانے کے بعد مجیب نے اپنے لئے ٹیکسی لی۔ "کدھر جاؤ گے باؤ جی؟"

"کسی اچھے سے ہوٹل لے چلو۔ زیادہ مہنگا نہ ہو۔"

"کتنے کرائے والا کمرا چاہئے باؤ جی؟"

"پانچ سو تک چلے گا۔" مجیب نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔

"ٹھیک ہے باؤ جی۔ ایسا ہوٹل ہو گا کہ دل خوش ہو جائے گا آپ کا۔"

ٹیکسی چل دی۔ اب مجیب کو ٹرین سے اترنے والا واقعہ یاد آیا۔ کچھ بھی ہو سکتا تھا اس میں - وہ واقعی مرتے مرتے بچا تھا "آج تو اپنی ہی کہانی ختم ہونے والی تھی کہانی نویس صاحب۔" اس نے دل ہی دل میں خود سے کہا۔

اسے احساس نہیں تھا کہ کہانی جہاں ختم ہوتے ہوتے پہنچتی ہے' وہاں سے ایک اور کہانی شروع ہوتی ہے۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ کہانی تو اب شروع ہو رہی ہے!



ہوٹل بہت اچھا اور صاف ستھرا تھا۔ چیک ان کرتے کرتے رات کے بارہ بج گئے۔ کھانا اس نے ٹرین میں ہی کھا لیا تھا۔ سحاب کی دی ہوئی چیزوں نے پورے سفر میں ساتھ دیا تھا۔ سوائے چائے کے اسے ٹرین سے کچھ لینے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی۔

وہ کپڑے بدل کر فریش ہو گیا۔ چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ اس نے روم سروس کو چائے لانے کے لئے کہا۔ چائے آئی تو اس نے ویٹر سے پوچھا۔ ”روم سروس کب تک ملتی ہے؟“

”چوبیس گھنٹے سر اور ویسے بھی میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔“ ویٹر نے بے حد خوش خلقی سے کہا۔ سامان کمروں تک پہنچانے والے پورٹر نے اسے بھاری ٹپ کی اطلاع دے دی تھی۔

”گڈ... ٹھیک ہے‘ ضرورت پڑی تو بلا لوں گا۔“ مجیب نے اسے بھی ٹپ دی۔ وہ اس کی اہمیت سے واقف تھا۔ اس کے نتیجے میں غیر معمولی تعاون ملتا تھا۔

چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے مجیب نے کمرے کا جائزہ لیا۔ چھوٹا مگر صاف ستھرا اور خوب صورت کمرا تھا۔ آرائش سے سلیقہ جھلک رہا تھا۔ اوپر ایک کونے میں کیبنٹ تھی جس میں چودہ انچ سکرین کا کلر ٹیلی ویژن موجود تھا۔

اس نے اٹھ کر ٹی وی آن کیا۔ ڈی ٹی وی۔ چینل بدلا تو ایل ٹی وی۔ وہ چینل بدلتا رہا۔ ہر طرف ڈش کی حکمرانی تھی۔ ایک چینل پر وی سی آر لگا تھا۔ کوئی بھارتی فلم دکھائی جا رہی تھی۔ کیا مصیبت ہے۔ وہ جھنجلا گیا۔ اپنا کہیں کچھ نہیں ہے۔ جو ہوتا ہے‘ وہ دیکھنے کے قابل نہیں ہوتا۔ اس نے ٹی وی بند کر دیا۔

چائے پینے کے بعد اس نے دانت برش کئے۔ دروازہ بند کر دیا اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔ بستر کافی کشادہ تھا۔ وہ سنگل بیڈ تو ہرگز نہیں تھا۔ سفر کی تھکن تھی۔ لمحوں

میں اس پر غنودگی چھا گئی۔ بے خیالی میں اس نے شاہد کو خود سے لپٹانے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر وہاں بستر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ غنودگی طاری رہی مگر اسے قلق ہو رہا تھا۔ شاید شاہد بھی اسے اسی طرح مس کر رہا ہو گا؟ لیکن نہیں‘ وہ تو سحاب سے لپٹ کر سو بھی چکا ہو گا۔

وہ نیند کے عالم میں یہ سب کچھ سوچے جا رہا تھا۔ نہ جانے وہ کیسی آہٹ تھی کہ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ نیند کافور ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ کمرے کا جائزہ لیتا رہا پھر بڑی مشکل سے اٹھ کر اس نے روشنی کی۔ اس وقت تک وہ خوف سے لرزنے لگا تھا۔ جس بات کا ڈر تھا‘ وہی ہو رہی تھی۔

طرح طرح کے واہمے اسے ستانے لگے۔ ہوٹلوں میں ٹھہرنے والے مسافروں کے پیچھے چور لٹیرے بھی تو لگ جاتے ہیں پھر ہوٹلوں میں ٹھہرنے والے اسمگلر‘ جرائم پیشہ لوگ بھی تو ہوتے ہیں۔ پولیس تو ہوٹلوں پر خاص طور پر نظر رکھتی ہو گی۔ مسافروں کو خاص طور پر چیک کیا جاتا ہو گا۔

وہ اوہام میں بری طرح گھرنے لگا۔ خوف کی مکڑی جالے بن رہی تھی۔

اس نے سوچا‘ کمرے کے دروازے کی ڈپلی کیٹ چابی بھی تو ہوتی ہے۔ وہ ہوٹل کی انتظامیہ کے پاس ہوتی ہو گی لیکن کوئی اسے غلط مقصد کے لئے بھی تو استعمال کر سکتا ہے۔ ہاں‘ ناممکن تو کچھ بھی نہیں۔ اس نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہاں چٹخنی نہیں تھی۔ بس پیڈ لاک ہی تھا۔

وہ کیفیت ہی ایسی تھی کہ اس میں ناممکن بھی اسے عین ممکن لگنے لگتا تھا۔ اب تو وہ اس امکان پر بھی غور کر رہا تھا کہ کمرے میں کوئی گھس آیا ہو گا۔ آخر جس آہٹ کو سن کر اس کی غنودگی ٹوٹی تھی‘ وہ بھی تو کچھ رہی ہو گی۔ کیا؟ یہ اسے معلوم نہیں۔ ممکن ہے‘ کوئی ڈپلی کیٹ چابی سے دروازہ کھول کر کمرے میں گھس آیا ہو.... اسے قتل کرنے یا لوٹنے کے ارادے سے اور اسے جاگتے دیکھ کر چھپ گیا ہو۔

اس وقت تک اس کا جسم لرزنے لگا تھا۔ خوف اس حد تک طاری ہو چکا تھا کہ اس میں اٹھ کر کمرے کی تلاشی لینے کی ہمت بھی نہیں تھی بلکہ اس سے تو اٹھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ وہ کسی بت کی طرح بیڈ پر بیٹھا ہوا تھا۔

میاں مجیب' یوں تو نہایت آسانی سے مارے جاؤ گے۔ اس نے خود سے کہا۔ جو اندر موجود ہے' وہ ساری رات تمہارے سونے کا انتظار نہیں کرے گا اور باہر کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ اندر تم پر کیا گزر رہی ہے۔ کیا گزر چکی ہے۔ وہ سمجھیں گے کہ تم سو رہے ہو۔

اس نے بند دروازے کو دیکھ کر دانت پیسے۔ آدمی اکیلا ہو تو دروازہ بہت بڑا فساد ہے۔ اس نے سوچا۔ اٹھ کر دروازہ تو کھولنا ہی پڑے گا۔

وہ اٹھا اور اس تیزی سے دروازے کی طرف لپکا جیسے کمرے میں موجود مداخلت کار اس پر جھپٹنے والا ہے۔ اس نے ہینڈل گھمایا اور تیزی سے دروازے کو چوپٹ کھول دیا۔ پھر اس نے سکون کی گہری سانس لی۔ اب وہ محفوظ تھا' وہ دوبارہ بستر پر آ لیٹا۔

مگر چند منٹ گزرے ہوں گے کہ وہ پھر بے چین ہو گیا..... میں خوامخواہ تماشا بن رہا ہوں۔ اس نے سوچا' رات کے ڈیڑھ بجے کون اپنے کمرے کا دروزاہ کھلا رکھتا ہے۔ یہ تو بے وقوفی ہے۔ کوئی دیکھے گا تو کیا سمجھے گا۔

لیکن اٹھ کر دروازہ بند کرنے کی اب بھی اسے ہمت نہیں ہوئی۔ اس نے سوچا' روم سروس سے چائے منگوائی جائے مگر یہ بھی مسئلے کا حل نہیں تھا۔ دروازہ بند نہیں رکھ سکتا تھا اور دروازہ کھلا رکھ کر تماشا نہیں بننا چاہتا تھا۔

ایسے میں اسے ایک راستہ سجھائی دے گیا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ ہوٹل کی لابی میں پوری رات گزارے۔ بس یہی ہو سکتا تھا۔ اس سے پہلے اسے گھر فون کر کے سحاب سے بات کا خیال بھی آیا تھا پھر اس نے سوچا' شرمندگی بھی ہو گی اور کچھ فائدہ بھی نہیں ہو گا۔ سحاب اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔ الٹا پریشان ہو جائے گی۔

وہ اٹھا' کمرے کا دروازہ لاک کر کے چابی جیب میں رکھی اور سیڑھیاں اتر کر نیچے لابی میں آ گیا۔ وہاں دن کا سماں تھا۔ ہوٹل کا پورا اسٹاف جاگ رہا تھا۔ وی سی آر پر فلم چل رہی تھی اور وہ سب بیٹھے دیکھ رہے تھے۔۔ یہ ان کی مجبوری تھی کہ وہ سو نہیں سکتے تھے۔

مجیب بھی جا کر خاموشی سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ جیسے جاگنا اس کی مجبوری تھی'

ایسے ہی فلم دیکھنا بھی مجبوری بن گیا۔ اب آدمی دھیان بٹانے کو کچھ تو کرے یا بیٹھا خوف زدہ ہوتا رہے۔

ایک گھنٹے بعد فلم ختم ہو گئی۔ مجیب نے گھڑی دیکھی۔ تین بجے تھے۔ وی سی آر میں ایک اور کیسٹ لگا دیا گیا۔ ایک اور فلم شروع ہو گئی۔

اسی وقت اس کے کمرے کے ویٹر نے اس دیکھ لیا۔ وہ اٹھ کر اس کی طرف آیا۔

"کیا بات ہے سرجی؟"

"کچھ نہیں۔ نیند نہیں آ رہی ہے مجھے۔" مجیب نے کہا۔

"چائے پئیں گے؟"

"ہاں' پلوا دو۔"

چائے بھی پی لی گئی۔ ویٹر اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اسے اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ زبردستی جاگ رہا ہے۔

ویٹر پیالی اٹھانے کے لئے آیا تو اس نے مجیب سے کہا۔ "سو جائیں سرجی' آپ کا تو نیند سے برا حال ہے۔"

"نہیں' ٹھیک ہے۔ میں فلم دیکھ رہا ہوں۔"

"میں یہ فلم کل بھی لگوا دوں گا سرجی۔ آپ کمرے میں جا کر سو جائیں۔"

مجیب نے سوچا' خوف کس کس طرح ذلیل کراتا ہے آدمی کو۔ اس کے متعلق دوسروں پر غلط تاثر مرتب ہو جاتا ہے اور وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا۔ اب یہ ویٹر سمجھ رہا ہے کہ میں فلم کی وجہ سے جاگ رہا ہوں۔ حالانکہ مجھے فلم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ "بات یہ ہے کہ اکیلے میں مجھے نیند نہیں آتی۔" اس نے ویٹر پر اپنا تاثر درست کرنے کی کوشش کی "تنہائی میں سو ہی نہیں سکتا میں۔"

اس نے نہیں دیکھا کہ ویٹر کے ہونٹوں پر کیسی معنی خیز مسکراہٹ ابھری ہے۔ تاثر درست ہونے کے بجائے اور بگڑ گیا تھا۔



اس روز صابر کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ ڈیوٹی پر جائے۔ انڈیا سے دونوں چچا اپنی

بیٹیوں کے ساتھ آ گئے تھے۔ گھر میں رونق ہو گئی تھی۔ وہ لوگ رات دیر سے آئے تھے اور پھر تقریباً صبح تک باتیں ہوتی رہی تھیں۔ سرحد پار سے لوگ برسوں کے بعد آئیں تو یہ تو ہوتا ہی ہے۔ صرف معلومات کا تبادلہ کرنے میں کئی دن لگ جاتے ہیں۔

صبح اس کی آنکھ کھل ہی نہیں رہی تھی مگر ناظمہ نے اسے جگا دیا "سنیں.... کام پر نہیں جانا ہے؟؟"

"چھوڑو نا۔ سونے دو مجھے۔" صابر نے نیند میں ہی کہا۔

"جانتی ہوں کہ مشکل سے تین گھنٹے سوئے ہیں آپ؟" ناظمہ نے کہا "میں تو اٹھانا نہیں چاہتی تھی لیکن آپ خود ہی کہتے ہیں کہ بغیر اطلاع کے آپ چھٹی نہیں کر سکتے۔ اچھا ایسا کریں، فون ہی کر دیں...."

یہ سنتے ہی صابر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اسے ہر حال میں ڈیوٹی پر جانا تھا۔ کبھی چھٹی کرنی ہوتی تو وہ رات کے ریسپشنسٹ احمد کو فون کر دیتا۔ آپس میں انڈراسٹینڈنگ تھی۔ احمد اس کی جگہ ڈیوٹی کر لیتا تھا اور جب احمد کو ضرورت ہوتی تو وہ بھی ایسا ہی کرتا۔ مگر ان دنوں یہ مناسب نہیں تھا۔ انہیں بہت محتاط رہنا تھا۔ انتظامیہ چھانٹی کے چکر میں لگی ہوئی تھی۔ انہیں کوئی بہانہ نہیں ملنا چاہئے۔

اس نے گھڑی دیکھی پھر وہ تیزی سے باتھ روم کی طرف لپکا۔ باتھ روم سے آیا تو ناظمہ ناشتہ لگا چکی تھی "فون کر لیں نا" اس نے کہا "اچھا ہے، نیند پوری ہو جائے گی۔"

"نہیں۔ آج کل حالات ایسے نہیں، جانا ضروری ہے۔"

وہ تیار ہو کر گھر سے نکل آیا۔ ٹھیک وقت پر پہنچنے کے لئے اسے رکشا کرنا پڑا۔ لابی میں قدم رکھتے ہوئے اسے سکون کا احساس ہوا۔ گھڑی نو بجا رہی تھی۔

احمد نے جلدی جلدی چارج اسے دیا اور رخصت ہو گیا۔ ویٹر ارشد نے چائے کی پیالی لا کر اس کے سامنے رکھ دی۔ وہ چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے ہوئے ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ لابی سنسان تھی۔ روم سروس کے ویٹرز بھی موجود نہیں تھے۔ ہوٹل کے معمولات شروع ہو رہے تھے۔

اس نے چیک ان، چیک آؤٹ رجسٹر اٹھایا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ یہ

ان کا روز کا معمول تھا۔ وہ دیکھتا تھا کہ گزشتہ روز اس کے جانے کے بعد سے کتنے مہمانوں نے چیک ان کیا ہے۔

رجسٹر میں چھ نئے اندراجات تھے۔ ان میں مجیب انور کا نام دیکھ کر وہ چونکا۔ فوراً ہی اسے جو خیال آیا وہ یہ تھا کہ یہ وہ مجیب انور نہیں ہو سکتا مگر تفصیل نے اس کے خیال کی تردید کر دی۔ پیشے کے خانے میں کمرشل رائٹر لکھا تھا۔

اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ کیسا خوش گوار اتفاق ہے۔ اس نے سوچا۔ مجھے مجیب انور کو دیکھنے کی کتنی آرزو تھی۔ یوں بیٹھے بٹھائے پوری ہو گئی۔ مجیب انور کا لاہور آنا.... اور پھر اسی ہوٹل میں قیام کرنا.... کیا اتفاق ہے۔

اسی لمحے اسے صفورہ کا خیال آ گیا۔ صفورہ، مجیب انور سے ملنے کی اس سے بڑھ کر آرزومند ہو گی اور کیسی عجیب بات ہے کہ صفورہ اور مجیب انور، دونوں کل ہی لاہور آئے ہیں۔ صفورہ انڈیا سے اور مجیب انور کراچی سے۔

وہ رجسٹر کا صفحہ کھولے بیٹھا تھا۔ اچانک اس کی نظر چیک ان ٹائم پر پڑی۔ وہ بالکل وہی وقت تھا، جب انڈیا کے مہمان لاہور میں اس کے گھر آ کر اترے تھے۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ کہیں مجیب بھی انڈیا ہی سے تو نہیں واپس آیا۔ ممکن ہے، ملنے ملانے گیا ہو اور کل ہی آیا ہو۔ لاہور تو انڈیا جانے اور آنے والوں کی مجبوری ہے مگر فوراً ہی اس نے اس خیال کو مسترد کر دیا۔

پھر بھی یہ خیال بے حد سنسنی آمیز تھا کہ صفورہ اور مجیب انور ایک ہی وقت میں لاہور اسٹیشن پر اترے ہوں گے۔ کون جانے، دونوں ایک ہی پلیٹ فارم پر رہے ہوں۔ کون جانے، دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا بھی ہو۔ صفورہ کو تو معلوم بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ مجیب انور ہے۔

صابر نے سوچ لیا کہ وہ مجیب انور سے ضرور بات کرے گا۔ راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کرے گا۔ اگر وہ اسے صفورہ سے ملوانے میں کامیاب ہو گیا تو صفورہ کتنی خوش ہو گی۔ خود اس کی اپنی خوشی بھی ناقابل یقین تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اسی وقت جا کر کمرا نمبر 201 کے دروازے پر دستک دیتا اور مجیب انور سے مل کر اسے ہر طرح کے تعاون کی پیش کش کرتا.... "سر، میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔" اس نے تصور

میں مجیب انور سے کہا۔

لیکن یہ ممکن نہیں تھا یہ ہوٹل کے ضابطے کے خلاف تھا۔

ویٹر ارشد آیا تو اس نے اس سے پوچھا۔ "کمرا نمبر 201 میں کس کی ڈیوٹی ہے؟"

"سلیم کی ہے سر!" ارشد نے بتایا۔

صابر نے سلیم کو بلا لیا "کمرا نمبر 201 والے گیسٹ سے ملے ہو؟" اس نے پوچھا۔

سلیم نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا "نہیں سر جی! ابھی میری ڈیوٹی شروع ہوئی ہے اور وہ سو رہے ہیں۔" اس نے کہا پھر چونک کر پوچھا "آپ خاص طور پر کیوں پوچھ رہے ہیں سر۔ کیا جانتے ہیں انہیں؟"

"وہ بہت بڑے کہانی لکھنے والے ہیں" صابر نے کہا "بڑا نام ہے ان کا۔ پڑھنے والوں میں تو بہت مشہور آدمی ہیں۔"

"مجھے تو بس اتنا معلوم ہے کہ شوقین آدمی ہیں۔"

اس کے لہجے کی چبھن نے صابر کو بے چین کر دیا "کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔

سلیم گڑبڑا گیا۔ اسے احساس ہوا کہ صابر اس مہمان کی بہت عزت کرتا ہے "مجھے نہیں معلوم سر جی!" اس نے بے حد لجاجت سے کہا "ساجد کہہ رہا تھا۔ رات کو اس کی ڈیوٹی تھی نا۔ اس نے اٹینڈ کیا تھا انہیں۔"

صابر خاموش ہو گیا۔ وہ شوقین مزاجی کی اصطلاح کو سمجھتا تھا۔ بیس سال سے ہوٹلوں میں ملازمت کر رہا تھا۔ اسے ٹھیس سی لگی - مجیب انور کے بارے میں وہ یہ گمان کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اچانک ہی لابی میں تیزی کا رجحان پیدا ہو گیا اور وہ مصروف ہو گیا۔



مجیب کی آنکھ کھلی۔ ان [illegible]ی گھڑی پر نظر ڈالی۔ سوا گیارہ بجے تھے۔ اسے احساس تھا کہ نیند اب بھی پوری [illegible]ں ہوئی ہے۔ کیسے ہوتی؟ سات بجے تو اسے نیند آئی تھی۔ اس سے پہلے سونا ممکن ہی نہیں تھا۔ دن میں یہ خوبی تھی کہ چاہے وہ اکیلا

ہو' اسے خوف نہیں آتا تھا۔

جی تو چاہ رہا تھا کہ پھر سو جائے لیکن خدشہ تھا کہ پورا دن ضائع ہو جائے گا اور دن ضائع ہونے کا مطلب تھا' لاہور میں مزید ایک دن کا قیام اور یہ اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ وہ جلد از جلد یہاں سے واپس چلے جانا چاہتا تھا۔

باتھ روم جانے سے بھی پہلے اس نے ریسیور اٹھایا اور آپریٹر کو غفور کا فون نمبر دیا۔ چند لمحے بعد وہ غفور سے بات کر رہا تھا "میں مجیب بول رہا ہوں.... مجیب انور" اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"کیا حال ہے سر! کراچی سے بات کر رہے ہیں؟"

"نہیں بھئی۔ رات لاہور پہنچا ہوں۔ ایور گرین میں قیام ہے۔ کمرا نمبر 201-"

"میں آدھے گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں سر' اگر اجازت ہو تو۔"

"مناسب ہے۔ میں ابھی سو کر اٹھا ہوں۔ مجھے بھی وقت مل جائے گا۔"

"او کے سر!"

مجیب نے فون رکھا اور باتھ روم میں گھس گیا۔ غسل کے فوائد کا تو وہ ہمیشہ سے قائل تھا۔ نیند کے اثرات بھی ڈھل گئے' کسل مندی بھی دور ہو گئی اور وہ تازہ دم ہو گیا۔ اس نے ویٹر کو طلب کیا اور ناشتے کا آرڈر دیا۔

ویٹر آرڈر لینے کے بعد بھی کھڑا رہا۔ مجیب نے سر اٹھا کر اسے دیکھا "کیا بات ہے؟"

"میں شرمندہ ہوں سر جی!" سلیم نے بڑی عاجزی سے کہا۔

مجیب کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا "کس بات پر؟" اس نے الجھن بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ہمارے ہوٹل میں ہوتے ہوئے ہمارے کسی گیسٹ کو تکلیف ہو تو یہ شرمندگی کی بات ہے سر جی!"

"مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔"

"رات بھر سو نہیں سکے۔ یہ تکلیف ہی ہے سر جی' نیند بھی پوری نہیں ہوئی آپ کی۔"

مجیب کو رات کی کیفیت یاد آگئی اور وہ کھسیا گیا "وہ تو میری اپنی کمزوری ہے۔ اس میں ہوٹل کا کیا قصور۔"

سلیم اب بھی بات کرتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ ہوٹل کی انتظامیہ بہت سخت تھی۔ ایک شکایت پر نوکری ختم ہو جاتی۔ خیر نوکری کی کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ اس جیسے آدمی کے لئے نوکری کوئی مسئلہ نہیں تھی مگر وہ ایک جگہ ٹک کر کام کرنے میں خوش رہتا تھا "ساجد بتا رہا تھا سر جی کہ اکیلے میں آپ کو نیند نہیں آتی۔"

"ہاں۔ یہ مسئلہ ہے میرے ساتھ۔" مجیب نے خجالت سے کہا۔

"تو سر' آپ پہلے بتا دیتے۔ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہمارے لئے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ سر جی کہ جیسا آپ چاہیں گے' ویسا ساتھی مل جائے گا۔ اکیلے میں نیند نہیں آتی تو آپ اکیلے رہیں ہی کیوں۔"

مجیب کا چہرہ تمتما اٹھا "تم جاکر ناشتہ لاؤ۔" اس نے گڑبڑا کر کہا۔

"کوئی تکلف نہ کریں سر جی!" سلیم نے نظریں جھکا کر کہا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ گیسٹ اس قسم کے معاملات کا عادی نہیں ہے "جب جی چاہے' حکم کر دیجئے گا۔ رات دس بجے تک میری ڈیوٹی ہے۔"

مجیب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سلیم کمرے سے نکل گیا۔



"معاف کرنا جناب!"

آواز سن کر صابر نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک خوش پوش نوجوان اس کے سامنے تھا۔ وہ ہر زاویئے سے لاہور ہی کا لگ رہا تھا۔ "فرمایئے جناب۔ کیا خدمت کر سکتا ہوں میں؟" اس نے بے حد خوش اخلاقی سے کہا۔

"آپ کے ہاں کمرا نمبر 201 میں مجیب انور صاحب ٹھہرے ہیں۔"

صابر کا ہاتھ خود کار انداز میں رجسٹر کی طرف بڑھا مگر پھر اس نے ہاتھ کھینچ لیا "جی ہاں جناب' آپ کو ان سے ملنا ہے؟"

"ملنا ہے' مل بھی لوں گا مگر بات یہ ہے کہ وہ یہاں لاہور میں میرے مہمان

"

صابر نے اسے غور سے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ مجیب انور کا اس ص سے کیا تعلق ہو سکتا ہے "تو پھر؟"

"انہوں نے ڈپازٹ بھی کیا ہو گا؟"

"جی ہاں۔ دو ہزار روپے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ آپ انہیں وہ رقم واپس کر دیں۔" غفور نے جیب میں ہاتھ ل کر پرس نکالا اور ہزار کے پانچ نوٹ اس کی طرف بڑھائے "یہ پانچ ہزار آپ رکھ ں۔ کھانے کے' کسی چیز کے چارجز بھی ان سے وصول نہ کریں۔ ان کے جاتے وقت ں خود آ کر حساب کر لوں گا۔"

صابر کا ہاتھ نہیں بڑھا۔ وہ رقم لیتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ غفور نے اس کی ہچکچاہٹ نپ لی۔ نوٹ اس نے کاؤنٹر پر رکھے اور پرس میں سے اپنا کارڈ نکال کر اس کی طرف ھایا "یہ دیکھیں میرا کارڈ۔ میں ان کا پبلشر ہوں۔ ان کی کہانیاں کتابی شکل میں شائع ر رہا ہوں۔ وہ میرے مہمان ہیں۔ معاہدے کے سلسلے میں آئے ہیں۔"

اس بار صابر نے نوٹ اٹھا لئے۔ اس نے رجسٹر کھولا اور اس میں اندراج کرنے ۔ اندراج کرتے کرتے اس نے سر اٹھا کر غفور کو دیکھا "سر۔۔۔ ایک مہربانی کر سکتے ں؟"

"کیا بات ہے؟" غفور نے پوچھا۔

"میں مجیب صاحب کا فین ہوں۔ میرے لئے بڑے فخر کی ہے کہ وہ یہاں ٹھہرے یں۔ آپ ان سے ملنے جا رہے ہیں۔ ان سے میرا تذکرہ بھی کر دیں۔ وہ مجھے پانچ ٹ دے دیں گے تو میری بڑی عزت افزائی گی۔"

غفور مسکرایا۔ "یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ میں انہیں تمہارے متعلق بتا دوں گا۔ ے جانے کے بعد تم انہیں یہ دو ہزار روپے واپس کرنے چلے جانا۔"

"ٹھیک ہے سر۔ بہت بہت شکریہ!"



مجیب ناشتہ کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے سر اٹھا کر پکارا۔ "آ

جائیے پلیز!"

دروازہ کھلا اور غفور کی صورت نظر آئی۔ غفور نے مسکراتے ہوئے سلام کیا۔ مجیب اٹھنے لگا تو وہ بولا "بیٹھیں سر۔ ناشتہ کریں۔ مجھے خود سوچنا چاہئے تھا۔"

"ارے نہیں بھئی۔ میں ناشتہ کر چکا ہوں۔ اچھا ہے' چائے ساتھ پئیں گے۔ میں تو بڑی تنہائی محسوس کر رہا تھا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

دونوں گلے ملے اور بڑے تپاک سے مصافحہ کیا پھر مجیب نے کہا "آؤ بیٹھو۔" اس کے بعد اس نے روم سروس کو مزید چائے لانے کو کہا۔

غفور سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا "سفر کیسا رہا سر؟"

"ٹھیک ٹھاک۔ کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔"

"لاہور کیسا لگا؟"

"ابھی تک دیکھا ہی نہیں لیکن لاہور مجھے شروع ہی سے اچھا لگتا ہے۔" مجیب نے کہا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ ویٹر چائے لے آیا تھا۔ غفور چائے بنانے میں لگ گیا۔ چائے کی پیالی مجیب کے سامنے رکھتے ہوئے اس نے کہا "آپ موقع دیں تو میں آپ کو سیر کراؤں لاہور کی۔"

"اس بار نہیں بھائی!" مجیب نے جلدی سے کہا "ابھی تو میں جلد از جلد یہاں سے بھاگ لینا چاہتا ہوں۔"

"ایسی کیا جلدی ہے سر!"

"جلدی ہے۔ اگلے مہینے میں پھر آؤں گا۔ تب دکھا دینا۔ ویسے بھی سب کچھ میرا دیکھا ہوا ہے۔"

"جلو پارک تو نہیں دیکھا ہو گا آپ نے؟"

"ہاں' وہ نہیں دیکھا۔"

"تو وہ دکھا دیتے ہیں آپ کو۔"

"میں نے کہا نا' اگلی بار۔ مجھے آنا تو ہے ہی۔ اس بار تو مجھے جلدی سے فارغ کر دو۔"

"اگلے مہینے آپ آئیں گے' پکی بات؟"

"ہاں بھائی۔ مری جانا ہے۔ ایک اسکرپٹ پر کام کرنا ہو گا۔"

"چلیں' ٹھیک ہے۔"

چائے پینے کے بعد غفور نے اپنے بیگ سے کاغذات نکالے اور مجیب کی طرف بڑھائے "یہ معاہدے کا رف ڈرافٹ ہے سر۔ اس میں کمی بیشی کی ضرورت محسوس کریں تو لکھ دیں۔ کوئی تبدیلی چاہیں تو وہ کر دیں پھر میں اسٹامپ پیپر پر ٹائپ کرا لوں گا۔"

مجیب نے ڈرافٹ کا جائزہ لیا اور کچھ ترمیم بھی کی۔ ایک شق کا اضافہ بھی کیا۔ "دیکھ لو' تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟" اس نے ڈرافٹ واپس کرتے ہوئے غفور سے کہا۔

"ارے نہیں سر۔ جو آپ کہیں گے' وہی ہو گا۔ یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔"

"بس تو ٹھیک ہے۔"

دونوں کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے پھر غفور نے کہا۔ "ہوٹل کا ریسپشنسٹ آپ کے پرستاروں میں سے ہے۔ آپ سے ملنے کا خواہش مند ہے۔"

مجیب مسکرایا "میں اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوں پھر ملاقات کا کیا مسئلہ ہے؟"

"وہ آپ کے پاس آئے گا" غفور بھی مسکرا دیا "اچھا سر' میں چلتا ہوں۔ کل کاغذات تیار کرا کے لاؤں گا پھر آپ کو میرے ساتھ چلنے کی زحمت کرنا ہو گی۔"

"ہاں ہاں' کیوں نہیں۔"

"میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا تکلف حکم کریں۔"

"ایک کام تو ہے" مجیب نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا "واپسی کے لئے سیٹ ریزرو کرانی ہے۔"

"ہو جائے گی سر۔ یہ بتائیں' کب کی؟"

"کل تمہارا کام نمٹ جائے گا۔ نائٹ کوچ میں کل کی سیٹ مل جائے تو اچھا ہے۔"

"اتنی جلدی کیا ہے سر' ہفتہ تو رکیں۔ ہمیں بھی خدمت کا موقع دیں" غفور نے احتجاج کیا۔

"میں نے کہا نا' اگلے ماہ آؤں گیا۔ تین دن تمہارے پاس رکوں گا مگر ابھی جانا ہے۔"

"کل کی تو مشکل ہے لیکن پرسوں کی انشاء اللہ ہو جائے گی" غفور نے کہا "میں آج ہی بات کرلوں گا۔"

غفور ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ مجیب سوچ میں پڑ گیا۔ اسے ابھی سے رات کی فکر ہو رہی تھی۔ بلکہ اب تو دو راتوں کی فکر تھی۔ وہ بھی پرسوں کی سیٹ مل جانے کی صورت میں۔ اپنے کراچی کے تجربات کے پیش نظر اسے اس کی امید کم ہی تھی۔ دو راتیں... پہاڑ سی راتیں۔

اس پر ایک نیا خوف طاری ہونے لگا۔ وہ ایک بالکل اجنبی شہر میں تھا جہاں اس کا کوئی شناسا بھی نہیں... سوائے غفور کے۔ اگر کسی چکر میں اسے پھانس لیا گیا تو کراچی میں کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ نہ گھر والوں کو نہ دفتر والوں کو۔ چلو دن میں تو خیر ہے مگر رات کو کیا ہو گا۔

وہ باقاعدہ خوف زدہ ہو گیا۔ بس چلتا تو اسی وقت کراچی کے لئے روانہ ہو جاتا لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ اچانک اسے ویٹر کی بات یاد آئی۔ تنہائی میں بھی اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ ان لوگوں نے اسے برا آدمی سمجھا ہے اور وہ انہیں سمجھا بھی نہیں سکتا۔ اچانک اس کے وجود میں ایک سرکش سی لہر اٹھی۔ ضرورت کیا ہے کسی کو سمجھانے کی... اپنی صفائی پیش کرنے کی! کسی کے برا سمجھنے سے وہ برا تو نہیں ہو جائے گا۔

مگر اس مسئلے کا حل کیا ہے۔ وہ سوچتا اور الجھتا رہا۔



صابر کی نظریں زینے پر جمی ہوئی تھیں۔ غفور نامی پبلشر ابھی واپس نہیں آیا تھا۔ ظاہر ہے' کاروباری معاملات میں دیر تو لگتی ہے۔ اس نے خود کو سمجھایا۔ یہی کیا کم ہے کہ لاہور کے اس پبلشر نے اسے مجیب انور سے ملنے کا جواز فراہم کر دیا تھا۔ اب وہ مجیب انور کے کمرے میں جا سکتا تھا۔

کوئی دو گھنٹے کے بعد غفور سیڑھیاں اترتا نظر آیا۔ نیچے آنے کے بعد وہ خود ہی ریسپشن کی طرف چلا آیا "لو جی... اب تم کسی بھی وقت جا سکتے ہو۔" اس نے صابر سے کہا۔

"آپ نے میرے متعلق بتا دیا تھا انہیں؟"

"ہاں' بتا دیا ہے۔"

"میں بہت شکرگزار ہوں سر!"

غفور مسکرایا۔ "مگر میں تم پر ایک ذمے داری ڈال رہا ہوں۔ مجیب صاحب کا ہر طرح خیال رکھنا۔ کسی بات کی تکلیف نہ ہو انہیں۔ ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھنا۔ پیسے کی بالکل فکر نہ کرنا" اچانک اسے کچھ خیال آیا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا "کہو تو اور رقم دے دوں؟"

"اس کی ضرورت نہیں سر۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ مجیب صاحب تو ویسے بھی میری ذمے داری ہیں۔ انہیں کوئی شکایت' کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔"

غفور چلا گیا تو اس نے دراز میں ہاتھ ڈال کر دو ہزار روپے نکالے اور لفافے میں رکھ لئے۔ اس نے امجد کو ڈیسک کا خیال رکھنے کو کہا "میں کمرا نمبر 201 کے گیسٹ کے پاس جا رہا ہوں" یہ کہہ کر وہ زینوں کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ وہ اس شخص سے ملنے والا تھا جس سے ملنے کا اسے بڑا اشتیاق تھا۔ دراصل یہ شوق اس انٹرویو نے بھڑکایا تھا۔ اسے بہت تجسس تھا کہ مجیب انور کیسا ہو گا؟ عمر کیا ہو گی اس کی؟ صورت شکل... آواز... یہ تو اسے یقین تھا کہ وہ گفتگو بہت اچھی کرتا ہو گا۔

201 کے دروازے پر وہ رکا۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ لمحے گزر گئے۔ اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے دوبارہ دستک دی...



پریشانی میں مجیب کو سحاب کی بات یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ ہوٹل میں رات کو گھبراہٹ ہو تو اسے رات کے لئے کوئی ساتھی بھی تو مل سکتا ہے۔ سحاب نے وہ بات سنجیدگی سے کہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ محض ضرورت کے تحت ایسا کرے گا۔ عیاشی اس کا مطمع نظر نہیں ہو سکتا۔

اور ویٹر نے اسے کھلے لفظوں میں پیش کش بھی کر دی تھی مگر وہ گھبرا گیا تھا۔ بلکہ اسے تو توہین کا احساس بھی ہوا تھا۔ اس کے انکار کے باوجود ویٹر کی پیش کش برقرار تھی۔ وہ کسی بھی وقت اس سے استفادہ کر سکتا تھا۔ تو کیا وہ ویٹر سے بات کرے؟

وہ جانتا تھا کہ اس کے دل میں کوئی ایسا ویسا خیال نہیں۔۔۔ اور آئے گا بھی نہیں۔ مگر یہ بات سحاب کے سوا کوئی نہیں سمجھے گا اور دوسروں کو غیر اہم قرار دینے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا جسے بھی معلوم ہو گا' وہ اسے برا اور عیاش سمجھے گا۔ بلا وجہ اپنا اچھا بھلا امیج خراب کرنا کوئی اچھی بات نہیں۔

مگر یہ بلاوجہ نہیں۔ ذہن چلایا۔ رات بھر نیند نہیں آتی۔ یہ کم اذیت ہے۔ امیج زیادہ اہم ہے یا اذیت سے بچنا۔

اسی وقت اسے خیال آیا کہ ہوٹلوں پر چھاپے بھی پڑتے ہیں۔ اگر اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تو؟ وہ یہ سوچ کر لرز گیا۔ اخبار میں اس کی دیگر گرفتار شدہ لوگوں کے ساتھ تصویر چھپے گی اور اس کا نام بھی شائع ہو گا۔ وہ لوگ بھی دیکھیں گے اور پڑھیں گے' جو اس کی تحریروں کے حوالے سے اس کے پرستار ہیں۔ وہ کیا کہیں گے۔۔۔۔ یہی کہ اچھائیوں کی تلقین کرنے والا خود کتنا پست انسان ہے۔ یہ وہ کیسے گوارا کر سکتا ہے۔

ضرورت کے تحت وہ باتھ روم میں گیا۔ اب تک کئی بار جا چکا تھا مگر باتھ روم میں اضافی دروازے پر اس کی نظر نہیں پڑی تھی۔ اس وقت اس نے اس دروازے کو دیکھا تو تجسس میں مبتلا ہو گیا۔ اس نے ہینڈل گھمایا۔ دروازہ نہیں کھلا۔ دروازے میں

چٹخنی بھی تھی۔ اس نے چٹخنی گرا کر ہینڈل گھمایا۔ دروازہ اب بھی نہیں کھلا۔ اس کا مطلب تھا کہ دوسری طرف سے بند ہے مگر دوسری طرف کیا ہے؟

بات اس کی سمجھ میں آ ہی رہی تھی کہ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ جلدی سے باتھ روم سے نکلا۔ اسی لمحے دوسری دستک ہوئی "کم ان" اس نے پکارا۔



صابر تیسری دستک دینے والا تھا کہ اندر سے آواز آئی "کم ان۔"

اس نے دروازہ کھولا اور اندر چلا گیا۔ مجیب انور کرسی پر بیٹھ رہا تھا۔ صابر نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ اسے مایوسی نہیں' خوشی ہوئی۔ مجیب انور خوش شکل بھی تھا اور خوش لباس بھی۔ اس کے تصور کے برعکس وہ خوب صورت کسرتی جسم کا مالک تھا ورنہ بیٹھ کر کام کرنے والے عام طور پر موٹے اور بھدے ہو جاتے ہیں۔ توند بھی نکل آتی ہے۔ دیکھنے میں بھی وہ پینتیس سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔

"جی فرمایئے؟" مجیب نے کرسی پر بیٹھنے کے بعد سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"میں استقبالیہ کلرک ہوں سر!" صابر نے کہا۔ اس نے لفافہ مجیب کی طرف بڑھایا "میں یہ آپ کو دینے آیا ہوں۔"

"یہ کیا ہے؟" مجیب نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

"آپ نے آنے کے بعد دو ہزار روپے ڈپازٹ کئے تھے' یہ وہی ہیں۔"

مجیب کا ہاتھ رک گیا "واپس کیوں دے رہے ہو؟"

"غفور صاحب نے ڈپازٹ جمع کرا دیا ہے سر۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ ان کے مہمان ہیں۔ سب کچھ ان کے ذمے ہے۔"

مجیب کی نظروں میں سختی جھلکی "مجھ سے پوچھے بغیر آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔"

"میں معافی چاہتا ہوں سر! وہ ہمارے پرانے کسٹمر ہیں۔"

"چلو' ٹھیک ہے۔" مجیب نے لفافہ لے کر رقم چیک کی۔

صابر اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ مجیب کی آنکھیں بے حد چمک دار تھیں اور ہر تاثر پہلے وہیں آتا تھا۔ وہ بلاشبہ بے حد زندہ اور خوب صورت آنکھیں تھیں۔ اس

شخص کی شخصیت خاصی سحر انگیز ہے۔ وہ سوچ رہا تھا۔

مجیب کو احساس ہوا کہ ریسپشنسٹ ابھی گیا نہیں ہے "کوئی اور بات؟" اس نے سر اٹھایا۔

"بات یہ ہے سر کہ میں آپ کا فین ہوں۔ آپ کی تحریروں نے بہت متاثر کیا ہے مجھے اور آپ کے انٹرویو نے تو پاگل ہی کر دیا۔"

مجیب بے ساختہ مسکرایا "اچھا۔۔۔ غفور نے تمہارا تذکرہ کیا تھا؟"

"جی ہاں۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ آپ کا یہاں قیام میرے لئے کس قدر خوشی لایا ہے۔ آپ سے ملاقات میرے لئے ایک اعزاز ہے۔"

"محبت ہے آپ کی۔"

"آپ ہیں ہی محبت کے قابل۔ میری ایک کزن ہے' ان دنوں انڈیا سے آئی ہوئی ہے۔ وہ تو دیوانی ہے آپ کی۔"

مجیب اس بات پر زیادہ توجہ نہ دے سکا۔ اس کا ذہن باتھ روم کے دوسرے دروازے میں الجھا ہوا تھا۔

"ایک گزارش ہے آپ سے" صابر نے کہا "کل رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔۔۔ میرے گھر پر۔ صفورہ آپ سے مل کر بہت خوش ہو گی۔"

"کون صفورہ؟" مجیب کے لہجے میں الجھن تھی۔

صابر نے اس کی بے دھیانی محسوس کر لی تھی "میری انڈیا والی کزن!" اس نے وضاحت کی "وہ تو خوش ہو جائے گی آپ سے مل کر۔"

"عزت افزائی کا بہت شکریہ۔۔۔"

"سر۔۔۔ میرا نام صابر ہے۔"

"ہاں صابر' بات یہ ہے کہ اس بار میں جلد از جلد واپس جانا چاہتا ہوں ورنہ یہ میرے لئے اعزاز ہوتا' خوشی کی بات ہوتی۔ اگلے ماہ میں پھر آؤں گا' اس وقت دیکھیں گے۔"

صابر مایوس تو ہوا لیکن اس نے اصرار نہیں کیا "ٹھیک ہے جناب! لیکن میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حکم کیجئے۔"

مجیب کو پھر باتھ روم کے دوسرے دروازے کا خیال آگیا "یہ میرے باتھ روم کا دوسرا دروازہ کہاں کھلتا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"برابر والے کمرے میں سر۔ یہ فیملی روم ہے۔ باتھ کامن ہوتا ہے۔"

"یہ کمرا تم کسی اور کو دے دو گے تو بڑی پرابلم ہو گی۔۔۔ میرے لئے بھی۔۔۔ اور اس مہمان کے لئے بھی۔"

"ایسا ہوتا نہیں ہے سر۔۔۔ اور اب تو جب تک آپ اس کمرے میں ہیں' میں یہ کمرا کسی اور کو دوں گا بھی نہیں۔"

مجیب انور یوں مطمئن نظر آنے لگا جیسے کوئی بڑا مسئلہ حل ہو گیا ہو "ضرورت پڑی تو یہ کمرا میں ہی لے لوں گا۔" اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

صابر نے اسے الجھن بھری نظروں سے دیکھا۔ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی پھر بھی اس نے کہا "یور آر ویل کم سر! اب میں چلتا ہوں۔ کل آٹو گراف بک لاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے صابر' شکریہ!"

صابر جانے لگا تو مجیب نے اسے پکارا "ایک زحمت کرو گے صابر؟"

"حکم کریں سر!"

"ویٹر کو بھیج دینا" مجیب نے کہا اور کہتے کہتے چور سا ہو گیا۔ اس نے جلدی سے وضاحت کی "مجھے کھانا منگوانا ہے۔"

"بہتر سر!" صابر نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔



سلیم کھانے کے برتن سمیٹتے ہوئے کن انکھیوں سے مجیب کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ مجیب کچھ کہنا چاہ رہا ہے لیکن ہچکچا رہا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ کیا بات کرنا چاہتا ہے۔ وہ برتن سمیٹ کر ٹرے میں رکھتے ہوئے زیر لب مسکرایا۔ کام وہ آہستگی سے کر کے اپنے طور پر مجیب کو حوصلہ مجتمع کرنے کی مہلت دے رہا تھا۔

سلیم برسوں سے یہ کام کر رہا تھا۔ ہر طرح کے لوگوں سے اس کا واسطہ پڑتا تھا۔ مجیب انور اس کے لئے نئی ورائٹی نہیں تھا۔ جو لوگ شرافت کا لبادہ اوڑھے ہوئے

ہوں' وہ یونہی ڈرتے' گھبراتے اور جھجکتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جن لوگوں کا لبادہ دبیز ہو' وہ خواہش اور ارادے کے باوجود بات کر ہی نہیں پاتے۔ ایسے لوگوں سے خود ہی بات کرنی پڑتی ہے۔

اس نے برتن ٹرے پر رکھے اور ٹرے لے کر اٹھا۔ اس نے مجیب کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اس کے چہرے پر کشمکش کا تاثر تھا پھر اس نے گہری سانس لی اور نظریں جھکا لیں۔ سلیم نے سمجھ لیا کہ اس شخص کی شرافت کا لبادہ بہت دبیز ہے۔ سلیم کو ایسے لوگوں پر بہت ترس آتا تھا۔ ان کی مشکل آسان کرنا وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ وہ تو تھا ہی خدمت گزار....

وہ اٹھا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔



کوشش کے باوجود مجیب کی زبان نہیں کھلی تھی۔ وہ بری طرح جھنجلا رہا تھا مگر یہ حقیقت تھی کہ اس طرح کی بات منہ سے نکالنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ اس کی عزت اور وقار کے منافی تھا۔ یوں حقیر اور ذلیل ہونے سے تو بہتر تھا کہ وہ دو راتوں کی اذیت اور اٹھا لے۔

وہ برتن سمیٹتے ہوئے ویٹر کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ جتنی سست رفتاری سے برتن سمیٹ رہا تھا' وہ معنی خیز تھا۔ اس سے اسے امید بندھنے لگی کہ شاید ویٹر خود ہی بات چھیڑ دے گا۔

ویٹر نے برتن سمیٹ کر ٹرے پر رکھے اور ٹرے لے کر اٹھا تو مجیب کا عجیب حال تھا۔ اس لمحے وہ ایک منقسم آدمی تھا۔ دل کہتا تھا کہ ویٹر پیشکش کرنے کے بعد بری الذمہ ہو چکا ہے۔ اب اسے خود بات کرنی چاہئے.... اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو' جیب میں زر ہو اور وہ چیز بازار میں موجود ہو تو بڑھ کر خرید لینے میں کوئی برائی نہیں لیکن ذہن نے اس خیال کو پہلے ہی لمحے مسترد کر دیا اور چند لمحے کی کشمکش کے بعد مجیب انور نے ذہن کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور سر جھکا لیا۔

اب وہ ابھی سے رات کی اذیت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے پتہ بھی نہیں

چلا کہ ویٹر دروازے پر پہنچ کر رک گیا ہے۔ اسے تو ویٹر کی آواز نے چونکا دیا۔ "سر جی....!"

اس نے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ویٹر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے دل میں پھر امید جاگی "کیا بات ہے؟" اس نے سرد لہجے میں پوچھا۔



دروازے پر پہنچ کر سلیم رکا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ کسٹمر سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر سلیم کو اس پر اور زیادہ ترس آنے لگا۔

سلیم ڈرامائی تاثر اجاگر کرنے کا شدت سے قائل تھا۔ اس نے آہستہ سے پکارا "سر جی....!"

کسٹمر نے جھکا ہوا سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ سلیم اس وقت براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھرنے والی چمک اس سے چھپی نہ رہ سکی لیکن جب وہ بولا تو اس کی آواز میں بے مہری تھی اور اس کا لہجہ سرد تھا "کیا بات ہے؟"

"سر جی پھر کیا سوچا آپ نے؟" سلیم نے پوچھا۔

"کس بارے میں؟"

ایسے سوالیہ جوابوں سے سلیم کا واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ اس کا پیشہ ہی ایسا تھا' جو بے غیرتی کو پہنچی ہوئی ڈھٹائی کا متقاضی تھا.... اور تغافل مقابل کا حق تھا۔ "میں نے آپ کو پیشکش کی تھی نا سر جی!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "کیا فائدہ' جب اکیلے میں آپ کو نیند نہیں آتی' خوامخواہ تکلیف کیوں اٹھائیں آپ؟"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن...." کسٹمر اب بھی ہچکچا رہا تھا "بات یہ ہے کہ میں بہت عزت دار آدمی ہوں اور مجھے عزت کا پاس بھی ہے۔"

"آپ اس کی فکر نہ کریں سر' کسی کو پتہ نہیں چلے گا۔"

"ہوٹلوں پر چھاپے بھی تو پڑتے ہیں۔"

سلیم دل ہی دل میں ہنسا۔ یہ کسٹمر زیادہ اسپیشل کیس معلوم ہو رہا تھا۔ "نہیں سر جی' اگر ایسے چھاپے پڑنے لگیں تو ہوٹلوں میں ٹھہرے گا کون۔ بزنس ہی چوپٹ ہو

جائے گا" اس نے اطمینان دلایا۔

"میں نے تصویریں تک دیکھی ہیں چھاپوں کے بعد کی" کسٹمر نے ذرا اکھڑ کے کہا۔

"برسوں میں کبھی ایسا ہو جاتا ہے سر جی!" سلیم نے کہا "ورنہ آپ خود سوچیں...."

"اس کی کیا گارنٹی ہے کہ برسوں کے بعد آج ہی ایسا نہیں ہو گا.... میرے ساتھ۔"

"سر جی' ایسا ہوتا نہیں ہے...."

"میری بات کا جواب دو" کسٹمر نے اس کی بات کاٹ دی "تم گارنٹی دے سکتے ہو؟"

"نہیں سر جی!" سلیم نے چند لمحے سوچا پھر بولا "ایک محفوظ صورت بھی ہے۔ خرچہ زیادہ ہو جائے گا۔"

"مطلب؟"

"برابر والا کمرا آپ لے لیں۔"

کسٹمر کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر سلیم نے جان لیا کہ تیر نشانے پر بیٹھا ہے "ہاں' یہ ٹھیک ہے" کسٹمر نے کہا "مگر میں کچھ اور باتیں بھی واضح کرنا چاہتا ہوں۔ دیکھو' میں اس طرح کا آدمی نہیں ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ میرا پہلا...." وہ کہتے کہتے ہچکچایا "... یہ پہلا موقع ہے.... اور میرا مقصد.... عیاشی نہیں' مجبوری ہے۔ میں کسی بند جگہ پر اکیلا رہ ہی نہیں سکتا۔ ہاں' کوئی ساتھ ہو تو مجھے آسانی سے نیند آ جائے گی۔"

سلیم دل ہی دل میں ہنسا۔ ایسے موقعوں پر اسے اپنا آپ برا لگنے لگتا تھا۔ کیسے کیسے لوگ اس کے سامنے صفائی پیش کرتے ہیں۔ "میں سمجھتا ہوں سر جی!" اس نے منہ پکا کر کے کہا "ہم تو ایک نظر میں بندے کو پہچان لیتے ہیں جی۔"

"میری پوری بات سن لو" کسٹمر نے بدمزگی سے کہا "مجھے کوئی ایسا ساتھی چاہئے جو.... جو.... جو پروفیشنل نہ لگے.... اپنی صورت سے' انداز سے' گفتگو سے۔ جس سے باتیں کر کے خوشی ہو۔"

"میں سمجھ رہا ہوں سر جی۔ آپ فکر نہ کریں" سلیم نے کہا اور دروازے کے

ہینڈل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"سنو.... ایک بات اور...."

سلیم نے پلٹ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"برابر والا کمرا لو گے تو تمہارے ریسپشنسٹ کو بھی پتہ چل جائے گا۔ یہ میں نہیں چاہتا۔"

"اس کی تو پانچ بجے ڈیوٹی ختم ہو جائے گی سر جی!"

"بس' ٹھیک ہے۔"

سلیم کمرے سے نکل آیا۔



ویٹر کے جانے کے بعد مجیب نے سکون کی گہری سانس لی۔ اب وہ مطمئن تھا۔ رات کا ڈر اور خوف ابھی سے مٹ گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اب رات کو وہ سکون سے سو سکے گا۔ سینے پر سے ایک بوجھ سا ہٹ گیا تھا۔ برابر والے کمرے کی موجودگی نے اسے بالکل بے فکر کر دیا تھا۔

مجیب کو کبھی اس بات کا احساس نہیں ہوا تھا کہ اسے اپنے امیج کی اتنی فکر رہتی ہے۔ البتہ اس تجربے کے بعد اسے اس بات کا بہ خوبی احساس ہو گیا تھا۔ چھاپے کا ڈر! یہ دوسروں کو بھی ہوتا ہو گا مگر اس سے دنیا میں کہیں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ لوگوں کی سرگرمیاں ختم نہیں ہوئی تھیں.... زندگی کی طرح.... جاری رہی تھیں.... لیکن اسے ڈر تھا.... اس حد تک کہ برابر والے کمرے کے تحفظ کے باوجود بھی وہ ڈر رہا تھا۔ دوسری طرف اسے یہ فکر تھی کہ ریسپشنسٹ کو پتہ نہ چلے۔ استقبالیہ کلرک اس کا رشتے دار نہیں تھا' دوست نہیں تھا.... حد یہ کہ کوئی جاننے والا بھی نہیں تھا۔ وہ تو لاکھوں انسانوں کی طرح اس کی تحریروں کا پرستار تھا اور بس۔

یہی تو سب سے بڑی بات ہے - اس نے سوچا' اپنی تحریروں کے پرستار میرے لئے دنیا میں سب سے زیادہ اہم ہیں۔ میں ان کے سامنے نیچا نہیں ہونا چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ ان کے سامنے میرا کوئی ناپسندیدہ روپ آئے۔ وہی تو میرا سرمایہ.... میری عمر بھر کی کمائی ہیں۔ میں ان کے سامنے سبک سر نہیں ہونا چاہتا' کبھی نہیں۔

تو یہ جذبہ تو انسان کو بہت اچھا انسان بنا سکتا ہے۔ اس کے اندر سے کسی نے کہا۔
مجیب اچھل پڑا۔ الحمد للہ اچھا انسان تو میں ہوں۔ اس نے بلند آواز میں خود کلامی کی۔ اصل بات یہی ہے۔ میں کسی برائی میں نہیں ہوں۔ اپنی ایک نفسیاتی کمزوری کے لئے کور تلاش کر رہا ہوں۔ اگر میں برا ہوتا.... عیاش ہوتا تو مجھے اس بات کی پروا تو ہوتی... مگر اتنی نہ ہوتی لیکن یہ تو بہت برا ہو گا کہ میں عیاش طبع نہ ہوتے ہوئے دوسروں کے سامنے ایک اوباش آدمی کی حیثیت میں آؤں۔ خوامخواہ....

وہ اٹھا اور باتھ روم کی طرف چل دیا۔ باتھ روم میں اس نے دوسری طرف والا دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ حیرت انگیز طور پر دروازہ کھل گیا۔ چند لمحے وہ ساکت کھڑا رہا۔ پھر اس نے دوسرے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ کمرا بھی اس کے کمرے جیسا ہی تھا۔ سب کچھ ویسا ہی تھا۔ مگر اسے یہ احساس ستانے لگا کہ وہ مداخلت کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اسے اس کمرے میں موجودگی کا کوئی حق نہیں۔ وہ الٹے قدموں باتھ روم میں آ گیا۔

باتھ روم سے نکلتے ہوئے اسے خیال آیا کہ اس نے دوسرے کمرے میں کھلنے والا دراوزہ بند نہیں کیا ہے۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ اب وہ دوسری طرف سے چٹخنی بند نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اپنی طرف سے چٹخنی چڑھا دی۔
اسے اپنے بااختیار ہونے کا خوش کن احساس ہونے لگا۔



صابر ساڑھے چار بجے معمول کے مطابق کیش چیک کر رہا تھا۔ پانچ بجے اس کی ڈیوٹی آف ہونا تھا۔ وہ اس کی تیاری کر رہا تھا۔
اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف ہوٹل کا منیجر تھا
"یس سر!" اس نے کہا۔
"ابھی عباس کا فون آیا ہے۔ اس کی بیوی کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے۔ وہ اسے اسپتال لے کر جا رہا ہے۔"
صابر کا دل ڈوبنے لگا۔ عباس بھی استقبالیہ کلرک تھا۔ اسے عباس ہی کو چارج دینا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔

"کیا ہوا، بولتے کیوں نہیں؟" دوسری طرف سے منیجر نے کہا۔
"کچھ نہیں سر۔ میرے ہاں آج ہی انڈیا سے مہمان آئے ہیں۔"
"آئی ایم سوری مگر یہ تو ایمرجنسی ہے اور رشتے دار تو تمہارے کافی عرصہ رہیں
"انڈیا سے جو آئے ہیں۔"
"یس سر!"
"بس تو تم ڈبل ڈیوٹی کر لو۔"
"یس سر!"

اس نے فون رکھ دیا۔ عباس سے اس کے اچھے خاصے تعلقات تھے اور وہ جانتا تھا یہ وقت آنے والا ہے۔ عباس کے ہاں زچگی ہونے والی تھی۔ اسے عباس کی جگہ کرنے میں کوئی تامل نہیں تھا۔ مہمانوں سے تو اس نے رات خوب باتیں کی تھیں وہ ابھی جانے والے بھی نہیں تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کی نیند پوری نہیں ہوئی۔ اب تک تو اس نے گزارہ کر لیا تھا لیکن ڈبل ڈیوٹی آسان نہیں تھی۔ دوسرے نے سوچا تھا کہ ڈیوٹی آف کر کے کچھ دیر مجیب کے ساتھ بھی گزارے گا۔
بہرحال اب کیا ہو سکتا ہے۔ قہر درویش بر جان درویش۔ اس نے درواز بند کر

ایک گھنٹے بعد سلیم اس کے پاس آیا "کیا بات ہے سر! آپ چھٹی نہیں کریں

"نہیں۔ مجھے ڈبل ڈیوٹی دینی ہے۔ عباس کی بیوی کی حالت بہت خراب ہے۔" نے اسے بتایا۔
"یہ تو بہت برا ہوا" سلیم پر تشویش لہجے میں بولا۔
صابر نے حیرت سے اسے دیکھا "کیوں بھئی۔ اس میں کیا برائی ہے؟"
"کچھ نہیں سر!" سلیم نے گڑبڑا کر کہا اور ایک طرف چلا گیا۔ صابر کی حیرت اب فع نہیں ہوئی تھی۔ سلیم کا انداز ایسا تھا، جیسے اس کی ڈبل ڈیوٹی سے اس کا کچھ ہو رہا ہو لیکن کیا؟ یہ وہ نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ غور کرنے پر بھی بات سمجھ میں آئی۔ اس نے سر جھٹکا اور کام میں مصروف ہو گیا۔ 312 کا گیسٹ اس سے چابی

طلب کر رہا تھا۔

نیند کی بھی عجیب فطرت ہے۔ سونے کا امکان نہ ہو تو کبھی کبھی اڑ بھی جاتی ہے.... اور کبھی زیادہ آنے لگتی ہے۔ خوش قسمتی سے صابر کے ساتھ پہلا معاملہ ہوا۔ نیند یوں اڑی جیسے صبح وہ نیند سے زیادہ سو کر اٹھا ہو۔ وہ تازہ دم ہو گیا۔

سات بجے اچانک اسے خیال آیا کہ گھر میں لوگ پریشان ہو رہے ہوں گے۔ انہیں بتا دیا جائے۔ اس نے آپریٹر کو گھر کا نمبر ملانے کی ہدایت کی۔ وہ ناظمہ سے فون پر بات کر ہی رہا تھا کہ اس نے مجیب کے پبلشر کو زینوں کی طرف جاتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں بیگ تھا۔



"گھر کیسے ایک دم سونا ہو گیا" صفورہ نے ناظمہ سے کہا۔

"ہاں۔ اتنے سارے لوگ چلے گئے نا" ناظمہ بولی "اتنا تو روکا کہ دو چار دن یہاں بھی رک جائیں۔"

"واپسی میں ایک ہفتہ آپ کے ہاں رکیں گے وہ لوگ۔"

چچا جان' چچی جان اور ان کی بیٹیاں ابھی دو گھنٹے پہلے یہاں سے گئے تھے۔ ان پروگرام چچی کے بھائی کے ہاں قیام کا تھا۔ ان کے جاتے ہی گھر ایک دم سونا ہو گیا۔ دن بھر آوازوں سے جو بھرا رہتا تھا' تو اب سناٹا لگ رہا تھا۔

"تم لوگ نہیں تھے تو یہ احساس نہیں ہوتا تھا" ناظمہ کہہ رہی تھی "گھر کے جتنے افراد ہیں' وہی ہوتے تھے۔ اب تم ہو تب بھی سونا لگ رہا ہے۔"

صفورہ نے اثبات میں سر ہلایا پھر چونک کر بولی۔ "ارے.... صابر بھائی کہاں ہیں؟"

"انہیں ڈبل ڈیوٹی کرنی پڑ گئی۔ یہ بھی آج ہی ہونا تھا۔"

"کب آئیں گے؟"

"دو بجے چھٹی ہو گی۔ یہاں پہنچتے پہنچتے ڈھائی تو بج ہی جائیں گے۔"

"خدایا۔ گویا آج ملاقات نہیں ہو گی۔"

"تم ٹی وی دیکھو جب تک۔ میں کھانے کا کرتی ہوں۔"

صفورہ اٹھ کھڑی ہوئی "میں بھی چلتی ہوں۔ ہاتھ تو کیا بٹاؤں گی' ہاں باتیں کر

رہوں گی۔"

ناظمہ کھل کھلا کر ہنس دی۔ "چلو۔"



نو بجے تک سلیم کی تشویش انتہا کو پہنچ گئی۔ اس نے ارشد کو پوری صورت حال بتائی "اس سے کیا فرق پڑتا ہے" ارشد نے بے پروائی سے کہا "صابر بھائی نہیں ہوتے تو عباس بھائی ہوتے۔ کمرا تو انہیں بتائے بغیر نہیں مل سکتا۔"

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں" سلیم نے بھنا کر کہا "پر کسٹمر ہی اوندھا ملا ہے مجھے۔"

"تجھے بہلانا نہیں آتا" ارشد نے مضحکہ اڑایا۔

"تو جانتا ہے مجھے۔" سلیم کو تاؤ آ گیا۔

"تو پھر پریشان کیوں ہو رہا ہے؟"

سلیم سیدھا صابر کے پاس چلا گیا۔ اس وقت استقبالیہ پر کوئی نہیں تھا "سر جی 202 کی چابی تیار رکھیں" اس نے دھیرے سے کہا۔

"202 " صابر بری طرح چونکا "وہ تو نہیں دے سکتا۔ 201 میں مجیب صاحب ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"او۔ سر جی! کیا پتہ چلے گا انہیں۔"

"بے خبری میں دے دیتا تو اور بات تھی" صابر نے کہا "لیکن انہوں نے خود منع کیا تھا مجھے۔"

سلیم نے تصور میں اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے پیٹا۔ تو صاحب بہادر صابر صاحب سے اس سلسلے میں بات بھی کر چکے ہیں۔ اب کیا ہو سکتا ہے' پردہ تو نہیں رکھا جا سکتا۔

"یہ انہی صاحب کی فرمائش ہے سر جی!" اس نے دل کڑا کر کے کہا۔

صابر کے چہرے پر زلزلے کا سا تاثر ابھرا "یہ کیا کہہ رہے ہو؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں سر جی۔ انہی کا مہمان ٹھہرے گا اس کمرے میں۔"

"اوہ.... تو یہ بات ہے۔ مجیب صاحب واقعی شوقین نکلے۔" صابر کے لہجے میں دکھ

"تو اس میں بری بات کیا ہے سر!"

"کوئی نہیں۔ نادانی تو ہماری ہے.... ہم پڑھنے والوں کی۔ تحریر سے امیج بناتے ہیں۔ مجھ سے کبھی کسی نے کہا تھا کہ یہ لکھنے والے لوگ ملنے ملانے کی چیز نہیں ہوتے۔ ان سے مل کر تکلیف ہی اٹھاتا ہے آدمی۔ اس وقت بات سمجھ میں نہیں آئی تھی' اب آئی ہے۔ تحریروں میں بہت اچھے' عمل میں بہت کھوٹے ہوتے ہیں۔"

"سر جی.... ایک بات کہوں؟" سلیم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"کہو!" صابر کا انداز پھاڑ کھانے والا تھا۔

"صاحب کو اندازہ نہ ہو کہ آپ کو یہ بات معلوم ہے۔"

"کیا مطلب' کیوں؟"

"وہ نہیں چاہتے کہ آپ کو یہ معلوم ہو۔"

"شکر ہے۔ اپنے امیج کا اتنا خیال تو ہے انہیں" صابر نے زہریلے لہجے میں کہا "میں بھی یہ نہیں چاہوں گا۔"

"اول تو وہ نیچے نہیں آئیں گے۔" سلیم بولا "اور آئیں گے بھی تو آپ ان کا سامنا نہ کریں۔"

"ظاہر ہے' کر ہی نہیں سکتا۔ گناہ گار جو ہوں۔" صابر نے تپ کر کہا۔

اسی وقت اسے پبلشر غفور زینوں سے اترتا دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ مجیب انور بھی تھا۔ اس کی نظر اس طرف نہیں اٹھی تھی۔ صابر نے بڑی پھرتی سے غوطہ لگایا اور ڈیسک کے نیچے دبک گیا۔ "آ جائیں تو تم سنبھال لینا" اس نے سلیم سے کہا۔

لیکن وہ دونوں اس طرف آئے ہی نہیں۔ مجیب نے نیچے اتر کر غفور کو رخصت کیا اور اوپر چلا گیا۔



مجیب انور بہت مطمئن تھا۔ غفور اس کے لئے ریزرویشن لے آیا تھا.... تیسرے دن کی۔ گویا اسے آج کی اور اگلی رات لاہور میں گزارنا تھی۔ بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ تنہائی سے تحفظ کا سامان پہلے ہی ہو چکا تھا۔

غفور دستاویزات بھی مکمل کرا لایا تھا۔ مجیب نے ان کا تفصیلی جائزہ لے لیا تھا۔

اگلے روز اسے غفور کے ساتھ جانا تھا اور اوتھ کمشنر کے سامنے معاہدے پر دستخط کرنا تھا۔ اوتھ کمشنر کی تصدیق کے بعد کاغذات مکمل ہو جاتے۔

وہ غفور کو رخصت کرنے نیچے تک گیا۔ لابی میں اسے رخصت کرنے کے بعد اس نے استقبالیہ کی طرف دیکھا۔ وہاں اس وقت کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے سکون کی سانس لی۔ یہ خیال طمانیت بخش تھا کہ اس کا فین استقبالیہ کلرک.... صابر چھٹی کر کے جا چکا ہے۔

اوپر آ کر اس نے وقت دیکھا۔ سوا نو بجے تھے۔ اس نے فون پر کھانے کا آرڈر دیا۔ بہت زور کی بھوک لگی تھی۔

دس منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی "کم ان" اس نے پکارا۔

یہ دیکھ کر اسے مایوسی ہوئی کہ کھانا لانے والا ویٹر اس کے لئے اجنبی ہے۔ ویٹر نے کھانے کی ٹرے رکھی اور پلیٹیں سلیقے سے میز پر رکھنے لگا پھر اس نے مجیب سے کہا "کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا لیجئے گا۔"

کھانے کے دوران میں مجیب اسی الجھن میں رہا کہ اس کا ویٹر کہاں غائب ہو گیا۔ اس نے تو کہا تھا کہ اس کی ڈیوٹی دس بجے تک ہے اور اس نے کوئی وعدہ بھی کیا تھا!

وہ بہت آہستہ آہستہ کھانا کھاتا رہا۔ بھوک تو اب بھی لگ رہی تھی مگر کھانا اس طرح نہیں کھایا جا رہا تھا۔ وہ فکر مند ہو گیا تھا۔ کیا آج کی رات بھی کل کی طرح....؟ یہ خیال اس کے لئے سوہان روح تھا۔

وہ بے دلی سے کھانا کھا ہی رہا تھا کہ دروازے پر پھر دستک ہوئی "آ جاؤ" اس نے منہ بنا کر کہا۔



قدموں کی آہٹ سن کر صابر نے سر اٹھایا۔ لڑکی اسے دیکھ کر مسکرائی۔ صابر نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ وہ جو کچھ تھی' اس کے چہرے پر لکھا تھا۔ صابر ایسے چہرے دیکھتا ہی رہتا تھا لیکن وہ اس کے لئے اجنبی تھی۔ چہرے پر بے ڈھنگے پن سے کئے گئے میک اپ کی تہیں' بھڑکیلا لباس اور نگاہوں میں بے باکی۔ اس کی ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔ غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوگیا کہ وہ نروس تھی مگر چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔

صابر نے روایتی خوش خلقی سے کہا "جی فرمائیے؟" مگر اس کا لہجہ حقارت لئے ہوئے تھا۔

لڑکی نروس انداز میں مسکرائی۔ اس کے ہونٹ لرزے لیکن آواز نہیں نکلی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

"جی فرمائیے۔" صابر نے دہرایا۔ لہجے کی حقارت بڑھ گئی تھی۔

اسی وقت سلیم تیز قدموں سے ڈیسک کی طرف آیا "سر جی' یہ 202 کی گیسٹ ہیں" اس نے صابر سے کہا "چابی دے دیں۔"

صابر کا منہ بن گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر رجسٹر اٹھایا اور کھولا "آپ کا نام؟" اس نے لڑکی سے کہا "شناختی کارڈ دیجئے پلیز!"

لڑکی نے ہینڈ بیگ کھولا۔ سلیم نے جلدی سے کہا "رجسٹر کو چھوڑیں نا سر جی!"

"جانتے ہو' آج کل کتنی سختی ہے۔"

"ٹھیک ہے سر جی۔ ڈپازٹ 201 کے کھاتے میں ڈال دیں" سلیم نے کہا۔ صابر کے تیور دیکھتے ہوئے اس نے اضافہ کیا "گیسٹ تو وہ آپ ہی کے ہیں۔"

صابر سے چابی لے کر سلیم نے لڑکی کے بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا "لائیے میڈم!" بیگ تھامنے کے بعد وہ بولا "آئیے میرے ساتھ!"

لڑکی اس کے پیچھے چل دی۔ زینہ سنسان تھا۔ سلیم نے ادھر ادھر دیکھا پھر لڑکی

دھیمی آواز میں بولا۔ "میں بتا چکا ہوں' یہ اور طرح کا کسٹمر ہے۔"

"تم جانتے ہو کہ میں ہر طرح کے کسٹمر کو بھگت چکی ہوں" لڑکی استہزائیہ انداز ہنسی "مجھے تو لگتا ہے' یہ لفظ بنا ہی مردوں کے لئے ہے۔"

"ہاں۔ باتوں کا یہ اسٹائل اچھا رہے گا۔ وہ رائٹر ہے۔"

"مگر میں اچھی کہانی نہیں ہوں۔"

سلیم نے کمرا نمبر 202 کا دروازہ کھولا اور ہاتھ پھیلاتے ہوئے تمسخرانہ لہجے میں کہا "یہ ہے آپ کا کمرا میڈم' دیکھ لیجئے۔"

لڑکی کے پیچھے وہ بھی کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے بیگ میز پر رکھ دیا۔ لڑکی سیدھی باتھ روم میں گئی تھی۔ اس نے درمیانی دروازے کو دھکیلا۔ "یہ تو اس طرف سے بند ہے۔" اس نے کہا۔

"ابھی کھل جائے گا۔"

"نہ کھلے تو مجھے کیا" لڑکی نے کہا اور عجیب انداز سے ہنسنے لگی۔ "خوامخواہ کی فضول خرچی ہے۔ بے عزت لوگوں کو عزت کی زیادہ ہی فکر ہوتی ہے۔"

"میں جا رہا ہوں۔ یہ دروازہ کھول دوں گا۔" سلیم نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔



مجیب نے سر اٹھا کر دیکھا۔ آنے والا وہی ویٹر سلیم تھا۔ وہ اسے دیکھ کر خوش ہو گیا۔ "سر' کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟" سلیم نے پوچھا۔

"نہیں شکریہ!" مجیب نے خشک لہجے میں کہا "تم کہاں غائب ہو گئے تھے۔"

"آپ ہی کے کام کی فکر میں لگا ہوا تھا سر جی!" سلیم معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

مجیب نے سر جھکایا اور جیسے کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ ویٹر سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کام بنا یا نہیں لیکن پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ البتہ مسکراہٹ سے حوصلہ افزا نتیجے کا امکان ضرور نظر آ رہا تھا۔

سلیم وہیں کھڑا رہا "کام بن گیا ہے سر جی!" اس نے دانستہ ذرا انتظار کرانے کے بعد کہا "آپ کا مہمان برابر والے کمرے میں موجود ہے۔"

"ہوں.... اچھا۔ ٹھیک ہے۔" مجیب نے آخری نوالے سے پلیٹ صاف کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے جگ سے گلاس میں پانی انڈیلا "برتن سمیٹ لو۔"

سلیم برتن سمیٹنے لگا۔ مجیب نے پوچھا "کیا دینا ہے؟"

"ایک ہزار سرجی!" سلیم نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

مجیب نے گن کر ہزار اس کی طرف بڑھائے پھر سو کا ایک نوٹ الگ سے دیا "یہ لو۔ یہ تمہارے لئے۔"

سلیم کھل اٹھا "شکریہ سرجی!" اس نے کہا پھر معنی خیز لہجے میں بولا "اور کوئی خدمت سر؟"

"نہیں۔ میرے لئے اتنا ہی کافی ہے" مجیب نے خشک لہجے میں کہا "ہاں' چائے ضرور لے آؤ۔"

"میری ڈیوٹی ختم ہو رہی ہے سر۔ ساجد چائے لے آئے گا.... وہی رات والا ویٹر!"

"ٹھیک ہے۔"

سلیم نے برتن ٹرے پر رکھے پھر ٹرے اٹھانے کے بجائے باتھ روم کی طرف بڑھا

"وہاں کیوں جا رہے ہو؟" مجیب نے پکارا۔

سلیم نے پلٹ کر حیرت سے اسے دیکھا "دروازہ ادھر سے بند ہے سرجی' اسے کھولوں گا۔"

"رہنے دو۔ میں خود کھول دوں گا مناسب وقت پر" مجیب نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "ہاں' تم ادھر سے بھی پوچھ لو۔ جس چیز کی ضرورت ہو' دے دو۔"

"ٹھیک ہے سرجی!" سلیم ٹرے اٹھا کر چلا گیا۔



چائے کی پیالی خالی کرنے کی بعد مجیب نے کرسی سے ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلائیں اور سگریٹ سلگائی۔ ذرا دیر بعد ویٹر برتن لے گیا۔ مجیب اپنی جگہ بیٹھا سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ اب اسے گھبراہٹ بھی ہو رہی تھی اور تجسس بھی تھا لیکن گھبراہٹ زیادہ تھی۔ خوامخواہ محض اپنی ایک کمزوری کی وجہ سے وہ ایک ایسی چیز میں ملوث ہو رہا تھا'

جو اس کے لئے قابل قبول نہیں تھی۔ یہ بات خوش آئند تھی کہ معاملہ اپنے اختیار میں تھا۔ وہ چاہتا تو درمیانی دروازہ کھولتا ہی نہیں اور اس کیچڑ سے محفوظ رہتا۔

اس نے آخری کش لے کر سگریٹ بجھا دیا۔ تجسس بھی کم طاقت ور نہیں تھا۔ وہ ایک کہانی نویس تھا۔ مشاہدہ اور تجربہ اس کی ضرورت تھی اور یہ مشاہدہ.... یہ تجربہ اس کے لئے بالکل نیا تھا۔ اس نے ایسا کوئی کردار کبھی دیکھا بھی تھا تو یا تخیل کے زور پر.... یا قلم کے مشاہدے سے۔ جبکہ آج ایک جیتا جاگتا کردار اس کی دسترس میں تھا۔

اس کا مطلب ہے کہ مشاہدے اور تجربے کے نام پر جو جی چاہے' کرتے پھرو۔ اس کے اندر کسی نے اسے لتاڑا۔ یہ بات نہیں ہے۔ اس نے خود سے کہا۔ میں نے تو صرف اپنے خوف کی وجہ سے یہ گوارا کیا ہے۔ ایسے کرنے والا ہوتا تو یہ سب پہلے ہی کر لیتا۔

تو پھر جب تک خوف نہ ستائے' درمیان کا دروازہ نہ کھولنا' ضمیر نے فیصلہ سنایا۔

اس نے ضمیر کے فیصلے کو قبول کر لیا۔ کوئی آدھے گھنٹے بعد دروازے پر دستک سنائی دی "آ جاؤ" اس نے خاصی بلند آواز میں پکارا لیکن کوئی اندر نہیں آیا اور دستک کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اسے اچانک ہی احساس ہوا کہ دستک باتھ روم کے اندر اس دروازے پر ہو رہی ہے جو دوسرے کمرے میں کھلتا ہے۔

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اسے لگا کہ دستک کی وہ آواز پورے ہوٹل میں گونج رہی ہو گی۔ سب سن رہے ہوں گے۔ وہ گھبرا کر باتھ روم میں گیا۔ اس کا ہاتھ خود کار انداز میں چٹخنی کی طرف بڑھا مگر اس نے بروقت خود کو روک لیا۔ خیال آ گیا تھا کہ اس کے کمرے کا دروازہ ابھی کھلا ہوا ہے "کیا بات ہے؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

"دروازہ کھولو نا سر!" دوسری طرف سے نسوانی آواز آئی۔ وہ دھیمی نہیں تھی' خاصی بلند تھی۔

"ابھی نہیں کھول سکتا۔ جب ضرورت ہو گی' کھول دوں گا" اس نے حتمی لہجے میں کہا "تم اپنے کمرے میں آرام سے رہو۔"

"اکیلے کمرے میں دل گھبراتا ہے میرا۔ میں رات کو اکیلے رہنے کی عادی نہیں

ہوں" دوسری طرف سے لڑکی نے اٹھلا کر کہا۔

پہلی ہی قدر مشترک نکل آئی۔ مجیب نے دل میں خود سے کہا۔ میں بھی رات کو اکیلا رہنے کا عادی نہیں ہوں۔ بس نوعیت بے حد مختلف ہے۔ "میں نے کہا نا' ابھی نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں اپنی گھبراہٹ دور کرنے کے لئے کسی کو بلا لوں گی" لڑکی نے بھنا کر کہا پھر جاتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

باتھ روم سے نکل کر مجیب نے سب سے پہلے اپنے کمرے کا دروازہ لاک کیا پھر اس نے کپڑے بدل کر گویا سونے کی تیاری کرلی۔ اس نے گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ گیارہ بج رہے تھے اور آنکھوں میں نیند بھی بھری ہوئی تھی۔ متوقع خوف کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ لگتا ہے' آج میں بے کھٹکے سو جاؤں گا۔ اس نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے سوچا۔ اس نے عادت کے مطابق پڑھنے کے لئے کتاب اٹھائی لیکن پڑھنے میں اس کا دل نہیں لگا۔ وہ اس اسرار کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اجنبی شہر میں' ہوٹل کے کمرے میں اکیلے' رات کے وقت اسے گزشتہ رات کی طرح خوف کیوں نہیں ستا رہا ہے۔ شاید اس تقویت کی وجہ سے کہ برابر والے کمرے میں اس کا کوئی اپنا موجود ہے۔

"ایک رات کا اپنا" ذہن نے فوراً تصحیح کی۔ وہ مسکرا دیا۔ ٹھیک ہے مگر یہ ایسا ہی ہے' جیسے گھر میں دو الگ الگ کمروں میں وہ اور کوئی اور ہو۔ تو ایسے میں ڈر تو نہیں لگتا۔

یہ سوچتے سوچتے اس پر غنودگی طاری ہو گئی۔ اسے پتہ بھی نہیں چلا کہ اس کے تخیل نے کمان سنبھال لی ہے۔ وہ تو نیند کی وادی میں اتر رہا تھا۔

اچانک وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ گھبراہٹ کی وجہ یہ تھی کہ اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی مگر اس آواز سے وہ گھبرایا کیوں' یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ کتاب بستر پر بکھری ہوئی تھی۔ کمرے میں روشنی تھی۔ کیونکہ اس نے لائٹ آف نہیں کی تھی۔ اس نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ چیک کیا۔ وہ لاک تھا۔ وہ باتھ روم میں گیا۔ درمیانی دروازے کی چٹخنی لگی ہوئی تھی۔

وہ پھر اپنے کمرے میں آیا مگر اس دوران خوف اس پر طاری ہو چکا تھا۔ تخیل نے بیدار ذہن پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ شاید لڑکی تنہائی سے گھبرا کر کسی اور کو پکڑ لائی ہے۔

اس نے سوچا اور کیا پتہ' وہ آنے والا کون ہو۔ پولیس کا یا ایجنسی کا کوئی آدمی۔ یا کوئی چور اور ڈاکو۔ درمیانی دروازہ تو موجود ہے۔ ایسے لوگ تو بڑے بڑے تالے کھول لیتے ہیں۔ اتنی سی چٹخنی کی کیا بساط ان کے سامنے۔ لڑکی کے سونے کی بعد کسی بھی وقت وہ اس دروازے سے اس کے کمرے میں آ جائے گا اور پھر....؟

اس کے ذہن کا ایک حصہ مسلسل احتجاج کر رہا تھا کہ یہ نہایت لغو اور دور از کار بات ہے لیکن وہ پوری طرح خوف کے طوفان میں گھر چکا تھا اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔ ایسے میں کون سنتا ہے فغان درویش۔

اس سے زیادہ دیر بستر پر نہیں بیٹھا گیا۔ وہ اٹھ کر مضطربانہ انداز میں ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ وہ باتھ روم میں جاتا' دروازے کی چٹخنی کی طرف ہاتھ بڑھاتا اور کھینچ لیتا۔ الجھن اسی میں تھی کہ درمیانی دروازہ کھول دیا جائے لیکن دوسرے کمرے میں لڑکی کے ساتھ کوئی اور ہوا تو؟ تب بھی وہ اس کے مقابلے میں اکیلا تو نہیں ہو گا۔ لڑکی بھی ہو گی اور اسکے ساتھ اور اگر وہ لڑکی کا ساتھی ہی ہوا تو؟

دیر تک وہ انہی اندیشوں میں الجھتا رہا مگر بالآخر اسے سپر ڈالنا پڑی۔ اس نے بڑی آہستگی سے چٹخنی گرا دی۔ چند لمحے وہ دروازے سے کان لگائے کھڑا رہا۔ دوسری طرف کوئی آہٹ' کوئی آواز نہیں تھی۔ تین چار بار ارادہ کر کے فسخ کرنے کی بعد اس نے دروازے پر ہلکی سی تین دستکیں دے ہی ڈالیں مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ تب اس نے ذرا زور سے دستک دی۔ اس بار دروازے کی طرف آتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی دی پھر کسی نے دروازہ دھکیلا۔

دروازہ کھلا اور لڑکی کا چہرہ نظر آیا تو اس نے سکون کی سانس لی۔ لڑکی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ "میں اندر آ سکتا ہوں؟" اس نے بے حد تہذیب سے پوچھا۔

لڑکی نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا اور کندھے جھٹک دیئے۔ مجیب نے باتھ روم سے نکل کر دوسرے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ مطمئن ہو کر پلٹ آیا۔ لڑکی اب بھی باتھ روم میں کھڑی تھی۔ وہ حیران نظر آ رہی تھی "چلو' آ جاؤ نا" مجیب نے نرم لہجے میں اس سے کہا "حیران کیوں ہو؟"

"سر' آپ نے ناک کیوں کیا۔ آپ کمرے میں آ سکتے تھے پھر آپ نے اجازت بھی مانگی۔" لڑکی نے حیرت سے کہا پھر وضاحت کی۔ "میری آنکھ لگ گئی تھی۔ ہمیں رات میں سونے کا موقع کم ہی ملتا ہے۔"

مجیب کا چہرہ تمتما اٹھا "بغیر اجازت' بغیر دستک کے کسی کے کمرے میں گھسنا خلاف تہذیب ہے۔"

"وہ کمرا بھی آپ ہی کا ہے۔ اس کا کرایہ آپ ہی ادا کریں گے۔" لڑکی نے کہا۔

مجیب نے چونک کر اسے دیکھا مگر چہرے سے نہیں لگا کہ وہ طنز کر رہی ہے "میرا اپنا کمرا تو اپنے گھر میں بھی نہیں کہ جہاں اندر آنے سے پہلے کوئی اجازت مانگے۔"

مجیب اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔ لڑکی بھی اس کے پیچھے تھی۔ "بیٹھو" مجیب نے کرسی کی طرف اشارہ کیا "اور پرسکون ہو جاؤ" اچانک ایک خیال نے اسے پریشان کر دیا۔ "تم نے اس کمرے کا دروازہ اندر سے لاک کر دیا ہے؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔

لڑکی کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ نظر آئی "دروازے کا خیال ہم لوگ کبھی نہیں رکھتے۔ یہ کسٹمر کی ذمے داری ہوتی ہے" اس نے سرد لہجے میں کہا۔

مجیب تیزی سے باتھ روم سے گزر کر دوسرے کمرے میں گیا لیکن کمرے کا دروازہ اندر سے لاک تھا۔ اسے لڑکی پر غصہ آنے لگا۔ واپس آ کر اس نے دیکھا کہ لڑکی کرسی پر بیٹھنے کے بجائے بستر پر نیم دراز ہو گئی ہے "کیا تمہارا انداز ہمیشہ یہی رہتا ہے؟" اس نے سخت لہجے میں لڑکی سے پوچھا۔

"اس طرح کا پہلے کوئی تجربہ ہی نہیں ہوا" لڑکی نے نہایت اطمینان سے کہا۔

مجیب نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس کا خوف دور ہو چکا تھا اور اب وہ ایک نارمل آدمی تھا۔ اس نے لڑکی کو غور سے دیکھا۔ پہلی نظر میں وہ اسے اچھی نہیں لگی۔ چہرے پر میک اپ کی تہیں' بھڑکیلا لباس اور عامیانہ انداز و ادا مگر غور سے دیکھنے پر احساس ہوا کہ وہ صرف انہی چیزوں کی وجہ سے بری لگ رہی ہے۔ ورنہ خوب صورت نہیں تو کم از کم قبول صورت ضرور ہو گی۔ لیکن جو حلیہ اس نے بنا رکھا تھا' اس میں وہ اچھی لگ ہی نہیں سکتی تھی۔

لڑکی بڑی بے باکی سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی مگر اس کے ٹکٹکی باندھ

دیکھنے کے نتیجے میں اس نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں اور نروس انداز میں اپنی انگلیاں چٹخانے لگی۔ میری طرح یہ بھی نروس ہے۔ مجیب نے سوچا "تم کچھ پریشان ہو؟" مجیب نے اس سے پوچھا۔

"نہیں سر' پریشانی کیسی۔ یہ تو روز کی بات ہے' کام ہے اپنا۔"

مجیب اب بھی اسے تنقیدی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا مگر جو کچھ اسے نظر آ رہا تھا' اس سے دل برا ہو رہا تھا۔ اس لڑکی سے تو وہ بات بھی نہیں کر سکتا۔ "یہ تم نے لباس کیسا پہنا ہے؟" اس نے معترضانہ لہجے میں کہا۔

"خریدار کو اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ مال چیک کرے۔ لیبل ایسا رکھا جاتا ہے کہ ایک نظر میں پتہ چل جائے۔" لڑکی نے جواب دیا۔

مجیب کا دل اور برا ہو گیا "لاحول ولاقوۃ" اس نے کہا "کوئی معقول آدمی اس حلیے میں تمہیں پسند نہیں کر سکتا۔"

"معقول آدمی اس طرف کا رخ ہی نہیں کرتا" لڑکی نے بے حد سادگی سے کہا۔

مجیب کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اسے لگا کہ لڑکی نے اسے گالی دی ہے۔ "یہاں تو جیب میں پیسہ ہونا شرط ہے" لڑکی اپنی کہے جا رہی تھی "اور ہم یہ بھی نہیں دیکھتے کہ آدمی دولت مند ہے یا کہیں سے اتفاقاً کوئی ہاتھ مار کر لایا ہے۔"

مجیب کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ کیچڑ میں گر گیا ہے۔

لڑکی نے اسے ایک نظر دیکھا اور شاید اسے اس پر ترس آ گیا۔ "یہ تازہ ترین فیشن ہے سر!" اس نے بے حد تہذیب سے کہا۔

"فیشن کو بھی شخصیت کی مناسبت سے اپنایا جاتا ہے۔"

"شخصیت؟ مال کی کوئی شخصیت ہوتی ہے سر!" لڑکی پھر تہذیب بھول گئی۔ "ہمیں تو بس گاہکوں کی پسند اور ان کی ضرورت کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔"

ایک لمحے کو مجیب کی آنکھیں چمکیں "تو تمہیں میری پسند کا خیال بھی رکھنا چاہیے۔ تمہارے پاس کوئی اور لباس نہیں؟"

اس پر لڑکی چونکی "ارے' میں اپنا بیگ تو اسی کمرے میں بھول آئی" وہ اٹھی اور

باتھ روم کی طرف چلی گئی۔ ایک منٹ بعد باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا۔

"یہ بیگ کس لئے؟" مجیب نے پوچھا۔

"ہوٹل کا گیسٹ ہونے کا ڈراما بھی تو کرنا پڑتا ہے" لڑکی نے بے زاری سے کہا۔ اس نے بیگ کی زپ کھولی اور اس میں سے شب خوابی کا ایک لباس نکالا۔ وہ بہت باریک تھا۔ اس نے لباس کو اپنے بدن پر پھیلا کر دکھایا "یہ ہے میرے پاس۔ ایک کسٹمر نے دیا تھا۔"

"نہیں چلے گا" مجیب نے جھرجھری لے کر کہا۔ وہ بیگ کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا "اس میں تو اور کچھ بھی معلوم ہوتا ہے۔"

"بیگ بھرنے کے لئے فضول کپڑے بھی ڈال لائی تھی" لڑکی کے لہجے کی بے زاری اور بڑھ گئی۔

"دکھاؤ تو۔"

لڑکی نے بادل نخواستہ کپڑے نکال کر دکھائے۔ وہ سادہ سے لباس تھے "ہاں' یہ ٹھیک ہے۔ یہ پہن لو" مجیب نے جلدی سے کہا۔

"لیکن ان پر استری بھی نہیں ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ تمہیں تو میری پسند کا خیال رکھنا ہے۔"

لڑکی کپڑے لے کر باتھ روم کی طرف جانے لگی۔ اس کے چہرے پر ناگواری کا تاثر تھا۔ وہ دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ مجیب نے اسے پکارا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا "ذرا منہ بھی اچھی طرح دھو لینا۔ میرا مطلب ہے' اس میک اپ سے جان چھڑا لو۔"

پانچ منٹ بعد لڑکی باہر آئی تو مجیب اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ کوئی عام سی گھریلو لڑکی لگ رہی تھی۔ وہ بہت خوب صورت تو نہیں تھی لیکن بلاشبہ بے حد پرکشش تھی۔ چہرے سے زیادہ خوب صورتی اس کے جسمانی خطوط میں تھی۔ مجیب کو ڈر لگنے لگا۔ اس روپ میں یہ لڑکی اس کے لئے خطرناک تھی۔ اسے ہر لمحے خود کو یہ یاد دلانا تھا کہ وہ کوئی عام لڑکی نہیں' ایک کال گرل ہے۔ ورنہ وہ اس کی طرف کھنچ جائے گا۔ پہلی بار اسے اندازہ ہوا کہ پارسائی کتنی مشکل اور آزمائش کتنی خوفناک ہوتی ہے۔

لڑکی کو بھی یہ سب عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ بہت شرمسار نظر آ رہی تھی۔ اس کا

انداز اعتماد سے یکسر محروم تھا۔ اس بار وہ بیڈ پر نہیں بیٹھی۔ بلکہ مجیب کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

مجیب کو اس پر ترس آنے لگا "میں نے تمہارا نام تو پوچھا ہی نہیں۔"

"ان کمروں میں کسی کا کوئی نام نہیں ہوتا" لڑکی نے تلخ لہجے میں کہا "نہ مال کا نہ خریدار کا۔"

"نہ تم مال ہو' نہ میں خریدار۔ اپنا نام بتاؤ نا۔"

لڑکی جھجکنے لگی "میرا نام پروین ہے۔ سب پیار سے پینا کہتے تھے مجھے۔"

"کہتے تھے؟" مجیب نے معنی خیز لہجے میں دہرایا۔

"منہ سے نکل گیا تھا۔ اب بھی کہتے ہیں" لڑکی نے کہا پھر بہت دھیمی آواز میں بولی "جو نہیں جانتے" اس کا یہ جملہ مجیب تک نہ پہنچ سکا۔

"میں مجیب انور ہوں۔ کہانیاں لکھتا ہوں۔"

"تبھی اتنے گھسے پٹے آدمی لگتے ہیں" لڑکی نے بے ساختہ کہا مگر فوراً ہی اسے احساس ہو گیا "سوری سر!" وہ بولی۔

"کوئی بات نہیں۔ اپنی رائے کا اظہار کرنا تو اچھی بات ہے" مجیب نے کہا۔ پچھلے چند لمحوں میں وہ اچانک ہی کہانی کار بن گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا' کون جانے یہ لڑکی بھی ایک کہانی ہو۔ اسے کھوجنا چاہئے "کسی اچھے گھر کی لگتی ہو۔ میرا مطلب ہے' شریف گھرانے کی۔"

ایک لمحے کو لڑکی کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا پھر اس نے بے حد تند لہجے میں کہا "جی نہیں۔ میرا تعلق بازار سے ہے۔"

مجیب اسے بہت غور سے دیکھتا رہا۔ لڑکی نے بازار سے تعلق کا اعلان بہت طاقت ور انداز میں کیا تھا لیکن شریف گھرانے کے حوالے پر ایک لمحے کو وہ سراسیمہ ہو گئی تھی۔ مجیب کو یقین ہو گیا کہ اس کا اندازہ درست ہے۔ لڑکی جھوٹ بول رہی ہے لیکن یہ بھی طے تھا کہ وہ اس سے سچ نہیں اگلوا سکے گا۔ ایسے لوگ اپنی حقیقت بھی نہیں بتاتے۔ کوئی بات نہیں لڑکی۔ اس نے دل میں خود سے کہا۔ میرے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ میں تمہارا بیک گراؤنڈ خود سوچ لوں گا۔۔۔ اور کہانی ہو جائے گی۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر مجیب نے لڑکی سے پوچھا "لائٹ آف کر دوں؟"

"جیسے آپ کی مرضی۔ ہمیں روشنی اور اندھیرے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

مجیب کو لڑکی کا لہجہ بہت برا لگا لیکن وہ یہ کہہ کر چھوٹا ہونا نہیں چاہتا تھا کہ وہ کوئی عام کسٹمر نہیں ہے "تم اس طرف آ کر لیٹ جاؤ" اس نے بیڈ کے دیوار سے ملے ہوئے حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا "پھر میں لائٹ آف کروں گا۔"

لڑکی لیٹ گئی تو مجیب نے لائٹ آف کر دی پھر وہ بھی بستر پر آ لیٹا۔ اس کی نیند سے بھری ہوئی آنکھیں جل رہی تھیں۔ لائٹ آف کرنے سے پہلے' اس نے وقت دیکھا تھا۔ بارہ بج چکے تھے۔ لڑکی کی دھیمی سانسوں کی آواز نے ابتدا میں اسے ڈسٹرب کیا پھر جیسے وہ اس کا عادی ہو گیا مگر نیند آنے کے باوجود وہ سو نہیں پا رہا تھا۔

"آپ مجھ سے جھجک کیوں رہے ہیں؟" لڑکی نے اسے پکارا۔

"میں... نہیں تو۔"

"آپ نے مجھے اپنی ضرورت کے لئے ہی بلوایا تھا نا؟"

"ہاں۔"

"تو پھر؟"

"ضرورت پوری ہونے والی ہے۔ مجھے نیند کی ضرورت ہے اور میں اکیلے سو نہیں سکتا۔"

مجیب لڑکی کی طرف پیٹھ کئے لیٹا تھا مگر نیند کے باوجود سو نہیں پا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے کروٹ بدل لی۔ اس وقت وہ نیند اور بیداری کے درمیان معلق تھا۔ اس نے لڑکی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کا ہاتھ لڑکی کے جسم سے ٹکرایا۔ اس نے ایک دم ہاتھ کھینچ لیا۔ "سوری بیٹا۔ تمہارا ہاتھ کہاں ہے؟"

لڑکی نے خاموشی سے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے ہاتھ تھام لیا "دیکھو بیٹا' اپنا ہاتھ نہ ہٹانا۔ میں ابھی سو جاؤں گا" اس کے لہجے میں التجا تھی۔

لڑکی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

مجیب کو ایک اور خیال آیا "سنو' تم یہیں سو جانا۔ یہاں سے چلی نہ جانا" اس

پھر التجا کی۔

وہ لڑکی کے جسم کی تھرتھری محسوس نہ کر سکا "میں جا ہی نہیں سکتی سر۔ مجھے ت اکیلے کمرے میں ڈر لگتا ہے۔"

مجیب کو جو آخری خیال آیا وہ طمانیت کا تھا۔ دو تنہائی سے ڈرنے والے ایک تھ سو رہے تھے۔ اسی طمانیت سے لپٹ کر وہ سو گیا۔



ساڑھے دس بجے صابر نے احمد کا فون ریسیو کیا "او بھائی خدا کے لئے!" اس نے د کی آواز پہچانتے ہی فریاد کرنے والے انداز میں کہا "اب تم بھی کسی ایمرجنسی کی للاع نہ دینا۔ میرا بہت برا حشر ہو رہا ہے۔"

"اتنا گھبرا کیوں رہے ہو۔ میرے حساب سے تو یہاں تمہیں ہونا ہی نہیں تھا۔" سری طرف سے احمد نے کہا۔

جواب میں صابر نے اسے عباس کی ایمرجنسی کے متعلق بتایا۔ یہ بھی بتایا کہ انڈیا ے آئے ہوئے مہمانوں کی وجہ سے گزشتہ رات بمشکل تین گھنٹے کی نیند میسر آئی ی۔

"تو فکر نہ کر۔ میں تمہارے کام آؤں گا" احمد نے ہنس کر کہا "میں ابھی آ جاتا وں۔ گیارہ بجے تک تمہاری چھٹی ہو جائے گی۔"

"میں جانتا ہوں۔ تم اس بات سے ڈر رہے ہو کہ صبح میں سوتا رہوں گا اور ہیں ڈبل ڈیوٹی دینا پڑے گی۔"

"نیکی کا زمانہ ہی نہیں ہے یار!" احمد نے آہ بھر کے کہا پھر سنجیدگی سے بولا "عباس کا معاملہ جب تک سیٹ نہیں ہو جاتا' ہم دونوں مل کر بوجھ اٹھا لیتے ہیں.... بارہ بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی ٹھیک رہے گی۔ صبح نو سے رات نو تک تمہاری اور رات نو سے صبح نو ک میری' ٹھیک ہے؟"

"بہت شکریہ احمد۔ تم بہت تعاون کرنے والے ہو۔"

"زیادہ مکھن نہ لگاؤ' میں آ رہا ہوں۔"

گیارہ بجنے میں دس منٹ پر احمد ہوٹل پہنچ گیا۔ صابر نے اسے چارج دیا اور گیارہ

بجے ہوٹل سے نکل آیا۔

گھر پہنچنے تک وہ صرف مجیب انور کے بارے میں سوچتا رہا۔ جو بات سامنے آئی تھی، اس سے اسے صدمہ ہوا تھا۔ بہت اذیت پہنچی تھی۔ دماغ پر ناقابل برداشت بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا وجود غم و غصے سے پھنک رہا تھا۔

پونے بارہ بجے وہ اپنے گھر کے دروازے پر تھا۔ اس نے صرف ایک لمحے کے لئے اطلاعی گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھی۔ وہ دوسروں کی نیند خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہ بھی جانتا تھا کہ ناظمہ جاگ رہی ہوگی۔ دروازہ پہلی ہی گھنٹی پر کھل جائے گا۔



صفورہ گیارہ بجے تک ٹی وی پر ڈراما دیکھتی رہی پھر اٹھ کر اس کمرے میں چلی آئی جہاں اسے سونا تھا۔ وہاں اماں اور چچی پہلے سے سو رہی تھیں۔ رات کو دیر تک جاگنے اور صبح جلدی اٹھنے کے نتیجے میں انہیں نیند جلدی آگئی تھی۔

صفورہ نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کی مجبوری تھی کہ پڑھے بغیر سو ہی نہیں سکتی تھی۔ اسے کاجل کا وہ شمارہ نظر آگیا، جس میں مجیب انور کا انٹرویو شائع ہوا تھا۔ انٹرویو وہ کئی بار پڑھ چکی تھی پھر بھی ہر بار نیا لطف آتا تھا۔ اس نے سوچا، ایک بار اور سہی۔

انٹرویو پڑھنے کے بعد اس نے رسالہ بند کر کے میز پر رکھا اور ایک انگڑائی لی۔ پھر اس نے لائٹ آف کی اور سونے کے لئے لیٹ گئی مگر سونے کے بجائے وہ مجیب انور کے بارے میں سوچنے لگی۔ کیا اس بار وہ اسے دیکھ پائے گی۔ اس سے ملے گی تو کیا ہو گا، کیسا لگے گا۔

اطلاعی گھنٹی نے اسے چونکایا۔ وہ جانتی تھی کہ بھابی صابر بھائی کے انتظار میں جاگ رہی ہیں۔ دروازہ کھول دیں گی مگر اس وقت کون آیا ہے۔ بھابی نے تو کہا تھا کہ صابر بھائی دو بجے کی قریب آئیں گے۔ ایمرجنسی میں انہیں ڈبل ڈیوٹی دینی پڑی ہے۔

صابر بھائی اور بھابی بچوں کے ساتھ برابر والے کمرے میں سوتے تھے۔ چند لمحے بعد اسے احساس ہوا کہ آنے والے صابر بھائی ہی تھے۔ بھابی ان سے کھانے کا پوچھ رہی تھیں اور وہ بتا رہے تھے کہ کھانا کھا کر آئے ہیں۔ ایک لمحے کو اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر جائے اور صابر بھائی سے باتیں کرے مگر پھر خیال آیا کہ وہ دن بھر کے تھکے

ہوئے ہیں۔ نیند بھی پوری نہیں ہوئی ہے۔ خوامخواہ انہیں تنگ کرنا۔ اور ویسے بھی جب وہ مجیب انور کے متعلق سوچ رہی ہوتی تھی تو کچھ اور کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔

چنانچہ وہ مجیب انور کے تصور میں گم رہی۔ اب وہ اس کے روبرو تھا۔

پھر مجیب انور کے نام نے ہی اسی چونکایا۔ اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ ایک لمحے بعد اس کی سمجھ میں آیا کہ صابر بھائی اور بھابی کے درمیان باتیں ہو رہی ہیں اور ان میں مجیب انور کا نام آیا ہے۔ اب وہ دلچسپی لئے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔ صابر بھائی اگرچہ دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے لیکن رات کے سناٹے میں ان کی آواز اسے واضح طور پر سنائی دے رہی تھی۔ اس نے گفتگو پر کان لگا دیئے۔



کہاں تو یہ کہ صابر کا خیال تھا کہ بستر پر گرتے ہی نیند آ جائے گی مگر ہوا یہ کہ وہ کروٹیں بدلتا رہا اور نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس کا سبب بھی وہ جانتا تھا۔ دل و دماغ پر جو بوجھ تھا، اسے اتارے بغیر وہ سو نہیں سکتا تھا۔

ناظمہ نے بھی محسوس کر لیا کہ اسے نیند نہیں آ رہی ہے "کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔ "آپ کا تو نیند سے برا حال ہونا چاہیے تھا۔"

"برا حال ہے" صابر نے کہا "مگر سویا نہیں جا رہا ہے۔"

"بھوک اور نیند میں ایسا ہوتا ہے۔ میں تیل لگا دوں سر میں۔"

ناظمہ اٹھنے لگی لیکن صابر نے ہاتھ تھام کر اسے روک دیا۔ "رہنے دو۔ تم بھی نیند سے بے حال ہو رہی ہو اور مجھے تیل سے کوئی فرق بھی نہیں پڑے گا۔"

"کیوں؟ کوئی بات ہے؟" ناظمہ نے اسے غور سے دیکھا۔

صابر کشمکش سے دوچار ہو گیا۔ اس نے گھر میں کبھی ہوٹل کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اب بھی اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ بوجھ اتارے بغیر اسے نیند نہیں آئے گی۔ "کوئی خاص بات نہیں۔ تم سو جاؤ" وہ بولا۔

بیویاں بہت تھوڑے عرصے میں شوہروں کو سمجھ لیتی ہیں جبکہ ان کی شادی کو تو

دس سال ہو گئے تھے "کوئی بات ضرور ہے۔ بتا کر ہلکے ہو جائیں" ناظمہ نے کہا۔

"کہا نا' کوئی بات نہیں" صابر جھنجلا گیا۔

ناظمہ جان گئی کہ اصرار کا کچھ فائدہ نہیں۔ وہ لیٹے ہی لیٹے صابر کا سر سہلانے لگی۔

صابر اور کچھ دیر لڑتا رہا پھر اچانک اس نے کہا "برا ہو مجیب انور کا۔ اس نے میری نیند اڑائی ہے۔"

"مجیب انور؟ وہی کہانی والے۔"

"ہاں بھئی وہی۔"

"وہ کیسے۔ نیا رسالہ تو ابھی آیا نہیں ہے۔"

صابر کو معلوم تھا کہ اب وہ نہیں رکے گی۔ اس نے رازدارانہ انداز میں بیوی سے پوچھا "صفورہ تو سو گئی ہے نا؟"

"ہاں' دیر ہو گئی اسے سوئے ہوئے۔"

"میری نیند مجیب انور کی کسی کہانی نے نہیں' خود مجیب انور نے اڑائی ہے" صابر نے قدرے بے فکری سے کہا "وہ لاہور آیا ہوا ہے۔۔۔ اور ہمارے ہوٹل میں ہی ٹھہرا ہے۔" اس کے بعد اس نے مجیب کا بت ٹوٹنے کا پورا المیہ تفصیل سے بیوی کے سامنے دہرا دیا۔

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے" ناظمہ نے بے پروائی سے کہا۔ "سب مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

"یہ ہے تمہارا تبصرہ۔ تم سے بات کرنا دیوار سے سر ٹکرانے کے برابر ہے۔ تم بھی جانتی ہو کہ سب مرد ایسے نہیں ہوتے' میں ایسا نہیں ہوں۔"

"جو ایسے نہیں ہوتے' وہ بہت اچھے ہوتے ہیں" ناظمہ نے سادگی سے اپنا فلسفہ بیان کیا "اور جو ایسے ہوتے ہیں' ان میں اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔"

اس بار صابر کا دماغ آؤٹ ہو گیا "بڑی علامہ ہو۔ اچھے کیسے ہو سکتے ہیں ایسے لوگ؟"

"ہوتے ہیں' اچھے بھی ہوتے ہیں۔ پتہ نہیں کیوں' بس مجھے یقین ہے کہ مجیب

انور اچھے ہوں گے۔"

"اور جو میں بک رہا ہوں' وہ غلط ہے؟"

"دیکھیں انسان تو خامیوں سے بالکل پاک نہیں ہو سکتا اور ایک خرابی پر برا ہونے کا اور ایک خوبی پر اچھا ہونے کا فتویٰ نہیں لگایا جا سکتا" ناظمہ نے معقولیت سے کہا۔ "آپ کو دکھ اس لئے ہوا کہ آپ نے ان کا بہت اچھا امیج بنایا تھا۔ یہ آپ کی غلطی تھی' ان کی نہیں۔ انسان کو بس انسان ہی سمجھنا چاہئے۔"

"لیکن کوئی پبلک فگر ہو تو اسے اپنے امیج کا خیال رکھنا چاہئے۔"

"اور انہوں نے خیال رکھا" ناظمہ نے جلدی سے کہا "آپ سے پردہ رکھنا چاہا تا۔ یہ الگ بات کہ ڈبل ڈیوٹی کی وجہ سے آپ کو پتہ چل گیا۔"

صابر نے دل میں تسلیم کیا کہ بات درست ہے مگر مجیب کی اس کمزوری کو وہ معاف نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے اس کا بہت اچھا امیج بنا رکھا تھا۔ "اور مجھے دیکھو' میں نے اسے مدعو کیا کہ ایک بار رات کا کھانا وہ ہمارے ساتھ ہمارے گھر پر کھائے اور میں اسے صفورہ سے ملوانا چاہتا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو شرم آتی ہے خود پر اور جب اس نے معذرت کی تو میں نے سوچا کہ صفورہ کو ہوٹل لے جاؤں گا اس سے ملوانے۔"

ناظمہ سمجھ گئی کہ اصل دکھ یہ ہے۔ اس نے اس کا مداوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "دونوں باتوں میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ایسی لوگوں کی نظر خراب تو نہیں ہوتی۔"

"بس' رہنے دو" صابر بپھر گیا۔

اب اس کا علاج صرف اٹیک میں تھا۔ چنانچہ ناظمہ نے پہلو بدل کر وار کیا "آپ اپنی بتائیں' مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ ہوٹلوں میں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔"

حسب توقع صابر گڑبڑا گیا "ہوٹلوں میں تو سبھی کچھ ہوتا ہے۔ ہمارا ہوٹل صاف ستھرا ہے مگر کچھ ویٹر ایسے کام بھی کرتے ہیں۔"

"تو آپ کسی اور ہوٹل میں کام کر لیں۔ اتنا تجربہ ہے آپ کو۔ کہیں بھی کام مل جائے گا۔"

"انسانوں کی طرح ہوٹلوں کی پیشانی پر بھی نہیں لکھا ہوتا۔ بڑے بڑے ہوٹلوں

میں یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ سمجھیں' اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ میں بھی خراب ہو گیا۔"

"خیر' میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ آپ تو بہت اچھے ہیں۔"

بات بن گئی۔ صابر ہلکا ہو گیا تھا۔ سونے سے پہلے اس کا آخری جملہ یہ تھا "صفورہ کو یہ سب نہ بتانا' اسے صدمہ ہو گا۔"



صفورہ نے یہ سب سن لیا تھا اور اپنے آپ میں تقسیم ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ مجیب انور کی محض فین تو نہیں تھی۔ وہ اسے محبوب تھا اور پھر وہ کچی عمر کی کوئی نادان لڑکی نہیں تھی جو بے سوچے سمجھے کسی کا امیج بنائے اور پھر ٹوٹے ہوئے امیج کی کرچیوں سے لہولہان ہونے کے بعد غم و غصے سے بھر جائے۔ محبت اس کا بہت پسندیدہ سبجیکٹ تھا۔ وہ انسانوں کو بھی سمجھتی تھی۔ وہ اس بات کی قائل تھی کہ کسی سے محبت کی جائے تو اس کی ممکنہ خامیوں کو بھی مدنظر رکھا جائے۔ وہ جانتی تھی اور اس بات سے ڈرتی تھی کہ کمزور لمحہ کسی بھی وقت کسی بھی انسان کی زندگی میں آ جاتا ہے اور ایسے میں آدمی وہ کچھ بھی کر بیٹھتا ہے' جو اس کی فطرت' اس کے مزاج میں نہیں ہوتا۔ وہ تو خود اپنے لئے بھی کمزور لمحوں سے اللہ کی پناہ مانگتی تھی۔

مگر اس کے باوجود مجیب انور کے متعلق یہ سن کر اسے دھچکا لگا تھا۔ اس کا پہلا رد عمل صابر والا ہی تھا' جیسے کوئی پسندیدہ آئینہ ہاتھ سے گر کر چھن سے ٹوٹ گیا ہو۔ اس کے وجود میں سناٹے تیر گئے تھے مگر چند لمحے بعد ہی مجیب کی محبت ایک تند موج کی طرح اٹھی تھی اور سب کچھ بہا کر لے گئی تھی۔

اب نیند کا تو کوئی سوال نہیں تھا اور اسے صرف مجیب کے بارے میں سوچنا تھا۔ طوفان میں گھری ہوئی صفورہ کے لئے تو وہ آخری تنکے کی طرح تھا جسے وہ چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ اس نے بڑی احتیاط سے اپنے تصور میں اس کا خاکہ بنایا تھا۔ صورت شکل کے بارے میں اس نے کوئی اچھا امکان نہیں رکھا تھا اور اندر کی شخصیت کو اس نے اس کی تحریر سے اخذ کیا تھا۔ وہ اس کے خیال میں بہت اچھی ہونی چاہئے تھی۔ اس کا تجربہ تھا کہ لکھنے والے اپنی تحریروں کی مدد سے پوری طرح سمجھے جا سکتے ہیں... کم از کم سچے قلم کار۔ اور اسے یقین تھا کہ مجیب انور سچا قلم کار ہے۔ اس کی تحریریں بتاتی تھیں کہ وہ ایک اچھا انسان' اچھا شوہر' اچھا باپ اور اچھا بیٹا ہے۔ اس کی تحریروں میں

ہمیشہ عورت کا احترام ہوتا تھا۔

تو پھر وہ ایسا کیوں نکلا؟ کیا بیوی سے محبت کرنے والا کوئی شخص اس طرح بے وفائی نہیں کر سکتا؟ یہ سوال اس کے ذہن میں چبھ رہے تھے۔ کیوں نہیں کر سکتا؟ ایسا کیوں نہیں ہو سکتا' اس کے اندر سے جواب ابھرا۔ جو شخص بیوی سے محبت کرتا ہو' اس سے دور نہ رہا ہو اور اس سے دور نہ رہنا چاہتا ہو' وہ یہ بھی کر سکتا ہے۔

اسے احساس ہوا کہ یہ اس کی جانب داری بول رہی ہے اور جواب کمزور ہے۔ بہرحال اصل بات یہ تھی کہ اس کے خیال میں کسی انسان کو اس کی کسی کمزوری کی وجہ سے مسترد کر دینا بے انصافی ہے۔ بھائی نے ٹھیک کہا تھا' نہ ایک خوبی سے آدمی اچھا ہو جاتا ہے' نہ ایک برائی کی وجہ سے برا۔

خود سے خاصے مباحثے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ مجیب انور اب بھی اسے اتنا ہی عزیز ہے لیکن اب وہ اس سے ملنا کبھی پسند نہیں کرے گی۔ ایک آدمی کی ایسی خرابی سامنے آ جائے تو اس کی نظر پر اعتبار نہیں رہتا۔

اپنی اس سوچ پر اسے ہنسی آ گئی۔ کس قدر سنجیدگی سے سوچ رہی تھی وہ۔ یہ خیال ہی نہیں تھا کہ وہ ایک بار تو مجیب سے مل سکتی ہے مگر اس سے زیادہ کوئی تعلق قائم ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے اور اسے کون سا مجیب پر اپنی محبت کا اظہار کرنا ہے۔

یہ سب سوچتے سوچتے اسے نیند آ گئی!



پروین ایک طرح سے لیٹے لیٹے تنگ آ گئی تھی۔ اس کا ہاتھ اب بھی مجیب انور کے ہاتھ میں تھا اور سوچنے کے لئے اس ہاتھ کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ پروین کا ہاتھ اب تک ہزاروں بار پکڑا گیا تھا اور سیکڑوں مردوں نے پکڑا تھا۔ کسی نے اس کا ہاتھ محبت سے بھی تھاما تھا کبھی۔۔۔ اور ہوس سے تو تھاما ہی جاتا رہا تھا مگر یہ واضح طور پر ایک نیا اور مختلف تجربہ تھا۔ اس میں نہ محبت تھی' نہ ہوس۔ حد یہ کہ گرم جوشی بھی نہیں تھی۔ یہ لمس کسی بھی جذبے سے محروم تھا۔۔۔ یوں جیسے کسی نے لڑکھڑاتے ہوئے دیوار کا سہارا لیا ہو۔

"سر' میں تھک گئی ہوں۔ کروٹ بدلنا چاہتی ہوں۔" پروین نے اسے پکارا لیکن کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ اس نے آہستگی سے اس کی طرف رخ کیا اور اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اندھیرے میں بھی یہ بات واضح تھی کہ وہ گہری نیند سو چکا ہے۔ اس کی ہموار سانسیں گواہی دے رہی تھیں۔

پروین چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر اس نے نہایت آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کرایا اور اسی طرف کروٹ بدلی۔ سوتے ہوئے شخص کے چہرے پر سکون نظر آ رہا تھا۔ عجیب طرح کی معصومیت اور وقار بھی تھا۔ واہ' سو بھی گئے۔ پروین نے خود سے کہا۔ شریف آدمی معلوم ہوتے ہو۔ اس کے لہجے میں حقارت تھی۔

پروین کی عمر 22 سال تھی اور اتنی ہی عمر میں اسے شرافت سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس لئے کہ شرافت ہر جگہ بس ظاہری تھی۔ اندر کی کمینگیوں اور خباثتوں پر شرافت کا خوب صورت نقاب ڈالا جاتا تھا اور دنیا سے معزز کا خطاب حاصل کر لیا جاتا تھا۔ اس نے شرافت کے تمام رنگ دیکھے تھے۔ بزدلی' نا اہلی' خود غرضی اور کج روی۔ سب اس نے دیکھ لئے تھے۔

وہ پانچ سال سے اس پیشے میں تھی۔ اس میں واسطہ ہی مردوں سے پڑتا تھا۔ ایسے مرد بھی تھے جو دھڑلے سے آتے تھے اور چلے جاتے تھے اور وہ بھی تھے جو نام نہاد شرافت کے نام پر سو پردوں کا اہتمام کرتے تھے۔ وہ بزدل تھے۔ اپنی ضرورت کو چھپا کر رکھتے تھے پھر وہ بھی تھے' جو شوق تو رکھتے تھے مگر اہلیت سے محروم تھے۔ ایسے لوگوں سے وہ بہت ڈرتی تھی۔ وہ بھی دو طرح کے ہوتے تھے۔ جو بزدل ہوتے وہ منہ لپیٹ کر سو رہتے یا پارسائی کی کشمکش میں مبتلا ہونے کی اداکاری کرتے۔۔۔۔ اور بالآخر نیکی جیت جاتی۔ دوسری طرح کے لوگ اسے بے حساب اذیت پہنچاتے' جیسے ان کی نااہلی بھی اسی کا قصور ہو۔ وہ اس کے جسم اور چہرے پر ان گنت نشان چھوڑتے۔

یہ شخص بھی آخری درجے کا بزدل معلوم ہوتا ہے۔ پروین نے سوئے ہوئے مجیب کو دیکھتے ہوئے سوچا۔

وہ اسے پہلی نظر میں برا لگا تھا۔ شرافت اس کے چہرے پر تحریر تھی۔ اس کی چال ڈھال' اس کے ہر انداز سے ٹپک رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا' یہاں صرف نقاب نہیں

ہے چہرے پر' پورے جسم پر لبادہ ہے۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ آگے کیا' کیا ہو گا اور اب تک اس کا اندازہ درست ثابت ہو رہا تھا لیکن اس نے ایک امکان سامنے رکھا تھا۔ وہ رات میں کسی بھی وقت اپنی مستقل ناآسودگی میں اضافے کی کوشش کر سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نیند آنے کے باوجود پروین سو نہیں پائی تھی۔

مجیب کو دیکھتے ہوئے اس کے تصور میں وہ منظر لہرا گیا' جب پہلی بار اس کا سامنا ہوا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر نروس ہو گئی تھی۔ شرافت سے صرف نفرت نہیں تھی اسے۔ خوف بھی آتا تھا' زخم ہی اتنے کھائے تھے شرافت کے ہاتھوں۔

پھر جب وہ اس کی فرمائش پر چہرے کو میک اپ کی کیچڑ سے پاک کر کے اور گھریلو لباس پہن کر باتھ روم سی نکلی تو اسے دیکھ کر مجیب کی نظروں میں ایک لمحے کے لئے پہلے حیرت اور پھر پسندیدگی چمکی تھی۔ اس کے بعد وہ آنکھیں ایک دم سرد مہر ہو گئی تھیں۔ اس لمحے میں پروین کو ایک لطیفہ یاد آ گیا تھا۔

ایک شخص ایک ریسٹورنٹ میں پہنچا اور ویٹر کو آرڈر دیتے ہوئے کہا "کچھ روٹیاں آدھی کچی' آدھی پکی اور کچھ بری طرح جلی ہوئی لاؤ۔ ایک پلیٹ سالن لاؤ' جس میں بہت سارا پانی ہو۔ مرچیں بہت تیز ہوں اور نمک ہلکا اور اس کی رنگت سیاہ ہو.... یعنی جلے ہوئے سالن کو کھرچا گیا ہو اور ایک آملیٹ لاؤ' جس میں نمک بہت زیادہ ہو اور مرچیں بالکل نہ ہوں۔ جاؤ' جلدی کرو۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔"

بے چارہ ویٹر بڑی حیرت اور بے چارگی سے اسے دیکھتا رہا' اس سے کچھ کہا بھی نہیں گیا۔

"کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو" اس شخص نے بھنا کر کہا۔ "جاؤ' جلدی کرو۔"

ویٹر آرڈر لے کر کچن میں گیا مگر کچن والوں نے اس کی تعمیل سے صاف انکار کر دیا۔ کسٹمر کے اصرار پر ویٹر کو مینجر سے مداخلت کی اپیل کرنا پڑی پھر کچن والوں کو اس آرڈر کی تعمیل کے لئے غیر معمولی اہتمام کرنا پڑا۔ ایک گھنٹے بعد ویٹر نے مطلوبہ چیزیں میز پر سرو کیں۔

"ایسے نہیں' تمہیں سرو کرنے کی تمیز بھی نہیں" کسٹمر نے غصے سے کہا "یہ سب چیزیں پٹخ کر رکھو یہاں۔"

بوکھلائے ہوئے ویٹر نے اس حکم کی بھی تعمیل کی پھر پوچھا "اور کوئی خدمت ؟"

"ہاں۔ اب میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ کر بہت تیز رفتاری سے' رکے بغیر مجھے کٹی سنانا شروع کر دو۔"

"بات کیا ہے سر؟" ویٹر نے اور بوکھلا کر پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ میں اس وقت پردیس میں ہوں اور مجھے اپنی بیوی بہت یاد آ رہی " کسٹمر نے جواب دیا۔

تو پروین کو اس لمحے یہ لطیفہ یاد آیا جو ایک کسٹمر نے اسے سنایا تھا۔ اس لمحے وہ سے کہنا چاہتی تھی.... میں جانتی ہوں سر کہ اب کیا ہو گا۔ آپ مجھ سے کہیں گے یہاں سامنے بیٹھ کر مجھے خوب برا بھلا کہو' جلی کٹی سناؤ۔ مجھے اپنی بیوی یاد آ رہی ہے ن اس نے یہ بات نوک زباں پر روک لی۔ یہ پیشہ ہر پل اس کے وجود کو جارحیت بھرتا تھا لیکن اس پیشے میں اس جارحیت کے اظہار کا کوئی موقع نہیں تھا.... سوائے مقام کے اور جب وہ بھی نہ ملے تو وہ گھٹ کر رہ جاتی تھی پھر دبی ہوئی جارحیت ن سے ہی ظاہر ہوتی تھی۔

پھر وہ کہانی نویس تھا۔ موقع ملتے ہی اس نے اس کے اندر کہانی کی تلاش شروع کر تھی۔ وہی آغاز کہ کسی شریف گھر کی لگتی ہو۔ یہ جملہ پروین کو ہمیشہ گالی لگتا تھا۔ کیسے زخم ہرے ہو جاتے تھے اور اس نے بڑی نفرت سے کہا تھا کہ وہ بازار کی ۔ اس نے سوچا تھا' وہ تو اپنی کہانی کسی کو بھی نہیں سناتی اور پھر ایک کہانی لکھنے لے کو سنائے۔

پروین کو عزت اور شرافت سے بلاوجہ چڑ نہیں تھی۔ وہ عزت اور شرافت ہی کے ر اس حال کو پہنچی تھی اور مردوں سے بھی اسے خوامخواہ کا بیر نہیں تھا۔ اس نے ہ کرنے کی طاقت انہی کے پاس دیکھی تھی اور وہ فیصلے کرتے وقت یہ نہیں سوچتے کہ ان کے فیصلے کس کس پر کس کس طرح اثر انداز ہوں گے۔ اس کی پہلی مثال س کا باپ ہی تھا۔

وہ واقعی ایک شریف اور عزت دار گھرانے کی بیٹی تھی۔ اس کا باپ سیدھے

راستے پر چلنے کا قائل تھا۔ اس نے کبھی غلط طریقے سے پیسہ نہیں کمایا۔ ایسے ہر موقع کو اس نے ٹھوکر مار دی۔ وہ اکل حلال کا بڑی شدت سے قائل تھا۔ اسے یہ فکر نہیں تھی کہ اس کا صرف ایک بیٹا ہے اور وہ بھی چار بیٹیوں کے بعد۔ اسے اس بات کی پریشانی بھی نہیں تھی کہ بیٹیاں جوان ہو رہی ہیں اور ان کی شادیاں بھی کرنی ہیں۔ چنانچہ جب وہ دنیا سے رخصت ہوا تو اس کے گھر میں عملاً کچھ بھی نہیں تھا۔ ہاں' رشتے دار بہت تھے جن میں بیشتر بڑے لوگ تھے مگر ان کے پاس مرحوم کی بیوی اور بچوں کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا' سوائے جھوٹے دلاسوں کے۔

پروین کی زندگی میں آنے والا دوسرا مرد لطیف تھا۔ لطیف کے پاس نہ عزت تھی نہ شرافت۔ کیونکہ وہ علاقے کا سب سے بڑا بدمعاش تھا۔ علاقے کے تمام شرفا دل ہی دل میں اس کے مرنے کی دعا کرتے لیکن اس کے سامنے اسے زندگی کی دعا دیتے۔

باپ کی موت کے بعد چالیس دن تو جیسے تیسے گزر گئے۔ اس کے بعد صحیح معنوں میں مفلوک الحالی کا دور شروع ہوا۔ پروین سب سے بڑی تھی اور سولہ سال کی تھی۔ جبکہ فرحان صرف پانچ سال کا تھا۔ چند ہی دنوں میں فاقوں کی نوبت آگئی۔ رشتے داروں میں سے کوئی ان کی مدد کو نہیں آیا۔

اس روز جب صبح دس بجے دروازے پر دستک ہوئی تو وہ سب تین وقت کے فاقے سے تھے۔ پروین نے دروازہ کھولا تو حیران رہ گئی۔ لطیف کو وہ صورت سے جانتی تھی اور اس کی ساکھ سے پہچانتی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں اور آواز خوف سے لڑکھڑا گئی "جی فرمایئے" اس نے دل کڑا کر کے خشک لہجے میں پوچھا۔

"اپنی اماں کو بلا" لطیف نے درشت لہجے میں کہا اور ایک ایک کر کے سامان دروازے پر رکھ دیا۔ وہ سامان سے لدا پھندا تھا۔ پروین نے ادھر ادھر دیکھا۔ گلی کے دروازوں سے محلے کی عورتیں جھانکتی نظر آئیں مگر جیسے ہی لطیف نے سر گھما کر دیکھا وہ سب تیزی سے غروب ہو گئیں۔

پروین بوجھل قدموں سے کمرے کی طرف گئی۔ اماں پلنگ پر سر پکڑے بیٹھی تھیں "کون ہے؟" انہوں نے سر اٹھا کر پوچھا۔

"لطیف ہے" اس نے لرزتی آواز میں کہا "آپ کو بلا رہا ہے۔"

امی کا چہرہ فق ہو گیا۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف گئیں۔ پروین کچن میں چلی گئی۔ وہاں سے وہ گفتگو سن سکتی تھی۔ لطیف نے امی کو سلام کیا۔ امی کے استفسار کے جواب میں لطیف نے کہا کہ وہ گھر کے لئے کچھ چیزیں لایا ہے۔

"لیکن ہمیں ان کی ضرورت نہیں ہے۔" امی نے کہا۔

"لطیف بھوک سے کبھی بے خبر نہیں رہتا اماں!" لطیف بولا۔ "یہ سامان رکھ لو' کھانا بچوں کو کھلاؤ اور آٹا دال ڈبوں میں بھر لو۔"

"میں نے کہا نا....."

"اماں' شاید تم مجھے جانتی نہیں ہو" اس بار لطیف نے کڑے لہجے میں کہا "میں بہت چھوٹا تھا جب بھوک کی وجہ سے چھیننا سیکھا.... اور چھینتے چھینتے یہاں تک آگیا ہوں۔ میں آدمی کو مرتا دیکھ سکتا ہوں' بھوکا نہیں دیکھ سکتا۔"

"مگر یہاں ایسی بات نہیں ہے...." امی نے کہا۔

اسی وقت شاید فرحان وہاں پہنچ گیا۔ اس نے کمزور آواز میں کہا "امی' مجھے کچھ ہو رہا ہے۔ بہت بھوک لگی ہے۔"

"لو دیکھ لو اماں.... تمہارا جھوٹ گھر میں ہی پکڑا گیا" لطیف کا لہجہ تند ہو گیا "یہ رکھ لو اماں۔ میں تمہیں اور تمہارے بچوں کو بھوکا نہیں مرنے دوں گا۔ بھوکا مرنے کی کوشش کی تو خود ہی ٹھنڈا کر دوں گا سب کو۔"

لطیف تو سامان دے کر چلا گیا۔ امی نے جھنجلاہٹ میں فرحان کو دھن ڈالا۔ پروین بیچ میں نہ آتی تو شاید وہ اسے ختم ہر کر دیتیں۔ "کیوں مارتی ہیں امی۔ یہ بچہ ہے۔ بھوک کے سوا کچھ نہیں سمجھ سکتا۔"

اس روز ایک نیا تجربہ ہوا۔ لطیف کا لایا ہوا فرحان کے سوا کوئی نہیں کھانا چاہتا تھا مگر سہ پہر تک بھوک کے آگے سب لوگ ہار گئے اور پیٹ بھرنے کے بعد نیند بھی بہت اچھی آئی۔

لطیف نے اس دن کے بعد اس گلی سے گزرنا ہی چھوڑ دیا تھا مگر ہفتے میں ایک بار وہ گھر کا سودا ضرور لے آتا تھا۔ اب امی بحث بھی نہیں کرتی تھیں۔ خاموشی سے رکھ لیتی تھیں۔ پروین بہت حساس تھی۔ ابا کا انتقال ہوا تو وہ فرسٹ ایئر میں تھی۔ اسے

احساس تھا کہ اب اسے ہی کچھ کرنا ہے۔ اس نے کالج چھوڑا اور ٹائپنگ سیکھنے لگی کہ ملازمت ملنے میں آسانی ہو جائے۔

پروین کو یہ احساس تو ہوتا تھا کہ محلے کی عورتوں کی نظریں بدل گئی ہیں مگر اسے علم نہیں تھا کہ چھینٹے بازی بھی شروع ہو چکی ہے۔ اس روز لطیف سامان لے کر آیا تو امی نے اسے گھر میں بلا لیا۔ صحن میں چارپائی پر بٹھا کر انہوں نے اس سے کہا "دیکھو لطیف، سچی بات یہ ہے کہ میرا سگا بیٹا بھی شاید وہ نہ کرتا جو تو ہمارے ساتھ کر رہا ہے اور تیری بے غرضی اور خلوص میں بھی مجھے کوئی شبہ نہیں مگر ہماری رسوائی گلی سے نکل کر دور تک پھیل رہی ہے۔ اس سے تو اچھا ہے کہ ہم بھوک سے مر جائیں۔"

لطیف تلملا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کے ہونٹ لرزے مگر کوئی آواز نہ نکلی پھر ایک دم سے وہ بیٹھ گیا۔ "دیکھ اماں، تو جانتی ہے کہ میں ایک دو کو نہیں، ہر بری بات کہنے والے کو زمین میں گاڑ سکتا ہوں مگر پہلی بار میری سمجھ میں عزت کی بات آئی ہے۔ یہ مسئلہ یوں حل نہیں ہو گا۔"

"یہی تو میں کہتی ہوں" امی نے جلدی سے کہا "تو ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دے۔"

لطیف کی آنکھیں جیسے کہیں دور دیکھ رہی تھیں۔ وہ خواب ناک لہجے میں بولا۔

"اپنا باپ تو مجھے یاد نہیں۔ ہاں اماں مری تو میں تیرے فرحان جتنا تھا اماں۔ اسکول میں پڑھتا تھا اور پڑھنے میں بہت دل لگتا تھا میرا۔ پر اکیلا ہوا تو سب ختم ہو گیا۔ میں یہ بن گیا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اماں کہ تیرا فرحان خوب پڑھے لکھے۔ لطیف نہ بنے۔"

"چاہنے سے کیا ہوتا ہے بیٹے!" امی نے پہلی بار اسے بیٹا کہا۔

لطیف کی آنکھیں چمکنے لگیں "ایک حل ہے اماں!" اس نے کہا "دیکھ اماں، میں کوئی شریف آدمی نہیں، غنڈا ہوں۔ سچ بولنے سے کبھی نہیں ڈرتا اس لئے جھوٹ بولنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ میری بات کو جھوٹ نہ سمجھنا۔ یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ میں نے تم سے کبھی کوئی غرض نہیں رکھی۔ اب سوال کر رہا ہوں تو تمہاری بہتری کے لئے۔ پینا سے شادی کر دو میری۔ میں یہیں رہوں گا تمہارے گھر میں.... تمہاری بچیوں کا بڑا بھائی بن کر۔ تمہارے بیٹے کو لکھاؤں پڑھاؤں گا.... کچھ

بناؤں گا۔"

شاید امی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ چند لمحے خاموشی رہی پھر لطیف نے کہا "اور اماں یہ بات لطیف بدمعاش کی نہیں کہ تم ڈرو۔ تم انکار بھی کر سکتی ہو۔"

"میں.... میں کیا کہوں...." امی گڑبڑا گئیں۔

پروین تڑپ کر کچن سے نکلی اور جا کر لطیف کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی "تم ہماری مدد کرنا چاہتے ہو؟" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تو اور کیا۔ یہ نہ سمجھنا پینا کہ تیرے رنگ روپ پر مرمٹا ہوں۔ تجھ سے اچھی بھی ہزاروں ہیں یہاں۔ جسے نظر بھر کر دیکھ لوں، کچی چلی آئے گی۔ پر مجھے آرزو ہی نہیں۔"

زندگی میں پہلی بار پروین نے اسے نظر بھر کر دیکھا۔ واقعی.... وہ تھا ہی ایسا۔ خوبرو، وجیہہ، جسم سے توانائی چھلکتی ہوئی، نڈر اور بے خوف مگر تھا تو بدمعاش۔ اس کی نظریں آنکھوں میں جھلکنے والی پسندیدگی کو چھپانے کے لئے جھک گئیں "تمہیں زحمت کرنے کی ضرورت نہیں، میں نے ٹائپنگ سیکھ لی ہے۔ مجھے ملازمت مل جائے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ بولی۔

"ابھی دنیا نہیں دیکھی ہے نا، اس لئے بڑھ بڑھ کر بول رہی ہے" لطیف نے تلخ لہجے میں کہا "او پگلی، دنیا میں لطیف بہت کم ہیں اور منافق اور مکار شریف بہت زیادہ ہیں۔ نوکری تو تجھے فوراً مل جائے گی پھر پتہ چلے گا کہ تنخواہ کیا ہوتی ہے.... عزت کی قیمت!" پھر وہ امی سے مخاطب ہوا "سن اماں۔ اگر دل کا معاملہ ہوتا تو میں زبردستی اٹھا کر لیتا۔ پر وہ بات نہیں۔ اب سودا میں کسی اور کے ہاتھ بھجوا دیا کروں گا۔ اپنی بیٹی کو نوکری کا ارمان پورا کرنے دو۔ پر اسے سمجھا دو کہ عزت کی بات پر یہ ہاری تو جان سے مار دوں گا اسے۔ اور یہ راہ پر آ جائے تو مجھے بلوا لینا۔" یہ کہہ کر وہ اٹھا اور چلا گیا۔

اس موضوع پر پروین کی امی سے بات نہیں ہوئی مگر پروین نے یہ جان لیا کہ لطیف جھوٹا نہیں۔ شادی کیا، وہ تو ویسے بھی زبردستی کر سکتا تھا۔ اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا پھر وہ اسے اچھا بھی لگا تھا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ دل میں کھب گیا تھا مگر خرابی یہ تھی کہ وہ بدمعاش تھا.... عزت اور شرافت سے محروم اور.... اور ابھی پروین کو یہ معلوم

نہیں تھا کہ عزت اور شرافت کھوکھلے لفظ ہیں۔

آئندہ ایک مہینے میں اسے معلوم ہو گیا کہ لطیف کی ہر بات درست تھی۔ وہ جب بھی نوکری ڈھونڈنے نکلی، کبھی ناکام نہیں ہوئی مگر تین دن سے زیادہ کہیں نہ ٹک سکی۔ شرافت، عزت اور ان کی قیمت، پھر سب اس پر کھل گیا۔ اس کی ٹائپنگ کی ڈیمانڈ کہیں نہیں تھی۔ ہاں، جسم کے طلب گار ہر جگہ موجود تھے۔ اس نے سمجھ لیا کہ واقعی دنیا میں لطیف بہت کم ہیں اور منافق اور مکار شریف بہت زیادہ ہیں۔

ایک ماہ بعد لطیف کا چیلا سودا لے کر آیا تو اس نے اس سے کہا "سنو۔۔۔ لطیف صاحب کو بھیج دینا۔"

امی نے سنا تو دل تھام لیا "کیا ہو گیا تجھے پینو۔ یہ کیا کر رہی ہے؟"

"امی، بے عزت کہلانا بے عزت ہو جانے سے کہیں بہتر ہے" اس نے صرف اتنا کہا۔

مگر اسی روز بدمعاش لطیف سے پہلے اس کے کروڑ پتی تایا گھر آ گئے۔ وہ آتے ہی امی پر برس پڑے "مجھے پتہ چلا ہے کہ تم پینا کو لطیف کے ہاتھوں بیچ رہی ہو۔"

"لطیف نے ہماری بہت مدد کی ہے بھائی صاحب اور میں پینا کی شادی کرنا چاہتی ہوں اس سے" امی نے کہا۔

"مدد؟ ہم مر گئے ہیں کیا؟" تایا نے غصے سے کہا "تم نے مجھ سے کہا ہوتا۔"

"کہنا آتا ہی کہاں ہے بھائی صاحب!" امی نے سرد آہ بھر کے کہا۔

"خیر۔۔۔ تمہیں ہر مہینے پانچ سو روپے پہنچ جایا کریں گے۔ کہے بغیر" تایا نے نرم لہجے میں کہا "اب وہ کمینہ آئے تو اسے دھتکار دینا" تایا نے جیب سے پانچ سو روپے نکال کر امی کو دیئے۔

"ابھی وہ آنے والا ہے۔ آپ ہی اس سے کہہ دیجئے گا بھائی صاحب!" امی نے کہا۔

یہ سنتے ہی تایا گڑبڑا گئے "یہ تمہارا درد سر ہے بتول۔ میں ایسوں کے منہ نہیں لگتا۔"

کہاں تو تایا بیٹھنے کے موڈ میں تھے اور کہاں ایک دم اٹھ کر چل دیئے۔ ان کے

جانے کے پانچ منٹ بعد لطیف آ گیا۔ امی نے اسے صحن میں بٹھایا "کیا بات ہے اماں؟"

"دیکھ بیٹے، ہم عزت دار لوگ ہیں۔ ہمارے خاندان والے تجھ سے ہمارے تعلق کو پسند نہیں کرتے۔"

"تمہارے عزت دار خاندان والوں کو تمہاری بھوک کا کیوں پتہ نہیں چلا اماں؟" لطیف نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"ہم نے کہا جو نہیں تھا ان سے۔۔۔ مگر اب انہوں نے ہمارا بندوبست کر دیا ہے۔ اب تو تکلیف نہ کرنا۔"

"دیکھ اماں، میں سچ بولنے سے کبھی نہیں گھبرایا۔ آج بھی نہیں گھبراؤں گا۔" لطیف نے عجیب سے لہجے میں کہا "پہلے جب میں نے تم سے پینا کی شادی کا کہا تھا تو تم سے ہمدردی کر رہا تھا مگر اب بات اور ہے۔ پینا مجھے اچھی لگی ہے اس لئے میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ تو سوچ بیٹے۔۔۔!"

"میں اس کی خاطر بدمعاشی چھوڑ دوں گا اماں۔ شریف بن جاؤں گا۔"

"تو پھر اس وقت بات کرنا" امی نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

مگر لطیف نے شاید ان کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ خود کلامی کے انداز میں کہہ رہا تھا "مگر اماں، یہ دنیا شریفوں کی نہیں۔ منافق اور مکاروں کی ہے یا بدمعاشوں کی۔ شریفوں کو تو زمین کے نیچے ہی جگہ ملتی ہے۔ اچھا اماں، چلتا ہوں۔"

پروین اسے روکنا چاہتی تھی مگر عزت دار تایا کی وجہ سے زبان پر قفل ڈالے بیٹھی رہی۔ ویسے بھی اس وقت اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ لطیف سے محبت کرنے لگی ہے۔ یہ علم تو اسے اس وقت ہوا جب لطیف کی موت کی خبر سنی۔ اسے اس کے کسی مخالف بدمعاش نے چاقو کا وار کر کے صرف اس لئے ہلاک کر دیا تھا کہ اس نے جواب میں چاقو نہیں نکالا تھا اور خالی ہاتھوں سے ہی اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی تھی۔

ہمیشہ کی طرح لطیف نے آخری بار بھی سچ بولا تھا۔ اس نے کہا تھا نا کہ شریفوں کو زمین کے نیچے ہی جگہ ملتی ہے اور شرافت نے اسے پیوند زمین ہی کر دیا تھا۔

پروین کی زندگی میں تیسرا مرد اس کے تایا تھے۔۔۔ شریف اور عزت دار، جنہیں

خاندانی عزت کا بہت خیال تھا۔ ایک بار پانچ سو روپے دے کر وہ دوبارہ کبھی نہیں آئے۔ پیسے بھی نہیں بھیجے یہاں تک کہ ایک بار پھر فاقوں کی نوبت آگئی۔ امی نے کہا بھی کہ تایا کے پاس چلی جاؤ۔ اس پر پروین نے بڑی نفرت سے کہا تھا "امی' اب میرے سامنے کبھی کسی شریف آدمی کا نام نہ لیجئے گا۔ تایا کو خود آنا چاہئے تھا۔ ذمے داری انہوں نے قبول کی تھی۔ میں کیوں جاؤں ہاتھ پھیلانے۔ خود ہی کچھ کرلوں گی۔"

یوں وہ پھر نوکری کی تلاش میں نکلی اور اس بار اسے زینت مل گئی "تین سو روپے میں باس کا دل بہلا کر عزت دار بنی رہنے کو میں حماقت سمجھتی ہوں" زینت نے کہا تھا۔ "میں گھما کر کان پکڑنے کی قائل نہیں۔ مردوں کا کھلونا بننا ہے تو کچھ حاصل تو ہو۔ بھائی کا مستقبل تو بنے۔ بہنوں کے عزت سے ہاتھ پیلے تو ہوں۔"

اور پروین قائل ہو گئی "مگر معزز رشتے داروں کے اس شہر میں نہیں رہنا چاہتی۔"

"یہ اور بھی اچھا ہے۔ لاہور میں میری ایک سہیلی ہے' تم وہاں چلی جاؤ۔"

یوں پروین کو لاہور میں "ملازمت" مل گئی۔ کراچی کا گھر اچھی طرح چلنے لگا مگر اس کے بعد پروین کی زندگی میں کبھی کوئی مرد نہیں آیا...... صرف کسٹمر ہی آئے۔

پروین نے چونک کر آنکھیں کھولیں تو آنسو رخساروں پر بہنے لگے۔ پتہ نہیں' کب سے جمع تھے وہ آنسو۔ اس نے گھبرا کر مجیب کو دیکھا۔ اچھا تھا کہ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ جاگتا اور آنسو دیکھتا تو کہانی نکلوانے کی کوشش کرتا رہتا۔

پروین نے کروٹ بدلی۔ دنیا کے سب سے اچھے' سب سے وجیہہ اور سب سے طاقتور مرد کا سراپا اس کے سامنے آگیا...... لطیف۔ اس کا دل محبت کی اذیت سے تڑپنے لگا۔ یہ خیال ہمیشہ بہت اذیت پہنچاتا تھا کہ اب وہ اس سے کبھی نہیں مل سکے گی۔ آخرت میں بھی وہ جنت میں ہو گا اور وہ خود جہنم میں۔

یہی سب کچھ سوچتے سوچتے وہ سو گئی۔



مجیب انور کو فون کی گھنٹی نے جگایا۔ اس کی آنکھیں پوری طرح کھلی بھی نہیں تھیں کہ اس نے ریسیور اٹھالیا "مجیب انور اسپیکنگ!" اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

"سوری سر۔ آپ کو ڈسٹرب کیا" دوسری طرف سے آپریٹر کی آواز سنائی دی۔ "لیکن غفور صاحب کا اصرار ہے کہ آپ کو جگا دیا جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ کو کچھ ضروری کام کرنے ہیں۔"

مجیب کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں "شکریہ بھائی۔ مجھے واقعی کام ہے۔ غفور صاحب سے بات ہو سکتی ہے؟"

"انہوں نے آپ کے لئے پیغام چھوڑا ہے سر! وہ گیارہ بجے آپ کو لینے آئیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ شکریہ!"

ریسیور رکھ کر مجیب نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ دس بجے تھے۔ تیار ہونے کے لئے ایک گھنٹہ بہت کافی تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھا تو اس کا ہاتھ کسی جسم سے ٹکرایا۔ اس نے سر گھما کر دیکھا اور حیران رہ گیا مگر اگلے ہی لمحے اسے سب کچھ یاد آگیا۔

وہ بے خبر سوتی ہوئی پروین کو بہت غور سے دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہوں میں شکر گزاری تھی۔ اس لئے کہ اسے نیند سے محروم رات بھی یاد تھی اور گزشتہ رات کی میٹھی پیاری نیند بھی۔ وہ ایسا بے خبر سویا تھا کہ درمیان میں بھی آنکھ نہیں کھلی تھی۔ یہ سب اس مہربان لڑکی کی وجہ سے تھا' جو محض اپنی مجبوری کی وجہ سے یہاں موجود تھی۔ یہ نہ ہوتی تو سکون سے سونا تو دور کی بات ہے' وہ سو ہی نہیں سکتا تھا۔

اسے خیال آیا کہ وقت بہت کم ہے۔ وہ جلدی سے اٹھ کر باتھ روم کی طرف لپکا۔ پانچ منٹ بعد وہ باتھ روم سے نکلا تو کپڑے بھی بدل چکا تھا۔ وہ آکر بیڈ پر بیٹھ گیا اور پروین کو پھر غور سے دیکھنے لگا۔ سوتے میں وہ بہت معصوم اور خوب صورت لگ رہی تھی۔ میک اپ سے پاک چہرہ' مسکا ہوا بے ترتیب لباس' اس وقت اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کوئی ایسی ویسی لڑکی ہے۔ اس کے چہرے پر تازگی اور معصومیت تھی۔ یقیناً لڑکی جھوٹ بول رہی تھی کہ اس کا تعلق بازار سے ہے۔ ضرور وہ کسی شریف گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ ایسی حقیقتیں کہانیوں میں ہی نہیں ملتیں' معاشرے میں روز وقوع پذیر ہوتی رہتی ہیں۔

اسے جگانا ضروری تھا مگر جگانے پر دل آمادہ نہیں تھا۔ اس وقت مجیب کا دل ایک

انسان کا دل تھا۔ اسے اس طرح اپنی عمر کے مطابق بے فکری سے سوتا دیکھ کر اسے بہت خوشی ہوئی تھی۔ بے چاری کو رات کی نیند کہاں نصیب ہوتی ہو گی۔ سوئی ہے تو وحشت اور خوف کی جگہ کیسی آسودگی نظر آ رہی ہے چہرے پر۔

مگر وقت کم تھا۔ اٹھانا ضروری تھا۔ وہ اسے پکارتا رہا مگر نیند گہری تھی۔ آخر اسے ہلانا جلانا پڑا مگر وہ تو جھنجوڑنے پر بھی بڑی مشکل سے اٹھی۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا "سوری بیٹا۔ میں نے مجبوری میں تمہیں جگایا ہے" اس نے معذرت کی۔

"کیا آدمی ہیں آپ۔ ہم جیسوں سے سوری کہتے ہیں" وہ بولی۔ "معذرت تو مجھے کرنی ہے سر۔ دیکھیں، بزنس از بزنس۔ آپ کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اب آپ کو مجھ سے کچھ نہیں ملے گا۔ لبادہ اتارنے میں دیر آپ نے کی ہے۔"

مجیب کو غصے کے بجائے ہنسی آ گئی "تم غلط سمجھیں بیٹا۔ میری تو تم سے جو غرض تھی، پوری ہو چکی۔ میں تمہیں اٹھانا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن گیارہ بجے کوئی آنے والا ہے۔ میں چاہتا ہوں، اس سے پہلے ہم ناشتہ کر لیں۔"

پروین لیٹے لیٹے اسے حیرت سے دیکھتی رہی پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "کیا کہا آپ نے؟ ہم ناشتہ کر لیں۔"

"ہاں، کیوں نہیں۔ تم باتھ روم جاؤ۔ اتنی دیر میں، میں ناشتے کا آرڈر دیتا ہوں۔"

پروین اٹھ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ مجیب نے روم سروس کو فون کیا۔ دس منٹ میں ناشتہ آ گیا۔ ویٹر وہی سلیم تھا جس کی عنایت سے پروین وہاں موجود تھی۔

اس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ دیکھ کر مجیب کو غصہ آ گیا۔ "سنو..... تم کب سے اس پیشے میں ہو؟" مجیب نے پوچھا۔ اس نے پیشے کا لفظ گالی کی طرح ادا کیا تھا۔

"بیس سال ہو گئے سر جی!" سلیم نے گڑبڑا کر کہا۔

"پھر بھی تمہیں آداب نہیں آئے؟"

سلیم کا رنگ فق ہو گیا "کوئی غلطی ہو گئی سر جی؟"

"بے وقت مسکرایا نہ کرو۔ اس پیشے میں یہ بداخلاقی اور بدتمیزی شمار ہوتی ہے۔"

سلیم کے ہونٹوں سے مسکراہٹ یوں غائب ہوئی، جیسے کسی نے اسے نوچ کر

پھینک دیا ہو "سوری سر!" اس نے کہا اور کن انکھیوں سے باتھ روم کے بند دروازے کو دیکھا۔

"بس اب جاؤ" مجیب نے سخت لہجے میں کہا۔

سلیم چلا گیا۔ مجیب نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ دس بج کر بیس منٹ ہوئے تھے۔ اس نے توسٹ پر مکھن لگانا شروع کر دیا۔ اسی وقت پروین بھی باتھ روم سے نکل آئی

"آؤ بیٹا، بیٹھو۔" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

پروین ہچکچائی "میں ناشتہ دوسرے کمرے میں کر لوں گی سر!" اس نے آہستہ سے کہا "یہ آپ کے شایان شان نہیں۔"

"ارے میں کوئی شان والا نہیں ہوں۔ آؤ بیٹھو۔"

پروین اب بھی نہیں بیٹھی "لیکن کیوں سر!"

"تم نے مجھ پر مہربانی کی ورنہ میں سو نہیں سکتا تھا۔ میں اس کے صلے میں کچھ نہیں دے سکتا۔ تمہارے ساتھ ناشتہ تو کر سکتا ہوں۔"

پروین بیٹھ گئی "مہربانی کوئی نہیں سر! آپ نے مجھے خریدا تھا۔"

"میں نے تمہیں نہیں خریدا، تمہارے وقت کو خریدا تھا..... کمپنی کے لئے" مجیب نے تصحیح کی۔

دونوں ناشتہ کرنے لگے۔ اچانک مجیب نے پوچھا "تم کراچی کی ہو نا؟"

پروین بری طرح گڑبڑا گئی "جج..... جج..... جی..... جی نہیں۔"

"تم کراچی کی ہی ہو..... اور عادی جھوٹ بولنے والی بھی نہیں ہو۔" مجیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

پروین کہانی نویس کے مشاہدے کی قائل بھی ہوئی اور اس سے خوف زدہ بھی ہو گئی۔ ماں اور بہن بھائی عزت سے جی رہے تھے۔ وہ انہیں ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے مضبوط لہجے میں کہا "آپ کی مرضی، کچھ بھی سمجھ لیں مگر میرا کراچی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"رات کو بھی تم نے جھوٹ بولا تھا۔ تمہارا تعلق بازار سے نہیں ہے" مجیب نے نہایت اطمینان سے کہا "اور میں چھوٹی چھوٹی باتوں سے نتائج اخذ کیا کرتا ہوں۔ تبھی تو

کہانی لکھتا ہوں۔ تمہارے اصرار نے ثابت کر دیا کہ تم کراچی سے تعلق اس لئے چھپانا چاہتی ہو کہ تمہارا تعلق کسی شریف گھرانے سے ہے۔ گھر کی مجبوری نے تمہیں یہاں تک پہنچایا ہے مگر تمہارے گھر والے بے خبر ہیں اور تم انہیں بے خبر ہی رکھنا چاہتی ہو۔"

پروین کا چہرہ فق ہو گیا۔ ناشتہ کرنا اس کے لئے ناممکن ہو گیا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے چائے کی پیالی اٹھائی "کہانی لکھنے والوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہیں پر مل جائے تو اس کا کوا بنا دیتے ہیں۔"

"بے پر کے بھی کوا بن جاتا ہے" مجیب نے ہنستے ہوئے کہا "مگر مجھے ڈھانچے کی ضرورت پڑتی ہے۔۔۔ اور پھر میں تحقیق بھی کرتا ہوں کہ ڈھانچا ہے کس کل پرندے کا یا درندے کا اور پرندہ ہے تو کوا ہے یا نہیں۔"

وہ ناشتے سے فارغ ہوئے تو ساڑھے دس بج چکے تھے۔ اب بھی خاصا وقت تھا۔ وہ پروین سے کام کی بات کر سکتا تھا۔ "میں کل کراچی واپس جا رہا ہوں" اس نے کہا۔

"جی سر!"

"میں چاہتا ہوں کہ تم آج رات بھی میرے ساتھ رہو۔"

پروین نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اندر تک جھانک لینے والے اس شخص سے خوف زدہ تھی اور اس کے ساتھ وقت نہیں گزارنا چاہتی تھی۔ ایک اندر کی وجہ بھی تھی۔ وہ واقعی شریف آدمی تھا اور پروین کو شرافت سے نفرت تھی۔ اس لحاظ سے وہ بھی اس کے لئے قابل نفرت تھا۔ یہ الگ بات کہ وہ اس کے لئے نفرت محسوس نہیں کر رہی تھی۔ اس نے خشک لہجے میں کہا "سوری سر' یہ ممکن نہیں ہے۔"

مجیب کے چہرے پر مایوسی چھا گئی "اوہ۔۔۔" وہ بولا۔

"مایوس کیوں ہوتے ہیں سر۔ آپ رقم خرچ کریں گے تو کوئی بھی کمپنی دے دے گا" پروین کے لہجے میں خفیف سا طنز تھا۔

"تم مجھے اچھی لگی ہو۔ میرا جو تصور تھا' اس سے مختلف۔ میں خود کو جانتا ہوں۔ خالص بازاری عورت کے ساتھ شاید میری غرض بھی پوری نہیں ہو گی۔"

"آپ کو سونا ہی تو ہے۔ کیوں فکر کرتے ہیں؟"

اب مجیب اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا "سچ سچ بتاؤ۔ کوئی مصروفیت ہے تمہیں؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"جی نہیں۔"

"تو پھر؟"

"دیکھیں سر۔ میں برائے فروخت ہوں لیکن اپنی مرضی بھی تو میرا حق ہے۔ جی نہ چاہے تو میں انکار بھی کر سکتی ہوں۔"

"بے شک' تمہارا حق ہے" مجیب نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا پھر اچانک پوچھا "تم مجھے ناپسند کرتی ہو؟"

پروین نے جواب دینے کے بجائے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"وجہ نہیں بتاؤ گی؟"

"آپ کو سننا اچھا نہیں لگے گا۔ آپ اسے بدتمیزی سمجھیں گے اور ہمیں کسٹمر کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

"بے فکر ہو کر کہو۔ مجھے کچھ بھی برا نہیں لگے گا اور میں کسٹمر ہوں بھی نہیں۔" مجیب کے ہونٹوں پر تاؤ دلانے والی مسکراہٹ ابھری۔

پروین کے اندر غصہ اور نفرت پوری شدت سے امڈی۔ "تو سنیں۔ میں آپ کو ناپسند کرتی ہوں۔ کیونکہ آپ شریف آدمی ہیں اور مجھے شرافت سے نفرت ہے۔ شرافت کے تین ہی روپ دیکھے ہیں میں نے۔ مکاری' منافقت اور بزدلی۔ مجھے نہیں معلوم کہ آپ ان تینوں میں سے کیا ہیں مگر جو بھی ہیں' ہیں شریف۔ میں آپ کو برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ کے مقابلے میں عام کسٹمر میرے لئے زیادہ معزز اور قابل قبول ہیں" وہ نفرت بھرے تند لہجے میں کہہ گئی۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں "میں آپ کے ساتھ اور ایک لمحہ بھی نہیں رک سکتی" اس نے آخر میں کہا اور نظریں اٹھا کر دیکھا۔ وہ حیران رہ گئی۔ مجیب اب بھی مسکرا رہا تھا۔

"مجھے برا نہیں لگا۔ بلکہ مجھے خوشی ہوئی" مجیب نے کہا "میں نے کہا تھا نا کہ میں چھوٹی چھوٹی باتوں سے نتائج اخذ کرتا ہوں تو جو کچھ تم نے کہا' اس سے مجھے تمہیں' تمہارے حالات اور پس منظر کو سمجھنے میں مدد ملی۔ کہو تو تمہیں تمہارے بارے میں

بتاؤں۔"

پروین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"شرافت اور شریفوں سے جس نفرت کا تم نے اظہار کیا' اس سے میرا اندازہ درست ثابت ہوتا ہے۔ تم کسی بڑے شریف خاندان کی لڑکی ہو" مجیب نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا "تم باپ سے محروم ہوئیں۔۔۔ اور یقیناً تم بھائی بہنوں میں سب سے بڑی ہو۔ فاقوں سے بچنے کے لئے تم نے جدوجہد کرنا چاہی مگر شریفوں نے تم سے اس کی کچھ اور قیمت وصول کی۔ ایسے میں نفرت ہونا تو لازمی ہے مگر صرف اس بنیاد پر اتنی شدید نفرت نہیں ہو سکتی۔ تمہیں یقیناً اپنے شریف خاندان کے بڑوں سے تکلیفیں اور صدمے پہنچے ہوں گے۔"

ہر جملے کے ساتھ پروین کے چہرے کا رنگ اڑتا جا رہا تھا۔ مجیب اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا "لیکن میری فہم اور تجربہ بتاتا ہے کہ بات صرف اتنی نہیں۔ شرافت سے اتنی نفرت یوں نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ آدمی برے کی عظمت دیکھ چکا ہو۔ تمہاری زندگی میں کوئی ایسا شخص آیا ہو گا جسے معاشرہ بدمعاش قرار دیتا ہو گا مگر تم نے اس میں وہ عظمت دیکھی ہو گی جو شریفوں کو بھی میسر نہیں ہوتی اور تم اس شخص کو پسند بھی کرتی ہو گی۔ ممکن ہے' محبت کرتی ہو۔"

اس بار پروین اندر سے ہل کر رہ گئی مگر اس نے بہت تیزی سے خود کو سنبھالا۔ اس کا وجود سامنے بیٹھے شریف آدمی کی نفرت سے چھلکنے لگا "آپ کتنا ہی اکسا لیں' مجھ سے آپ کو کوئی کہانی نہیں ملے گی سر!" اس نے زہریلے لہجے میں کہا "کیونکہ یہاں ایسی کوئی کہانی نہیں ہے۔"

"کہانی تو مجھے مل چکی ہے پروین!" مجیب بولا "ویسے تم اس لئے تو گریز نہیں کر رہی ہو کہ کہیں میں تم سے کہانی نہ اگلوا لوں۔ اگر یہ بات ہے تو یقین کرو' میں اب تمہیں نہیں کریدوں گا۔ جتنا جاننا چاہتا تھا' جان چکا ہوں میں۔"

"میں اجازت چاہتی ہوں سر۔ ایک بار پھر سوری۔" پروین نے بیگ اٹھایا اور باتھ روم کی طرف چل دی۔

چند ہی لمحوں بعد درمیانی دروازہ بند ہونے اور پھر چٹخنی لگائے جانے کی آواز سنائی

دی۔ اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی "کم ان" مجیب نے کہا۔
دروازہ کھلا اور غفور کی صورت نظر آئی۔



پروین کو زندگی میں کبھی کسی سے اتنی نفرت محسوس نہیں ہوئی تھی' جتنی اس کسٹمر سے ہو رہی تھی۔ حالانکہ نفرت اس کے لئے اجنبی جذبہ نہیں تھا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں' جو یکجا ہو کر بڑی ہو گئی تھیں۔ پہلی قابل نفرت چیز تو اس کی شرافت تھی پھر وہ خطرناک حد تک سمجھ دار اور ذہین ثابت ہوا تھا۔ صرف تجزیئے کی مدد سے اس نے بغیر بتائے تقریباً اس کی پوری کہانی سمجھ لی تھی۔ ایک وجہ جسے وہ خود بھی نہیں سمجھ سکی تھی اور بھی تھی۔ اس کے نہ سمجھنے کی وجہ یہ تھی کہ اس نے خود کو لڑکی سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر تھی تو وہ لڑکی ہی۔ پامال ہونے کی وہ عادی ہو گئی تھی۔ کوئی اس کی عزت کرتا' اس کے ساتھ نرمی سے پیش آتا تو وہ سمجھتی کہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے.... تذلیل کر رہا ہے اس کی۔ اسے احساس نہیں تھا مگر اپنے اندر' کہیں گہرائی میں مجیب انور اسے اچھا لگا تھا۔ جب مجیب نے جسمانی طور پر اسے نظر انداز کیا تو اسے برا لگا جیسے اسے مسترد کر کے اس کی توہین کی ہو اس نے۔ یہ بھی عجیب پہلو تھا نفسیات کا۔ اگر مجیب دوسروں جیسا ہوتا تو ایک عام کسٹمر لگتا۔ وہ ایسا نہیں تھا تو پروین کو اس سے محبت کی طلب ہوئی تھی۔ ٹھیک ہے' وہ عام کسٹمر نہ بنے مگر مختلف انداز میں' ذرا محبت سے نرمی سے چھوئے تو.... یہ نہیں ہوا تو اسے چڑ سی ہونے لگی۔

ویٹر سلیم کمرے میں آیا تو وہ بھری بیٹھی تھی۔ "کیسا رہا؟" سلیم نے پوچھا۔

بس اس کے بعد پروین نے اپنی ساری نفرت نکال دی۔

اس سے جو کچھ سنا تھا' وہ کچھ بڑھا چڑھا کر سلیم نے ارشد کو سنا دیا۔ اس کے بعد ویٹرز اور ہوٹل کے نچلے کارندوں کی سپریم کونسل میں یہ موضوع زیر بحث رہا۔ سب کی ہمدردیاں کسٹمر کے ساتھ تھیں۔ سب نے حتی المقدور اس سلسلے میں مشورے بھی دیئے۔ لانڈری میں استری کرنے والے اللہ وتے نے سلیم سے کہا "او بھائی' کوئی دوا شوا کا بندوبست کر دے صاحب کے لئے۔"

"کیسے کر دوں؟" سلیم نے اس پر آنکھیں نکالیں "الٹا مصیبت میں پھنس جاؤں تو' صاحب ناراض ہو گیا تو کیا ہو گا؟"

"ہاں' یہ تو ہے" کونسل کے بڑوں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے متفکرانہ انداز میں کہا۔

استقبالیئے پر بیٹھے صابر نے یہ غیر معمولی سرگرمیاں دیکھیں تو سمجھ گیا کہ دال میں کالا ہے۔ ہوٹل میں ایسا ہوتا رہتا تھا مگر وہ خود کو لئے دیئے رہتا تھا۔ ان چکروں میں کبھی نہیں پڑتا تھا۔ یہ ویٹر لوگ ذرا دیر میں سر چڑھ جانے والے لوگ تھے۔ اس لئے وہ ان سے فاصلہ ہی رکھتا تھا۔

مگر یہ معاملہ مجیب انور کا تھا' جس میں وہ دلچسپی لئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اسے تو اس معاملے میں تجسس بہت تھا۔ مجیب کی اس غیر اخلاقی دلچسپی سے اسے دلی تکلیف پہنچی تھی۔

بہت سوچ سمجھ کر اس نے ارشد سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ ویٹرز میں نسبتاً بہتر تھا۔ اس نے ارشد کو بلایا "کہو بھئی' سر جوڑے کیا باتیں کر رہے ہو؟"

"کچھ نہیں سر!"

"کچھ تو ہے۔ دو گھنٹے ہو گئے مجھے دیکھتے۔"

"یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے سر۔ پر آپ کب دلچسپی لیتے ہیں؟"

صابر کا دل گھبرانے لگا۔ نہ جانے کیا ملے گا سننے کو۔ اس نے ان باتوں میں کبھی دلچسپی نہیں لی تھی مگر باتیں کان میں پڑ ہی جاتی تھیں۔ زیادہ تر یہ ہلچل اس وقت ملتی تھی جب کوئی کال گرل رخصت ہوتے وقت کسٹمر کی درندگی کی کہانی سنا کر اپنے جسم پر اس کے ثبوت دکھاتی تھی۔ اس کی بات کرتے ہوئے ویٹرز کی گردن یوں تنتی تھی اور آنکھیں یوں چمکتی تھیں جیسے وہ سب کارنامے خود انہوں نے انجام دیئے ہوں۔ تو کیا مجیب انور بھی....! یہ سوچ کر ہی صابر کا دل گھبرا گیا "میں واقعی دلچسپی نہیں لیتا۔" بالاخر اس نے ارشد سے کہا "لیکن یہ 201 والا گیسٹ.... تم جانتے ہو' مجھے اس میں دلچسپی ہے۔ بتاؤ۔ کیا ہوا؟"

"رات لڑکی آئی تھی نا ان کے لئے" ارشد نے ڈرتے ڈرتے بات شروع کی۔ وہ

غور سے صابر کے چہرے کو دیکھ رہا تھا تا کہ چہرے کے تاثر سے اندازہ لگا سکے اور اسی حساب سے بات کرے۔

"ہاں' مجھے معلوم ہے" صابر نے کہا۔

"صاحب اسے آج کے لئے بھی بک کرنا چاہتے تھے مگر لڑکی نے منع کر دیا۔"

"کیوں؟"

"اس کا کہنا ہے کہ اس کا پیشہ بدکاری ہے' بھیک مانگنا نہیں۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ صاحب سکون سے رات بھر سوتے رہے۔ اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

"تو اس میں کیا برائی ہے۔ لڑکی کو تو فائدہ ہی ہوا۔"

"آپ ان کسبیوں کو نہیں جانتے سر جی۔ یہ بڑی حرام زادی ہوتی ہیں۔ وہ کہہ رہی تھی کہ خالی خولی نام کے مردوں سے اسے بہت ڈر لگتا ہے۔ کچھ کرنا جن کے بس میں نہیں ہوتا پھر وہ توڑ پھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ جانور بن جاتے ہیں' ایسوں سے دور رہنا ہی اچھا۔"

"مگر اس گیسٹ نے تو یہ سب کچھ نہیں کیا۔"

"انہوں نے تو اسے انگلی بھی نہیں لگائی سر!"

"تو پھر مسئلہ کیا ہے؟"

"لڑکی کہتی ہے' وہ اس سے کہانی پوچھ رہے تھے اس کی۔ کون ہے' یہاں تک کیسے پہنچی تاکہ اسے بلیک میل کر سکیں۔ وہ کہتی ہے' وہ بہت خطرناک آدمی ہیں۔"

اس بار صابر مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا "بکتی ہے وہ۔"

"نہیں سر جی۔ شریفوں کا واقعی کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ یہ لڑکیاں بہت تیز ہوتی ہیں آدمی کو سمجھنے میں۔ دنیا دیکھی ہوتی ہے انہوں نے۔"

"ٹھیک ہے۔ چھوڑو اس بات کو" صابر نے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ارشد چلا گیا۔ صابر' مجیب کے بارے میں سوچے جا رہا تھا۔ کیسی رسوائی ہو رہی تھی اس کی.... وہ بھی خوامخواہ مگر ایک بات وہ سمجھ گیا تھا۔ ہو نہ ہو' مجیب صاحب کا کال گرل

کے بارے میں کہانی لکھنے کا ارادہ ہے۔ اسے افسوس ہونے لگا۔ اس نے نہ صرف مجیب انور کو غلط سمجھا بلکہ اس کی کردار کشی بھی کی۔ آخر ناظمہ کو یہ سب کچھ بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ خوامخواہ ایک شریف آدمی کا امیج خراب کیا۔ کال گرل طلب کرنے کی وجہ کچھ بھی ہو مگر یہ طے ہے کہ مجیب انور بدکار اور عیاش نہیں ہے۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال چمکا۔ وہ محروم بھی تو ہو سکتا ہے۔



معاہدہ مکمل ہونے کے بعد غفور اپنی دکان کی طرف چلا گیا۔ اس نے شام کو آنے کا وعدہ کیا تھا۔ مجیب بازار کی طرف چل دیا۔ سحاب اور بچوں کے لئے کچھ خریداری کرنا تھی۔ اس وقت اسے بچے اس شدت سے یاد آئے کہ گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ جی چاہا کہ اڑ کر کراچی پہنچ جائے۔

وہ سامان سے لدا پھندا ہوٹل پہنچا۔ استقبالیہ کلرک صابر کھانا کھا رہا تھا۔ اس نے بڑے تپاک سے اسے سلام کیا اور بولا "سر' آج ہمیں عزت بخش دیں۔"

"سوری۔ کھانا میں نے غفور کے ساتھ کھا لیا تھا" مجیب نے معذرت کی۔

"اچھا سر' چائے تو پی لیں گے نا؟"

کلرک کے لہجے میں ایسی لجاجت تھی کہ مجیب انکار نہ کر سکا۔ وہ لابی میں اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔ صابر نے پوچھا "آپ کا سامان اوپر بھجوا دوں؟"

"ہاں بھئی' شکریہ۔"

صابر نے آواز دے کر سلیم کو بلایا "کاؤنٹر سے 201 کی چابی لو اور صاحب کا سامان کمرے میں پہنچا دو۔" اس نے ہدایت کی پھر اس نے ارشد کو بلا کر چائے لانے کو کہا۔

سلیم سامان لے گیا اور ارشد چائے لے آیا۔ چائے پینے کے دوران میں صابر نے پوچھا "سر.... اپنے بارے میں کچھ بتائیں؟"

"میرا انٹرویو نہیں پڑھا تم نے؟"

"پڑھا تھا مگر سب کچھ تو اس میں بھی نہیں ہے۔"

مجیب انور اسے اپنے بارے میں بتانے لگا "بچے کتنے ہیں آپ کے سر؟" صابر نے پوچھا۔

"تین۔ دو بیٹے ایک بیٹی!"

"بڑے ہوں گے ماشاء اللہ۔"

"سب سے چھوٹی بیٹی چار سال کی ہے۔" مجیب نے بتایا۔

چائے ختم کرنے کے بعد مجیب نے صابر کا شکریہ ادا کیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ صابر ڈیسک پر آ گیا۔ بچوں کی بات اس نے بے سبب نہیں چھیڑی تھی مگر بات اب بھی واضح نہیں ہو سکی تھی۔ بہرحال وہ مطمئن تھا کہ مجیب انور برا آدمی نہیں، ہو ہی نہیں سکتا۔



مجیب نے کمرے میں پہنچتے ہی سلیم کو طلب کیا "فرمائیں سر، کیا حکم ہے؟" سلیم نے پوچھا۔

"لڑکی ہے یا چلی گئی؟" مجیب نے نظریں ملائے بغیر پوچھا۔

"چلی گئی سر۔ دوسرے کمرے کی چابی اب بھی میرے پاس ہے۔"

"برا ہوا۔ رک جاتی تو اچھا تھا۔"

"میں نے بہت کوشش کی روکنے کی۔ پر بری طرح بھڑکی ہوئی تھی سر!" سلیم نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ یہ موقع تھا صبح کی بے عزتی کا کچھ بدلہ لینے کا، جب صاحب نے اسے مسکرانے پر بری طرح ڈانٹا تھا۔

مجیب نے چونک کر اسے دیکھا "کچھ کہہ رہی تھی۔"

سلیم نے دانستہ جھجکنے کی اداکاری کی "نہیں.... نہیں تو سر جی!" پھر معنی خیز لہجے میں اضافہ کیا "اور کہے بھی تو اس کی کون سنے گا سر جی!"

مجیب کو اس کا انداز اور لہجہ بہت برا لگا مگر وہ اس کی مجبوری بن گیا تھا "ٹھیک ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں سر۔ میں اور بندوبست کر لوں گا۔"

"وہ مجھے اچھی لگی تھی۔ میرے مطلب کی تھی" مجیب نے آہستہ سے کہا۔

"میں سر، بندے کا ذوق پہچانتا ہوں۔" سلیم کے لہجے میں تفکر تھا "اس سے اچھی لے آؤں گا۔"

"کل تو میں چلا ہی جاؤں گا۔ بس آج رات کی بات ہے۔" مجیب نے کہا "ٹھیک ہے۔ تم جاؤ لیکن رکو.... ایک بات اور ہے۔"

سلیم سوالیہ نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"اگلے مہینے میں پھر آؤں گا۔ مجھے مری جا کر لکھنے پڑھنے کا کچھ کام کرنا ہے۔ ایک مہینہ تو لگے گا۔ زیادہ بھی ہو سکتا ہے اور اکیلے میں سو نہیں سکتا۔ تم میرے لئے کسی اچھی سی لڑکی کا بندوبست کر کے رکھنا۔ ایسی ہو کم از کم.... پروین جیسی۔ اچھی باتیں کرتی ہو۔ انداز سے بازاری نہ لگے" مجیب کہتے کہتے رکا "میں تمہیں ایک ہزار دوں گا۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں سر۔ آپ خوش ہو جائیں گے۔ یہاں کتنے دن رکیں گے؟"

"دو دن۔"

"ٹھیک ہے سر۔ کام ہو جائے گا۔"

ویٹر کے جانے کے بعد مجیب اس سلسلے میں سوچتا رہا۔ ویٹر کے انداز سے اسے اندازہ ہوتا تھا کہ پروین نے جاتے جاتے اس سے کچھ اور طرح کی باتیں کی ہوں گی۔ اس سے کچھ بعید بھی نہیں تھا۔ ڈرے ہوئے لوگ تو کچھ بھی کہہ سکتے ہیں.... کچھ بھی کر سکتے ہیں اور پھر آدمی کیچڑ میں چلے گا تو گندگی بھی اچھلے گی۔

تو ایک گندگی ساتھ لے کر جاؤ گے اور اسے طویل عرصے تک ساتھ لگا کر رکھو گے مری میں۔ اس نے خود سے کہا۔ مجبوری ہے، اس نے سرد آہ بھر کے سوچا۔ نیند سے محروم جو ایک رات یہاں گزری ہے، ویسی ایک اور رات گزارنے کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔ کجا یہ کہ ویسی ان گنت راتیں۔ نہیں بھئی، گندگی میں رہنا اس اذیت سے بہتر ہے۔

پھر وہاں بات اور ہو گی۔ اس نے خود کو دلاسا دیا۔ وہ ہوٹل نہیں، بنگلا ہو گا اور لڑکی کے لئے بھی وہ اجنبی ماحول ہو گا۔ لوگوں سے گھلنا ملنا بھی نہیں ہو گا۔ چوکی دار اور ایک آدھ ملازم کے سوا وہاں کوئی ہو گا ہی نہیں۔ وہاں ایسا کچھ نہیں ہو گا۔

مگر کیا یہ بہتر نہیں کہ اسکرپٹ کراچی ہی میں لکھ لیا جائے.... گھر میں نہ سہی، کسی

اور جگہ سہی۔ اس کے اندر سے کسی نے کہا۔

دیکھیں گے۔ اس نے بلند آواز میں خود کلامی کی پھر وہ اپنا سامان اضافی بیگ میں رکھنے لگا' جو اس نے بیوی اور بچوں کے تحائف کی وجہ سے خریدا تھا۔



مجیب نے رات کا کھانا اپنے کمرے میں غفور کے ساتھ کھایا۔ ساڑھے نو بجے کے قریب غفور رخصت ہوا "آپ کو لینے کے لئے کل میں گاڑی لے کر آ جاؤں گا..... پانچ بجے۔"

اس نے مجیب سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا "میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حکم کریں۔"

"ارے نہیں بھائی۔ میں تو ویسے ہی تمہارا بوجھ محسوس کر رہا ہوں۔"

"ایسی باتیں نہ کریں سر۔ میں تو مہمان نوازی بھی نہیں کر سکا۔ اچھا چلتا ہوں سر!"

غفور کے جانے کے بعد سلیم کمرے میں آیا "آپ کا مہمان آ چکا ہے سر جی! دوسرے کمرے میں ہے" اس نے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔

دوسرے کمرے کے حوالے پر مجیب کو ایک بہت اہم بات یاد آئی "سنو سلیم' دوسرے کمرے کا بل فائنل ہو جائے تو کل دوپہر تک مجھے بتا کر حساب صاف کر دینا" اس نے کہا "یہ بوجھ میں اپنے میزبان پر نہیں ڈالنا چاہتا۔"

"ٹھیک ہے سر جی!" برتن سمیٹ کر ٹرے پر رکھنے کے بعد سلیم سیدھا ہوا "سر جی' میرے لائق کوئی اور خدمت ہو تو بلاتکلف کہیں سر جی!" اس نے معنی خیز لہجے میں کہا "میں ہر چیز کا بندوبست کر سکتا ہوں..... پوری راز داری سے۔"

مجیب نے الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا "مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔"

"دوا دارو کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے سر!" سلیم نے نروس انداز میں کہا "میرا مطلب ہے' دونوں کا۔"

مجیب نے دل ہی دل میں اپنی اس مجبوری کو کوسا' جس کی وجہ سے ویٹر کو منہ لگانا

پڑا تھا "شکریہ!" اس نے خشک لہجے میں کہا "اس کی مجھے کبھی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

جہاں دیدہ سلیم کو اندازہ ہو گیا کہ گیسٹ کو اس کی بات بری لگی ہے۔ ضروری تھا کہ اپنی مستقبل کی اہمیت بھی جتا دی جائے۔ چنانچہ اس نے جلدی سے کہا "اور مری کے لئے بھی بے فکر رہئے گا سر۔ میں سب انتظام کر کے رکھوں گا۔ آپ بس آنے سے پہلے ہوٹل کے پتے پر مجھے چٹھی لکھ دیجئے گا۔"

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" مجیب نے بے زاری سے کہا پھر گیارہ سو روپے نکال کر اسے دیئے "ٹھیک ہے نا؟"

"ٹھیک ہے سر جی!" سلیم نے کہا۔ "اب میں چلتا ہوں' ڈیوٹی آف ہو رہی ہے۔"

سلیم کے جانے کے بمشکل دو منٹ بعد مجیب کو باتھ روم کی چٹخنی گرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ بری طرح چونکا پھر اسے یاد آیا کہ پروین نے جاتے ہوئے باتھ روم کا درمیانی دروازہ اپنے کمرے کی طرف سے بند کیا تھا۔ سو اب دوسرے کمرے میں موجود اس کی مہمان اسے کھول رہی تھی۔

سلیم کی باتوں نے اس کی طبیعت مکدر کر دی تھی۔ اسے خود پر بھی غصہ آ رہا تھا۔ آدمی کو اتنا کمزور بھی نہیں ہونا چاہئے۔ خوامخواہ گرے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں بھی ذلیل ہونا پڑتا ہے۔

قدموں کی چاپ اور دروازہ کھلنے کی آواز سن کر اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو موڈ چوپٹ ہو گیا۔ لڑکی اس کے کمرے میں آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اس کا تکدر بڑھ گیا۔ پروین کے برعکس اس لڑکی کے چہرے پر میک اپ تھپا ہوا نہیں تھا بلکہ بہت ہلکا میک اپ تھا اور سلیقے سے کیا گیا تھا۔ لباس بھی بے حد معقول تھا۔ لگتا تھا' سلیم نے اسے بہت اچھی طرح سمجھایا تھا لیکن اس معقول حلیئے کے باوجود یہ لڑکی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ خوش شکل بھی تھی مگر اس کے چہرے اور انداز اور ادا سے صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ کون ہے۔ پروین میں یہ بات نہیں تھی۔ خیر' مجھے کیا۔ اس نے سوچا۔ مجھے تو سونا ہی ہے۔ بات کرنے کی بھی ضرورت نہیں اور پھر آج رات ہی کی تو بات ہے۔

"سر' میں آ سکتی ہوں؟" لڑکی نے کمر پر ہاتھ رکھ کر بڑے نخرے اور ادا سے پوچھا۔

"آ تو گئی ہو۔ اب اجازت کی کیا ضرورت ہے؟" مجیب نے چڑچڑے پن سے کہا اور اٹھ کر کمرے کے دروازے کی طرف بڑھ گیا' جو لاک نہیں تھا۔ دروازہ لاک کر کے وہ باتھ روم میں سے گزر کر ملحقہ کمرے میں گیا۔ پچھلے تجربے کے پیش نظر اسے لڑکی سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ اس نے دروازہ بند کیا ہے یا نہیں۔

اور دوسرے کمرے کا دروازہ بند نہیں تھا۔ وہ اسے لاک کرنے کے بعد باتھ روم سے گزر کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ لڑکی سنگھار میز کے سامنے بیٹھی اپنے اسلحے کا معائنہ کر رہی تھی۔



اس رات صفورہ گیارہ بجے ہی سونے والے کمرے میں چلی آئی۔ صابر بھائی دس بجے سے کچھ پہلے آ گئے تھے۔ اس نے ان کے انتظار میں رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ وہ آئے تو وہ بھی بھابی کے ساتھ کھانے پر بیٹھ گئی "اور سناؤ' کیسی گزر رہی ہے" صابر بھائی نے پوچھا "بور تو نہیں ہو رہی ہو؟"

"نہیں۔ کتابیں موجود ہوں تو میں بور کبھی نہیں ہوتی" صفورہ نے کہا "لیکن ایک کمی محسوس ہو رہی ہے۔ آپ سے بات نہیں ہو پاتی۔"

"زیادہ سے زیادہ دو دن کی بات ہے۔ مجھے آج کل ڈیڑھ ڈیوٹی کرنی پڑ رہی ہے پھر بھی' آج خوب باتیں کریں گے۔"

"نہیں۔ آپ کی ڈیوٹی نارمل ہو جائے پھر" صفورہ نے جلدی سے کہا "آج تو مجھے بہت نیند آ رہی ہے۔"

"ابھی اپنے ہاں کی عادی ہو نا" صابر نے ہنستے ہوئے کہا "چند روز میں ہمارا رنگ چڑھ جائے گا۔"

بات یہ نہیں تھی کہ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ گزشتہ رات اس نے اتفاقاً صابر بھائی کی بھابی سے گفتگو سن لی تھی۔ کیسی عجیب بات تھی کہ مجیب انور اسی دن' تقریباً اسی وقت لاہور پہنچا تھا' جب وہ لوگ پہنچے تھے اور وہ ٹھہرا بھی اسی ہوٹل میں تھا جہاں

صابر بھائی کام کرتے تھے اور کیسی دل شکن بات تھی کہ اس کے متعلق ایسی خراب بات سامنے آئی تھی۔ وہ دن بھر اسی کے متعلق سوچتی رہی تھی۔ منفی بات تو کہیں پیچھے رہ گئی تھی۔ یہ خیال اس کے لئے سنسنی خیز تھا کہ وہ اس قدر قریب ہے۔۔۔ اسی شہر میں' جہاں وہ سانس لے رہی ہے۔ اس سے ملنا کتنا آسان ہے۔۔۔ مگر کتنا مشکل۔

اس نے تھوڑی دیر ایک کتاب پڑھنے کی کوشش کی لیکن پڑھنے میں اس کا دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے لائٹ آف کی اور بستر پر دراز ہو گئی مگر نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور مجیب کے تصور میں کھو گئی۔

اصل میں صفورہ کو تجسس تھا۔ اسے یقین تھا کہ صابر بھائی آج بھی بھابی کو مجیب کے بارے میں کچھ بتائیں گے اور مجیب کے بارے میں وہ سب کچھ جان لینا چاہتی تھی۔ اس بار مجیب اس کے تصور میں اس شخص کے روپ میں آیا' جسے اس نے لاہور اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بڑھیا کی جان بچاتے دیکھا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ شخص اسے اچھا لگا تھا۔۔۔ بہت اچھا۔

وہ اس بار بھی ساحل سمندر پر ملے تھے مگر اس بار وہ اس سے خفا تھی۔ اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

مجیب نے یہ بات محسوس کر لی "کیا بات ہے؟ ناراض ہو مجھ سے۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"اچھا' بات تو بتاؤ۔"

وہ پھٹ پڑی "میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ اخلاقی طور پر اتنی گراوٹ کا شکار ہوں گے۔"

"اوہ۔۔۔وہ۔ بڑا مسئلہ ہے۔ یہاں کوئی بات چھپتی ہی نہیں۔"

"بات کھلنے یا چھپنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔" صفورہ نے کہا۔ "حقیقت تو وہی رہتی ہے۔"

مجیب اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا "تم مجھ سے محبت کرتی ہو' ہے نا؟"

"ہاں۔"

"تو پھر مجھے انسان سمجھو۔ میری کمزوریوں' میری خامیوں سے بھی پیار کرو۔ یہ کیا

کہ آدمی کو فرشتہ سمجھ کر محبت کرلی اور جب پتہ چلا کہ وہ آدمی ہے تو محبت ختم۔۔۔"

"کرتی تو میں ایسا ہی ہوں" صفورہ نے کہا "لیکن آپ کو بلند۔۔۔ بہت بلند دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"یہ بھی بچکانہ بات ہے۔ بلندی پستی جس کے اختیار میں ہے' اس سے دعا کرو۔"

صفورہ شرمندہ ہونے لگی۔ وہ لفظوں کا آدمی تھا۔ لاجواب کر دیتا تھا "پھر بھی آپ میری خاطر اپنی بڑی خرابیوں کو چھوڑ تو سکتے ہیں۔" اس نے التجائیہ لہجے میں کہا۔

"کوشش کر سکتا ہوں لیکن کمزور لمحے تو کسی کا بھی سر جھکا سکتے ہیں۔"

صفورہ چونکی۔ تصور کی قلم ٹوٹ گئی۔ وہ تصور میں ایسی گم تھی کہ پتہ ہی نہ چلا کہ صابر بھائی اور بھابی اپنے کمرے میں آ چکے ہیں۔ وہ تو مجیب کے نام پر چونکی تھی۔ اس نے ان کی گفتگو پر کان لگا دیئے۔



صابر اس روز بھی ناظمہ سے گفتگو نہیں کرنا چاہتا تھا مگر یہ اس پر قرض تھا۔ گزشتہ رات اس نے مجیب کے بارے میں جو کچھ کہا تھا' اب اس کی تردید ضروری تھی۔ یہ کیا کہ کسی کا امیج تباہ تو کر دیا لیکن غلطی کا احساس ہونے پر اس کی صفائی پیش نہیں کی۔

"ناظمہ!" اس نے آہستہ سے بیوی کو پکارا "میں نے مجیب صاحب کو غلط سمجھا تھا۔ وہ برے آدمی نہیں ہیں۔"

ناظمہ نے کروٹ بدل کر اسے دیکھا "کیوں' کیا ہوا؟"

صابر نے اسے وہ سب کچھ کہہ سنایا جو ہوٹل میں ادھر ادھر سے جمع کیا تھا۔

"اس سے تو کچھ ثابت نہیں ہوتا" ناظمہ نے کہا "ممکن ہے کہ۔۔۔" وہ بات پوری نہیں کر سکی۔

صابر نے اس کی بات سمجھ لی "نہیں۔ یہ بات ہوتی تو وہ کم از کم کوشش کرتے۔"

"پھر اسے بلوانے کا کیا جواز ہے؟"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ ہو سکتا ہے' کوئی اور بات بھی ہو مگر اتنا کہہ سک

ہوں کہ وہ اس سے اس کی کہانی سننا چاہتے تھے۔ ممکن ہے' اس موضوع پر کوئی کہانی لکھ رہے ہوں۔"

"ہاں' ہو سکتا ہے مگر کوئی اور وجہ بھی ہو گی" ناظمہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"اچھا' آج کیا ہوا؟"

"آج بھی۔۔۔ آج جو لڑکی آئی ہے' وہ بہت ہی خطرناک لگ رہی تھی۔"

"ایسی عورتیں تو خطرناک ہی ہوتی ہوں گی۔"

"نہیں۔ کل والی ایسی نہیں لگ رہی تھی۔"

"اس کے باوجود کیسی باتیں کر کے گئی" ناظمہ نے ملامت بھرے لہجے میں کہا "تم مرد تو بس عورت کا ظاہر ہی دیکھتے ہو۔"

"اچھا اب سو جاؤ" صابر نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا "کل مجیب صاحب واپس جا رہے ہیں۔"



دوسرے کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی!

صفورہ نے سکون کی گہری سانس لی۔ ابھی چند لمحے پہلے تک کیا تھا۔ روشنی میں بھی دنیا اتنی روشن نہیں لگ رہی تھی مگر چند لمحوں میں سب کچھ بدل گیا تھا۔ تاریک کمرا بھی جگمگاتا ہوا لگ رہا تھا۔

پتا نہیں کیوں' میرے اندر بہت گہرائی میں یہ یقین تھا کہ مجیب انور ایسے نہیں ہو سکتے۔ اس نے خود سے کہا۔ اپنی تحریر سے مختلف کوئی بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ اب تو وہ اور سچے قلم کار کے روپ میں سامنے آئے ہیں۔

اچانک ہی اس کا دل اداس ہو گیا۔ اگلے روز وہ جا رہا تھا۔ کاش۔۔۔ کاش وہ اس سے مل پاتی۔ اس کا جی چاہا کہ اڑ کر مجیب کے پاس چلی جائے لیکن وہاں تو پہلے ہی ایک بری لڑکی ہو گی۔۔۔ ان کی خلوت میں۔ دل میں ایک خیال نے چٹکی لی۔

اس کے بعد کہاں اس سے ملنے کا کوئی موقع ملے گا۔ اداسی اور گہری ہونے لگی۔ اگر وہ صابر بھائی سے کہے تو شاید وہ اسے اس سے ملوا دیں گے لیکن نہیں' اتنا کچھ سننے کے بعد وہ ہوٹل میں اس سے کیسے مل سکتی ہے۔ اس ماحول میں ملنا ممکن ہی نہیں۔ وہ

ایک شریف لڑکی ہے۔ لوگ کن نظروں سے دیکھیں گے۔ ہاں' یہ ہو سکتا ہے کہ صابر بھائی اسے یہاں لے آئیں لیکن پھر اسے خیال آیا کہ وہ صابر بھائی سے اس کے متعلق بات کر ہی نہیں سکتی۔ ان کے حساب سے تو اسے لاہور میں مجیب انور کی موجودگی کا علم ہی نہیں ہے۔ انہوں نے اسے بتایا ہی کب ہے۔ وہ تو اس نے ان کی لاعلمی میں سن لیا تھا۔

اچانک اس نے اپنے بچپنے کو بری طرح جھڑک دیا۔ ختم کرو یہ حماقت۔ ایسے ملنے کا کیا فائدہ۔ یوں تو کوئی بھی ان سے مل سکتا ہے اور میں چاہے ان کے لئے "کوئی" ہوں۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ میں تو بہت ہی خاص ہوں۔ ان سے بے پناہ محبت کرتی ہوں۔ میں ان سے یوں پرستاروں کی طرح سرسری انداز میں ملنا deserve نہیں کرتی۔

اسے خیال آیا کہ وہ اللہ سے دعا کر چکی ہے اور دعا کے بعد اسے سکون بھی آیا تھا۔ لگا تھا کہ دعا قبول ہو گئی۔ اب امکان نہیں تو کیا۔ وہ ملانا چاہے گا تو اسے ملا دے گا۔ اس کے ہاں تو ناممکن کچھ بھی نہیں ہے۔

اس خیال کے بعد وہ پرسکون ہو گئی۔



یہ دوسری لڑکی مجیب کے لئے کوفت کا باعث تو بنی لیکن اس کی موجودگی کی افادیت اپنی جگہ تھی۔ جب نیند آئی تو وہ سکون سے سو گیا۔ سونے سے پہلے وہ مطالعہ کرتا رہا۔ اسے خود بھی حیرت تھی کہ لڑکی کے بارے میں اسے پیشہ ورانہ تجسس بھی نہیں تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ آپ اپنا چلتا پھرتا اشتہار تھی۔

لڑکی نے شروع میں اسے لبھانے کی کوششیں کیں مگر کچھ دیر بعد سکون سے لیٹ گئی۔ شاید سلیم نے اسے سمجھا دیا ہو گا۔ چنانچہ مجیب اپنے مطالعے میں مصروف رہا۔ اس نے لڑکی سے اس کا نام تک نہیں پوچھا۔ ویسے بھی اس معاملے میں اخلاقیات کا تو کوئی دخل نہیں تھا کہ وہ اس کی فکر کرتا۔

کچھ دیر بعد لڑکی نے منمناتی آواز میں پوچھا۔ "سر جی' اگر نیند آئی تو میں سو سکتی ہوں؟"

"ضرور۔ وہ تکیہ رکھا ہے' اس طرف سو جاؤ۔" مجیب نے بڑے اخلاق سے کہا۔

لڑکی لیٹ گئی "کوئی ضرورت پڑے تو مجھے جگا لینا سر جی!" اس نے دعوت دی۔

صبح نو بجے مجیب کی آنکھ کھلی تو لڑکی بستر پر موجود نہیں تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ لڑکی باتھ روم میں بھی نہیں تھی۔ درمیان کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے دوسرے کمرے میں جا کر دیکھا۔ وہ وہاں بے خبر سو رہی تھی۔ مجیب کو بہت غصہ آیا۔ وہ تو شکر تھا کہ درمیان میں اس کی آنکھ نہیں کھلی۔ ورنہ اچھا خاصا مسئلہ ہو جاتا۔

اس جھنجلاہٹ میں اس نے اسے جھنجھوڑ کر جگا ڈالا۔ لڑکی آنکھیں ملتے ہوئے اٹھی "ٹیم کیا ہوا ہے سر جی!" اس نے آنکھ کھلتے ہی پوچھا۔

"نو بجے ہیں مگر تم یہاں کیوں ہو۔ تمہیں میرے کمرے میں ہونا چاہئے تھا۔"

"وہ سر جی' بات یہ ہے کہ کسی کے ساتھ ہوں تو میں سو نہیں سکتی۔ اکیلے میں ہی نیند آتی ہے مجھے۔"

مجیب کی ہڈیاں تک سلگ اٹھیں "تم نے بڑی غیر ذمے داری کی ہے۔"

"پر آپ تو بے خبر سو رہے تھے سرجی!" وہ اٹھلائی "خیر جی' رات کی جانے دیں میں اب بھی ہر خدمت کے لئے تیار ہوں" اس کی مسکراہٹ میں بلاوے تھے۔

"شکریہ۔ میں صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ یہاں ناشتہ منگوا لینا اپنے لئے۔ میں دروازہ بند کر رہا ہوں۔"

"پر سرجی۔۔۔۔"

"اور اس کے بعد تم جب جی چاہے جا سکتی ہو۔ مجھے بتانے کی ضرورت نہیں" کہہ کر مجیب اپنے کمرے میں آگیا۔ اس نے دروازہ بند کر لیا۔

سلیم ناشتہ لے کر آیا تو اس نے خالص کاروباری انداز میں اس سے کہا "سنو سلیم مری میں ساتھ رہنے کے لئے اس طرح کی نہیں چلے گی اور یہ بھی سن لو۔ میں مہینے کے آٹھ ہزار سے زیادہ نہیں دوں گا۔" اپنے انداز پر اسے خود بھی حیرت ہوئی۔ وہ دو دن میں وہ اتنا پکا ہو گیا تھا۔

"آپ بے فکر ہو جائیں سرجی!" سلیم نے کہا "وقت بہت پڑا ہے۔ وہ کام پوری طرح آپ کی مرضی کا ہو گا۔"

"اور اب اس کمرے کا بل لے آؤ تاکہ میں ادائیگی کر دوں۔"

"ابھی لاتا ہوں سرجی!"



غفور پونے پانچ بجے ہوٹل میں داخل ہوا اور سیدھا استقبالیہ کی طرف بڑھا۔ وہاں صابر موجود تھا۔ کمرا نمبر 201 کا بل تیار تھا۔ صابر نے اسے سامنے رکھ دیا۔ غفور نے ادائیگی کر دی۔

غفور' مجیب کے کمرے کی طرف چلا تو صابر بھی اس کے ساتھ تھا۔ "میں نے سوچا' مجیب صاحب کو الوداع کہہ دوں" صابر نے اس کی مستفسرانہ نظروں کی جواب میں کہا۔

مجیب روانگی کے لئے تیار تھا۔ بس چھوٹی موٹی چیزیں سمیٹنا تھیں۔ یوں صابر کو دیر باتیں کرنے کا موقع مل گیا "سر' اگلے مہینے آپ پھر آئیں گے نا؟" اس نے پوچھا

"ہاں مگر آگے جانے کے لئے آؤں گا" مجیب نے اپنے پروگرام کے متعلق بتایا۔

"ہمارے گھر کھانے کا وعدہ بھی پورا کریں گے؟"

"انشاء اللہ۔"

"ہم آپ کی کامیابی کے لئے دعا کریں گے سر!"

"شکریہ!"

پانچ بجے وہ ہوٹل سے نکل آئے۔ باہر غفور کی گاڑی کھڑی تھی۔ اسٹیشن پہنچنے میں بیس منٹ لگے۔ غفور نے گاڑی میں پہلے سے رکھا مٹھائی کا ڈبا اور ایک اور پیکٹ نکال کر مجیب کو دیا "یہ کیا ہے؟" مجیب نے پوچھا۔

"مٹھائی ہے سر۔۔۔ اور بھابی اور بچوں کے لئے کچھ چیزیں ہیں۔"

غفور گاڑی کے حرکت کرنے تک مجیب کے ساتھ رہا۔ ٹھیک چھ بجے گاڑی چلی تو وہ مجیب سے گرم جوشی سے گلے ملنے کے بعد گاڑی سے اترا۔ مجیب نے سکون کی سانس لی۔ ریلوے کی کارکردگی بہت بہتر ہو گئی تھی۔۔۔۔ پچاس فیصد۔ اور پچاس فیصد بھی اگلی صدی تک۔ ٹھیک ہو ہی جائے گی۔ اب کم از کم ٹرینیں روانہ تو وقت پر ہونے لگی ہیں اور اگلی صدی ہی کون سی دور ہے۔ اس نے سوچا۔۔۔۔ صرف 102 سال!

پھر اس نے ایک اور گہری سانس لی۔ لوٹ کر بدھو گھر کو آئے۔ اس کا وجود طمانیت کے احساس سے بھر گیا۔



ٹرین میں رات بھر وہ سکون سے سویا۔ صبح دس بجے وہ کراچی کے اسٹیشن پر تھا۔ گیارہ بجے سے پہلے گھر پہنچ گیا۔ بچے اسکول گئے ہوئے تھے۔ سحاب اسے دیکھ کر حیران ہوئی "اتنی جلدی آگئے آپ؟" اس نے کہا۔

"مایوسی ہوئی تو واپس چلا جاتا ہوں" مجیب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جا سکیں تو ضرور چلے جائیں۔"

"ٹکٹ نہیں ملے ورنہ میں تو کل ہی آگیا ہوتا۔" مجیب نے کہا۔ "کام ہی کتنا تھا۔"

مجیب نے بیگ کھول کر وہ چیزیں نکالیں' جو وہ لاہور سے لایا تھا۔ سحاب بہت

خوش ہوئی مگر فوراً ہی عورت بن گئی "اس فضول خرچی کی کیا ضرورت تھی؟"

"فضول خرچی ہوتی تو بلاضرورت ہے" مجیب ہنسنے لگا۔ "ضرورت کے تحت ہو تو فضول خرچی کیوں کہلائے۔"

انہیں زیادہ دیر بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ کراچی پہنچتے ہی کراچی کی زندگی شروع ہو گئی۔ کل بیل کی آواز سن کر مجیب نے دروازہ کھولا تو ایوب ساغر سامنے تھا۔ مجیب نے دروازہ کھول کر اسے ڈرائنگ روم میں بٹھایا "معافی چاہتا ہوں سر۔ بے وقت آیا ہوں۔"

"تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ کتنے بروقت آئے ہو" مجیب نے کہا "ایک گھنٹہ پہلے آئے ہوتے تو واقعی بے وقت ہوتا۔"

"میں سمجھا نہیں سر!"

"لاہور سے آئے، مجھے ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا ہے۔"

ایوب شرمندہ نظر آنے لگا "تب تو سر میں نے ڈسٹرب کیا آپ کو۔ ابھی تو سفر کی تھکن بھی نہیں اتری ہو گی۔"

"تھکن ہوئی ہی نہیں۔ پوری رات سکون سے سویا ٹرین میں" مجیب نے کہا "تم سناؤ۔ کوئی خاص بات ہی ہو گی ورنہ اس وقت نہ آئے ہوتے۔"

"میرے لئے تو خاص ہی بات ہے۔ آپ کو شاید نہ لگے" ایوب نے اپنا بیگ کھول کر اس میں سے شاہکار کا وہ شمارا نکالا جس میں قرضِ جاں چھپی تھی "میں گزشتہ کئی دن سے اس پر کام کر رہا ہوں سر!" اب اس کے لہجے میں دبا دبا جوش اور ہیجان تھا "رات میں نے اسے مکمل کیا۔ بس پھر بچوں کی طرح ایکسائیٹڈ ہو گیا۔ جی چاہا کہ فوراً آپ کو دکھاؤں اور آپ کی رائے لوں۔"

"اور میں تمہیں مل بھی گیا" مجیب نے ڈائجسٹ اس سے لیا اور اپنی کہانی کے صفحات نکالے۔ حاشیئے میں جا بجا ایوب ساغر کے ریمارکس تھے۔ کس جگہ کس تکنیک سے کام لینا ہے، کہاں کوئی تبدیلی کرنا ہے، کہاں بیانئیے کو کس طرح visual میں تبدیل کرنا ہے۔ ایوب نے اپنی بساط بھر مسئلے کو پوری طرح حل کر دیا تھا۔

"گڈ ورک ایوب!" مجیب نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔

"سر، پہلی بار مجھے آزادانہ سیریل بنانے کا کوئی موقع ملا ہے۔ میں بہت ایکسائیٹڈ ہوں پھر سر کہانی بھی وہ، جس پر سیریل بنانا میرا خواب تھا۔ میں جلد از جلد کام شروع کر دینا چاہتا ہوں۔"

"اب فرصت ہو گئی ہے۔ اسی پر کام کرنا ہے" مجیب نے کہا۔ "یہ ڈائجسٹ چھوڑ جانا۔ میں تنقیدی نقطہ نظر سے تمہارے نوٹس کا جائزہ لوں گا۔ جوابی نوٹس تیار کروں گا۔ پھر ہم اس پر تبادلہ خیال کریں گے۔ اس پروسس میں ہم تمام قسطوں کا scenario مکمل کریں گے۔ پھر میں اسکرپٹ پر کام شروع کر دوں گا۔"

"آپ مائنڈ تو نہیں کریں گے سر؟"

"کس بات کو؟"

"میں شاید خود کو آپ پر ضرورت سے زیادہ امپوز کر رہا ہوں۔"

"ارے نہیں۔ میں ایسا نہیں سمجھتا۔ یہ تو ٹیم ورک ہے۔"

"آپ کے خیال میں یہ کام کتنا وقت لے گا سر!"

"کچھ کہہ نہیں سکتا۔ دراصل یہ بہت اہم مرحلہ ہے۔ میرا خیال ہے، تین ہفتے تو لگیں گے اس میں پھر میرا بھی باقاعدہ اور مکمل اسکرپٹ لکھنے کا یہ پہلا تجربہ ہے اور یہ کہانی ڈرامے کے لحاظ سے بہت مشکل کہانی ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں سر اور آپ اسے شاہکار بنانا چاہیں گے۔"

"یقیناً.... میں ہی نہیں، تم بھی۔"

"ٹھیک ہے سر۔ میں چلتا ہوں...."

"ارے نہیں۔ اب کھانا کھا کر جانا۔"

"نہیں سر۔ مجھے اندازہ ہے کہ لاہور سے واپس آنے کے بعد آپ ابھی تک بچوں سے بھی نہیں ملے ہوں گے۔" ایوب نے اپنی مخصوص شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "اور میں اس بات کی اہمیت سمجھتا ہوں۔ میں مخل ہو گیا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔"

"نہیں سر۔ میں چلوں گا۔ آج کا دن آپ کے بچوں کا دن ہے" ایوب اٹھ کھڑا ہوا "جب یہ ڈائجسٹ آپ دیکھ لیں اور میری ضرورت ہو تو فون کر لیجئے گا۔

میں آ جاؤں گا۔"

مجیب کو اس کی سمجھ داری پر شدت سے پیار آیا۔



ایوب ساغر رخصت ہوا ہی تھا کہ بچے اسکول سے واپس آ گئے۔ مجیب کی صورت دیکھنے کے بعد ان کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ اس سے بری طرح لپٹ گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اس سے اتنے دن دور رہے تھے۔ کہنے کو وہ صرف تین دن تھے.... نہیں چار۔

مجیب کو بہت خوشی ہوئی۔ کسی بچے نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ ان کے لئے کیا لایا ہے۔ عالیہ نے بھی نہیں۔ ان کے لئے یہی سب سے بڑی خوشی تھی کہ ابو واپس آ گئے۔ ایسے میں تحفے دینے کی خوشی بڑی لازوال ہوتی ہے۔ مجیب نے انہیں ان کی چیزیں دیں۔ سب کی خوشیاں دوبالا ہو گئیں۔

بچے اسکول سے آتے ہی ہمیشہ سب سے پہلے کھانا مانگتے تھے لیکن اس روز وہ کھانا بھی بھول گئے "ابو' میں نے امی کو ذرا بھی پریشان نہیں کیا۔" شاہد نے بڑے فخر سے کہا۔

"میں نے بھی ابو!" حامد بولا۔

"اور میں نے بھی" عالیہ کیوں پیچھے رہتی۔

"تو تم لوگوں کو میں یاد نہیں آیا؟"

"نہیں ابو' یاد تو بہت آئے۔ دل ہی نہیں لگتا تھا ہمارا لیکن امی نے ہمیں سمجھا دیا تھا۔"

"اچھا!" مجیب نے کہا اور سحاب کو دیکھا' جو مسکرا رہی تھی۔

"ابو' آپ سعودی عرب تو نہیں جائیں گے نا؟" عالیہ نے معصومیت سے پوچھا۔

"آپ سعودی عرب نہیں جایئے گا ابو۔ وہاں جو بھی جائے' وہ ایک سال سے پہلے واپس نہیں آتا۔" شاہد بولا۔

"ایک سال تو بہت زیادہ ہوتا ہے ابو!" حامد کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

مجیب حیرت سے ایک ایک کو دیکھتا رہا "یہ سعودی عرب کہاں سے آ گیا بیچ میں؟"

"امی نے بتایا تھا کہ ابوؤں کو بچوں کے لئے پیسے کمانے دور بھی جانا پڑتا ہے جیسے راشد کے ابو سعودی عرب گئے ہیں۔ وہاں سے وہ نہیں آ سکتے۔ بس خط لکھ سکتے ہیں۔"

شاہد نے کہا "ہم تو خوش نصیب ہیں کہ آپ پاکستان میں ہی تھے۔"

"اور آپ دوبارہ جائیں گے تو بھی ہم آپ کا انتظار کریں گے۔ آپ کو روکیں گے نہیں اور امی کو تنگ بھی نہیں کریں گے۔"

مجیب نے پھر سحاب کو دیکھا۔ وہ مسکرائے جا رہی تھی "بچوں کو سب کچھ بتانا چاہئے۔ زندگی کی بارے میں۔" اس نے آہستہ سے کہا "کام تو ہوتے ہیں زندگی میں۔ دور بھی جانا پڑتا ہے۔"

مجیب ممنونیت بھری نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ سحاب کی نظریں جھک گئیں پھر سحاب نے گھڑی کو دیکھا اور بولی "ارے' تین بج گئے اور تم لوگوں نے ابھی کپڑے نہیں بدلے۔ چلو' جلدی کرو' کھانا بھی کھانا ہے۔"

"ابو' آج پارک چلیں گے نا؟" حامد نے کہا۔

"ضرور۔ بلکہ آج تم لوگوں کی دعوت بھی ہو گی اور کھانے کے بعد فالودہ۔"

اس روز کھانا ساڑھے تین بجے کھایا گیا لیکن کسی نے بھی ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا۔ کبھی کبھی خوشی بھی بھوک اڑا دیتی ہے۔



اس شام عباس ڈیوٹی پر آ گیا۔ صابر کی جان چھوٹ گئی۔ وہ بھی معمول کے مطابق شام کو گھر پہنچ گیا۔ مغورہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی "بات کرنا تو دور کی بات' ہم تو آپ کو دیکھنے کو بھی ترس گئے تھے صابر بھائی" اس نے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ اب خوب گھمائیں پھرائیں گے تمہیں۔ پہلے چائے پلواؤ۔"

چائے پر سب لوگ اکٹھے بیٹھے۔ صابر نے کہا۔ "بھئی مغورہ۔ تمہارے لئے دو تحفے ہیں میرے پاس۔ ایسے کہ تمہارا دل خوش ہو جائے گا۔"

"تو لایئے نکالیئے۔"

صابر نے جیب سے ایک آٹوگراف بک نکالی اور اس کی طرف بڑھائی "پہلا

تحفہ۔"

صفورہ نے حیرت سے آٹوگراف بک کو اور پھر اسے دیکھا۔ "میں اس کا کیا کروں گی؟"

"جان سے زیادہ سنبھال کر رکھو گی' کھول کر دیکھو تو۔"

صفورہ نے آٹوگراف بک کو کھولا۔ پہلے ہی صفحے پر خوب صورت' صاف ستھری تحریر میں لکھا تھا۔ صفورہ سفیان کے لئے جو میری تحریروں کو بے حد محبت سے پڑھتی ہیں' بے حد خلوص اور محبت کے ساتھ۔ اس کے بعد ایک شعر لکھا تھا......

مجھے یقین ہے پختہ حصول منزل کا
میں ست رو سہی لیکن گریز پا تو نہیں

اور اس کے نیچے دستخط اور جو نام تھا' اسے دیکھ کر صفورہ کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ مجیب انور! چند لمحے تو وہ گنگ رہی' کچھ بول ہی نہ سکی پھر اس نے کہا "بہت بہت شکریہ صابر بھائی۔ یہ تو واقعی دنیا کا سب سے قیمتی تحفہ ہے" اچانک اسے خیال آیا کہ اسے حیرت بھی ظاہر کرنی ہے۔ آن دی ریکارڈ تو اسے معلوم ہی نہیں ہے کہ مجیب انور یہاں آیا ہوا تھا "آپ نے کمال کر دیا صابر بھائی مگر کیسے؟ یہ آپ کو کیسے ملا؟"

"بھئی تم آم کھاؤ۔ پیڑ گننے کی ضرورت نہیں" صابر کا لہجہ فاتحانہ تھا۔

"پھر بھی' بتائیں تو۔ مجیب صاحب تو کراچی میں رہتے ہیں۔"

"لاہور آئے تھے کسی کام سے۔ کل ہی واپس گئے ہیں۔"

"اور آپ نے مجھے بتایا بھی نہیں" صفورہ نے خفا ہونے کی اداکاری کی۔

"موقع ہی نہیں ملا" صابر نے گڑبڑا کر کہا۔ اب اسے جھوٹ بھی بولنا تھا "ایک ہی دن تو رکے وہ اور میں ڈبل ڈیوٹی میں الجھا ہوا تھا۔ تم سے بات بھی نہیں ہو سکی۔ ارے ہاں' دوسرا تحفہ بھی تو ہے" اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کسی ڈائری کا تہہ کیا ہوا صفحہ نکالا اور صفورہ کی طرف بڑھا دیا۔

صفورہ نے اسے کھول کر دیکھا۔ وہ مجیب انور کا کراچی کا پتہ تھا... گھر کا... اس کی اپنی تحریر میں اور اس کی اردو کی طرح انگلش کی رائٹنگ بھی بہت خوب صورت تھی۔

"اس کا مجھے کیا کرنا؟" اس نے اداسی سے کہا "میرے نصیب میں ان سے ملنا کہاں؟"

صابر نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا "ایسی بات نہیں۔ اگلے مہینے انشاء اللہ وہ پھر لاہور آئیں گے تو میں انہیں گھر لا کر تم سے ملواؤں گا۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے مجھ سے۔"

"واقعی؟"

"ہاں۔ جھوٹ کیوں بولوں گا میں۔"

"تب بھی' پتہ تو آپ ہی رکھ لیں۔"

"میرے پاس ہے۔ یہ تم رکھ لو۔ انہی کی رائٹنگ میں ہے۔"

"شکریہ صابر بھائی' یہ بھی بڑا تحفہ ہے میرے لئے۔"

"اب آج تو تھکن اتاریں گے۔ خوب سوئیں گے۔ ہاں کل تمہیں گھمانے لے چلیں گے۔ کھانا بھی کہیں باہر ہی کھائیں گے۔" صابر نے کہا۔

اس رات بھی صفورہ کے کان صابر بھائی کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔ پورے گھر پر سکوت طاری تھا۔ ایسے میں بھابی کی آواز ابھری۔ "سنیں' کیا مجیب صاحب اگلے مہینے واقعی آئیں گے؟"

"ہاں'۔ میں نے صفورہ کو جھوٹی آس تھوڑا ہی دلائی ہے۔ بس دعا کرو کہ صفورہ کے جانے سے پہلے آ جائیں۔"

"خیریت تو ہے' کیا چسکا پڑ گیا؟" بھابی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"یہ بات نہیں۔ ہر بات واضح ہو گئی ہے" صابر بھائی بولے۔ "انہیں ٹی وی کے لئے ایک سیریل کا اسکرپٹ لکھنا ہے۔ اس کے سلسلے میں مری جائیں گے۔ مہینے دو مہینے قیام رہے گا۔ یہ بات تو انہوں نے مجھے بتائی ہے اور ویٹر سلیم کو انہوں نے بتایا کہ وہ اکیلے نہیں رہ سکتے کہیں بھی۔ خوف آتا ہے تنہائی سے۔ کوئی نفسیاتی مرض ہو گا۔ یہ مجبوری ہے ان کی۔ انہوں نے سلیم سے کہا ہے کہ ان کے لئے ماہانہ بنیاد پر کسی معقول لڑکی کا بندوبست کر دے.... عیاشی کے لئے نہیں' بس انہیں دوسراہٹ کی ضرورت ہے۔"

"ارے سب بہانے ہیں عزت دار مردوں کے" بھابی نے بہت خراب لہجے میں کہا۔

"بس' اب ایک لفظ نہ کہنا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ ایسے نہیں ہیں۔" صابر بھائی نے انہیں ڈانٹا۔

اس کے بعد کوئی گفتگو نہیں ہوئی۔ صفورہ اپنے سینے سے آٹوگراف بک لگائے بستر پر لیٹی دیر تک جاگتی رہی۔



وہ لوگ کھانا کھا کر گھر واپس آئے تو بچے بہت خوش تھے۔ لیکن نیند سے بھرے ہوئے بھی تھے۔ وہ ان کے لئے بے حد تھکا دینے والا دن تھا۔ پارک میں بھی وہ خوب بھاگے دوڑے تھے پھر کھانے کے بعد بدہضمی کے ڈر سے مجیب نے انہیں کافی دور تک پیدل چلایا تھا۔ گھر پہنچتے ہی تینوں بستر پر گرے اور بے سدھ ہو کر سو گئے۔

"آپ کو بھی نیند آ رہی ہو گی؟" سحاب نے مجیب سے پوچھا۔

"ابھی تو نہیں آ رہی ہے لیکن آئے گی اور خوب آئے گی" مجیب نے جواب دیا۔

"چائے پئیں گے؟"

"نہیں۔ تمہارے سوا اب کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

وہ سونے کی لئے لیٹے تو مجیب ننھے بچے کی طرح سحاب سے لپٹ گیا۔ لاہور میں ایک اسی چیز سے تو وہ محروم رہا تھا "لاہور میں کیسی گزری؟" سحاب نے پوچھا۔

"جو کرنا تھا' سب کر لیا۔ سارے کام ہو گئے۔"

"میں راتوں کے بارے میں پوچھ رہی ہوں" سحاب نے سنجیدگی سے کہا "زندگی میں پہلی بار آپ نے چار راتیں گزاری ہیں میرے بغیر۔"

"ایک تو سفر میں گزری۔ وہ ان چاروں میں سب سے اچھی رات تھی" مجیب نے کہا اور ایک دم ہی خاموش ہو گیا پھر اسے احساس ہوا کہ سحاب اسے مستفسرانہ نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ "لاہور میں پہلی رات حسب توقع بڑی اذیت میں گزری۔۔۔ ہوٹل کی لابی میں۔۔۔ جاگتے ہوئے۔ دوسری رات ایک کہانی مل گئی۔ تیسری رات کوفت بہت ہوئی مگر سکون سے سو لیا۔"

"یعنی پہلی رات تنہا گزری۔ دوسری اور تیسری راتوں کے ساتھی مختلف تھے۔"

"تم تو بغیر کہے سب جان لیتی ہو۔" مجیب نے کہا اور اسے بہت غور سے دیکھا۔

"سچ سچ بتانا۔ برا تو نہیں لگا تمہیں؟ تکلیف تو نہیں پہنچی اس سے۔"

"کیا آپ کو سمجھتی نہیں ہوں میں اور جانتا بھی کیا۔ سب کچھ خود ہی تو بتا دیا آپ نے۔ پہلی رات آپ اکیلے رہے۔ دوسری رات آپ کا ساتھ کسی مجبور اور ستائی ہوئی لڑکی نے دیا اور تیسری رات کی ساتھی آپ کو بالکل اچھی نہیں لگی۔ آپ کو کراہت آئی ہو گی اس سے۔"

مجیب ستائشی اور تشکر بھری نظروں سے بیوی کو دیکھتا رہا۔ اللہ نے کیسی سمجھدار اور محبت کرنے والی بیوی عطا فرمائی تھی۔

"اور مجھے برا کیوں لگے گا؟" سحاب نے چند لمحوں کے توقف کے بعد کہا "یہ مشورہ تو میں نے ہی دیا تھا آپ کو۔ دل سے اجازت دی تھی۔ اعتماد جو ہے آپ پر۔ بلکہ میں تو اس رات پر متاسف ہوں' جو آپ نے تنہا گزاری۔ کیسی اذیت ناک ہو گی وہ رات۔"

اس لمحے مجیب کو خود پر شرم آئی۔ اس نے لاہور میں ایک بار بھی یہ نہیں سوچا ہو گا کہ اکیلی سحاب بچوں کو سلانے کے بعد کس کیفیت سے گزر رہی ہو گی۔ اس بے چاری نے تو دہری اذیت سہی تھی۔۔۔ اس کی جدائی کی بھی اور اس کے دکھ اور اذیت کے تصور سے بھی۔ شاید اسی لئے کہتے ہیں کہ عورت میں ایثار ہوتا ہے اور مرد خود غرض ہوتا ہے۔

"اچھا' مجھے ان دونوں کے بارے میں تو بتائیں" سحاب نے اسے چونکا دیا۔

مجیب نے پروین کا نقشہ بیان کرنا شروع کیا۔ جب وہ اس مرحلے پر پہنچا جہاں اس نے پروین کو سادہ لباس پہننے اور میک اپ سے نجات پانے کو کہا تھا تو سحاب نے متاسف ہو کر کہا "اگر وہ شریف گھرانے کی تھی تو اس کے لئے وہ وقت بہت اذیت ناک ہو گا۔"

"کیوں بھئی؟" مجیب نے حیرت سے پوچھا۔

"اپنا وہی سادہ روپ دیکھنا تو اس کے لئے اذیت ناک ہو گا۔ وہ اسے چھوڑنا جو پڑ گیا۔ اس وقت آئینہ دیکھ کر اس کے سب زخم ہرے ہو گئے ہوں گے۔"

"ہاں' یہ تو ہے" مجیب نے پرخیال لہجے میں کہا "مجھے خیال ہی نہیں آیا۔"

پھر مجیب آگے کا حال سنانے لگا۔ اس نے اپنے تجزیئے کے متعلق بتایا "پتہ ہے
اس کا چہرہ فق ہو گیا تھا میرا تجزیہ سن کر۔"

"آپ نے بھی تو کمال کر دیا۔ اس بے چاری کو آر پار دیکھے جانے کا احساس ہو رہا
ہو گا اور یوں اندر تک دیکھا جانا تو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ کجا ایک ایسی لڑکی، جس
ایک ماضی بھی ہو، جسے وہ چھپانا بھی چاہتی ہو۔"

پھر مجیب نے اسے دوسری لڑکی کے متعلق بتایا۔ آخر میں اس نے کہا "مجھے لگتا
ہے کہ اس دوسری لڑکی نے میرے متعلق ویٹر سے غلط سلط باتیں کی ہوں گی۔ ویٹر کا
رویہ کچھ عجیب سا ہو گیا تھا۔"

سحاب چند لمحے سوچتی رہی پھر آہستہ سے بولی "نہیں۔ یہ حرکت پہلی لڑکی نے
ہو گی.... اس نے جو کہانی تھی۔ کیا نام بتایا آپ نے.... ہاں، پروین اور شاید میں
اندازہ بھی لگا سکتی ہوں کہ اس نے کیا کہا ہو گا۔"

"یہ کیسے کہہ سکتی ہو تم کہ پروین نے کچھ کہا ہو گا۔"

"جو شریف ہوں مگر مجبوراً گندگی میں رہ رہے ہوں، انہیں شرافت اور پاکیزگی
کبھی نہیں بھاتی۔ اپنی محرومی کا خیال آ جاتا ہے انہیں۔ وہ شریف اور اچھے لوگوں
توہین اور تذلیل سے بھی نہیں چوکتے۔ اس طرح گویا وہ اپنی بے آبروئی کا بدلہ
ہیں۔"

"اچھا، تمہارے خیال میں اس نے ویٹر سے کیا کہا ہو گا؟" مجیب کے لہجے
دلچسپی تھی۔

"کہنے کو تو وہ کچھ بھی کہہ سکتی ہے مگر سب سے بڑا امکان یہ ہے کہ اس
آپ کو...." سحاب کہتے کہتے رک گئی۔ وہ جھجک بھی رہی تھی اور سوچ بھی رہی
جیسے کسی مناسب لفظ کی تلاش میں ہو۔ بالآخر اس نے بڑی مشکل سے کہا "اس نے
ہو گا کہ آپ.... آپ کسی قابل ہی نہیں ہیں۔"

پہلے تو مجیب کی سمجھ میں ہی کچھ نہیں آیا پھر سمجھ میں آیا تو اس کا چہرہ تمتما اٹھا
وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اسے ویٹر کا دوا دارو والا جملہ یاد آیا۔ اس بار وہ اس میں
اہمیت کو پوری طرح سمجھ گیا۔ "ٹھیک ہے مگر یہ بات دوسری لڑکی بھی تو کہہ

ہے۔"

"نہیں۔ جیسا آپ نے بیان کیا، اس سے وہ پروفیشنل لگتی ہے۔ اس نے تو شکر
ادا کیا ہو گا کہ مفت کے پیسے ملے۔ اس کے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں۔ دنیا
میں بے وقوفوں کی کمی نہیں ہے۔ یہ سوچ ہو گی اس کی اور اس کے نزدیک اس کے سوا
ہر شخص شریف ہے۔ اسے نہ شرافت سے شکایت ہو گی نہ نفرت، نہ کوئی احساس
محرومی۔ مجھے یقین ہے کہ پروین نے یہ بات کہی ہو گی۔ یہ الگ بات کہ یہ محض میرا
گمان ہو۔"

"نہیں۔ تم سو فی صد ٹھیک کہہ رہی ہو" مجیب نے کہا "میں تو قائل ہو گیا
تمہارا۔ تم تو ماہر نفسیات ہو بھئی۔"

"جی نہیں۔ بس عورت ہوں اور عورت کی سوچ سمجھنا میرے لئے آسان ہے۔
میں تو خود آپ کی قوت تجزیہ کی قائل ہوں۔"

"نہیں بھئی، کہانی کا آئیڈیا تو اب مکمل ہوا ہے.... تمہاری کھوج کے بعد۔"

"شکریہ۔ مجھے یقین ہے کہ آپ بہت اچھی کہانی لکھیں گے۔"

مجیب پھر سوچ میں ڈوب گیا "اس کا مطلب ہے کہ کمپنی کے لئے پروفیشنل
عورت بہتر ہے۔ جو ہمیں اچھی لگے، وہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔"

"جی ہاں۔ میں تو یہی کہوں گی۔ مجبوراً خراب ہونے والی عورت میں آپ کے
لئے اپیل ہو گی۔ وہ آپ کو بہکا سکتی ہے جبکہ پروفیشنل آپ کے لئے بے ضرر ہے اور
آپ اس کے لئے بے ضرر ہیں۔ جس کے ساتھ کوئی کمپلیکس وابستہ ہو، وہ پروفیشن
بھول کر کوئی اور کھیل شروع کر سکتی ہے اور اسے شریف اور مضبوط کردار کے لوگوں
کو لبھانے کے انداز اور طور طریقے بھی یقیناً آتے ہوں گے۔ وہ تو خطرناک ہو گی
ہی۔"

مگر پروفیشنل کی محض اپنے کمرے میں موجودگی برداشت کرنا بھی آسان نہیں ہوتا۔
اس سے بہتر ہے کہ آدمی خود پر بھروسا کرے اور خطرناک سے نبرد آزما ہو۔"

دو منٹ خاموشی رہی پھر سحاب نے پوچھا "سنئیں.... پروین میں آپ کو کشش تو
محسوس نہیں ہوئی تھی؟"

لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ مجیب سو چکا تھا۔ وہ اس کا چہرہ غور سے دیکھتی رہی۔ تم صرف سوتے میں نہیں لگتے' سچ مچ بہت معصوم ہو۔ اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا اور لائٹ آف کرنے کے لئے اٹھ گئی۔



ڈائجسٹ میں چھپی ہوئی اپنی کہانی پر ایوب ساغر کے ریمارکس کو assess کر کے ان کے بارے میں فیصلہ کرنے اور ان پر جوابی ریمارکس لکھنے میں مجیب کو دس دن لگے لیکن وہ مطمئن تھا کہ ایک بڑا مرحلہ طے ہو گیا ہے۔ اس کے بعد scenario بنانا زیادہ مشکل نہیں تھا۔

اسی شام اس نے ایوب ساغر کو فون کیا "میں آپ کے فون کا منتظر تھا سر!" ایوب نے اس کی آواز پہچان کر کہا۔

"کام میری توقع سے زیادہ طویل ثابت ہوا" مجیب نے کہا "تم نے بہت دیدہ ریزی سے کام کیا تھا کہانی پر۔ مجھے بھی اسے اتنی ہی باریک بینی سے دیکھنا پڑا۔"

"آپ کی یہ داد میری حوصلہ افزائی ہے سر!"

"پھر جہاں مجھے تم سے اختلاف تھا' وہاں جوابی تجویز بھی ضروری تھی۔ اسی لئے اتنا وقت لگا۔"

"کام تو نمٹ گیا نا سر!"

"ہاں۔"

"تو اب کیا حکم ہے سر؟"

"تمہیں فرصت تو ہے نا؟"

"فرصت کیا' بیکاری کہئے سر!" دوسری طرف سے ایوب ساغر نے ہنس کر کہا "اب تو بے زار ہو گیا ہوں۔"

"بس تو بیکاری ختم۔ کل صبح دس بجے آ جاؤ۔۔۔ پورے دن کے لئے۔ ایک دن میں ایک قسط بھی نمٹائی تو تیرہ دن لگیں گے۔"

"میں حاضر ہو جاؤں گا سر!"

اگلے روز ٹھیک صبح دس بجے ایوب ساغر اس کے گھر آ گیا۔ سب سے پہلے اس

نے مجیب کو ایک لفافہ دیا "یہ ایک لاکھ کا چیک ہے سر۔ طے شدہ شرائط کے مطابق باقی رقم اسکرپٹ مکمل ہوتے ہی ادا کر دی جائے گی۔ کل میری خلیل صاحب سے بات ہوئی تھی۔ آج انہوں نے مری فون کر کے اپنے چوکیدار سے کہہ دیا ہو گا کہ دس پندرہ دن میں آپ آنے والے ہیں وہ تیار رہے۔"

"شکریہ ایوب!" مجیب نے چیک کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "لیکن میرا خیال ہے کہ میں مری نہیں جا سکوں گا۔ اسکرپٹ یہیں مکمل کر لوں گا۔"

ایوب ساغر مایوس نظر آنے لگا "بہتر تو یہی ہے سر کہ آپ مری چلے جائیں۔ لوکیشن سامنے ہو تو لکھنے کا لطف ہی اور ہے۔"

"مجبوری ہے ایوب۔ میں ابھی چار دن لاہور میں رہ کر آیا ہوں۔ میں گھر سے دور نہیں رہ سکتا۔"

"سب کچھ آدمی بچوں ہی کے لئے تو کرتا ہے سر!"

"مجھ سے نہیں رہا جائے گا۔ کام بھی ٹھیک سے نہیں کر سکوں گا۔"

"آپ بغیر تجربے کے کہہ رہے ہیں سر۔ وہاں تو کام کا ماحول ہو گا۔"

"دل اور دماغ کو سکون نہ ہو تو سب بے کار ہے۔"

ایوب نے بھی زیادہ بحث نہیں کی۔ مجیب نے ڈائجسٹ اٹھایا اور اپنے نوٹس ایوب کو دکھائے۔ دوپہر کو انہوں نے کھانے کا وقفہ کیا۔ شام تک وہ دونوں ریمارکس کو فائنل کر چکے تھے۔ زمین ہموار ہو چکی تھی۔ اب صرف بوائی کرنی تھی "کل سے scenario پر کام کریں گے۔" مجیب نے ایوب سے کہا۔

"سچی بات یہ ہے سر! کہ کام کرنے کا لطف آ رہا ہے" ایوب نے رخصت ہوتے ہوئے کہا "آپ بڑے پروفیشنل انداز میں کام کرتے ہیں۔"

اس رات سحاب نے مجیب سے کہا "آپ مری جانے سے کیوں بچ رہے ہیں؟"

"جب تم نے یہ سن لیا تھا تو میری بتائی ہوئی وجہ بھی سن لی ہو گی" مجیب نے خشک لہجے میں کہا۔

"مگر ایوب صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لوکیشن سامنے ہو گی' ماحول پر سکون ہو گا تو کام اچھا بھی ہو گا اور تیز بھی۔"

"ایوب تو اپنی غرض سے اصرار کر رہا ہے۔" مجیب جھنجلا گیا۔ "اس طرح اسے لوکیشن تلاش کرنے کی خواری سے نجات مل جائے گی۔"

"تو اس میں کیا برائی ہے۔ یہ بھی اچھا ہی ہے" سحاب بولی "اور میں بھی اپنی اور آپ کی غرض سے کہہ رہی ہوں۔ محبتوں کو مردوں کے پاؤں کی زنجیر نہیں ہونا چاہئے۔ کبھی خدانخواستہ وقت مجبور کر دے تو کیا کریں گے۔ بچوں کو تو میں سمجھاتی رہی ہوں' اب آپ کو سمجھا رہی ہوں۔"

"بات بچوں کی نہیں' میرے خوف اور میری ممکنہ اذیت کی ہے" مجیب اور جھنجلا گیا۔

"خوف سے لڑیں گے تو وہ دور ہو گا۔ ورنہ زندگی بھر مسلط رہے گا' بچہ نہ بنیں۔"

"اچھا' بس اب ختم کرو" مجیب کے لہجے میں قطعیت تھی۔

سحاب سمجھ گئی کہ اب بات کرنا فضول ہے۔ وہ خاموش ہو گئی۔



جب سے صفورہ نے صابر بھائی کی بھالی سے آخری گفتگو سنی تھی' اس کی کیفیت' اس کے دن رات بھی بدل گئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بے حد قوی امکان کی ڈور آ گئی تھی۔ جو کبھی دور' بہت دور کا امکان تھا' اب حقیقت میں بدلتا نظر آ رہا تھا۔ وہ مجیب سے مل سکتی تھی۔۔ بلکہ اسے یقین تھا کہ ضرور ملے گی۔ اس خیال نے اس کے اردگرد ایک خواب کی سی فضا بن ڈالی تھی' جس میں وہ چل پھر رہی تھی' سانس لے رہی تھی' سب کچھ کر رہی تھی۔ مگر بغیر سوچے سمجھے۔ ایک سحر تھا' جس میں وہ گرفتار تھی۔

فینٹیسی ویسے ہی اس کے مزاج' اس کی شخصیت کا لازمہ تھی۔ اس کی مہربانی سے وہ اب تک مجیب سے بلا شبہ سیکڑوں بار مل چکی تھی مگر اب جو ہو رہا تھا' وہ فینٹیسی نہیں تھا۔ وہ ایک یقینی امکان میں لپٹا ہوا تصور تھا۔ پہلے وہ اس سے کسی بھی طرح مل سکتی تھی' کچھ بھی کہہ سکتی تھی' کچھ بھی کر سکتی تھی۔ فینٹیسی کی یہی سب سے بڑی خوبی ہوتی ہے کہ امکان سے لاتعلق ہونے کی وجہ سے وہ ہر پابندی سے آزاد ہوتی ہے۔ اس میں آدمی کچھ بھی کر سکتا ہے۔ بلکہ وہی کچھ کرتا ہے جو ناممکن ہوتا ہے مگر اب ممکنہ ملاقات کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے محدود ہونا پڑتا تھا۔ وہ ملاقات یہیں ہونا تھی' اسی گھر میں۔ اور اس کا ایک محدود امکانی دورانیہ تھا۔ لہٰذا اس کا اسکوپ نہ ہونے کے برابر تھا۔

جب بھی اسے فرصت ہوتی (اور یہاں پاکستان میں فرصت زیادہ ہی تھی) وہ اس ملاقات کے بارے میں سوچتی' جو یقینی طور پر ہونی ہے۔ اس میں فینٹیسی کا کوئی دخل نہیں تھا۔ کیونکہ وہ اپنے تخیل کو پابند کرنے پر مجبور تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ اس چار دیواری سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔

اسے وہ دن نظر آیا۔ وہ دوپہر ہی سے رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف

ہوتی۔ خوشی اس کے روم روم سے ٹپکتی۔ اسے بس ایک ہی فکر تھی۔ کھانا جلد از جلد
تیار کر لیا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ کھانا پکانے میں لگی رہے اور مجیب کھانا کھا کر
چل دے۔ بات کا موقع ہی نہیں ملے۔ یہ طے تھا کہ اس روز وہ بھابی کو کوئی کام نہیں
کرنے دے گی۔ سب کچھ وہ خود پکائے گی اپنے ہاتھوں سے۔۔۔۔ وہ صرف اور صرف اس
کا مہمان تھا' کسی اور کا نہیں۔

شام چھ بجے صابر بھائی گھر میں داخل ہوئے۔ خوشی اور ہیجان سے ان کا چہرہ چمک
رہا تھا "آ گئے۔۔۔۔ مجیب صاحب آ گئے۔ میں نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے"
ان کی آواز بھی لرز رہی تھی۔ "چلو صفورہ۔۔۔۔ مل لو ان سے۔ میں نے تمہاری بہت
تعریف کی ہے ان سے۔"

اندھا کیا چاہے' دو آنکھیں۔ صفورہ نے ہاتھ دھو کر خشک کئے اور صابر بھائی کے
ساتھ ڈرائنگ روم کی طرف چل دی۔ ڈرائنگ روم میں قدم رکھتے ہی وہ اسے نظر
آیا۔ وہ سر جھکائے کسی میگزین کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

صفورہ ایک لمحے کو۔۔۔۔ صرف ایک لمحے کو ٹھٹکی۔ اسے شاک نہیں لگا تھا۔ کیونکہ
وہ وہی آدمی تھا جسے اس نے لاہور اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر اپنی جان خطرے میں ڈال
کر ایک بوڑھی عورت کی جان بچاتے دیکھا تھا۔ شاک اس لئے نہیں لگا کہ اس
ذہن میں یہ خیال پہلے سے موجود تھا کہ وہ مجیب انور ہو گا۔ ایک لمحے کو وہ حیرت
ٹھٹکی اس لئے کہ اس کا یقین اتنا سچا کیسے نکلا پھر اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال
لیا۔

"مجیب صاحب' یہ میری کزن صفورہ ہے" صابر بھائی نے کہا۔ "انڈیا سے
ہوئی ہے۔ آپ کی بڑی فین ہے یہ۔"

مجیب نے سر اٹھا کر اسے دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کی نظریں اس کے چہرے
پر جمی تھیں اور وہ انہیں ہٹا نہیں پا رہا تھا۔

اس کی محویت کو صابر بھائی نے بھی محسوس کر لیا۔ انہوں نے قدرے بلند
میں کہا "بیٹھو نا صفورہ!"

مجیب چونکا "جی ہاں۔ بیٹھئے نا۔"

وہ بیٹھی۔ صابر بھائی بھی بیٹھ گئے "ہمارے ہاں کھانا دیر میں کھلایا جاتا ہے مجیب
صاحب۔۔۔۔ دس بجے۔ ہاں درمیان میں چائے جتنی چاہیں' ملے گی" وہ بولی۔

"آپ اس کی فکر نہ کریں۔ میں کھانا دیر سے ہی کھاتا ہوں۔۔۔۔ اور وقت سے بے
نیاز ہو کر آیا ہوں میں۔"

وہ خوش ہو گئی۔ وہ دیر تک رکنے کو تیار ہے۔

ان کے درمیان باتیں ہونے لگیں۔ وہ اس سے اس کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ انڈیا
میں کہاں رہتے ہیں وہ لوگ؟ اس کی تعلیم کتنی ہے۔ دلچسپیاں کیا کیا ہیں' کیا کرتی ہے؟
ایم اے اردو کیا ہے تو لکھتی کیوں نہیں؟

اور وہ اس کی کہانیوں پر تبصرہ' تعریف و تنقید کرتی رہی۔ اس نے کچھ کہانیوں کے
پہلوؤں پر اعتراض کئے۔ ان میں سے کچھ کو مجیب نے تسلیم کیا اور کچھ کے بارے میں
بڑے تحمل سے وضاحت کی۔

دس بج گئے۔ کھانا کھلایا گیا۔ اس کے بعد بھی باتیں ہوتی رہیں۔ بارہ بجے مجیب
رخصت ہوا۔

یہ پہلا تصور تھا اور صفورہ کو بے رنگ لگا۔ چنانچہ ہر بار وہ چار دیواری میں رہتے
ہوئے نت نئی گنجائشیں نکالتی رہی۔ مثلاً دونوں کا تعارف کرانے کے بعد صابر بھائی نے
کہا "تم مجیب صاحب کو کمپنی دو صفورہ۔ میں تمہاری بھابی سے چائے بنوا کر لاتا ہوں۔"

"چائے ابھی ایک منٹ پہلے بنائی ہے میں نے۔ آپ بھابی سے کہیں' وہ نکال دیں
گی" صفورہ نے یہ جتانا ضروری سمجھا کہ مجیب کے لئے سب کچھ اس نے اپنے ہاتھ سے
کیا ہے مگر فوراً ہی اسے پچھتاوا ہونے لگا۔ اب صابر بھائی جلدی واپس آ جائیں گے
چائے لے کر۔ کاش اس نے چائے نہ بنائی ہوتی۔ (اگلی بار کے تخیل میں اس نے اس
کی اصلاح کر لی)

صابر بھائی کے جانے کے بعد خاموشی چھا گئی۔ مجیب نظریں جھکائے محجوب بیٹھا
تھا۔ اسے دیکھ کر صفورہ کو احساس ہونے لگا کہ وقت رائیگاں ہو رہا ہے۔ یہ تو ظلم ہے۔

"کچھ بولیئے نا" اس نے اسے اکسایا۔

"کیا بولوں؟"

"کیا بولنے کے حصے کا بھی لکھ دیتے ہیں؟" وہ شوخ لہجے میں بولی۔

"یہ بات تو نہیں۔"

"آپ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے تھے؟"

"برا لگا آپ کو؟"

"جی نہیں لیکن میری بات کا جواب دیں پلیز!"

"دیکھیں، میں سچ لکھتا ہی نہیں بولتا بھی ہوں۔ ممکن ہے آپ کو برا لگے، میرے بارے میں غلط رائے قائم کریں۔"

"سچ بولنے والوں کو ڈرنا نہیں چاہئے۔ یہیں سے جھوٹ کا آغاز ہوتا ہے۔"

"بات یہ ہے کہ آپ.... آپ بہت خوب صورت ہیں.... میں مبہوت ہو کر رہ گیا تھا" مجیب نے کہا اور نظریں اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا "برا لگا آپ کو؟"

"جی نہیں۔ اچھا.... بہت اچھا لگا۔"

آگے جا کے تخیل میں اور ترمیمات ہوئیں۔ اور گنجائشیں نکلیں۔ الہ اباد کے حوالے پر مجیب چونکا اور اسے وہ خط یاد آیا جو کسی بے نام لڑکی نے الہ آباد سے اسے لکھا تھا۔

اور جیسے ہی صابر بھائی نے تعارف کرایا، بیل بجی۔ صابر بھائی دروازے پر گئے۔ ان کی آوازیں ڈرائنگ روم تک آ رہی تھیں۔ دروازے پر پڑوسن تھیں۔ انہوں نے کہا "صابر بھائی پلیز، ذرا میرے ساتھ چلیں۔"

"سوری بھابی، اس وقت بہت اہم مہمان آئے ہوئے ہیں۔"

"ان کی طبیعت بہت بگڑ گئی ہے۔ اسپتال لے کر جانا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں، گھر میں کوئی نہیں۔"

"اچھا بھابی، میں ابھی آتا ہوں۔"

صابر بھائی نے واپس آ کر مجیب سے معذرت کی کہ مجبوری ہے۔ انہیں جانا ہے اور وعدہ لیا کہ ان کے آنے تک وہ ہرگز نہیں جائے گا پھر انہوں نے صفورہ سے کہا کہ مجیب صاحب کو بور نہ ہونے دے۔ ان کا خیال رکھے پھر وہ چلے گئے۔ اس بات کی گارنٹی نہیں تھی کہ وہ کب واپس آئیں گے یعنی کباب رہ گیا، ہڈی نکل گئی۔

"آپ.... آپ نے بھی کوئی خط لکھا تھا مجھے؟" مجیب نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں، دو لکھے تھے" وہ بہت غور سے مجیب کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ اسے مجیب کا دل چہرے پر دھڑکتا محسوس ہوا۔

"کیا انڈیا میں شادیوں کی صورت حال اتنی سنگین ہے، جتنی آپ نے خط میں بیان کی تھی؟"

"اس سے بھی زیادہ۔"

"آئی ایم سوری۔"

"عمل کی جگہ سوری کہنے سے کام نہیں چلتا۔"

"میں شادی شدہ ہوں۔ میرے بچے بھی ہیں۔"

"یہ مجھے خط لکھتے وقت بھی اندازہ تھا۔ آپ کو میرا خط یاد نہیں۔"

"خوب یاد ہے۔"

"تو اس کا جواب دیجئے مجھے۔"

اس طرح ہر روز اس کا تخیل کوئی نئی سچویشن تراشتا۔ وہ بہت خوش رہنے لگی تھی۔ چلتے پھرتے، کچھ کرتے، خالی بیٹھے، ہر وقت اس کی آنکھوں میں خواب ہوتے مگر پھر اضافوں اور ترامیم کی گنجائشیں سمٹتے سمٹتے ختم ہو گئیں۔ ہر سچویشن پامال لگنے لگی۔ وہ اکتا گئی، بور ہو گئی۔ اسے یہ احساس ستانے لگا کہ اس تخیل کا اسکوپ بہت کم ہے۔ آسودگی جاں کے لئے کچھ اور ہونا چاہئے مگر کیا؟ اس کا جواب فی الحال اس کے پاس نہیں تھا.... اور شب و روز بے کیف ہوئے جا رہے تھے۔



کام اس طرح نہیں ہو رہا تھا جیسے وہ کرنا چاہتا تھا۔ تین چار دن میں مجیب کو مایوسی سی ہونے لگی۔ وہ ارتکاز ہی میسر نہیں تھا جس کے زور پر وہ بہت اچھا کام کرتا تھا۔

اسے حیرت بھی تھی۔ کہانی لکھتے ہوئے اسے کبھی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ ارتکاز میں خلل پڑتا تو وہ وڈیو گیم کھیل لیتا یا کوئی فلم دیکھ لیتا مگر اب یہ ترکیبیں بھی ناکام ہو رہی تھیں۔

ایوب ساغر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا لیکن وہ بولا کچھ نہیں۔ اسے احساس تھا کہ

مجیب touchy ہو رہا ہے۔ بہتر یہی تھا کہ وہ خود ہی کوئی فیصلہ کرے۔

اس روز مجیب نے سیناریو میں ایک سین شامل کیا تو ایوب نے اعتراض کیا "سر! یہ تو جمپ بن گیا۔"

"کیسے؟" مجیب نے جھنجلا کر کہا۔

ایوب نے وضاحت کی تو اس نے فوراً تسلیم کر لیا۔ ایوب کو اس کی یہی بات سب سے اچھی لگتی تھی۔ ٹیم ورک کے دوران میں اس نے اسے ٹیم مین ہی دیکھا تھا۔

"بات یہ ہے کہ میں بار بار ارتکاز سے محروم ہو جاتا ہوں" مجیب نے پہلی بار مسئلہ سامنے رکھا۔

"یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں سر!" ایوب نے کہا "اجازت ہو تو میں کچھ عرض کروں؟"

"کہو نا۔ اجازت کی کیا بات ہے؟"

"آپ مری والی تجویز کو مسترد مت کیجئے۔ وہیں زیادہ بہتر کام ہو گا"

"مگر تبدیلی میرے اندر آئی ہے۔ گھر میں نہیں" مجیب نے معقولیت سے کہا "گھر میں سب کچھ معمول کے مطابق ہے۔ بلکہ بچے زیادہ صابر ہو گئے ہیں مجھ سے کوئی فرمائش ہی نہیں کرتے۔"

"یہ درست ہے۔ تبدیلی آپ میں ہی آئی ہے لیکن آپ اس کی وجہ سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں۔"

"تو تم سمجھا دو۔"

"دیکھیں سر' یہ کام نیا ہے آپ کے لئے۔ اس کے نتیجے میں ارتکاز کی نزاکت بڑھ گئی ہے۔ گھر بہرحال گھر ہوتا ہے۔ گھر میں رہتے ہوئے آپ بے نیازی برتیں تو وہ بھی بوجھ بن جاتی ہے۔ کہانی کی بات اور تھی۔ کہانی لکھنا شاید آپ کے لئے ایسا ہے جیسے مچھلی کا تیرنا یا پرندوں کا اڑنا مگر یہ نئی فیلڈ ہے پھر آپ پر یہ خود ساختہ پریشر بھی ہو گا کہ آپ اس نئے فیلڈ میں پہلا ہی کام شاہکار کرنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں' شاید یہی بات ہے۔"

"مری میں کام کرنے کے کئی مختلف زاویوں سے فوائد ہیں سر۔ سب سے بڑی

بات' یہ مجھ پر احسان ہو گا آپ کا۔ پروڈکشن آسان بھی ہو گی' خرچ بھی کم آئے گا اور وقت کی بچت بھی ہو گی۔ سبھی کا فائدہ ہے۔ آپ کو بھی کام کر کے خوشی ہو گی۔"

مجیب سوچ میں پڑ گیا۔ گزشتہ چند دنوں میں وہ ایوب سے خاصا بے تکلف ہو گیا تھا۔ اسے وہ اچھا بھی لگا تھا۔ چند لمحے ہچکچانے کے بعد اس نے اپنا مسئلہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

ایوب مسکرایا "آپ اتنے حساس نہ ہوتے تو اتنا اچھا کیسے لکھتے مگر سر' یہ تو کوئی بڑا مسئلہ نہیں" اس نے کہا "آپ لاہور والی ترکیب مری میں بھی استعمال کر سکتے ہیں۔"

"نہیں بھئی۔ وہ بھی کوئی خوش گوار تجربہ نہیں تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اسے دہرانا نہیں چاہتا۔"

ایوب ساغر عقل مند آدمی تھا۔ اس نے جان لیا کہ بحث کرنے سے نقصان ہو سکتا ہے۔ جبکہ وہ مجیب کو اس کے حال پر چھوڑ دے تو امکان یہی ہے کہ وہ خود بھی اس نتیجے پر ہی پہنچے گا' جہاں وہ اسے پہنچانا چاہتا ہے۔ اس نے سمجھ لیا تھا کہ مجیب ایک آزاد اور خود مختار آدمی ہے اور اپنے فیصلے آپ ہی کرنا چاہتا ہے "آپ کی مرضی سر!" اس نے آہستہ سے کہا "کوئی بھی کسی اور کی کسی سچویشن کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔ میں تو ویسے بھی اتنا سمجھ دار آدمی نہیں ہوں۔"

مجیب ہنس دیا "حالانکہ تمہاری یہی بات اس بیان کی تردید کر رہی ہے' خیر چھوڑو۔"



صفورہ بہت مضطرب اور بے کیف تھی۔ مجیب انور کے کراچی جانے کے بعد کے پندرہ دنوں میں وہ اس سے ملاقات کے امکان کو ہر سمت اور ہر حد تک پھیلا چکی تھی اور اب اس میں مزید گنجائش نہیں تھی۔ امکان بھی ربڑ کی طرح ہوتا ہے۔ اس کے پھیلنے کی' کھچنے کی ایک حد ہوتی ہے۔ اس سے گزرے تو وہ ٹوٹ جاتا ہے اور ربڑ ٹوٹے تو دونوں طرف سے خود کو پکڑنے والی انگلیوں پر اتنی زور سے لگتا ہے کہ وہ سن ہو جاتی ہیں۔ یہاں اسی طرح صفورہ کا تصور ٹوٹنے کی وجہ سے اس کا ذہن' اس کی سوچ سن ہو کر رہ گئی تھی۔

صفورہ کو یہ سوچ کر ہنسی آگئی کہ وہ ایک گائے تھی اور وہ امکان چھوٹی سی ہری بھری چراگاہ۔ اس نے پندرہ دن میں وہ پوری گھاس چر ڈالی تھی اور اب وہ ایک بے آب و گیاہ صحرا کی طرح لگ رہی تھی۔

وہ امکان کی نہیں، فینٹیسی کی عادی تھی۔ اور فینٹیسی کی چراگاہ اتنی وسیع و عریض ہوتی ہے جتنی کہ پوری کائنات۔ حد نظر سے آگے بھی حد نظر تک چراگاہ ہوتی ہے اور اس سے آگے بھی۔ اس چراگاہ میں چرنے والے سیر چشم ہوتے ہیں۔ حقیقت تو انہیں بھوکا ہی مار دیتی ہے۔ امکان سے بھی ان کا گزارہ نہیں ہوتا۔

دو تین دن اسی بے کیفی میں گزر گئے۔ وہ مجیب سے ملاقات کے بارے میں سوچتی اور گھسے پٹے منظر اس کے تصور میں ابھر آتے۔ اسے کوفت اور جھنجلاہٹ ہونے لگتی۔ تصور شیشے کی طرح چھن سے ٹوٹ جاتا۔ وہ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتی۔ وہاں جانے پہچانے گرد و پیش کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا۔

اس رات وہ بستر پر بیٹھی یہی کچھ سوچ کر کڑھ رہی تھی کہ اچانک اس نے خود کو اپنی جانی پہچانی اور من پسند وسیع و عریض چراگاہ میں پایا..... فینٹیسی!

وہ بستر پر لیٹی صابر بھائی کی اس رات کی گفتگو یاد کر رہی تھی۔ اسے خیال آیا کہ اہم ترین بات یہ نہیں کہ مجیب نے صابر بھائی سے یہاں ان کے گھر آنے اور کھانا کھانے کا وعدہ کیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ ایک اسکرپٹ کے سلسلے میں مری جا رہا ہے۔ وہاں اس کا طویل قیام ہو گا اور اہم تر بات مجیب کی یہ نفسیاتی کمزوری ہے کہ وہ کہیں اکیلا نہیں رہ سکتا۔ اسے تنہائی سے خوف آتا ہے اور اہم ترین بات یہ ہے کہ مری میں اسے اپنے ساتھ رہنے کے لئے کسی کی ضرورت ہے۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اگر وہ ساتھی وہ خود ہو..... صفورہ سفیان..... تو مری میں اسے مجیب کے ساتھ خاصے طویل عرصے تک رہنے کا موقع ملے گا..... اور اتنے عرصے میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو دریافت کر لیتے ہیں۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

لیکن میں کوئی کال گرل نہیں..... اور اللہ محفوظ رکھے، ایسی بننا بھی نہیں چاہتی۔ اس کے اندر احتجاج ابھرا۔ میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔

یہ مسئلہ ہے ہی کب۔ مجیب انور بھی کوئی ایسا ویسا مرد نہیں۔ اس نے خود کو جواب دیا۔ اسے ساتھی کی ضرورت اپنی مجبوری کی وجہ سے ہے۔ وہ کوئی عیاش آدمی نہیں، یہ بات وہ ثابت بھی کر چکا ہے۔ اسے تو بس دوسراہٹ کی ضرورت ہے۔

پھر بھی..... برائے نام، محبت کی خاطر، کسی کی قربت کے لئے بھی کوئی شریف لڑکی کال گرل تو نہیں بن سکتی۔

یہ کوئی کال گرل بننا تو نہیں۔ اس نے دلیل دی اور پھر یہ حقیقت کب ہے، یہ تو محض تصور ہے۔

اس دلیل کے آگے اس کے اندر چھپی احتجاج کرنے والی صفورہ ہار گئی۔ کچھ اس لئے کہ دلیل منطقی اور سچی تھی..... اور کچھ اس لئے کہ وہ ہار جانا چاہتی تھی۔

اب لامحدود اور سرسبز چراگاہ تھی اور وہ تھی۔ وہ اس میدان کی پرانی کھلاڑی تھی۔ جانتی تھی کہ ہر بات کے پیچھے منطق ہونا اور حقیقت سے قریب ترین ہونا ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو تو تصور live نہیں ہوتا اور تصور لائیو نہ ہو تو اتنا پرلطف نہیں رہتا۔

بس پھر دماغ میں تخیل کی مشین چل پڑی۔

اس روز وہ صابر بھائی اور بھابی کے ساتھ آخری شو میں فلم دیکھنے گئی۔ (حالانکہ اسے فلموں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی) واپسی میں وہ رکشا ٹیکسی کی تلاش میں رکنے کے بجائے پیدل چلنے لگے۔ آگے کچھ فاصلے پر اسٹریٹ لائٹس میں کچھ خرابی تھی جس کی وجہ سے وہ جل نہیں رہی تھیں اور وہاں خاصا اندھیرا تھا۔

وہ اس اندھیرے میں چل رہے تھے کہ تیز بریک کی آواز فضا میں گونجی اور ایک گاڑی ان کے بالکل قریب آ کر رکی۔ اس میں سے تین آدمی اترے۔ اندھیرے میں ان کی صورتیں ٹھیک سے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ لوگ کچھ سمجھ پاتے یا سنبھل پاتے، گاڑی سے اترنے والے دو افراد نے صفورہ کو دبوچا اور کھلونے کی طرح گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پٹخ دیا پھر وہ خود بھی تیزی سے اس کے دائیں بائیں بیٹھے اور گاڑی چل دی۔ صفورہ کو یاد تھا کہ گاڑی آگے بڑھنے کے بعد صابر بھائی اور بھابی کے چیخنے کی دبی دبی آواز سنائی دی تھی۔ دبی آواز اس لئے کہ فاصلہ کافی ہو چکا تھا۔

گاڑی میں صفورہ نے ہاتھ پاؤں چلانے کی کوشش کی مگر دونوں مرد بہت طاقتور تھے۔ ایک نے سختی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا تاکہ وہ چیخ نہ سکے۔ دوسرے نے اس کے دونوں ہاتھ جکڑ لئے۔ "زیادہ ہاتھ پاؤں نہ چلا" وہ غرایا "ورنہ یہیں کاٹ کر ڈال دوں گا۔"

صفورہ سہم گئی۔ وہ کچھ بھی تو نہیں کر سکتی تھی۔ دعا کے سوا! اے اللہ' میری اور میری آبرو کی حفاظت فرما۔ اس کے دل کی گہرائی سے دعا نکلی۔

خاصی دیر چلنے کے بعد گاڑی رکی۔ انہوں نے صفورہ کو اتارا۔ وہ ایک بنگلے کا پورچ تھا۔ روشنی بہت کم تھی۔ ویسے بھی صفورہ لاہور سے ناواقف تھی۔ یہ اندازہ کسی طرح بھی نہیں لگا سکتی تھی کہ وہ کہاں ہے' لاہور کے کس محلے میں ہے۔

وہ اسے بنگلے میں لے گئے۔ وہاں ایک بڑا ہال تھا' جہاں گھنی مونچھوں والا ایک خوف ناک شکل کا آدمی ایک کرسی پر بڑے شاہانہ انداز میں بیٹھا تھا۔ اغوا کرنے والوں نے اسے اس کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دیا "اسے لے آئے ہیں استاد!" اغوا کرنے والوں میں سے ایک نے کہا۔

استاد نے صفورہ کو بہت غور سے دیکھا۔ اس کی نظریں صفورہ کو اپنے آر پار ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی اور وہ تیز عقابی نگاہیں تھیں۔ چند لمحے صفورہ کو غور سے دیکھنے کے بعد اس نے سر کو اثباتی جنبش دی "دیکھنے میں تو ٹھیک ٹھاک ہے" اس نے کہا اور پھر نفی میں سر ہلایا "لیکن زیادہ چلنے والی نہیں لگتی۔ گن والی نہیں ہے۔ ہنر نہیں نظر آتا اس میں۔"

"لیکن استاد....!"

"میں ایک نظر میں پہچان لیتا ہوں۔" استاد نے بگڑے ہوئے لہجے میں اس کی بات کاٹی پھر صفورہ سے مخاطب ہوا "نام کیا ہے تیرا؟"

"مجھ پر رحم کیجئے۔" صفورہ گڑگڑائی۔

"رحم عورتوں کے پاس ہوتا ہے۔ نظر نہیں آتا' میں مرد ہوں۔" استاد نے بگڑ کر کہا "میری بات کا جواب دے۔"

"میرا نام صفورہ ہے۔"

"دیکھ لو۔ نام بھی اپنے کام کا نہیں ہے۔" استاد نے چیلوں کو دیکھا "لڑکی' ذرا چل کر دکھا" اس نے صفورہ کو حکم دیا۔

صفورہ مظلومیت سے اسے دیکھتی رہی مگر جب اس نے گرج کر اپنا حکم دہرایا تو وہ چلی "بس اتنا ہی کافی ہے" استاد نے کڑک کر کہا۔ "یہ نہیں ناچ سکتی' قدم بھی بے سرے ہیں۔"

صفورہ کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ وہ رات بھر سو نہیں سکی۔ رو رو کر اس کا برا حال ہو گیا۔ اگلے روز اس کا واسطہ دو بچ بچ کے استادوں سے پڑا۔ ایک موسیقی کے استاد تھے اور دوسرے رقص کے لیکن صفورہ نے کچھ بھی سیکھنے سے انکار کر دیا۔ اس کے نتیجے میں اسے بھوکا رکھا گیا۔ بالآخر وہ ٹوٹ گئی۔

لیکن دس دن کے بعد دونوں استاد اصل استاد کے سامنے کھڑے اپنی ناکامی کا اعتراف کر رہے تھے "یہ لڑکی کچھ نہیں سیکھ سکتی جناب! اس میں صلاحیت ہی نہیں ہے۔"

"میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا" استاد نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے' تم لوگ جاؤ" ان کے جانے کے بعد استاد صفورہ کے جسم کو قصائی کی نظروں سے دیکھتا رہا۔ "جو کچھ ہے اس کے پاس' اسی سے کام چلانا پڑے گا" اس نے اپنے چیلوں سے کہا۔ "کوئی بات نہیں' ایسی بھی ہوتی ہیں۔"

"میں عزت دار گھر کی لڑکی ہوں۔ مجھ پر رحم کرو" صفورہ نے فریاد کی۔

"ابتدا میں سبھی عزت دار ہوتی ہیں۔" استاد نے بے رحمی سے کہا۔

اسی لمحے ایک چیلے نے آ کر بتایا "استاد' وہ سلیم آیا ہے.... ایور گرین کا ویٹر۔"

"بھیج دو۔"

چند لمحے بعد سلیم آیا۔ استاد نے اس سے پوچھا "ہاں بھئی' کیا ہو رہا ہے؟"

"استاد' ایک خاص قسم کا گاہک ہے اور ایک خاص قسم کی لڑکی مانگتا ہے.... کانٹریکٹ پر" سلیم نے کہا۔

"ذرا تفصیل سے بتا۔"

"کوئی رائٹر ہے۔ کہانیاں لکھتا ہے۔ مہینے دو مہینے کے لئے مری لے جانا چاہتا ہے

لڑکی کو۔"

یہ سنتے ہی صفورہ کی دھڑکنوں کی لے بدل گئی۔ یہ تو مجیب انور کی بات ہو رہی ہے۔

"کیا دے گا مہینے کا؟" استاد نے سلیم سے پوچھا۔

"آٹھ دس ہزار استاد۔"

"تو جانتا ہے یہ بہت کم ہے۔"

"اتنا کم بھی نہیں ہے استاد۔ مہینے میں دس دن ہی لگتے ہیں مشکل سے پھر سب سے بڑی بات یہ کہ لڑکی ویسی کی ویسی واپس آئے گی۔"

"کیا مطلب" استاد کی باچھیں پھیل گئیں "نامرد ہے کیا؟"

"جو جی چاہے سمجھ لو استاد۔ پر وہ ہاتھ بھی نہیں لگاتا کسی لڑکی کو۔"

"تب تو ٹھیک ہے" استاد نے پرخیال لہجے میں کہا۔

اسی لمحے سلیم کی نظر صفورہ پر پڑی۔ اس نے صفورہ کو بہت غور سے دیکھا "یہ لڑکی اس گاہک کے مطلب کی ہے استاد۔"

استاد چند لمحے سوچتا رہا "تو نے کہا کہ ویسی کی ویسی واپس آئے گی' ہے نا؟"

"ہاں استاد!"

"تب تو ٹھیک ہے۔ صرف مال دکھانے کی بوہنی اچھا شگون ہے۔ پر یہ نیا پنچھی ہے' کہیں نکل لی تو؟"

"میں انڈیا سے آئی ہوں اپنے ماں باپ کے ساتھ۔ میں تو لاہور سے بھی اچھی طرح واقف نہیں" صفورہ نے جلدی سے کہا۔ اسے ڈر تھا کہ استاد اسے بھیجنے کا ارادہ نہ بدل دے۔

استاد نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے سلیم سے کہا "پر لاہور میں یہ اسے نہیں ملے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کا کوئی عزیز اسے پہچانے اور گڑ بڑ ہو۔"

"ٹھیک ہے استاد!"

تین دن بعد صفورہ ایک کوچ میں مجیب انور کے ساتھ بیٹھی تھی اور کوچ مری جا رہی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔

اصل فینٹیسی کے لئے میدان ہموار ہو چکا تھا۔ تصور کو گھر کی چار دیواری سے نکل کر غیر محدود فضا میں کھل کھیلنے کا موقع مل گیا تھا۔ بس دشواری یہ تھی کہ اسے مجیب کے ساتھ مری جانا تھا.... اور مری کے متعلق وہ اس سے زیادہ نہیں جانتی تھی کہ وہ ایک پہاڑی مقام ہے جہاں لوگ تفریح کی غرض سے جاتے ہیں۔ مری ہی کیا' اس نے کوئی پہاڑی مقام نہیں دیکھا تھا۔ ہاں' ان کے متعلق پڑھا بہت تھا مگر کسی نے سچ کہا ہے کہ مطالعہ تخیل' نظر اور علم میں وسعت پیدا کرتا ہے۔



پندرہ دن بڑی مشکل سے 10 اقساط کا scenario بن سکا تھا۔ یعنی مہینہ پورا ہونے والا تھا اور کام ابھی باقی تھا۔ مجیب بری طرح دباؤ میں آ گیا۔ کام کے معاملے میں وہ ہمیشہ کا مخلص اور ایمان دار تھا پھر یہاں تو وہ منہ مانگا معاوضہ لے رہا تھا۔ یہی نہیں' فنانسر اس کے تمام نخرے اٹھانے کو تیار تھا۔ صرف اس لئے کہ کام بہت اچھا ہو مگر جب یہاں سیناریو لکھنے میں اتنی دشواری ہو رہی ہے جبکہ وہ اتنا بڑا کام بھی نہیں ہے تو اسکرپٹ لکھتے وقت کیا ہو گا۔ اسکرپٹ تو واقعی ایک نیا میدان ہے اس کے لئے۔

پچھلے ایک ہفتے سے یہ خیال اسے مسلسل ستا رہا تھا۔ ایوب ساغر کی پیش کش بہت معقول تھی۔ اس روز اس نے یہی بات ایوب سے کہہ دی۔

"میں یہ بات کہنا نہیں چاہتا سر مگر یہ حقیقت ہی کہ سیناریو تو کچھ بھی نہیں۔ اسکرپٹ میں تو تفصیل ہو گی" ایوب نے کہا "آپ کو بہت زیادہ ارتکاز کی ضرورت ہو گی۔"

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں" مجیب نے پرخیال لہجے میں کہا "میرا خیال ہے' مجھے تمہاری پیش کش قبول کر لینی چاہئے۔"

"یہی بہتر ہے سر! میں نے خلیل صاحب سے بات کی تھی۔ وہ ہر ممکن تعاون کے لئے تیار ہیں۔ اس بنگلے میں آپ کو مکمل پرائیوسی ملے گی۔ ریکارڈنگ کرنے والے یونٹ کے قیام کا بندوبست ہوٹل میں کر دیا جائے گا۔ آپ کو کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔"

"ٹھیک ہے' شکریہ! لیکن میں ابھی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ سیناریو مکمل ہونے کے بعد ہی کچھ کہہ سکوں گا۔"

"جو آپ کی مرضی۔ جب بھی آپ کہیں گے، میں پہلی ممکنہ فلائٹ پر آپ کی سیٹ ریزرو کرا دوں گا۔"

"نہیں بھئی۔ فلائٹ کی ضرورت نہیں۔ میرے لئے ٹرین ہی مناسب ہے۔"

ایوب نے چونک کر اسے دیکھا "وقت کی بچت ہو گی سر اور سفر کی تھکن اور کوفت سے بھی بچیں گے۔"

"نہیں ایوب۔ ٹرین ہی مناسب ہے۔"

ایوب اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا "کوئی خاص وجہ ہے سر؟"

مجیب نظریں چرانے لگا "ہاں بھائی، مجھے جہاز سے بھی خوف آتا ہے۔"

"چلیں، ٹرین پر ہی کر لیں۔ آپ فیصلہ تو کریں۔"

اس رات مجیب نے سحاب سے اس سلسلے میں بات کی "میں نے تو پہلے ہی یہی مشورہ دیا تھا آپ کو۔"

"مگر مجھے زیادہ وقت بھی لگ سکتا ہے۔ دو ماہ.... ممکن ہے اور زیادہ۔"

"کوئی بات نہیں۔ کام سے زیادہ ضروری تو کچھ بھی نہیں ہوتا" سحاب بولی "اتنے عرصے کے لئے امی اور سرفراز یہاں آ جائیں گے۔ میں امی سے بات کر لوں گی، آپ فکر نہ کریں۔"

مجیب کے دل و دماغ پر سے ایک بوجھ ہٹ گیا۔ واقعی، یہ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اب وہ مری جانے کے لئے اندر سے نیم رضامند تھا۔ شاید اسے سب سے زیادہ فکر سحاب اور بچوں کی تنہائی کی تھی۔

اسے سحاب پر بڑی شدت سے پیار آیا۔ اس نے اسے لپٹا لیا۔ "ہر مسئلہ منٹوں میں حل کر دیتی ہو۔ کتنا خیال رکھتی ہو تم میرا۔"

"بس.... ضرورت سے زیادہ تعریف کی ضرورت نہیں۔"

"نہیں، سچ مچ.... میں سوچتا ہوں، ایسی کون سی نیکی کی تھی میں نے، جس کے صلے میں تم ملی ہو۔"

"نیکی سمجھ کر دریا میں نہیں ڈال دیجئے گا مجھے" سحاب نے ہنس کر کہا۔

"مگر بچوں کا کیا ہوگا۔ وہ اتنے عرصے کی دوری برداشت کر لیں گے؟" مجیب کو پھر

ہول چڑھنے لگا۔

"ان کی آپ فکر نہ کریں۔ انہیں میں مسلسل سمجھا رہی ہوں۔"



اب تصور تمام حدود و قیود سے آزاد تھا۔ وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ مجیب انور کے ساتھ کسی بھی طرح وقت گزار سکتی تھی اور وہ بہت اچھا وقت گزار رہی تھی۔ اس بار اسکوپ بہت زیادہ تھا اور تنوع بھی کم نہیں تھا۔ ہر روز ایک نئی وادی ہوتی' ایک نیا مرغزار اور نئی سچویشنز۔ وہ خوش تھی کہ اس طرح پوری عمر گزار سکتی ہے۔

لیکن دنیا میں کسی چیز کو ثبات نہیں۔ انسان کو نہیں' خود دنیا کو نہیں پھر وقت ایک سا کیسے گزر سکتا ہے!

شفاف اور پرسکون جھیل اپنے گرد و پیش کو اس انداز میں منعکس کرتی ہے کہ عکس اصل سے زیادہ خوب صورت اور دل نشین لگتا ہے مگر چھوٹا سا' بہت حقیر سا ایک کنکر جھیل میں آگرے تو سب کچھ بکھر کر رہ جاتا ہے۔ یہی کچھ صفورہ کے ساتھ ہوا۔ ایک بات کا کنکر جھیل میں آکر گرا اور سب کچھ بکھر گیا۔

کنکر امی نے اچھالا تھا "لو بھئی' مہینہ بھی گزر گیا۔ وقت بہت تیز گزرتا ہے" وہ چچی سے کہہ رہی تھیں۔

صفورہ نے چونک کر انہیں دیکھا لیکن کچھ کہا نہیں۔

"اس بار آپ لوگ کم وقت کے لئے کیوں آئے؟" چچی نے پوچھا۔

"ویزا ملنے والا تھا کہ سلمٰی کے رشتے کی بات چل پڑی۔ لکھا تو تھا آپ کو" امی بولیں "وہ لوگ جلدی کر رہے تھے۔ ہم نے سوچا' نمٹا ہی دیں اسے بھی۔ اس میں ڈیڑھ پونے دو مہینے کا عرصہ نکل گیا۔"

صفورہ نے دوبارہ اپنے تصور میں گم ہو جانا چاہا لیکن بات بنی نہیں۔ دراصل وہ یہ جاننا چاہتی تھی کہ کتنے دن گزر گئے اور کتنے رہ گئے ہیں۔ وہ ان دونوں کی طرف متوجہ رہی۔

"ویزا بڑھوایا بھی تو جا سکتا ہے" چچی نے بے حد خلوص سے کہا۔

"کوشش تو کی تھی انہوں نے مگر ہو نہیں سکا۔"

"ہمارا تو ابھی دل نہیں بھرا بھابی بیگم" چچی بولیں "مجھے تو آپ لوگوں کا آنا کل کی بات لگتی ہے۔"

"یہ تو تمہاری محبت اور خلوص ہے۔ کوئی بات نہیں' زندگی رہی تو پھر سہی۔"

صفورہ کا ضبط جواب دے گیا "امی' کتنے دن رہ گئے ہیں ہماری واپسی میں؟"

ناظورہ بیگم نے چونک کر اسے دیکھا "لو' تمہیں پتہ ہی نہیں' نہ جانے کہاں غائب رہتی ہو۔"

"آپ بتائیں تو" سچی بات یہ کہ صفورہ کو ان دنوں اور تاریخوں کے متعلق کچھ یاد ہی نہیں تھا۔

"بس آٹھ دن رہ گئے ہیں۔ آج ہی کے دن انشاء اللہ واپسی ہے ہماری۔"

آٹھ دن! صرف آٹھ دن! آج ہی کے دن! یہ خیال ہی سجی سجائی محفل کو درہم برہم کرنے کے لئے بہت کافی تھا۔ جس زمین پر مضبوطی سے پاؤں جما کے اس نے تصور کی بساط پر بازی بچھائی تھی' وہ زمین ہی پیروں کے نیچے سے نکلی جا رہی تھی۔

برا ہو اس تصور کا۔ مجھے پتہ ہی نہیں چلا کہ کتنا وقت گزر گیا ہے۔ اس نے گھبرا کر سوچا۔

اچھا ہی ہوا۔ فوراً ہی جوابی سوچ ابھری ورنہ ایک ایک دن' ایک ایک ساعت' ایک ایک پل گننے کی اذیت سے گزرنا پڑتا۔ اب تو صرف ایک ہفتے کا انتظار ہے۔ وہ بھی زیادہ سے زیادہ..... اور مجیب انور اب کسی بھی دن آ جائے گا۔

لیکن وہ نہ آیا تو؟ یہ خیال ہی صفورہ کے لئے لرزہ طاری کر دینے والا تھا۔ اگر وہ اس کی بھارت واپسی تک نہ آیا..... اگر وہ اس سے مل نہ سکی..... کم از کم اسے دیکھ نہ سکی تو..... وہ جانتی تھی کہ ایسا ہوا تو زندگی گزارنا..... ہر پل اس کے لئے عذاب ہو جائے گا۔ اللہ اسے اس محرومی سے محفوظ رکھے۔

اس لمحے سے اس کے روز و شب' اس کی روز و شب کی کیفیات بدل گئیں۔ بے خودی' سرشاری اور ازخودرفتگی کی جگہ انتظار اور گھبراہٹ نے لے لی۔ شام کو صابر بھائی گھر واپس آئے تو اس نے بے تابی سے پوچھا "مجیب صاحب نہیں آئے؟"

"آتے تو میں گھر میں گھستے ہی پہلی خبر یہی سناتی۔"
"پہلے تو آپ نے چھپا لیا تھا" صفورہ نے جھنجلاہٹ میں شکایت کی۔
"وہ اور بات تھی" صابر بھائی کھسیا گئے۔
"مجھے لگتا ہے' وہ نہیں آئیں گے" اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔
"اچھا سوچا کرو' اچھی باتیں کیا کرو۔"
"پتہ ہے' ہماری واپسی میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔"
"ایک ہفتہ بہت ہوتا ہے.... سات دن۔ تم فکر نہ کرو۔"

لیکن وہ فکر کیسے نہ کرتی' یہ اس کے لئے سب سے بڑی پریشانی تھی۔ اس دن سے اس کا کام بس لمحہ شماری رہ گیا۔ وہ لمحوں کی تسبیح پر مجیب انور کا نام پڑھتے پڑھتے دن تمام کر دیتی۔ لمحوں کے ہر دانے کے ساتھ اس کا ہول بڑھ جاتا۔ صابر گھر واپس آتا تو امید ٹوٹ جاتی مگر چند لمحے بعد وہ پھر آس لگا بیٹھتی۔ ممکن ہے' مجیب انور آ گیا ہو۔ اب صابر بھائی کو تو کل ہی معلوم ہو سکے گا۔

اس نے صابر بھائی سے کہہ دیا تھا کہ مجیب کے آتے ہی گھر فون کر دیں "یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے؟" صابر بھائی نے کہا "میں پہلا کام یہی کروں گا۔"

اسی عالم میں چار دن گزر گئے۔ چچا اور ان کے گھر والے بھی یہیں آ گئے تھے۔ واپسی ساتھ ہی ہونا تھی اور واپسی میں صرف تین دن رہ گئے تھے۔ مجیب انور اب بھی نہیں آیا تھا۔

روانگی میں دو دن رہ گئے تو چچا نے صابر بھائی سے کہا "صابر' اب دو دن کی چھٹی لے لو۔ بچیوں کو گھمانا پھرانا بھی ہے اور شاپنگ بھی کرانی ہے۔"

صابر بھائی نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر سر جھکاتے ہوئے کہا "بہت بہتر ابا میاں!"

بعد میں اکیلے میں اس نے صفورہ کو تسلی دی۔ "تم فکر نہ کرو۔ مجیب صاحب جیسے ہی آئیں گے' ہوٹل والے مجھے فون کر دیں گے۔"

اس کی تسلی تو نہیں ہوئی لیکن آس کے کمزور کچے دھاگے کو تھام کر رکھنے کے سوا کوئی چارہ تھا ہی نہیں۔



بیسویں دن آخری قسط کا سیناریو مکمل ہوا۔ وہ دوپہر کا وقت تھا۔ "شکر ہے' یہ کام تو نمٹا۔" مجیب نے طمانیت سے کہا "چلو' اب سکون سے کھانا کھائیں گے۔"

کھانے کے بعد ایوب ساغر نے پوچھا "اب بتائیں سر' کیا ارادہ ہے؟"

مجیب چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا "میں نے مری جانے کے حق میں ہی فیصلہ کیا ہے اور کوئی چارہ نہیں۔"

"مجھے یقین تھا سر! کہ آپ درست فیصلہ کریں گے" ایوب کھل اٹھا "آپ کل ہی روانہ ہو جائیں۔"
"کل!" مجیب نے حیرت سے اسے دیکھا "یہ کیسے ممکن ہے؟"
"میں نے کل کی تیز گام میں آپ کے لئے سلیپر میں دو کوپے پہلے ہی ریزرو کرا رکھا ہے۔ تیز گام شام کو پانچ بجے جاتی ہے۔ آپ کے پاس چوبیس گھنٹے ہیں۔"
"ریزرویشن تو پہلے ہی کرائی ہو گی؟" مجیب اب بھی اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔
"جی ہاں۔"
"مگر کیسے؟"
ایوب مسکرایا "بس میرا اندازہ تھا' اللہ نے آبرو رکھ لی۔"
"اور اگر میرا ارادہ نہ بنتا تو؟"
"کوئی فرق نہ پڑتا۔ وہی ہوتا' جو آپ چاہتے تھے۔" ایوب نے ٹکٹ اور ریزرویشن نکال کر مجیب کی طرف بڑھائے "یہ رکھ لیجئے۔ میں کل چار بجے آپ کو لینے آ جاؤں گا۔"
"ٹھیک ہے لیکن تم نے ہتھیلی پر سرسوں جمائی ہے۔"
"معافی چاہتا ہوں سر لیکن آپ خود دیکھیں۔ ہم شیڈول سے پیچھے چل رہے ہیں۔"
"ہاں' یہ تو ہے۔ خیر' ٹھیک ہے۔"

ایوب سیناریو کی ایک کاپی لے کر رخصت ہو گیا۔ "سر' میرا ٹیلی فون نمبر آپ کے پاس ہے" اس نے جاتے جاتے کہا "سیناریو میں کوئی تبدیلی کریں تو فون پر بتا دیجئے گا۔"

میرے ذہن میں کوئی تبدیلی آئی تو میں فون کر لوں گا۔"

"یہی نہیں' میں قسطیں تمہیں بھجواتا بھی رہوں گا۔"

ایوب کے جانے کے بعد مجیب نے سحاب کو جا کر بتایا "اب یہ تو اچانک ہی سر پر آ گئی ہے" اس نے کہا "اس بار تو تیاری بھی پوری کرنی ہو گی۔"

"تیاری کی آپ فکر نہ کریں۔" سحاب نے کہا "وہ میں کر لوں گی۔ آپ ایک کام کریں' جا کر اپنے لئے کچھ گرم کپڑے خرید لیں۔"

"گرم کپڑے!" مجیب نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کراچی میں مارچ میں گرمی شروع ہو جانے کا یہ مطلب نہیں کہ مری میں بھی یہی ہو گا۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔ شام کو میں یہ کام کر لوں گا۔"

سحاب کام میں لگ گئی۔ مجیب اپنی اسٹڈی میں چلا آیا۔ وہ اپنا لکھنے پڑھنے کا سامان سمیٹ کر رکھنے میں مصروف ہو گیا' جو ساتھ لے جانا تھا۔ عین وقت پر افراتفری میں وہ کچھ بھی بھول سکتا تھا۔ بعد میں مصیبت ہوتی۔ تمام ضروری چیزیں اس نے بریف کیس میں رکھ لیں۔ بریف کیس بند کرتے ہوئے اسے ٹکٹ کا خیال آیا۔ اس نے ٹکٹ نکال کر اس کا جائزہ لیا۔ ریزرویشن کے کوپن پر کوپے نمبر I C لکھا تھا اور مسافروں کے نام مسٹر اینڈ مسز مجیب انور تھے اور منزل راولپنڈی۔

وہ چکرا کر رہ گیا۔ راولپنڈی! اسے تو لاہور جانا اور ویٹر سلیم سے ملنا تھا ورنہ وہ تو خلیل نواز کے مری والے بنگلے میں وحشت سے ہی مر جاتا مگر ٹکٹ راولپنڈی تک کا ہے۔ خیر.... کیا ضروری ہے کہ وہ پنڈی تک جائے۔ وہ لاہور میں اتر سکتا ہے اور آگے اپنے طور پر جا سکتا ہے۔ بس دشواری یہ ہے کہ وہ شیڈول سے پیچھے چل رہا ہے۔

یہ سوچ کر وہ مطمئن ہو گیا مگر چند ہی لمحے بعد اسے لاہور کے متعلق گھبراہٹ ہونے لگی۔ لاہور پہنچ کر وہ ایور گرین ہوٹل جائے گا۔ وہاں قیام کرے گا۔ صرف ویٹر سلیم سے ملنے کے لئے! اور ان تمام لوگوں کی نگاہوں کا سامنا کرنے گا اور پھر لڑکی کو لے کر نکلے گا.... سفر کے لئے۔ تب بھی نگاہوں کا سامنا ہو گا اور غفور سے رابطہ نہ کیا اور کہیں سامنا ہو گیا تو کتنی بری بات ہو گی اور غفور کو بلا لیا تو.... اس کے سامنے ہی

کوئی بات ہو گئی تو.... اور وہاں اس کا وہ فین بھی ہو گا.... صابر۔ وہ تو استقبالیہ کلرک ہے وہاں۔ پچھلی بار تو امیج بچ گیا تھا لیکن اس بار ضروری نہیں کہ بچے۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ کیچڑ میں قدم رکھنے سے کتنی گندگی اچھلتی ہے۔

وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ہمت جواب دینے لگی۔ اس پورے معاملے کو ڈراپ کر دیا جائے۔ ایک لمحے کو اس نے سوچا مگر پھر مسلسل تنہا رہنے کے خیال سے تھرتھری چڑھ گئی مگر مری تو بالکل محفوظ ثابت ہو گا۔ اس نے خود کو دلاسہ دیا۔ وہاں ایسا کوئی چکر نہیں ہو گا۔ مسٹر اینڈ مسز مجیب انور کی آڑ بھی چل سکتی ہے۔

ایک خیال کے تحت وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ جو کچھ ہو رہا ہے' ٹھیک ہی تو ہو رہا ہے۔ اس نے سوچا۔ اس کا ذہن تیزی سے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایوب ساغر نے اس کے لئے کوپے بک کرایا ہے۔ مسٹر اینڈ مسز مجیب انور کے نام سے۔ گاڑی لاہور میں پچیس منٹ ٹھہرتی تھی۔ اگر لڑکی لاہور اسٹیشن سے اس کے کوپے میں آ جائے تو کسی قسم کا کوئی مسئلہ نہیں کھڑا ہو گا۔ کوئی اسے عجیب سی' چبھتی نظروں سے نہیں دیکھے گا.... اور بات بھی بن جائے گی۔

واقعی! وہ خوش ہو گیا۔ اسے صرف اتنا کرنا ہے کہ کسی طرح سلیم سے رابطہ کر لے اور اسے بتا دے کہ اسے لڑکی کو کس دن کہاں پہنچانا ہے۔ یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں.... اور اس سے عزت پر بھی کوئی حرف نہیں آتا۔ تو کیا فون کیا جائے؟ وہ بھڑک گیا۔ یہ مناسب نہیں۔ ہاں' خط لکھ دیا جائے۔

کل اس کی روانگی تھی اور پرسوں صبح کسی وقت اسے لاہور پہنچنا تھا۔ اگر وہ ابھی کوریئر سروس کے ذریعے ارجنٹ خط بھجوائے تو وہ آج رات ہی پہنچ جائے گا۔

وہ پوری طرح مطمئن ہو گیا۔ یہ اس مسئلے کا بہترین حل تھا۔

وہ خریداری کے لئے بازار گیا تو اس نے ایور گرین ہوٹل کی معرفت ویٹر سلیم کو خط بھجوا دیا۔ سامان سے لدا پھندا واپس آیا تو اس کی ساس اور منجھلا سالا گھر میں موجود تھے۔ سحاب نے فون کر کے انہیں بلا لیا تھا۔

اس رات مجیب اداس بھی تھا.... اور بیوی اور بچوں کی محبت سے سرشار بھی پھر بھی وہ بہت حسین رات تھی!



صفورہ عجیب وحشت سے دوچار تھی۔ اگلے روز روانگی تھی اور آنے والا اب بھی نہیں آیا تھا۔ اس کی مایوسی آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ بات بات پر جھنجلا رہی تھی۔ امی سامان پیک کرنے میں مصروف تھیں۔ اس نے ان کا ہاتھ بھی نہیں بٹایا۔

اس روز گھر مہمانوں سے بھرا تھا۔ چچی کے ان بھائی کا پورا گھر بھی آیا ہوا تھا' جہاں ان کا قیام رہا تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ رات سب لوگ یہاں گزاریں گے اور صبح یہیں سے اسٹیشن جائیں گے۔ گاڑی کی روانگی کا وقت گیارہ بجے تھا۔

صفورہ تمام وقت اس کمرے میں جمی رہی' جس کے برابر والے کمرے میں ٹیلی فون رکھا تھا۔ جب بھی ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی' اس کی آس بندھتی مگر فوراً ہی وہ مایوس ہو جاتی۔ اسے یقین ہو گیا کہ جو اس نے سوچا اور چاہا' وہ اس کے مقدر میں نہیں ہے۔

جب مایوسی حد سے گزر جاتی ہے تو اللہ پر یقین رکھنے والا مجسم دعا بن جاتا ہے۔ جسم کا رواں رواں' ہر دھڑکن' ہر سانس دعا بن جاتی ہے.... بغیر لفظوں کی دعا۔ یہی اس کے ساتھ بھی ہو رہا تھا لیکن اسے قرار نہیں تھا۔ کبھی کوئی پورا دن اس نے اتنا اذیت ناک نہیں گزارا تھا۔ پورے دن وہ ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھا سکی۔

رات کو نو بجے کے بعد فون کی گھنٹی بجی۔ اس کے کان دوسرے دروازے پر لگ گئے۔ وہ سراپا دعا بن گئی۔ اسے صابر بھائی کی آواز سنائی دی' جو فون ریسیو کر رہے تھے اور پھر اگلے ہی لمحے اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔

کیا ایسے بھی امید بر آتی ہے!



صابر کو بھی کوفت ہو رہی تھی۔ آج دو دن ہو گئے تھے۔ وہ صفورہ سے نظریں بھی نہیں ملا پا رہا تھا مگر اس کے اختیار میں کچھ نہیں تھا۔ یہ بے بسی کا احساس اور تکلیف دہ تھا۔ صفورہ سے اسے بہت محبت تھی۔ وہ اسے خوش دیکھنا چاہتا تھا۔

دن بھر وہ مصروف رہا۔ چھوٹے موٹے کام اتنے تھے کہ فرصت نہیں مل رہی تھی پھر بھی وہ ہوٹل سے آنے والے فون کا انتظار کرتا رہا لیکن فون نہیں آیا۔ اب سوا نو بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا "صابر اسپیکنگ!"

"میں احمد بول رہا ہوں صابر!" دوسری طرف سے کہا گیا۔

صابر کے چہرے پر رنگ دوڑ گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ مراد پوری ہو گئی ہے "کیا مجیب صاحب آ گئے؟"

"نہیں بھائی۔ ان کا خط آیا ہے.... کل رات آیا تھا۔"

صابر افسردہ ہو گیا۔ معذرت کا خط! مجیب صاحب کو کیا معلوم کہ کسی پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ صفورہ کو ان سے ملنے کا کتنا ارمان تھا۔ اور وہ کتنی مایوس اور دل گرفتہ ہندوستان واپس جا رہی ہے۔

"میں نے کل رات کئی بار تمہارا نمبر ٹرائی کیا مگر تمہارا فون بزی تھا" احمد کہہ رہا تھا۔

"ہاں۔ مہمان واری رہی ہے نا" صابر نے بجھے بجھے لہجے میں کہا "یہ تو بتاؤ' کیا لکھا ہے مجیب صاحب نے؟"

"خط سلیم کے نام تھا اور تم جانتے ہی ہو کہ سلیم کو ملازمت سے نکالا جا چکا ہے۔"

"اوہ.... پھر تم نے خط کا کیا' کیا؟"

"ارشد کو دیا کہ وہ سلیم کو پہنچا دے۔ خط کوریئر سروس سے ارجنٹ بھیجا گیا ہے' یقیناً اہم ہو گا۔"

صابر اس خط کی اہمیت سمجھ سکتا تھا۔ سلیم سے مجیب انور جیسے آدمی کا ایک ہی تعلق ہو سکتا تھا۔ "پھر.... خط سلیم کو پہنچ گیا؟"

"نہیں۔ ارشد خط واپس لے آیا۔ سلیم اپنے گاؤں جا چکا ہے۔"

معاملہ خاصا پیچیدہ ہوتا جا رہا ہے' صابر نے سوچا "تو اب کیا ہو؟"

"یہی تو مجھے پوچھنا ہے تم سے۔ ابھی ارشد نے خط لا کر دیا تو میں پریشان ہو گیا۔ لفافے پر ارجنٹ اور ذاتی لکھا ہے۔ کیا کروں؟" کھول لوں یا واپس بھجوا دوں؟"

"سلیم گاؤں جا چکا ہے۔ لفافے پر ارجنٹ لکھا ہے۔ تم خط کھول لو فوراً.... اور مجھے پڑھ کر سناؤ کہ کیا لکھا ہے؟" صابر نے بلا جھجک کہا۔ اس کے جسم میں سنسنی دوڑنے لگی۔ امکان تھا کہ صفورہ کی مجیب سے ملاقات ہو سکتی ہے۔

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی پھر احمد کی آواز ابھری۔ "مختصر سا خط ہے" وہ کہہ رہا تھا "لکھا ہے کہ پیر 17 مارچ کو تیز گام سے راولپنڈی کے لئے روانہ ہو رہا ہوں۔ لاہور رکنے کا موقع نہیں ہے۔ منگل 18 مارچ کی صبح ساڑھے نو بجے گاڑی لاہور پہنچے گی۔ 25 منٹ کا اسٹے ہے۔ میں سلیپر میں کوپے 1 C میں ہوں گا۔ براہ مہربانی میری چیز وہاں پہنچا دو۔ تمہاری ادائیگی بھی ہو جائے گی۔"

صابر چند لمحے سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ "اس وقت وہ ٹرین میں ہوں گے۔ کل صبح ساڑھے نو بجے ٹرین لاہور پہنچے گی۔ وہ یقیناً اپنی چیز کا انتظار کریں گے۔ کیا بتایا تم نے.... سلیپر کا کوپے نمبر۔ ایک منٹ.... میں لکھ لوں....ہاں' کوپے نمبر 1 C" وہ کہتے کہتے رکا۔ "اب تم بے فکر ہو جاؤ اور خط جلا دو۔ کل میں اسٹیشن پر ہی ہوں گا۔ میرے انڈیا والے مہمان واپس جا رہے ہیں نا۔ گیارہ بجے ان کی ٹرین روانہ ہو گی۔ میں وہیں مجیب صاحب سے مل لوں گا اور انہیں بتا دوں گا کہ سلیم گاؤں گیا ہوا ہے۔ ان کا پیغام اس تک نہیں پہنچ سکا' ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے بھائی۔"

"اچھا' شکریہ۔"

"پرسوں سے تو ڈیوٹی پر آ رہے ہو نا۔"

"ہاں دوست۔ اچھا اللہ حافظ۔"

صابر نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور کچھ سوچنے لگا۔ یہ بھی اچھا ہی تھا کہ مجیب انور نے خط کھل کر نہیں لکھا تھا۔ ورنہ وہ اس سے مل بھی نہ پاتا۔ خط کھولنا مجیب کے لئے اور اس کے لئے بھی شرمندگی کا سبب بن جاتا۔ اب وہ اس سے مل کر معذرت کر سکتا تھا.... خط کھولنے پر.... اور بتا سکتا تھا کہ سلیم کو ٹریس کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مگر وہ گاؤں جا چکا ہے۔

ایک لمحے کو اس نے سوچا کہ صفورہ کو بھی مجیب سے ملوا دے گا مگر دوسرے ہی

لمحے اس نے اس خیال کو رد کر دیا۔ صورت حال ایسی تھی کہ مجیب کسی لڑکی کی آمد کی توقع کر رہا ہو گا۔ ایسے میں اس کے منہ سے کوئی بات بھی نکل سکتی ہے' جو اس کے اور صفورہ کے لئے شرمندگی کا سبب بن جائے۔

وہ افسردہ ہو گیا۔ شاید مجیب انور سے ملنا صفورہ کے مقدر میں نہیں ہے۔



صفورہ نے پوری گفتگو بھی سن لی تھی اور سمجھ بھی لی تھی۔ نوٹ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ تمام معلومات اس کے دل پر نقش ہو گئی تھیں۔ گفتگو ختم ہوتے ہی وہ اس کمرے سے نکل گئی تھی۔ نہیں چاہتی تھی کہ صابر بھائی اسے وہاں دیکھیں اور سوچیں کہ شاید اس نے ان کی گفتگو سن لی ہے۔ اسے یقین تھا کہ صابر بھائی اسے اس سلسلے میں ایک لفظ بھی نہیں بتائیں گے اور وہ خود بھی اس سلسلے میں ان سے بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔

اپنے کمرے میں جا کر اس نے روشنی گل کی اور بستر پر لیٹ گئی۔ وہ اس معاملے میں سوچنا چاہتی تھی۔ تقدیر نے اسے مجیب انور سے ملاقات کا آخری موقع فراہم کر دیا تھا۔ اسے اس سے ہر حال میں استفادہ کرنا تھا مگر کیسے؟ یہ سوچنا تھا۔

صورت حال پوری طرح اس کے حق میں تھی۔ صابر بھائی صبح ہی اعلان کر چکے تھے کہ صبح آٹھ بجے گھر سے نکلنا ہے اور ہر حال میں نو بجے سے پہلے اسٹیشن پہنچ جانا ہے۔ گویا جس وقت کراچی سے تیز گام آئے گی' وہ اسٹیشن پر موجود ہو گی اور ٹرین 25 منٹ رکے گی۔ اتنی دیر میں وہ جا کر اس سے مل سکتی ہے۔ یہ بات بھی اس کے حق میں جاتی تھی کہ ہجوم کافی ہو گا اور وہ تیز گام کی طرف چلی جائے گی اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ یہ بھی اچھا تھا کہ اس بار فرقان چچا بھی اپنی فیملی کو لے کر ان کے ساتھ ہی آئے تھے اور ان کے ساتھ ہی واپس جا رہے تھے۔ گویا اچھا خاصا ہجوم تھا جانے والوں کا اور وہ اکیلی لڑکی بھی نہیں تھی۔ فرقان چچا کی تینوں بیٹیاں بھی ساتھ تھیں' ایسے میں کسی کو اس کی چند منٹ کی کمی کا پتہ بھی نہیں چلے گا۔

سب ٹھیک ٹھاک' بس ایک مسئلہ تھا۔ صابر بھائی! صابر بھائی کو بھی جا کر مجیب انور سے ملنا تھا اور ان کے سامنے وہ مجیب سے نہیں مل سکتی تھی اور صابر بھائی کے مجیب

سے ملنے کی صورت میں اس بات کی کوئی ضمانت نہیں تھی کہ اس کے ملنے کا وقت بچے گا یا نہیں۔ اس اعتبار سے ٹرین کا 25 منٹ رکنا بہت کم تھا۔

اسے صابر بھائی کو روکنے کی کوئی ترکیب سوچنی تھی۔



مجیب انور کے لئے وہ سفر ایک بہت کڑے وقت کا آغاز تھا۔ زندگی میں پہلی بار وہ بیوی اور بچوں سے اتنے طویل عرصے کے لئے دور جا رہا تھا۔ سحاب کی خواہش تھی کہ وہ اور بچے اسے رخصت کرنے اسٹیشن پر جائیں لیکن اس نے منع کر دیا "بچے سامنے ہوں گے تو میرا حوصلہ جواب دے جائے گا" اس نے کہا۔

وہ روہانسا ہو رہا تھا۔ سحاب نے ایک نظر اس کے چہرے کو دیکھا اور جان لیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ تو کسی بھی لمحے رو دے گا۔

چلتے وقت بچوں نے اپنی اپنی فرمائشیں بیان کیں مگر شاہد اس سے نظریں چرا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔ مجیب نے اسے لپٹا لیا لیکن اس سے نظریں چار نہیں کیں۔

ایوب ساغر اسے چھوڑنے گیا "سر' پنڈی پہنچ کر آپ اپنے کوپے سے نہ نکلئے گا۔ خلیل صاحب کے ڈرائیور کو بتا دیا گیا ہے۔ وہ گاڑی لے کر اسٹیشن پہنچے گا اور خود آپ تک پہنچے گا۔ وہی آپ کو مری لے جائے گا۔"

یہ ایسا ہی تھا جیسے مجیب کو سزائے قید سنا دی گئی ہو۔ کہاں تو وہ سوچ رہا تھا کہ ضرورت پڑی تو وہ لاہور پر بھی اتر سکتا ہے لیکن اب تو وہ پابند ہو گیا تھا۔ اسے ہر حال میں راولپنڈی جانا تھا "ٹھیک ہے ایوب!"

"اور سر' گھر کی فکر نہ کیجئے گا۔ میں گھر فون کر کے بھابی سے پوچھتا رہوں گا۔ کوئی مسئلہ ہوا تو نمٹا بھی دوں گا" ایوب نے بے حد خلوص سے کہا۔

"شکریہ ایوب!"

ایوب اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ "آپ کی اداسی فطری ہے سر لیکن جب آپ کام نمٹا کر واپس آئیں گے تو وہ ایک نئی اور بہت بڑی خوشی ہو گی آپ کے لئے۔"

"کون جانے" مجیب نے سرد آہ بھر کے کہا "مجھے تو لگتا ہے کہ میں کام کر ہی نہیں سکوں گا۔"

"فطرت کا جادو سب کچھ بدل دیتا ہے سر!"

روانگی کے وقت سے دو منٹ پہلے ایوب ٹرین سے اتر گیا۔ ٹرین ٹھیک وقت پر روانہ ہو گئی۔

سفر کے آغاز میں مجیب بہت خوش تھا۔ کوپے اسے بہت اچھا لگا۔ چھوٹا سا۔۔۔ بہت چھوٹا سا کمرا۔۔۔ ایک سیٹ۔۔۔ سیٹ کے اوپر ایک اور سیٹ پھر ملحقہ باتھ روم۔ باہر نکلنے کی ضرورت ہی نہیں۔ بس دروازہ لاک کر لیا۔ پرائیویسی ہی پرائیویسی۔۔۔ سب لوگوں سے دور۔ یہ سب سوچتے ہوئے اسے ایک لمحے کو بھی خیال نہیں آیا کہ یہاں وہ تنہا ہے۔ دراصل لاہور سے سوار ہونے والی لڑکی کے خیال سے اسے اس تنہائی میں عافیت معلوم ہو رہی تھی۔ یہ تنہائی پردہ رکھنے والی تھی۔

اس نے اسکرپٹ را شنگ پر کتاب نکالی اور پڑھنے لگا۔ کتاب سے اکتاہٹ ہوتی تو وہ پلٹ کر رکھتا اور کھڑکی سے باہر اڑتے ہوئے مناظر کو دیکھنے لگتا۔ وہ اس وقت اپنی ہی دھن میں مگن تھا۔ ادھر ادھر کا ہوش نہیں تھا۔

آٹھ بجے کوپے کے دروازے پر ہونے والی دستک نے اسے چونکا دیا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور ٹکٹ چیکر اندر آیا۔ مجیب نے کتاب پلٹ کر رکھی اور اس کی طرف متوجہ ہو گیا "پلیز' اپنا ٹکٹ چیک کرائیں گے؟" ٹکٹ چیکر نے بے حد خوش اخلاقی سے کہا۔

مجیب نے اوپر والی سیٹ سے اپنا بریف کیس اتارا اور اسے کھول کر اس میں سے ٹکٹ اور ریزرویشن نکال کر چیکر کی طرف بڑھائی۔ چیکر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ چیکر کے ہاتھ میں ایک لسٹ تھی۔ اس نے لسٹ میں ٹکٹ کا نشان لگایا اور ٹکٹ اور ریزرویشن مجیب کو واپس دی "اجازت ہو تو ذاتی نوعیت کی ایک بات پوچھ لوں؟" چیکر نے کہا۔

مجیب کو عجیب سا لگا۔ تاہم اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"آپ کی مسز ساتھ نہیں ہیں؟"

"جی نہیں۔ وہ لاہور سے مجھے جوائن کریں گی" مجیب نے کہا۔ "کیوں' کوئی

اعتراض؟"

"ارے نہیں سر!" چیکر ہنسنے لگا "میں کسی اور وجہ سے پوچھ رہا ہوں۔ گویا آپ لاہور تک اکیلے ہیں اور ابھی آپ نے دروازہ لاک بھی نہیں کیا تھا۔"

مجیب کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ چیکر کو سوالیہ نظروں سے دیکھتا رہا۔

"رات میں دروازہ لاک ہی رکھئے گا اور کھڑکی کا شٹر بھی گرا لیجئے گا۔"

مجیب گھبرا گیا "کیوں.... کوئی خطرہ ہے؟"

"آپ ریل میں جگہ جگہ لکھا دیکھیں گے کہ اجنبیوں سے گھلیں ملیں نہیں اور کسی کی دی ہوئی کوئی چیز نہ کھائیں۔ دراصل لٹیروں اور نو سربازوں کے گروہ ہیں جو ٹرینوں اور بسوں میں مسافروں کے ساتھ کارروائی کر دیتے ہیں۔ کوئی کھانے پینے کی چیز دی۔ مسافر بے ہوش اور اس کا سامان صاف۔ یہ لوگ تو مسافروں سے کھچا کھچ بھرے ڈبوں میں بھی ہاتھ دکھا دیتے ہیں۔ آپ تو کوپے میں اکیلے ہیں۔"

مجیب کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں "شکریہ۔ میں محتاط رہوں گا۔"

چیکر کے جاتے ہی مجیب نے کوپے کا دروازہ لاک کیا۔ اس کے لئے رات شروع ہو گئی تھی.... تنہائی کی رات.... خوفناک رات!

کتاب ایک طرف دھری رہ گئی۔ اس پر ہول سوار ہو گیا تھا۔ اس نے کھڑکی کا شیشے والا شٹر گرا دیا۔ باہر ٹرین کے ساتھ بھاگتی ہوئی روشنیاں خاصی حوصلہ افزا تھیں مگر کچھ دیر کے بعد وہاں گھپ اندھیرا رہ گیا۔ مجیب کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ اس نے دوسرا شٹر بھی گرا دیا۔ باہر کی دنیا سے رابطہ منقطع ہو گیا۔

لاہور کے ایورگرین ہوٹل میں گزاری ہوئی تنہا رات کی اذیت اسے اب بھی یاد تھی۔ وہ بھول ہی نہیں سکتا تھا لیکن ٹرین کی اس رات کے آگے وہ بھی ہیچ تھی۔ وہاں ہوٹل میں وہ کم از کم کمرے سے نکل کر لابی میں تو چلا گیا تھا۔ یہاں تو وہ کہیں جا ہی نہیں سکتا تھا۔ اس چھوٹی سی جگہ میں قید تھا وہ۔

ٹرین جھٹکوں اور آوازوں سے بھری ہوتی ہے پھر خوف شدید ہو تو واہمے کثیر ہوتے ہیں۔ ہر ایک منٹ کے بعد اسے لگتا کہ دروازے پر دستک ہوئی ہے.... کسی نے ہینڈل گھمایا ہے.... کوئی دروازے پر زور آزمائی کر رہا ہے۔ ہر ایک منٹ کے بعد وہ تھر

تھر کانپنے لگتا۔ تھرتھری تو جیسے وجود کا حصہ بن گئی تھی۔

اس رات کے عذاب کی کوئی حد نہیں تھی۔ اس نے ذہنی اور نفسیاتی طور پر اسے توڑ ڈالا.... کچل کر رکھ دیا۔ سفر شروع کرنے سے پہلے وہ سوچتا رہا تھا کہ لڑکی اگر ڈھنگ کی اور قابل قبول ہوئی تو ٹھیک ہے ورنہ وہ اسے واپس بھجوا دے گا۔ ایک ایسی لڑکی کو طویل عرصے تک دم چھلا تو نہیں بنایا جا سکتا جسے دیکھ کر کراہت آئے، جس سے آدمی بات بھی نہ کر سکے، جسے دیکھتے ہوئے بھی گھبرائے مگر اب وہ سوچ رہا تھا کہ اسے کمپنی کی ضرورت ہے۔ کیسی ہی سہی، وہ سراہٹ تو ہو گی۔

پوری رات وہ رات کٹنے کی دعا کرتا رہا اور وہ رات اس کے لئے ایک طویل عمر جیسی تھی۔ خوف کی اذیت نے اسے نچوڑ ڈالا۔ صبح کی روشنی بھی اسے خوشی نہ دے سکی۔ ہاں، جب دھوپ نظر آئی تو جیسے دنیا بدل گئی۔ رات کی نیند اچانک حملہ آور ہوئی اور اس کی آنکھیں مندنے لگیں مگر سوتے وقت بھی اسے خیال تھا کہ لاہور پہنچ کر اسے کوپے کا دروازہ کھولنا ہو گا۔ دروازہ کھولنے کی ہمت اسے اب بھی نہیں ہوئی مگر اس نے اپنے دماغ میں دروازے پر دستک کا الارم لگا دیا۔

آنے والی لڑکی کی اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی!



سب لوگ نو بجے اسٹیشن پہنچ گئے تھے۔ صفورہ بہت پریشان تھی۔ صابر بھائی کو روکنے کی کوئی ترکیب اسے نہیں سوجھی تھی۔ بس اب یہی ہو سکتا تھا کہ صابر بھائی مجیب سے مل کر واپس آئیں تو وہ اس کوپے کا رخ کرے۔ بہرکیف اس صورت حال نے اسے اعصاب زدہ کر دیا تھا۔ وہ ہر قیمت پر مجیب انور سے ملنا چاہتی تھی۔

خوش قسمتی سے جس پلیٹ فارم پر ان کی گاڑی لگنا تھی، اس کے دوسرے سرے پر تیز گام آنا تھی۔ ان کی گاڑی کو دس بجے لگنا تھا۔ اس لئے وہ ابھی پلیٹ فارم پر ہی تھے۔ بہت سارے لوگ تھے۔ اچھا خاصا قافلہ سا بن گیا تھا۔

نو بج کر پچیس منٹ پر ایک نسوانی آواز نے پبلک اناؤنسنگ سسٹم سے مطلع کیا کہ تیز گام لیٹ ہے اور امکان ہے کہ ساڑھے دس بجے لاہور پہنچے گی۔

صفورہ اور اعصاب زدہ ہو گئی۔ اسے یہ اندیشہ ستانے لگا کہ اگر تیز گام نہ آئی اور

ان کی گاڑی روانہ ہو گئی تو وہ مجیب سے نہیں مل سکے گی۔ اس نے صابر بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ پرسکون نظر آ رہے تھے۔ کون جانے' انہوں نے تیز گام لیٹ ہو جانے پر دل میں خدا کا شکر ادا کیا ہو۔ کیا پتہ' وہ ملنا ہی نہیں چاہ رہے ہوں۔

دس بج کر پانچ منٹ پر ان کی ٹرین پلیٹ فارم پر لگ گئی۔ صابر بھائی نے قلی تلاش کی۔ سامان چڑھوایا اور وہ لوگ پلیٹ فارم سے اپنی سیٹوں پر منتقل ہو گئے۔

ڈبے میں بہت ہجوم تھا۔ سب کا حال ان لوگوں کا سا ہی تھا۔ وہ جانے والے افراد تھے۔ آمنے سامنے کی دو سیٹیں ان کی تھیں اور انہیں رخصت کرنے کے آنے والے افراد دو بچوں کو ملا کر بارہ تھے۔ ہر جگہ تقریباً یہی صورت حال تھی۔ کے نتیجے میں ڈبا کھچا کھچ بھرا تھا۔ بلکہ خاصی افراتفری تھی۔

صفورہ بار بار کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتی رہی۔ دس بج کر پچیس منٹ چپکے سے' کسی کو بتائے بغیر ٹرین سے اتر آئی۔ اسے یقین تھا کہ اس ہجوم میں اس غیر موجودگی کا کسی کو احساس نہیں ہو گا اور کسی کو احساس ہوا بھی تو وہ اسے اہمیت دے گا اس لئے کہ اس کے ارادے کا کسی کو بھی پتہ نہیں۔۔۔ صابر بھائی کو بھی نہیں

جس وقت وہ پلیٹ فارم پر اتری' اسی وقت ایک اور اناؤنسمنٹ ختم ہوا تھا۔ اس قدر تھا کہ وہ اس کا ایک لفظ بھی نہ سن سکی۔ وہ اتر کر پلیٹ فارم کی اس چل دی' جہاں تیز گام کو آنا تھا اور وہ اپنے ڈبے کے سامنے سے بھی ہٹ گئی تا پر کسی کی نظر نہ پڑے۔

وقت اپنی مخصوص رفتار سے گزر رہا تھا مگر پلیٹ فارم پر لگے کلاک کی اسے بہت تیزی سے بھاگتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ساڑھے دس بجے۔۔۔ پھر پو مگر تیز گام اب بھی نظر نہیں آئی۔ اس کے اعصاب چٹخنے لگے۔ کیا ہو گا۔۔۔ کیا مل سکے گی۔ یہ تو طے ہے کہ اسے ہندوستان لے جانے والی گاڑی وقت پر ہی گی۔

وہ پلیٹ فارم کے کلاک پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔ گیارہ بجنے میں دو رہ گئے تھے اور بڑی سوئی بہت تیزی سے گیارہ کے ہندسے کی طرف لپک رہی اس کے دل و دماغ سن ہو کر رہ گئے تھے۔ اب کیا ہو گا؟ کیا میں اس سے

سکوں گی؟

بڑی سوئی گیارہ پر پہنچ گئی۔۔۔ اور پھر ایک قدم آگے بھی بڑھ گئی۔ مایوسی نے اس کے وجود کو شل کر کے رکھ دیا۔ سچ ہے' مقدر سے کون لڑ سکتا ہے۔ اس نے سوچا۔ اب تو مہلت بالکل ہی ختم ہو رہی ہے۔ اپنی گاڑی کی طرف چلنا ہے بس۔

اس نے واپسی کے لئے قدم اٹھائے ہی تھے کہ ٹرین کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ اس کے قدم ٹھٹک گئے۔ وہ پلٹی اور اس نے پلیٹ فارم کے کنارے پر کھڑے ہو کر دوسری طرف جھانکا۔ ٹرین آ رہی تھی۔ اسی لمحے پلیٹ فارم پر ہلچل مچ گئی۔ قلی دوڑنے لگے۔ مہمانوں کو ریسیو کرنے کے لئے آنے والے بھی چوکنے ہو گئے۔

اگلے ہی لمحے انجن صفورہ کے سامنے سے گزرا۔ رفتار کم ہو گئی تھی اور بتدریج کم ہو رہی تھی۔ بوگی پر لگی تختی پر تیز گام پڑھنے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس نے پلٹ کر اپنی ٹرین کو دیکھا مگر اب پلیٹ فارم پر اتنا رش ہو چکا تھا کہ کوئی کسی کو دیکھ اور پہچان نہیں سکتا تھا۔

صفورہ نے پلیٹ فارم کے کلاک کو دیکھا۔ گیارہ بجنے میں تین منٹ تھے۔ سوچنے کے لئے مہلت بالکل نہیں تھی۔ اسے اسی ایک پل میں فیصلہ کرنا تھا۔ بہت بڑا اور اہم فیصلہ! اور وہ کسی اعتبار سے بھی آسان فیصلہ نہیں تھا۔

وہ پلٹی اور اس نے اپنی ٹرین کی طرف قدم بڑھائے' اس کے ذہن میں ایک ہی خیال تھا۔۔۔ مقدر سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔۔۔

○

خبردار دوسرا حصہ لینے کی ضرورت نہیں

Boring Novel

اس کے بعد "مٹی کی امانت" کے دوسرے حصے کا مطالعہ کریں۔

جملہ حقوق حق ناشر محفوظ ہیں

جنوری 2000ء

ناشر محمد علی قریشی نے نیرّ اسد پریس سے چھپوا کر
مکتبہ القریش لاہور سے شائع کی !

قیمت 160 روپے

زندگی میں پیچیدگیاں اور تنوع صرف خواہشات کی بدولت ہیں۔ خواہشات لا محدود ہیں اور متنوع بھی۔ یہ نہ ہوتیں تو زندگی ہموار' بے رنگ' پھیکی اور غیر دلچسپ ہوتی۔ کیونکہ انسان کی ضروریات تو بہرحال جلد یا بدیر پوری ہو ہی جاتی ہیں مگر ناآسودہ خواہشیں آدمی کو مضطرب رکھتی ہیں' کچھ کرنے پر اکساتی رہتی ہیں۔ زندگی میں' انسان کے عمل میں غیر معمولی پن انہی کے دم سے ہے۔

خواہش جتنی شدید ہو' اتنی ہی طاقت ور ہوتی ہے اور جتنی طاقت ور ہو' اتنا ہی آدمی کو نڈر اور بے خوف کر دیتی ہے۔ خواہش کی شدت اور شدت کے نتیجے میں طاقت کا یہ حال ہوتا ہے کہ یہ آدمی کے دل و دماغ پر قابض ہو جاتی ہے۔ اس کی قوت' عمل کو تسخیر کرلیتی ہے۔ یہ قوت' عمل کو جدھر چاہے' موڑ دے۔

پھر خواہش بہت حیلہ ساز ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا اور خود فریبی کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ یہ اپنی مطلب براری کے لئے آدمی کو کسی بھی فریب میں مبتلا کر سکتی ہے۔ یوں کہ دل و دماغ' عقل و شعور' سب مبتلائے فریب ہو جائیں۔

صفورہ سفیان بھی اس وقت ایک نہایت طاقت ور خواہش کے زیر اثر تھی اور اس کے پاس سوچنے سمجھنے کی مہلت بالکل نہیں تھی۔ اسکی ٹرین کی روانگی میں صرف تین منٹ تھے۔ آزادی فکر و عمل کے آخری لمحے میں ذہن نے جو فیصلہ سنایا' قدموں نے اس پر عمل کیا مگر وہ اپنی ٹرین کی طرف صرف دو قدم بڑھ سکی پھر خواہش کے سحر نے اسے اسیر کرلیا اور وہ کوئی معمولی خواہش نہیں تھی' اس کی زندگی کی سب سی بڑی خواہش تھی۔ وہ مجیب سے ملے بغیر کیسے جا سکتی ہے۔ ذہن میں یہ خیال ابھرا اور وہ بھی اب جبکہ مجیب کی ٹرین اسکے سامنے ہے۔

لیکن اپنی ٹرین کی روانگی میں صرف تین منٹ ہیں۔ عقل نے احتجاج کیا۔

تین منٹ بہت ہوتے ہیں۔ بس مجیب سے ملنا ہے اور ایک آدھ بات کرنی ہے۔

دل نے عقل کو رد کیا۔

ڈبہ تلاش کرنا' پھر اس کے کوپے میں پہنچنا' یہ تین منٹ میں ممکن نہیں۔ اپنی ٹرین چلی گئی تو.....

تو کیا ہوا وہ چچا کے گھر چلی جائے گی۔ بہانہ تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ یہ خیال بے حد تقویت بخش تھا۔ اس کے آگے ساری محتاطی دھری رہ گئی تھی۔ ٹھکانا تو تھا اس کے پاس۔

اسی لمحے ٹرین رکی اور سامنے ہی چند قدم کے فاصلے پر ڈبا تھا جس پر سلیپر لکھا تھا۔ اسے دیکھ کر ہوش و خرد بالکل ہی ساتھ چھوڑ گئے۔ سلیپر پر چاک سے (1) بھی لکھا تھا۔ منزل بالکل سامنے تھی۔ اب کوئی ڈر' کوئی خوف اسے نہیں روک سکتا تھا۔

اس کے جسم میں جیسے بجلی بھر گئی تھی۔ وہ تیزی سے پلٹی اور سلیپر کی طرف چل دی۔ اس کے جسم میں سنسنی دوڑ گئی تھی۔

سلیپر کے دروازے سے کچھ لوگ چڑھ رہے تھے اور کچھ اتر رہے تھے۔ موقع ملتے ہی وہ ڈبے میں چڑھ گئی۔ سامنے ایک طویل راہداری تھی۔ دروازوں پر پینٹ سے انگریزی کے حروف تہجی لکھے تھے۔ C والے دروازے پر پہنچ کر وہ رک گئی۔ اب وہ جھجک رہی تھی۔ کیا پتہ' یہ اس کا کوپے نہ ہو لیکن باہر سلیپر پر (1) لکھا تھا اور یہاں کوپے کے دروازے پر C۔ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ اس کا آخری امکان تھا' اگر یہ مجیب کا کوپے نہ ہوا تو پتہ نہیں کیا ہوگا۔

ایک لمحہ ٹھٹکنے کے بعد اس نے دروازے پر دستک دی۔ کوئی رد عمل سامنے نہ آیا تو اس نے دوسری..... اور پھر تیسری دستک دی پھر وہ گھبرا کر دروازہ پیٹنے لگی۔ وقت بہت کم تھا۔ لمحوں کی ڈور ہاتھوں سے پھسلی جا رہی تھی۔ وہ دل میں دروازہ کھلنے کی دعا کرتی رہی۔



مجیب انور خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ بند کوپے میں تھا اور ڈر رہا تھا۔ وہ خوف زدہ تھا۔ اچانک دروازے پر بہت ہلکی سی دستک ہوئی۔ وہ لرز کر رہ گیا۔ اتنی رات کو کون ہو سکتا ہے۔ کچھ سوچ کر اس نے دستک کو نظر انداز کرنے کا فیصلہ کیا۔ جو بھی ہو گا' اکتا

کر چلا جائے گا۔ دستک دوبارہ..... اور تیسری بار ہوئی۔ اس نے اب بھی نظر انداز کر دیا۔ باہر جو بھی تھا' اب اس نے دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

یہ احساس بالکل ہی اچانک ہوا کہ دروازہ خواب میں نہیں پیٹا جا رہا ہے۔ بلکہ ایسا سچ مچ ہو رہا ہے۔ وہ گھبرا کر جاگا تو اس کا جسم پسینے میں تر تھا اور دروازہ مسلسل پیٹا جا رہا تھا۔ وہ بے ساختہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

اس وقت بھی اس کی ذہنی کیفیت وہی تھی' جس میں وہ سویا تھا۔ وہ خوف زدہ تھا۔ شٹر گرے ہونے کی وجہ سے اسے وقت کا بھی احساس نہیں ہوا۔ دروازے پر پہنچ کر وہ ٹھٹکا "کون ہے؟" اس نے پوچھا۔

"دروازہ کھولیئے۔" ایک نسوانی آواز نے کہا۔ لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

مجیب کی سمجھ میں پہلے تو کچھ نہیں آیا پھر جیسے اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا "کیا لاہور آ گیا ہے؟"

"جی ہاں۔ جلدی کریں۔ دروازہ کھولیں پلیز۔"

خوب صورت آواز' دل نشیں لہجہ۔ مجیب کو حیرت ہوئی۔ اس نے بولٹ گرایا اور دروازہ کھول دیا۔

دروازے پر کھڑی لڑکی دیکھ کر وہ حیران رہ گیا پھر بھی اس سے یہ بات چھپی نہیں رہ سکی کہ لڑکی اسے دیکھ کر اس سے زیادہ حیران ہوئی ہے۔



شاید وہ پوری ٹرین ہی جذبات کے بوجھ سے لرز رہی ہو گی۔ ہر طرف ایک ہی منظر تھا۔ گلے ملتے ہوئے لوگ' چھلکتی ہوئی آنکھیں' دبی دبی سسکیاں اور ٹوٹتی ہوئی آوازیں۔ کچھ اس وجہ سے بھی جذبات بے حد شدید تھے کہ جانے والے ایک اور ہی دیس جا رہے تھے اور کچھ پتہ نہیں تھا کہ ان میں سے کتنوں کو دوبارہ یہاں آنے اور ملنے کا موقع ملے گا اور کتنوں کو موت اس خوشی سے محروم کر دے گی اور دوبارہ آئیں گے' انہیں یہاں الوداع کرنے والے مل بھی سکیں گے یا نہیں۔ موت سے کس کو رستگاری ہے۔

صابر ڈبے میں کھڑا یہی سب کچھ دیکھ اور سوچ رہا تھا۔ اس کا دل بوجھل اور

آنکھیں نم تھیں۔ متلاشی نظریں ادھر ادھر بھٹک کر واپس آ رہی تھیں۔ صفورہ اسے کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ گزشتہ رات سے ہی صفورہ اسے بدلی بدلی نظر آئی تھی۔ مایوس، افسردہ اور اداس۔ وہ اس کی وجہ جانتا تھا۔ وہ مجیب انور سے مل جو نہیں سکی تھی اور شاید ایسا موقع پھر کبھی نہیں ملے گا مگر اس وقت صابر وہ وجہ بھی بھول چکا تھا۔ مجیب انور کا اسے خیال ہی نہیں تھا۔ وہ تو یہ سوچ کر کڑھ رہا تھا کہ شاید صفورہ اس سے ناراض ہو گئی ہے۔ تبھی تو اس نے منہ چھپا لیا ہے۔

مگر وہ گئی کہاں؟ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ پچھلی بار اس نے رخصت ہوتے وقت یہی کیا تھا۔ جا کر ٹرین کے باتھ روم میں بند ہو گئی تھی۔

اس نے دیکھا، امی چچی کے گلے لگ کر رو رہی تھیں اور ابا میاں چچا جان سے لپٹے کھڑے تھے۔ زبان چپ تھی۔ آنسو بول رہے تھے۔ ان کیفیتوں سے نکلنے کے لئے صدیاں بھی کم پڑ جائیں۔ اس لئے اس نے خود کو ہوش میں رکھا تھا۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ گھڑی احتیاطاً اس نے پلیٹ فارم کے کلاک سے ملالی تھی۔ گھڑی بتا رہی تھی کہ گاڑی کی روانگی میں اب صرف دو منٹ رہ گئے ہیں۔

اس نے نرمی سے ابا میاں کے کندھے کو چھوا "ابا میاں، اب صرف دو منٹ رہ گئے ہیں۔ اتر جائیے۔"

ابا میاں ہٹ آئے اور وہ چچا جان سے لپٹ گیا۔ چچی نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

ایک منٹ بعد پردیسیوں کو رخصت کرنے کے لئے آنے والے بیشتر لوگ پلیٹ فارم پر جمع تھے۔ سب سے نمایاں جگہوں پر کھڑے ہونے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ جانے والوں کو دیکھ سکیں اور دور تک ہاتھ لہراتے رہیں۔ پورا پلیٹ فارم سسکیوں سے گونج رہا تھا۔

صابر نے گارڈ کو دیکھا، جو اپنے ڈبے کے دروازے میں کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہری جھنڈی تھی، ہونٹوں میں وسل دبی تھی اور نظریں پلیٹ فارم کے کلاک پر جمی تھیں۔

وقت کبھی رکتا نہیں۔ خواہ کسی پر کچھ بھی گزر جائے!



وقت جیسے ٹھہر گیا تھا۔ اس کی گردش جیسے تھم گئی تھی!

صفورہ کو لگا تھا، جیسے وہ گھنٹوں دروازہ پیٹتی رہی ہو مگر ذرا سی پوچھ گچھ کے بعد بالآخر دروازہ کھول دیا گیا اور اب وہ اس کے سامنے تھا، جس کی دید کی وہ کب سے منتظر تھی۔ جسے اس نے خوابوں میں جیتے اور جاگتے تصور میں بارہا دیکھا تھا۔

وہ حیران رہ گئی۔ وہ پہلے بھی اسے دیکھ چکی تھی اور وہ اسے بہت اچھا لگا تھا۔ وہ وہی شخص تھا، جسے اس نے پاکستان آتے ہی ایک بوڑھی عورت کو بچاتے دیکھا تھا۔

"جی فرمائیے۔" اس نے صفورہ کو چونکا دیا۔ بھاری آواز.... مہربان لہجہ! "آپ کا نام مجیب انور ہے نا؟" اس نے رسماً پوچھا۔ ورنہ گواہی تو دل دے ہی چکا تھا۔

"جی ہاں اور آپ؟"

وہ گڑبڑا گئی "جی... وہ....میں...."

مجیب نے اس کی مشکل آسان کر دی "آپ کو سلیم نے بھیجا ہے۔ ہوٹل ایور گرین کے ویٹر سلیم نے؟"

"جج....جی ہاں....بالکل۔"

"خدا کا شکر ہے کہ آپ آ گئیں۔ میں ڈر رہا تھا کہ کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔"

صفورہ الجھنے لگی۔ اب اسے کیسے بتائے کہ گڑبڑ تو ہو چکی ہے۔ "میں دراصل یہ کہنے آئی ہوں...."

"کہنے آئی ہیں۔" مجیب نے گھبرا کر دہرایا "اس بات کا کیا مطلب ہے۔ آپ نہیں جانتیں کہ میں نے رات کس عذاب میں گزاری ہے۔" اس نے تند لہجے میں کہا پھر صفورہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے کوپے میں کھینچا اور دروازہ بند کر کے بولٹ چڑھا دیا "آپ پلیز بیٹھیں اور میری بات سنیں...."

رات کے عذاب کے حوالے سے صفورہ نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ ابھی سو کر اٹھا تھا اور متورم آنکھوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی نیند ابھی پوری نہیں ہوئی ہے اور رات کے عذاب بھی صاف اس کے چہرے پر لکھے نظر آ رہے تھے۔ اس کا دل پگھلنے لگا مگر فوراً ہی وہ خوف سے شل ہو گئی۔ اس کے پاس تو بمشکل ایک دید، ایک

جلنے کی مہلت تھی مگر یہ کیا ہو رہا ہے "پلیز' آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں آپ کے لئے سلیم کا جواب لائی ہوں۔۔۔"

"مجھے۔۔۔ جواب کی نہیں' آپ کی ضرورت ہے۔" مجیب نے اس کی بات کاٹ دی۔

"مگر مجھے واپس جانا ہے۔" صفورہ اب خوف سے لرز رہی تھی۔

"میں آپ کو واپس نہیں جانے دوں گا۔ یہ ممکن ہی نہیں۔ آپ بیٹھیں تو۔ میں آپ کو سب کچھ بتاؤں گیا۔ بس آپ وعدہ کریں کہ ایک لمحے کے لئے بھی مجھے اکیلا نہیں چھوڑیں گی۔ ورنہ یقین کریں' مجھے کچھ ہو جائے گا۔ میں پاگل ہو جاؤں گا یا مر جاؤں گا۔"

"خدا نہ کرے۔" صفورہ نے زیر لب کہا۔ اب بیٹھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ کوئی عام مرد ہوتا تو وہ یہاں ہوتی ہی نہیں اور وہ کوئی عام مرد ہوتا تو وہ شور مچانے کی دھمکی دے کر یا سچ مچ شور مچا کر یہاں سے نکل لیتی مگر وہ مجیب انور تھا' جس کے قرب کی وہ آرزو مند تھی اور وہ اس کے قرب کے لئے گھگیا رہا تھا۔

وہ سیٹ پر بیٹھ گئی "اچھا' مجھے کھڑکی تو کھولنے دیں۔" اس نے بیٹھتے ہی کھڑکی کا جالی والا شٹر اوپر کر دیا۔ سامنے ہی وہ ٹرین کھڑی تھی' جس میں اسے جانا تھا۔

مجیب قدرے پرسکون ہوا اور پہلی بار اس نے لڑکی کو غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ میک اپ سے پاک اور بہت حسین تھا۔ سب سے بڑی خوبی اس کی پاکیزگی تھی۔ صاف شفاف' معصوم شربتی آنکھوں میں گہرائی تھی۔ لباس سے وہ ایک عام لڑکی لگ رہی تھی۔ یہ وہ لڑکی ہے' جس کے ساتھ کہیں بھی دیکھے جانے پر مجھے کبھی شرمندگی نہیں ہو گی۔ اس نے سوچا۔

صفورہ کو شٹر اٹھائے ایک لمحہ ہی ہوا ہو گا کہ سامنے والی ٹرین میں حرکت پیدا ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بوگی سامنے سے گزر گئی۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ یہ کیا ہوا.... یہ کیا ہو رہا ہے اس کے ساتھ؟ اسے احساس تھا کہ ہندوستان جانے والی ٹرین کا ہر گزرتا ہوا ڈبہ ساکت قدموں کے باوجود اسے ماں باپ کی لاڈلی بیٹی' گھریلو لڑکی صفورہ سے ایک کال گرل بنانے کی طرف لے جا رہا ہے مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بے بسی

سے دیکھتی رہی اور جب گاڑی گزر گئی اور نگاہوں کے سامنے خالی پلیٹ فارم رہ گیا تو اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

مجیب نے اس کے آنسو دیکھے تو گھبرا گیا "ارے.... آپ رو رہی ہیں۔ پلیز.... پلیز...." پھر اس کی سمجھ میں بات آ گئی "اوہ.... اس جانے والی ٹرین میں کوئی تھا' جسے آپ رخصت کرنا چاہتی تھیں۔ میں کتنا احمق اور خود غرض ہوں کہ آپ کی بات سنی ہی نہیں۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں بہت شرمندہ ہوں لیکن میری شرمندگی سے بھی کچھ نہیں ہو سکتا۔"

صفورہ نے کچھ نہیں کہا۔ وہ بس روتی ہی رہی۔

"پلیز.... آپ نہ روئیں۔ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہو گا۔ پلیز۔" مجیب نے التجا کی۔

صفورہ نے ایک دم رونا موقوف کر دیا۔ اب تو کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔ رونے سے کیا حاصل۔ اب جو دو چار منٹ کا قرب نصیب میں ہے' اسے تو ڈھنگ سے گزار لیا جائے۔ اسے یقین تھا کہ اس کی ٹرین جانے کے بعد صابر بھائی یہاں آئیں گے۔ وہ اسے دیکھ کر حیران ہوں گے اور وہ ان کے سامنے شرمندہ ہو گی مگر کوئی بات نہیں۔ شرمندگی تو اب اس کا مقدر بن گئی ہے۔

یہی بہت ہے کہ وہ صرف صابر بھائی کے سامنے شرمندہ ہو گی۔ وہ اسے بڑی شرمندگی سے بچا لیں گے۔ یہاں سے لے جائیں گی اور اس کی طرف سے کوئی بہانہ بھی گھڑ لیں گے۔

"تو آپ کو میری ضرورت ہے؟" اس نے مجیب سے اچانک پوچھا۔

"جی ہاں۔ آپ کے بغیر میرا گزارہ نہیں ہو گا۔"

"ذرا تفصیل سے بتائیں۔"

مجیب نے اسے اپنے خوف کے متعلق اور گزری ہوئی رات کے متعلق سب کچھ بتا دیا۔ صفورہ اس کی باتیں بہت غور سے سن رہی تھی۔ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا۔

ٹرین دور جاتے جاتے ایک چھوٹا سا نقطہ بنی..... اور پھر وہ نقطہ بھی تحلیل ہو گیا۔

مگر پلیٹ فارم پر ہاتھ اب بھی لہرا رہے تھے۔ ہاتھ ہلانے والے جیسے کسی جادو کے زیر اثر تھے۔ صابر' ابا میاں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ نیم جاں سے ہو گئے تھے۔ ان کی نظریں اسی خلا میں کھوئی ہوئی تھیں' جہاں ٹرین گم ہوئی تھی۔

"چلیں ابا میاں؟" اس نے باپ کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"ہاں..... چلو۔ میرا دم گھٹ رہا ہے بیٹے۔ سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہے۔"

یہ سن کر امی بھی گھبرا گئیں "کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟"

"بس مجھے گھر لے چلو۔" ابا میاں نے اکھڑی اکھڑی آواز میں کہا۔

صابر بھی گھبرا گیا "میں باہر جا کر ٹیکسی کرتا ہوں۔" اس نے ناظمہ سے کہا "تم امی کے ساتھ ابا میاں کو لے کر آؤ۔ تیز نہ چلنا۔"

مگر اسٹیشن سے باہر نکل کر صابر کو خیال آیا کہ ابا نے سانس میں تکلیف کی شکایت کی تھی۔ اس لحاظ سے تانگا ٹیکسی سے بہتر ہے۔ دشواری یہ تھی کہ تانگا اسٹینڈ پر ہی ملتا۔ وہ گیٹ کی طرف بڑھا۔ ذرا دور جا کر اسے گھر والے مل گئے "اب کیسی طبیعت ہے ابا میاں؟" اس نے پوچھا۔

"بس' سانس لینے میں مشکل ہو رہی ہے۔"

صابر نے باپ کا ہاتھ تھام لیا "اسی خیال سے میں نے ٹیکسی نہیں کی۔ تانگا بہتر رہے گا نا ابا میاں؟"

"ہاں بیٹے۔"

وہ باپ کا ہاتھ تھام کر آہستہ آہستہ تانگا اسٹینڈ کی طرف چلتا رہا۔

گھر پہنچنے کے بعد امی نے ابا میاں کو شہد اور عرق گلاب ملا کر دیا تو ان کی طبیعت ذرا سنبھلی۔ اس دوران میں صابر اپنے ہاتھ میں ان کا ہاتھ لے کر اسے ملتا رہا۔ ابا میاں کی طبیعت ذرا سنبھلی تو وہ اٹھا۔

گھر سونا لگ رہا تھا۔ جانے والے اپنے ساتھ ساری رونق لے گئے تھے۔ وہ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔ اسے رہ رہ کر مفورہ کا خیال آ رہا تھا۔ وہ اسے رخصت بھی نہیں کر سکا۔ وہ خفا تھی اس سے۔ سرحد درمیان میں ہو تو فاصلے کتنے بڑھ جاتے ہیں

اور روٹھے ہوؤں کو منانا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ وہ وقت تھا کہ اچانک اسے مجیب انور کا خیال آیا..... یاد آیا کہ اسے مجیب انور سے ملنا تھا۔ اسٹیشن پر وہ اتنا الجھا ہوا تھا کہ یہ بات یاد ہی نہیں رہی۔ یہ سارا فساد تیز گام کے لیٹ ہونے کا تھا۔

وہ تیزی سے فون کی طرف جھپٹا اور ریسیور اٹھا کر ریلوے انکوائری کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے بتایا گیا کہ لاہور رکنے والی تیز گام ابھی ابھی راولپنڈی کے لئے روانہ ہوئی ہے۔

صابر نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ اب کیا ہو سکتا ہے اور کوئی خاص بات بھی نہیں۔ مجیب انور میں اسے دلچسپی تھی ضرور..... مگر اصل سبب تو مفورہ تھی اور مفورہ اب ہندوستان واپس جا چکی ہے۔

چند منٹ میں اس کے ذہن سے مجیب انور کا خیال بھی محو ہو گیا۔ اب وہ زندگی کے ان معمولات کے بارے میں سوچ رہا تھا' جو گزشتہ دو دن سے منقطع تھے اور جنہیں اب جاری ہونا تھا۔



"...بس یہ میری کمزوری ہے۔" اپنے کوپے میں مجیب انور کہہ رہا تھا "میں رات کو اکیلے سو ہی نہیں سکتا۔ اندر چھپا ہوا خوف طرح طرح کے واہموں کا روپ دھارتا ہے اور وہ واہمے رات کے ہر لمحے میں مجھے جیتے جی مارتے رہتے ہیں۔"

مفورہ سحر زدہ سے اس کی گفتگو سن رہی تھی۔ یہ اس کی زندگی کے سب سے قیمتی لمحات تھے اور وہ انہیں یادداشت میں محفوظ کر رہی تھی۔ مجیب انور جیسا اس کے تصور میں تھا' حقیقت میں اس سے بھی اچھا ثابت ہوا تھا۔ صاف گو' راست گو' دل نشیں اور پاکیزہ گفتگو "عجیب بات ہے۔" اس نے تبصرہ کیا "آپ نے اس خوف سے لڑنے کی کوشش....."

"بہت کی مگر ہار گیا۔"

"صرف ایمان اور محبت وہ طاقتیں ہیں' جو ہر خوف کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک سکتی ہیں۔ کسی کی بہت بچی اور طاقت ور محبت مل جائے تو یہ معجزہ ہو سکتا

ہے۔"

اس جملے پر مجیب نے چونک کر اسے دیکھا۔ مختلف تو وہ شروع ہی سے لگی تھی لیکن وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی کال گرل اتنی بڑی بات سوچ بھی سکتی ہے۔ کجا یہ کہ اسے لفظوں میں ادا کرنا۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اچانک ٹرین چل پڑی۔ "لو.... سفر شروع ہو گیا۔" وہ بولا۔

ادھر ٹرین کے چلتے ہی صفورہ کے لبوں سے بے ساختہ نکلا "یہ کیا۔" اور اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ صابر بھائی کیوں نہیں آئے۔ وہ سوچ رہی تھی۔ اب کیا ہو گا؟ یہ میں وقت کے کس پھیر میں پڑ گئی۔

اس کے چہرے کی بدلتی ہوئی کیفیت مجیب سے بھی چھپی نہ رہ سکی "کیا ہوا؟ تمہیں کیا ہوا؟"

"مجھے یہاں اترنا تھا۔" صفورہ نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

"میری مجبوری سننے کے بعد بھی؟ تم زندگی میں پہلی ہستی ہو جس کے سامنے میں نے خود کو کھول دیا۔ تم اب بھی نہیں سمجھ رہی ہو کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔"

اتنی خراب صورت حال میں بھی اس آخری جملے نے اس کے دل کے تار چھیڑ دیئے۔ مجیب کو اس کی ضرورت ہے۔ اس کے اندر رقص کی سی کیفیت امڈ آئی۔ خوشیوں کی رم جھم شروع ہو گئی۔ یہ تو اس کا خواب تھا۔ تعبیر کیسے مل گئی اسے "میں آپ کی ضرورت ہوں۔ تو آپ میرے لئے کیا کر سکتے ہیں؟" اس نے خواب ناک لہجے میں پوچھا۔

مجیب نے اس کے جملے کا اور ہی مطلب لیا۔ لڑکی کو اس کی کمزوری معلوم ہو گئی ہے۔ لہٰذا اب وہ اسے بلیک میل کرنا۔۔۔ بھاؤ بڑھوانا چاہتی ہے۔ آخر نکلی نا وہی "میں دولت مند نہیں۔ جو حیثیت تھی' وہ پہلے ہی بتا چکا۔ ہاں' مگر پیسے کے علاوہ میں تمہیں بہت کچھ دے سکتا ہوں۔ میں تمہیں عزت اور احترام دوں گا۔ میں تمہیں کھلونے کی طرح کبھی استعمال نہیں کروں گا۔" اس نے خشک لہجے میں کہا "جہاں تک پیسے کا تعلق ہے' میں آٹھ ہزار روپے ماہانہ سے زیادہ نہیں دے سکتا۔ اب تم چاہو تو مجھے چھوڑ کر جا سکتی ہو۔ میں زبردستی کا قائل نہیں۔"

صفورہ کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کی بات کس انداز میں سنی گئی ہے۔ شکایت کا سوال ہی نہیں تھا۔ کال گرل کی ایسی بات کا یہی مطلب لیا جا سکتا ہے "آپ غلط سمجھے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "میں یہی کچھ جاننا چاہتی تھی.... عزت' احترام.... انوکھی بات ہے۔ مجھے اچھی لگی۔ اچھا یہ بتائیں۔ اگلا اسٹیشن کون سا ہے اور کب آئے گا؟"

"گوجرانوالہ.... دو گھنٹے بعد۔"

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ مجیب نے جا کر دروازہ کھولا۔ سامنے ٹکٹ چیکر تھا "ٹکٹ چیک کرا دیجئے پلیز۔" اس نے کہا پھر اس کی نظر صفورہ پر پڑی "اوہ.... آپ کی مسز آ گئیں؟"

"جی ہاں۔ انہیں لاہور سے سوار ہونا تھا۔" مجیب نے جلدی سے کہا "یہ یہاں ایک رشتے دار کے ہاں آئی ہوئی تھیں۔"

"مگر بیگم صاحبہ کا سامان نظر نہیں آ رہا ہے۔"

"وہ تو میں کراچی سے اپنے ساتھ لایا ہوں۔"

ٹکٹ چیکر صفورہ سے مخاطب ہو گیا "اپنے صاحب کا بہت خیال رکھئے گا مسز مجیب انور۔ ان سے میں نے محتاط رہنے کو کہا تو یہ خوف زدہ ہو گئے تھے۔"

اپنے لئے مسز مجیب انور سنتے ہی صفورہ کے کانوں میں گھنٹیاں بجنے لگی تھیں "میں جانتی ہوں۔" اس نے کہا "ان کا بہت خیال رکھنا پڑتا ہے۔"

جس دوران میں ٹکٹ چیکر ٹکٹوں کے ساتھ رسمی کارروائی کرتا رہا' صفورہ سوچتی رہی۔ وہ ایک ایسی صورت حال سے دوچار تھی' جس میں اس کی زندگی تباہ ہو سکتی تھی۔ بلکہ تقریباً ہو گئی تھی۔ اب اسے سوچنا تھا کہ اس کے سامنے کتنے راستے ہیں.... اور کون سا بہتر رہے گا لیکن سوچنے کے لئے بہت یکسوئی اور ارتکاز درکار تھا۔ وہ کہاں سے آئے۔

پھر اسے کچھ سوجھ ہی گیا۔ یوں کم از کم وہ سکون سے سوچ سکتی تھی۔

مجیب دروازہ بند کر کے واپس آیا تو اس نے اس سے کہا۔ "سنئے' میں ذرا دیر اوپر لیٹ کر سو جاؤں تو آپ مائنڈ تو نہیں کریں گے؟"

"بالکل نہیں۔" مجیب نے کہا "تکیہ اور چادر دوں؟"

"اگر زحمت نہ ہو تو۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔"

دو منٹ بعد وہ اوپر برتھ پر چادر سر تک اوڑھے لیٹی تھی۔



ٹرین کچھ دور نکل آئی تو لوگ کچھ نارمل ہو گئے۔ وہ کھڑکیوں سے ہٹ آئے اور اپنی اپنی سیٹوں کی طرف چل دیئے۔ کچھ غیر جذباتی لوگ پہلے ہی اپنی سیٹوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔

وہ سب بھی اپنی سیٹوں پر آ گئے۔ اب کہیں انہیں ایک دوسرے کا خیال آیا تھا۔ سفیان صاحب فرقان صاحب کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئے۔ خواتین ایک سیٹ پر اکٹھی ہو کر ادھر ادھر کی گفتگو کرنے لگیں۔ موضوع پاکستان اور وہاں ان کا قیام ہی تھا۔

اچانک فرقان صاحب کی بڑی بیٹی مینہ کو خیال آ گیا۔ "ارے..... صفورہ آپا نظر نہیں آ رہی ہیں۔" اس نے کہا۔

اس پر سب نے ادھر ادھر دیکھا۔ ناظورہ بیگم کی نظر اوپر برتھ پر پڑ گئی۔ انہوں نے صفورہ کو اس کی چادر سے پہچانا۔ مینہ نے بھی ان کی نظروں کے تعاقب میں برتھ کی طرف دیکھا "ارے یہ تو چادر میں منہ لپیٹ کر لیٹ بھی گئیں۔"

مینہ نے کئی بار صفورہ کو پکارا مگر وہ ٹس سے مس بھی نہیں ہوئی "سو رہی ہیں شاید۔" اس نے تبصرہ کیا۔

"صفورہ پچھلی بار بھی ایسے ہی دکھی ہو گئی تھی۔" ناظورہ بیگم نے کہا "بلکہ پچھلی بار تو باتھ روم میں جا گھسی تھی۔"

"ٹھیک ہو جائے گی۔" مینہ کی امی نے کہا۔

گفتگو کا سلسلہ پھر سے جاری ہو گیا۔ ٹرین بارڈر کی طرف بڑھتی رہی۔



صفورہ کی سوچیں بھی اس کے ذہن کی طرح منتشر اور پریشان تھیں۔ اسے پوری طرح احساس تھا کہ اس سے بہت بڑی حماقت سرزد ہوئی ہے اور اس کے نتیجے میں وہ

بے حد خوفناک صورت حال سے دوچار ہے۔ خیر' اس کی حماقت کی تلافی بھی ہو سکتی تھی۔ اسے پورا یقین تھا کہ صابر بھائی' مجیب سے ملنے آئیں گے اور وہ ان کے ساتھ چلی جائے گی لیکن صابر بھائی آئے ہی نہیں۔

بہرکیف جو ہوا سو ہوا۔ اب اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا تھا۔ سوچنا یہ تھا کہ کیا کچھ ہو چکا ہے۔ اس کا غائب ہو جانا کھل چکا ہے یا نہیں؟ ابا اور اماں جا چکے ہیں یا نہیں؟ اچانک ایک خیال نے اسے لرزہ بر اندام کر دیا۔ کہیں صابر بھائی کے یہاں مجیب کے پاس نہ آنے کا سبب اس کی گمشدگی تو نہیں؟ یہ خیال حقیقت سے خاصا قریب تھا۔ یہ بات نہ ہوتی تو صابر بھائی یہاں ضرور آتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عین وقت پر ابا اور اماں کو اس کی غیر موجودگی کا اندازہ ہو گیا ہو گا۔ ہنگامی صورت حال پیدا ہو گئی ہو گی۔ اسے تلاش کیا جا رہا ہو گا۔ کیا پتہ' پولیس میں بھی گمشدگی کی رپورٹ..... لیکن اس نے فوراً ہی اس خیال کو مسترد کر دیا۔ ابا ہمیشہ عزت سے بہت ڈرتے تھے۔ وہ کبھی ایسا نہیں ہونے دیں گے۔

دوسری طرف یہ بھی ناممکن نہیں تھا کہ اس کی غیر موجودگی کا کسی کو پتہ ہی نہ چلا ہو۔ اور کسی نے اس کی کمی محسوس بھی کی ہو تو اسے سنگین نہ سمجھا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جانے والے چلے گئے ہوں اور انہیں آگے جا کر پتہ چلے.....

اس معاملے میں اتنی گنجائشیں تھیں کہ وہ سوچتی تو دن گزر جاتا اور سوچیں ختم نہ ہوتیں۔ وہ تو امکانات کے سراب کا صحرا تھا.....لامتناہی۔ سب سے بڑی حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنوں سے بچھڑ گئی تھی..... صرف دل کے ہٹیلے پن کی وجہ سے اور صورت حال بہت خراب تھی۔

اب کیا کیا جائے؟ وہ واپس جا سکتی ہے؟ واپسی کی یہی ایک امکانی صورت تھی کہ وہ مجیب کو سب کچھ بتا دے اور اس سے مدد طلب کرے۔ کیونکہ وہ تو خالی ہاتھ آئی ہے۔ اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ لاہور میں چچا میاں کے گھر کا پتا تو اس کے ذہن میں ہے لیکن فون نمبر اسے یاد نہیں۔ فون نمبر ہوتا تو بڑی آسانی ہوتی۔ گوجرانوالہ سے وہ گھر فون کر دیتی مگر کہتی کیا؟ کیا وضاحت کرتی؟ اس کا ذہن الجھنے لگا۔ جب فون نمبر ہی یاد نہیں تو خوامخواہ سر کھپانے سے فائدہ۔

بات پھر وہیں آ گئی۔ وہ مجیب کو سب کچھ بتا دے۔ بس یہ نہیں بتائے گی کہ انڈیا سے خط لکھنے والی لڑکی وہی ہے۔ تو مجیب کا رد عمل کیا ہو گا؟ یہ طے ہے کہ وہ اسے کچھ رقم دے دے گا لیکن اس سے زیادہ وہ خود کو اس معاملے میں ملوث نہیں کرے گا۔ وہ عزت دار ہے.... اور مشہور آدمی بھی ہے۔ کسی ایسی لڑکی کے ساتھ جو غیر ملکی ہو' ملوث ہونا اس کی شہرت کے لئے داغ ہو گا۔ بلکہ وہ نہیں چاہے گا کہ اس معاملے میں اس کا نام بھی آئے اور بات درست ہے۔ وہ خود بھی یہ نہیں چاہے گی۔ وہ دنیا کی ہر شے سے بڑھ کر اسے مطلوب و محبوب ہے۔

تو یوں ہے کہ وہ مجیب کو سب کچھ بتائے' اس سے کچھ رقم لے اور اکیلی گوجرانوالہ سے لاہور جائے اور چچا میاں کے گھر پہنچے۔ وہاں پہنچ کر کیا ہو گا۔ گھر کے لوگ بھی کیا سمجھیں گے اسے۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ داغی ہو چکی۔ یہ داغ اب عمر بھر نہیں دھل سکتا نہ وہ عزت سے جی سکے گی' نہ عزت سے مر سکے گی۔

اور اب تو اس کی پاکستان میں موجودگی بھی غیر قانونی ہے۔ اس کے پاس پاسپورٹ بھی نہیں ہے۔

اچانک ایک مہک سی اسے چھو کر گزری۔ اس نے چونک کر دیکھا۔ یہ سمجھنے میں اسے چند لمحے لگے کہ خوشبو چادر میں سے آ رہی ہے اور یقیناً وہ مجیب کے جسم کی ہو گی۔ کیونکہ وہ اسی کی چادر اوڑھے ہوئے تھی۔ اسی کے تکئے پر اس کا سر رکھا تھا۔

بس وہیں سے اس کی ذہنی رو بدل گئی۔ یہ وہ خوشی تھی' جو خواب میں بھی اسے نہیں مل سکتی تھی مگر سچ مچ مل گئی تھی۔ وہ جاگتی آنکھوں جس قرب کے خواب بنتی تھی' وہ تعبیر بن کر اسے مل گئے تھے۔ زندگی میں عام طور پر ایسا کہاں ہوتا ہے۔

فینٹیسی کا خیال آیا تو اسے اپنی آخری فینٹیسی کی بنیاد یاد آئی۔ وہ ڈر گئی۔ جب ایک خیال سچ ہو سکتا ہے تو دوسرا بھی سچ ہو سکتا ہے۔ وہ مجیب تک پہنچ گئی ہے.... اس کے ساتھ ہے.... اور بے حد قریب۔ اور اگر وہ اکیلی گوجرانوالہ سے لاہور جانے کی کوشش کرے تو؟ وہ یہاں اجنبی ہے۔ یہ پردیس ہے اس کے لئے اور ہر جگہ ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ اگر سچ مچ کسی گروہ نے اسے اٹھا لیا تو؟ اس خیال سے اس کی روح لرز کر رہ گئی۔

اچانک ہی اسے یاد آیا کہ اس نے اللہ سے مجیب کے ساتھ' اس کے قرب کی دعا بھی تو کی تھی۔ بے حد خراب صورت حال کے نتیجے میں سہی' اس نے جو مانگا تھا' وہ اسے مل تو گیا اور دنیا میں قیمت تو ہر چیز کی دینی پڑتی ہے۔ جتنی بڑی طلب ہو گی' اتنی ہی زیادہ قیمت ہو گی۔ ذرا سوچو تو سہی صفورہ بیگم.... کیا ملا ہے تمہیں؟

واقعی....! پریشانی ساتھ نہ ہوتی تو شاید اس پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ مجیب کا ساتھ.... اور سب سے بڑی بات یہ کہ مجیب کو اس کی ضرورت تھی۔ وہ اس کی مدد کر سکتی تھی۔ وہ اس کی ضرورت کے وقت میں اس سے کیسے منہ موڑ سکتی ہے اور کھونے کے لئے اب بچا ہی کیا۔ وہ تو داغی ہو گئی۔ زندگی سے تو بہتر اب موت ہے لیکن یہ زندگی مجیب کے کام آ جائے تو یہ سعادت ہو گی۔ وہ اسے سکون اور خوشی دے گی اور وہ اچھا کام کرے گا تو یہ عمر رائیگاں کسی کام ہی آ جائے گی۔ شکایت کی گنجائش ہی نہیں۔ شکایت تو ناشکری ہو گی۔ اس نے دعا یہی مانگی تھی کہ اس کی دعا پوری ہو جائے۔ وہ کبھی کوئی شکایت نہیں کرے گی۔

مگر اسے مجیب کو اپنے بارے میں بتا دینا چاہئے۔ وہ اسے غلط سمجھتا رہے گا تو یہ اس کی توہین ہو گی۔ عزت نفس بھی مجروح ہو گی۔

اسے قرار آ گیا!



ٹرین میں ہلچل سی مچ گئی۔ وہ بارڈر پر پہنچنے والے تھے۔ یہاں انہیں ٹرین سے اتر کر بھارتی کسٹم سے گزرنا تھا اور پھر دوسری ٹرین میں بیٹھنا تھا۔ سب مسافر اپنا سامان سمیٹنے لگے۔ بچھڑنے کی اداسی کی جگہ گھر پہنچنے کی ایکسائٹ منٹ نے لے لی تھی۔

ناظورہ بیگم نے صفورہ کو ہلایا "اٹھ جاؤ بٹی۔"

مگر جب سونے والی اٹھی تو ناظورہ بیگم کے پیروں تلے سے زمیں نکل گئی۔ وہ صفورہ نہیں تھی۔ کوئی بوڑھی عورت تھی۔ وہ اٹھی اور آنکھیں ملتی ہوئی دوسری برتھ پر پہنچ کر اس پار اتر گئی۔

ناظورہ بیگم دل پر ہاتھ رکھ کر یوں کھڑی تھیں' جیسی دل کی دھڑکن رک گئی ہو۔ ان کی دیورانی اور بھتیجیاں بھی حیران کھڑی تھیں۔ ناظورہ بیگم پاگلوں کی طرح ایک طرف چل دیں۔ انہوں نے پورا ڈبا چھان مارا مگر صفورہ ہوتی تو ملتی۔

سفیان احمد اور فرقان احمد کو بھی پتہ چل گیا۔ اتنے میں ناظورہ بیگم ہانپتی کانپتی آ گئیں "صفورہ نہیں ہے۔" انہوں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا "کہاں رہ گئی میری بچی۔"

"بھائی جان پلیز۔ یہ بات زور سے نہ کریں۔" فرقان احمد نے آہستہ سے کہا۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں۔"

"کیسے نہیں۔ میری بچی...."

"فرقان ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" سفیان صاحب نے سخت لہجے میں کہا "شور مچاؤ گی تو مصیبت کھڑی ہو جائے گی۔"

"میں یہی کہہ رہا ہوں بھائی جان۔" فرقان صاحب نے سرگوشی میں کہا "اس وقت صفورہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں۔ وہ وہاں رہ گئی ہے تو محفوظ ہاتھوں میں ہے... بھائی میاں کے گھر۔ لیکن یہاں امیگریشن والوں کو اس کی غیر موجودگی کا پتہ چل گیا تو بڑا

مسئلہ ہو جائے گا۔ ایک مستقل عذاب ہو گا یہ۔"

"ہاں' یہ تو ہے۔" سفیان احمد نے سر ہلاتے ہوئے کہا "اتنا کچھ تو میں نہیں سوچ سکا تھا مگر اب ہو گا کیا۔"

"ایک ہی صورت ہے۔ بھابی جان کو سمجھائیں اور مبینہ کو صفورہ بنا کر ساتھ لے جائیں۔ اس کی صورت بھی ملتی ہے۔ کام چل جائے گا۔"

"کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گی۔" سفیان احمد پریشان ہو گئے۔

"اور کوئی چارہ ہے بھی نہیں۔ دعا کریں' سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن بھابی جان کو سمجھا دیں۔ اس سلسلے میں ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالیں۔"

"میں سمجھا دوں گا۔" سفیان احمد نے گہری سانس لے کر کہا۔



تیز گام گوجرانوالہ پر صرف دو منٹ رکی تھی۔ گاڑی چلتے ہی مجیب نے کھانا نکال لیا "چلو' کھانا کھا لیں۔ ڈیڑھ بجا ہے۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" صفورہ نے کہا۔

"کھانا کھا لو۔ پنڈی ہم سات بجے سے پہلے نہیں پہنچیں گے۔"

صفورہ جا کر ہاتھ دھو آئی۔ مجیب نے سیٹ کے بیچ میں دستر خوان بچھا لیا تھا۔ پراٹھے تھے' بھنا ہوا گوشت تھا' ڈبل روٹی تھی اور جیلی اور شہد "کھانا کل کا ہے۔" مجیب نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "لیکن خراب نہیں ہوا ہے۔ میں چیک کر چکا ہوں۔ پھر بھی تم چاہو تو ڈبل روٹی اور میٹھے سے کام چلا لو۔"

صفورہ نے پراٹھے اور گوشت کو آزمایا۔ پراٹھا باسی ہونے کے باوجود نرم تھا اور گوشت بہت لذیذ "یہ تو ٹھیک ٹھاک ہے۔ کب کا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"کل شام چار بجے کا مگر گوشت خراب نہیں ہو سکتا۔ میری بیوی کو بڑی ترکیبیں آتی ہیں۔" مجیب کے لہجے میں فخر تھا۔

کھانے کے بعد مجیب برتن سمیٹنے لگا تو صفورہ نے اسے روک دیا۔ "آپ رہنے دیں۔ میں سمیٹ لوں گی۔"

"تمہیں سگریٹ پر کوئی اعتراض تو نہیں۔"

"جی نہیں۔"

مجیب نے سگریٹ سلگایا اور پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ برتن سمیٹ کر رکھنے کے بعد صفورہ بھی وہاں آ بیٹھی "بس چائے کی محتاجی ہے۔" مجیب نے کہا "میری بیوی سفر کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی ہے لیکن تھرموس میں چائے کا ذائقہ بدل جاتا ہے۔"

"تھرموس میں بغیر دودھ کی چائے رکھ کر دیکھیں۔ ذائقہ کبھی نہیں بدلے گا۔"

مجیب نے ذرا حیرت سے اسے دیکھا "تمہیں بھی کچھ ترکیبیں آتی ہیں۔" اس نے ستائشی لہجے میں کہا "اگلی بار آزما کر دیکھوں گا۔"

باہر سے برتنوں کی آواز ابھری تو مجیب دروازے پر گیا۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ وہ چائے والا ہی تھا "دو چائے دو۔ اچھی ہے نا۔"

"پی کر دیکھیں سر۔"

وہ چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے رہے۔ صفورہ سوچ میں گم تھی اور مجیب اسے بغور دیکھ رہا تھا "تم اپنے ساتھ کچھ بھی نہیں لائیں؟" اس نے پوچھا۔

"دراصل میں آپ کے ساتھ جانے کے ارادے سے نہیں آئی تھی۔ مجھے کہیں اور جانا تھا۔"

"اوہ۔۔۔"

"اس سے کوئی فرق پڑتا؟"

"بہت بڑا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ مجھ پر کیا گزرتی۔ سب کچھ تباہ ہو جاتا۔"

"بس اسی لئے رک گئی۔" صفورہ نے کہا۔

"مجھ پر ترس آ گیا تھا۔"

"مجھے کبھی آپ پر ترس نہیں آ سکتا۔ یہ بہت چھوٹا لفظ اور بہت بیگانہ جذبہ ہے۔"

"تو پھر؟"

"آپ مجھے اچھے لگے تھے۔"

مجیب کے چہرے پر جس تیزی سے تمتماہٹ ابھری' اس نے صفورہ کو حیران کر دیا "میں پنڈی سے تمہیں ضرورت کی ہر چیز دلا دوں گا۔" مجیب نے تیزی سے موضوع

بدلا۔ "تم بغیر پروگرام کے میرے ساتھ آ گئیں' اس سے تمہارے گھر والے ڈسٹرب نہیں ہوں گے؟"

صفورہ کے دل پر چوٹ سی لگی "بہت ڈسٹرب ہوں گے۔ ڈسٹرب رہیں گے مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔"

"انہیں مطلع بھی تو کیا جا سکتا ہے۔"

"چھوڑیں اس بات کو۔" صفورہ جھنجلا گئی۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ چائے والا پیالیاں لینے آیا۔ مجیب نے اس کو پیسے دیئے۔ اس کے جانے کے بعد صفورہ نے اچانک کہا۔ "اچھا ایک بات بتائیں۔ فرض کریں' میں نہ آتی۔۔۔ اور کسی اچھے گھر کی ایسی لڑکی یہاں آ جاتی جو آپ کی پرستار ہوتی۔ تب آپ کیا کرتے؟"

"میں پہلی فرصت میں اسے اپنے کوپے سے رخصت کر دیتا۔" مجیب نے ایک لمحہ جھجکے بغیر کہا۔

"اپنی مجبوری اور ضرورت کے باوجود؟" صفورہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ اپنی ہر مجبوری اور ضرورت کے باوجود میں اسے واپس کر دیتا۔"

"اس کی وجہ؟"

"میں کسی ایسی لڑکی کا ساتھ قبول نہیں کر سکتا' جو آگے جا کر مجھ سے مطالبے کرے۔ جسے مجھ سے توقعات ہوں۔ میں کسی قسم کا کوئی تعلق استوار نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ مجھے اس کا حق ہے نہ ضرورت یا طلب۔ میری بہت اچھی بیوی ہے۔ بہت پیارے بچے ہیں۔ میں ان سے بے اندازہ محبت کرتا ہوں اور میں کسی اسکینڈل کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ایسے کسی تعلق سے ہمیشہ دامن بچاتا ہوں' جس کے وابستگی میں تبدیل ہونے کا خدشہ ہو۔ یہ تو ایک نفسیاتی مجبوری ہے' جس کی وجہ سے گھر سے دور مجھے کسی کا ساتھ چاہئے۔"

صفورہ سن ہو کر رہ گئی۔ مجیب انور نے بڑے یقین سے یہ سب کچھ کہا تھا۔ گویا اس نے مجیب کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا ہوتا تو وہ اسے بھی کھو بیٹھتی۔ کہیں کی بھی نہ رہتی۔ تو اب اسے اپنی اصلیت چھپانی تھی۔ اسے ابھی سے توہین کا احساس ہونے لگا۔

"تب تو آپ آگ سے کھیل رہے ہیں۔" اس نے کہا "اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ میں یا آپ ایک دوسرے سے متاثر نہیں ہوں گے۔ لمبے عرصے کے ساتھ میں تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

مجیب نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ اگلے ہی لمحے اس کے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ ابھری "تمہاری تو نہیں، البتہ میں اپنی ضمانت دے سکتا ہوں۔ میں خود کو جانتا ہوں۔ اپنے کردار پر مجھے اعتماد ہے۔ محبت میرا خاص موضوع ہے۔ میں اس کے ہر پہلو سے واقف ہوں۔"

"آپ بہت بڑی بات کہہ رہے ہیں۔" صفورہ نے بھی بے حد اعتماد سے کہا۔ "مضبوط سے مضبوط آدمی بھی کمزور لمحوں میں بے حد کمزور ہو جاتا ہے۔"

"مگر میں یقین سے کہہ رہا ہوں کہ یہ ممکن ہی نہیں۔" مجیب نے کہا "اور میرا کام ہی انسانوں کو گہرائی میں جا کر ٹٹولنا، کھنگالنا اور سمجھنا ہے۔"

اس کے جواب میں صفورہ نے جو کچھ کہا، وہ مجیب تک نہیں پہنچ سکا۔ اس لئے کہ وہ اس نے دل ہی دل میں کہا تھا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ ٹرین اپنی منزل کی طرف پوری رفتار سے دوڑ رہی تھی۔

اچانک مجیب نے کہا "ارے.... میں نے تمہارا نام بھی نہیں پوچھا۔" اس کے لہجے میں کلٹ تھی۔ جیسے جتا رہا ہو کہ اس کی یہ اہمیت ہے۔

"صف...." صفورہ کہتے کہتے رک گئی۔ اب تو وہ اسے اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں بتا سکتی تھی "صفیہ نام ہے میرا!" ایک لحاتی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے بے ساختہ کہا۔

"اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔"

"آپ میری گہرائی میں جا کر ٹٹولیں اور کھنگالیں۔ مجھے بھی بتائیں۔" صفورہ کے ہجے میں خفیف سا طنز تھا۔

"کیوں نہیں۔" مجیب نے خوش دلی سے کہا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ صفورہ کو لگا کہ وہ اس کے آر پار دیکھ رہا ہے پھر مجیب کی نظروں سے الجھن بھی جھانکنے لگی "تم میرے اندازے اور تصور سے مختلف لڑکی ہو۔ تم خوش ذوق ہو۔ سادگی پسند ہو۔

حساس، جذباتی، تخیلاتی اور خود دار ہو.... مختصراً آرٹسٹک کہو۔ تم تعلیم یافتہ ہو۔ صرف تعلیم یافتہ ہی نہیں، لکھنے پڑھنے میں خاص دلچسپی بھی ہو گی تمہیں۔ تمہاری گفتگو سے پتہ چلتا ہے۔ تمہارے پاس ذخیرہ الفاظ بھی ہے اور الفاظ کے استعمال کا سلیقہ بھی۔" وہ کہتے کہتے اچانک خاموش ہو گیا "تم میرے پاس جس حیثیت میں آئی ہو، کسی بھی طرح وہ لگتی نہیں ہو۔ یہ میں نے پہلی ہی نظر میں محسوس کر لیا تھا۔ اس لئے مجھے تم میں کشش محسوس ہوئی تھی۔ تم یقیناً اچھی کمپنی ہو۔ تمہارے پاس کردار کی پختگی بھی ہے۔ کاش.... تمہاری یہ حیثیت نہ ہوتی۔"

"تو کیا ہوتا؟" صفورہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"پھر کوئی بھی اچھا اور خوش ذوق انسان تمہیں شریک حیات بنا کر فخر محسوس کرتا۔"

"آپ بھی؟"

"اپنے متعلق میں تمہیں بتا چکا ہوں۔" مجیب نے سادگی سے کہا "میری زندگی کی تصویر تو مکمل ہو چکی ہے۔"

"حیثیت۔" صفورہ نے پر خیال لہجے میں کہا "آپ کو اس حیثیت کا علم ہی کیا ہے، جس میں میں آپ کے پاس آئی ہوں۔"

مجیب بری طرح چونکا "کیا مطلب؟"

صفورہ گڑبڑا گئی پھر اس نے جلدی سے بات بنائی "مطلب یہ کہ آپ میری جو حیثیت سمجھ رہے ہیں، وہ ابھی ہے نہیں اور شاید میں اس سے محفوظ رہ جاؤں۔ اس لئے کہ یہ میرا پہلا اسائن منٹ ہے۔"

مجیب بے ساختہ ہنسا "کیا لفظ استعمال کیا ہے تم نے.... خالص علمی اور تحقیقی۔"

"مجھے بات پوری کرنے دیں۔" صفورہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں آپ کے ساتھ آنا نہیں چاہتی تھی مگر میں نے تین وجوہ کے تحت یہ اسائن منٹ قبول کر لیا۔ پہلی وجہ، آپ ضرورت مند ہیں، مجبور ہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ آپ مجھے اچھے لگے اور تیسری وجہ یہ کہ آپ نے مجھے عزت اور احترام دینے کا اور کھلونا سمجھ کر استعمال نہ کرنے کا وعدہ کیا۔ اب آپ خود ہی میری حیثیت کا تعین کر لیں۔ اس سلسلے میں جو

آپ کے ذہن میں تصور ہے' اس میں آپ کو ترمیم کر لینی چاہئے۔"

مجیب اب اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا "کمال ہے بھئی۔ کتنی خوب صورتی اور جامعیت کے ساتھ تم نے اپنا کیس پیش کیا ہے۔"

"میں بہت سنجیدہ ہوں۔"

مجیب بھی سنجیدہ ہو گیا "میرے لئے تمہاری حیثیت ایک قابل احترام ساتھی کی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ مجھے تم سے بہت فائدہ پہنچے گا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" صفورہ نے بے حد خلوص سے کہا۔



وہ سرحد پار کر چکے تھے۔ اب گزرتا ہوا ہر لمحہ انہیں گھر کے قریب لے جا رہا تھا۔

خواتین تو سناٹے کی سی کیفیت میں تھیں۔ وہ چپ چپ اور گم صم تھیں۔ ہنسنا بولنا اور باتیں کرنا جیسے بھول گئی تھیں۔ وہ ایک دوسرے کو بھی کم ہی دیکھتیں۔ زیادہ تر ادھر ادھر ہی دیکھ رہی تھیں۔

دونوں بھائی بھی خاموش بیٹھے تھے پھر فرقان احمد نے سفیان صاحب کو آنکھ سے اشارہ کیا۔ دونوں اٹھے اور بوگی کے آخری سرے کی طرف چل دیئے۔ وہاں دونوں ٹرین کے بند دروازے کی طرف جا کر کھڑے ہو گئے۔ دونوں نے سگریٹ سلگا لئے۔ ادھر ادھر کوئی اور مسافر نہیں تھا۔

ٹرین کی اپنی آواز خاصی پر شور ہوتی ہے.... چھک چھک چھکا چھک۔ خاص طور پر دروازے کے قریب کھڑے لوگوں کو تو ایک دوسرے سے گفتگو کرنے کے لئے زیادہ ہی بلند آواز کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ لیکن فرقان احمد بہت دھیمی آواز میں' بہت رازدارانہ انداز میں بول رہے تھے "بھائی جان' اس معاملے کو بہت نزاکت اور احتیاط سے برتنا ہو گا۔"

"لیکن کرنا کیا ہے۔ میرا تو دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔" سفیان احمد نے بے بسی سے کہا۔

"یہ بات تو کبھی اکیلے میں بھی منہ سے نہ نکلے کہ صفورہ غلطی سے پاکستان میں رہ گئی ہے۔ کجا یہ کہ کسی کے سامنے۔"

"مگر اس کی کمی تو سب کو محسوس ہو گی۔ کوئی پوچھے تو کیا کہیں گے؟"

فرقان احمد نے صرف ایک لمحے کے لئے سوچا "کہئے گا' وہاں اس کے رشتے کی بات چل رہی تھی۔ اس لئے اسے چھوڑ آئے۔"

"تمہارے گھر میں....؟"

"میں اپنے گھر میں بھی سب کو سمجھا دوں گا۔"

"لیکن پھر بھی کچھ کرنا تو ہو گا۔"

"گھر پہنچتے ہی بھائی میاں کو خط لکھئے گا۔ وہاں سے جواب آئے گا تو صورت حال واضح ہو جائے گی۔"

"اور اگر صفورہ وہاں نہ ہوئی تو؟"

"بھائی جان' خدا کے لئے۔ اندیشے نہ پالیئے۔ یوں سوچیں گے تو ایسے ایسے امکان نکلتے چلے آئیں گے کہ دل و دماغ معطل ہو جائیں۔ فی الوقت تو ہمیں یہی سمجھنا ہے کہ صفورہ ٹرین سے کسی وجہ سے اتری اور سوار نہیں ہو سکی اور بھائی میاں کی فیملی کے ساتھ چلی گئی ہے۔ یہ امکان بہت قوی ہے بھائی جان۔"

"لیکن اگر ایسا نہیں ہوا تو؟" سفیان احمد نے کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

فرقان احمد بوکھلا گئے "کیا کرتے ہیں بھائی جان۔ خود کو سنبھالیئے۔" وہ بھائی کو لپٹا کر ان کا کندھا تھپکنے لگے۔

"کیا کروں؟ عزت پر بن گئی ہے۔" سفیان احمد نے سسکیوں کے درمیان کہا۔

"دیکھئے۔ اب اس معاملے میں ہم تو بے بس ہیں نا۔ کر کچھ بھی نہیں سکتے۔"

فرقان احمد نے انہیں سمجھایا "اور ایسے میں آدمی اندیشے بھی پالنے لگے' پریشان بھی ہونے لگے تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی مفقود ہو جاتی ہے اور اس سے نقصان ہی ہوتا ہے۔ ایسے میں خود کو حالات اور تقدیر پر چھوڑ دینے ہی میں بہتری ہے۔ ہاں' اللہ سے عافیت کی دعا کرتے رہیں۔ وہی اس بگڑی کو بنا سکتا ہے۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس معاملے میں صبر اور دعا کے سوا ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ کسی سے کہہ بھی نہیں سکتے کہ پردہ رکھنا سب سے ضروری ہے۔"

فرقان احمد دیر تک سمجھاتے رہے۔ بالآخر سفیان احمد کی طبیعت سنبھل گئی۔

انہوں نے ممنونیت بھری نظروں سے بھائی کو دیکھا "تم نہ ہوتے تو میرا کیا بنتا؟"

"یہ بھی اللہ کا کرم ہے بھائی جان۔ دیکھ لیجئے' اللہ نے مصیبت پڑنے سے پہلے کتنے سارے مسائل سے بچنے کا سامان کر دیا۔ صرف آپ تین ہوتے تو صفورہ کی کمی کسی طرح بھی نہیں چھپتی مگر ہم سب ساتھ تھے۔ بات بن ہی گئی۔ اللہ پردہ رکھنے والا ہے بھائی جان۔"

سفیان احمد نے بھائی کو لپٹا لیا "تم بہت اچھے بھائی ہو فرقان۔"

"صرف بھائی کہہ دینا کافی ہے بھائی جان۔ بھائیوں کو تو اس سے بھی اچھا ہونا چاہئے۔" فرقان احمد نے کہا "مگر ہمیں ان لوگوں کو ابھی سے سمجھانا ہو گا۔ ٹرین میں ہی۔ میں نہیں چاہتا کہ گھبراہٹ میں کسی کے منہ سے کچھ نکلے۔"

دونوں نے سگریٹ بجھائی اور اپنی سیٹوں کی طرف چل دیئے۔ گاڑی میں عورتوں کو سمجھانا اور وہ بھی اس طرح کہ کوئی اور کچھ سن نہ سکے' آسان کام نہیں تھا مگر جس مشکل سے وہ گزر آئے تھے' اس کے بعد سب آسان ہی تھا۔

○

صفورہ اپنی مشکل بھی بھول گئی تھی۔ وہ سحر زدہ سے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ سرسبز کھیت ٹرین کی مخالف سمت میں اڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ کوئی منظر مکمل نہیں تھا۔ ہر منظر فلم کے شاٹ کی طرح تھا اور دوسرے منظر سے مربوط تھا۔ جیسے اسکرین پر فلم دیکھ رہے ہوں.... بے حد خوبصورت فلم!

جیسے ہی مجیب کے اور اسکے درمیان خاموشی ہوئی' وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ باہر وہ سب کچھ تھا' جو اس نے صرف پینٹنگز میں دیکھا تھا.... اور بے حد خوبصورت تھا۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ ملک اتنا خوب صورت اور سرسبز ہے۔ دیکھتے دیکھتے جادو سا ہو گیا۔ لمحوں میں اپنے مسائل بھول کر وہ گرد و پیش کے بارے میں شاعرانہ انداز میں سوچنے لگی۔

کھڑکی بھر منظر! اس کے ذہن میں یہ اصطلاح گونجی۔ وہ زیر لب مسکرائی مگر یہ کھڑکی بھر منظر محض ایک پل کے ہزارویں بلکہ شاید لاکھویں حصے کا تھا۔ چھب دکھا کر دوسرے منظر کو اپنی جگہ دے دیتا تھا۔ سوچنے سمجھنے کا کوئی موقع ہی نہیں دیتا تھا لیکن

بھرپور.... بہت بھرپور تاثر نقش کر دیتا تھا۔ ہر منظر ایک مصرع' ایک لائن کی طرح تھا' جو ایک مسلسل نظم کو آگے بڑھا رہا تھا۔ نظر اور دھیان کو ہٹنے بھٹکنے کی اجازت نہیں تھی۔

صفورہ کو ابتدا ہی سے پاکستان سے لگاؤ تھا مگر ان چند لمحوں میں وہ پاکستان کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ کس قدر خوب صورت ہے یہ ملک۔ وہ ایک متحرک کھڑکی کے واسطے سے اسے دیکھ رہی تھی۔ منظر ساکت تھے مگر اڑتے محسوس ہو رہے تھے۔ اس کا بس چلتا تو وہ اسی متحرک کھڑکی سے منظر میں چھلانگ لگا دیتی۔

پھر ایک دم منظر تبدیل ہو گیا۔ سرسبز کھیتوں کی جگہ بھوری چٹانوں اور پہاڑیوں نے لے لی اور اچانک ہی ڈبا اندھیرے میں ڈوب گیا۔ وہ ایک دم خوف زدہ ہوئی اور مجیب سے لپٹ گئی۔

جس وقت گاڑی سرنگ میں داخل ہوئی' مجیب ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ اس کے لئے وہ اتفاق تھی مگر پھر ہلکی سی چیخ سنائی دی اور کوئی اس سے لپٹ گیا۔ وہ کتاب میں ایسا کھویا ہوا تھا کہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکا۔ ایک پل میں اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ لڑکی ہو گی... صفیہ مگر عجیب بات تھی کہ اس کا لمس اسے بہت اچھا لگا۔ اس نے اسے ہٹانے کی کوشش بھی نہیں کی۔

چند ہی لمحے بعد روشنی ہو گئی۔ ٹرین سرنگ سے نکل آئی تھی۔

دونوں نے روشنی میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ اگلے ہی لمحے صفورہ کی نظریں جھک گئیں۔ مجیب اب اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

صفورہ نے تیزی سے خود کو الگ کیا "سوری.... سوری۔ یہ سب کچھ بے حد اچانک تھا...."

اس کے چہرے پر دوڑتی سرخی نے مجیب کو حیران کر دیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ یہ لڑکی ہرگز بازاری نہیں ہے لیکن وہ اس کے ساتھ جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ مہینہ بھر رہنے کے ارادے سے اور معقول معاوضہ بھی لے رہی تھی۔ یہ کیا ہے؟ پھر اس کے الجھے ہوئے ذہن کو خیال آیا کہ صفیہ نے خود ہی تو بتایا تھا کہ یہ اس کا پہلا اسائن منٹ ہے اور وہ سچ کہہ رہی تھی۔ وہ دعوے سے کہہ سکتا تھا کہ ابھی وہ خراب نہیں ہوئی

ہے۔

"کوئی بات نہیں صفیہ۔" مجیب نے نرم لہجے میں کہا۔

پھر خاموشی چھا گئی۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ صفورہ کے چہرے پر اب بھی تمتماہٹ تھی۔ وہ اس کا مردانہ لمس کا پہلا تجربہ تھا۔ پہلے تو وہ اندھیرے سے گھبرا کر اس سے لپٹی تھی۔ وہ معصوم لمحے تھے مگر روشنی میں' اس سے علیحدہ ہونے کے ایک پل میں جو اس سے لپٹی رہی تھی' وہ اس کا اپنا پل تھا۔ اس نے اسے مست اور بے خود کر دیا تھا۔ جی چاہا تھا کہ وہ کبھی اس سے علیحدہ نہ ہو مگر اگلے ہی لمحے وہ حیا کے بوجھ سے لرز گئی تھی۔

ادھر مجیب اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ اسے ایسی لڑکی لگی' جس کے لئے مردانہ لمس یکسر اجنبی ہو۔ اس کے جسم کے بے ساختہ رد عمل نے اسے یہی بتایا تھا۔ وہ اداکاری ہرگز نہیں تھی اور اب وہ جھینپی جھینپی نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔

اس نے صورت حال کو نارمل کرنے کی کوشش میں گفتگو شروع کر دی "دیکھو صفیہ' اب راولپنڈی زیادہ دور نہیں ہے۔" اس نے کہا۔

صفورہ نے چونک کر اسے دیکھا "جی؟"

"ہمیں لینے کے لئے ڈرائیور آئے گا گاڑی لے کر۔"

صفورہ کو اس کا ہمیں کہنا بہت اچھا لگا۔

"مری میں ہمارا قیام ایک بنگلے میں ہو گا۔ وہاں شاید دو یا تین ملازم بھی ہوں گے۔ اور ہمارے سوا کوئی نہیں ہو گا۔ میں چاہتا ہوں کہ اب جہاں بھی تعارف کی ضرورت پڑے' میں تمہیں اپنی بیوی کی حیثیت سے متعارف کراؤں۔"

صفورہ نے نظریں اٹھا کر بہت غور سے اسے دیکھا لیکن اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

"تمہیں اس میں کوئی اعتراض تو نہیں؟" مجیب نے پوچھا۔

صفورہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس اسے دیکھتی رہی۔

"شاید تم غلط سمجھ رہی ہو۔" مجیب نے کہا "میں واضح کر دوں کہ میں نے صرف تمہارا ساتھ خریدا ہے۔ بے ضرر کمپنی لیکن مجھے عزت کا بہت خیال رہتا ہے۔ اب ملازمین پر میں تمہیں اپنی بیوی ظاہر نہیں کروں گا تو وہ یقیناً مجھے برا آدمی سمجھیں گے۔

یہ بات مجھے بری لگے گی۔ کیونکہ میں برا آدمی ہوں نہیں۔"

"اگر آپ برے آدمی ہوں تو آپ کو یہ بات بری نہیں لگے گی کہ لوگ آپ کو برا سمجھیں۔"

"برا تو شاید پھر بھی لگے گا مگر دکھ نہیں ہو گا۔" مجیب مسکرایا "اس صورت میں مجھے خود پر غصہ آئے گا۔"

"عزت تو سبھی کو اچھی لگتی ہے۔ خواہ جھوٹی ہو۔" صفورہ بولی۔ "یہ تو مجھے بھی اچھا نہیں لگے گا کہ لوگ مجھے برا سمجھیں اور بری نظر سے دیکھیں۔ اس لئے مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ دکھاوے کے لئے بھی آپ کی بیوی بننا میرے لئے بڑا اعزاز ہو گا۔" دل ہی دل میں اس نے کہا "کاش مجھے حقیقت میں بھی یہ اعزاز مل جائے۔"

"بس تو ٹھیک ہے۔" مجیب نے کہا "پنڈی میں میں تمہیں شاپنگ کراؤں گا۔ تم بلا تکلف ضرورت کی ہر چیز خرید سکو گی۔"

صفورہ جیسے ہواؤں میں اڑنے لگی۔ جسے وہ صرف خوابوں میں دیکھ کر خوش ہو جاتی تھی' وہ سچ مچ اسے شاپنگ کرانے والا تھا۔ دکھاوے کی بیوی کی حیثیت سے سہی۔ اس کے لئے تو یہ بھی کم نہیں تھا۔

اس کے بعد کے چند لمحوں میں وہ بہت خوش رہی مگر پھر اچانک ہی اسے اپنی صورت حال کا خیال آ گیا۔ پتہ نہیں' ابا اور اماں کا کیا حال ہو گا؟ اسے ہول اٹھنے لگے۔ وہ گھبرا کر پھر کھڑکی کی طرف.... اڑتے مناظر کی طرف متوجہ ہو گئی۔



سفیان احمد نے فیصلہ کیا اور ناظورہ بیگم کو بھی سمجھایا کہ صفورہ کی حقیقی صورت حال کے متعلق رضوان کو سب کچھ بتانا مناسب نہیں ہو گا۔ "میں جانتا ہوں کہ اس عمر میں لڑکے کتنے جذباتی' گرم اور غیرت مند ہوتے ہیں۔ خاص طور پر بہنوں کی معاملے میں۔" انہوں نے بیوی سے کہا "اسے پتہ چل گیا تو نجانے کیا کر گزرے۔"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ۔" ناظورہ بیگم نے سرد آہ بھر کے کہا۔

رضوان کو صفورہ کو ان کے ساتھ نہ پا کر بہت حیرت ہوئی۔ "صفورہ کہاں ہے ابا؟"

"اسے ہم پاکستان چھوڑ آئے ہیں۔" سفیان احمد نے کہا۔

"کیوں ابا؟" رضوان کے لہجے میں شک تھا پھر وہ ماں کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔

"ایک رشتہ لگا تھا اس کا۔" ناظورہ بیگم نے جلدی سے بات بنائی "مگر ہم لوگوں کی واپسی کا وقت آگیا تھا۔ اب اس بات کو وہیں چھوڑتے تو دو سال نکل جاتے اور رشتوں کا تو یہ ہے بیٹے کہ جب آئے نعمت سمجھو۔ سال دو سال کون انتظار کرتا ہے پھر صفورہ کی عمر تو ویسے بھی نکلی ہی جا رہی ہے۔"

"تو پھر؟"

"ہم تیرے چچا میاں کو اختیار دے آئے ہیں۔ بات بنی تو وہ شادی کر دیں گے۔"

"ہمارے بغیر؟"

اب کے ناظورہ بیگم جھنجلا گئیں "کیا پولیس والوں کی طرح تفتیش کئے جا رہا ہے۔" انہوں نے بھنا کر کہا "ہمارے شریک ہونے سے زیادہ ضروری صفورہ کی شادی ہے۔ کیا تو کچھ بھی نہیں جانتا سمجھتا۔ بس اللہ سے دعا کر کہ اللہ اس کے نصیب اچھے کرے۔ عزت کی زندگی اور عزت کی موت نصیب ہو اسے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے اماں۔ دعا تو میں کرتا ہی ہوں لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ حلق سے ہی نہیں اترتی۔" رضوان کے لہجے میں الجھن تھی۔

"مسئلہ کیا ہے؟ کیا الجھن ہے تمہیں؟" سفیان احمد نے مداخلت کی۔ ان کا لہجہ قدرے سخت تھا۔

"ابا' امیگریشن والوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا اس پر؟"

"انہیں پتہ ہی نہیں چلا۔" سفیان احمد نے کہا پھر سرحد پار کرنے کی تفصیل سنا ڈالی۔

"یہ تو بہت بڑا خطرہ مول لیا آپ نے۔" رضوان نے سب سننے کے بعد تبصرہ کیا "بات کی جاتی تو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ بہت بڑا مسئلہ بن جاتا۔"

"بات ایسی تھی کہ اس کے لئے ہم بڑے سے بڑا خطرہ مول لے سکتے تھے۔" سفیان احمد کے لہجے میں قطعیت تھی "ہاں' میں نے فرقان میاں سے مشورہ کیا تھا۔

انہوں نے بھی میرے فیصلے سے اتفاق کیا۔ اس کے تعاون کے بغیر تو ہم یہ قدم نہیں اٹھا سکتے تھے۔"

"تو بس ہر وقت دعا کیا کر بہن کی لئے۔" ناظورہ بیگم نے بات ہی ختم کر دی۔

لیکن رضوان مطمئن نہیں تھا۔ اسے اس معاملے میں کسی بڑی گڑبڑ کا احساس ہو رہا تھا۔ حالانکہ بات ناقابل یقین ہرگز نہیں تھی مگر وہ ابا اور اماں کے مزاج سے خوب واقف تھا۔ وہ قانون کا بہت خیال کرتے تھے۔ صفورہ کو اس طرح چھوڑ کر آنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ اگر ابا کہتے کہ انہوں نے اس سلسلے میں باقاعدہ درخواست دے کر تحریری اجازت لی تھی تو وہ مطمئن ہو جاتا مگر ابا یوں حساب کتاب لگا کر اتنا بڑا خطرہ مول لینے والے نہیں تھے۔

عدم اطمینان اپنی جگہ لیکن رضوان یہ نہیں سمجھ سکا کہ گڑبڑ کیا ہے۔ جو کچھ ہوا تھا' وہ اس کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا پھر بھی اس نے فیصلہ کر لیا کہ چچا سے اس معاملے پر ضرور بات کرے گا۔ تبھی صحیح صورت حال سامنے آئے گی۔

ادھر سفیان احمد نے پہلی فرصت میں بھائی کے نام خط لکھ دیا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ وہ بہت مضطرب اور پریشان ہیں۔ انہیں جلد از جلد صفورہ کی خیریت سے مطلع کیا جائے اور یہ بھی بتایا جائے کہ وہ ٹرین پر سوار ہونے سے کیسے رہ گئی۔ فون پر اس طرح کی بات کرنا خطرناک تھا۔ ورنہ انہوں نے فون کیا ہوتا۔

اب وہ بے چینی سے بھائی کے جوابی خط کے منتظر تھے مگر میاں بیوی کی نیند اور بھوک اڑ چکی تھی۔ گھر کی فضا آسیبی ہو کر رہ گئی تھی۔ گھر میں کوئی رہا ہی نہیں تھا۔ سفیان صاحب اور رضوان دکان چلے جاتے تو ناظورہ بیگم گھر میں اکیلی رہ جاتیں اور ان کے پاس سوچنے کے لئے اندیشوں کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ سلمٰی آئی تو دو دن تک ان کا دل بہل گیا۔ لیکن دل کا بوجھ تو وہ اس کے سامنے بھی ہلکا نہیں کر سکتی تھیں۔

پڑوسنوں کو انہوں نے بتا دیا تھا کہ پاکستان میں صفورہ کا ایک بہت اچھا رشتہ آیا تھا اور انہوں نے وہیں اس کی شادی کر دی۔ شادی کی پوری تفصیل بھی انہوں نے خوب سنائی تھی۔

"لیکن باجی، تم خوش نظر نہیں آ رہی ہو۔" ایک پڑوسن نے انہیں ٹوک دیا۔

"کیسی باتیں کرتی ہو۔ میں بہت خوش ہوں۔ بیٹی کے نصیب کھل گئے۔" ناظورہ بیگم نے احتجاج کیا۔

"بیٹی کا بوجھ اتر جائے تو مائیں ہلکی ہو جاتی ہیں۔ تم تو مجھے اور بوجھل لگ رہی ہو۔"

ناظورہ بیگم کی سمجھ میں نہیں آیا کہ جواب میں کیا کہیں۔ ایسے میں دوسری پڑوسن نے ان کی طرف سے صفائی پیش کی "خوشی اپنی جگہ آپا۔" دوسری پڑوسن نے کہا "مگر ارمان بھی تو ہوتے ہیں۔ وہ تو نہیں نکل سکے ہوں گے پردیس میں۔"

"ہاں، یہ تو ہے۔" پہلی پڑوسن نے آہ بھر کے کہا "بابل کے گھر سے وداع ہونے کی تو بات ہی اور ہوتی ہے۔"

"پھر بھی، اللہ کا شکر ادا کرو بہن۔ بیٹی کی خوشیوں کے لئے دعا کرتی رہو۔" ایک اور پڑوسن نے نصیحت کی۔

ناظورہ بیگم نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ بات کچھ بن ہی گئی۔ پردہ رہ گیا مگر اندر کا وہ کیا کرتیں۔ اندر تو ہروقت ہول اٹھتے رہتے تھے۔



"راولپنڈی آنے والا ہے۔" مجیب کی آواز نے صفورہ کو چونکا دیا۔

اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ مجیب انور اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا "اوہ.... اچھا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"کہاں کھوئی ہوئی تھیں؟" مجیب نے پوچھا۔

"میں بیک وقت دو دنیاؤں میں رہ رہی ہوں۔" صفورہ نے کہا "ایک میں رہتی ہوں تو دوسری کے بارے میں سوچتی ہوں۔"

مجیب اسے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا پھر اس نے چانک کہا "برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟"

"ضرور کہیں۔"

"بات دہرا رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں۔" مجیب کہتے کہتے رکا۔ وہ جھجک رہا تھا۔

"میں چاہتا ہوں کہ...." وہ پھر جھجکا مگر پھر دل کڑا کر کے اپنی بات کہہ ہی دی "کہ تم خود کو میری بیوی ظاہر کرو۔ میرا مطلب ہے، کوئی ایسا سمجھے تو اس کی تردید نہ کرو۔"

صفورہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ پچھلی بار الجھنوں کی وجہ سے وہ اس بات کو اہمیت نہیں دے سکی تھی۔ اب خیال آ رہا تھا کہ یہ تو اس کی اپنی خواہش ہے۔ سب سے بڑی خواہش اور وہ اتنا.... گڑبڑا کر، گھبرا کر یہ بات کہہ رہا تھا۔

مجیب نے اس کی خاموشی کو ناراضی پر محمول کیا "دیکھو نا، دوسری صورت میں ہم دونوں ہی کو غلط سمجھا جائے گا۔" اس نے صفائی پیش کی۔

کاش، کبھی سچ مچ ایسا ہو سکے۔ صفورہ نے دل میں سوچا اور مجیب سے کہا "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ عزت کی بات تو کسی کو بھی بری نہیں لگتی۔ اعزاز سے کون انکار کرتا ہے۔"

اس کے لہجے میں کوئی بات تھی، جس نے مجیب کو اور گڑبڑا دیا۔ "بس تو یہ طے ہو گیا۔" اس نے جلدی سے کہا اور فوراً ہی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

گاڑی راولپنڈی پہنچ گئی۔ مجیب نے سامان سمیٹ کر یک جا کیا۔ چادر اور تکئے کو بستر بند میں رکھا اور سکون سے بیٹھ گیا۔ صفورہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ "کیا بات ہے؟ اتریں گے نہیں؟" اس نے پوچھا۔

"اتریں گے۔ ڈرائیور لینے کے لئے آئے گا۔" مجیب نے جواب دیا۔

ایک منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ مجیب نے بلند آواز میں کہا "آ جاؤ" دروازہ کھلا ہے۔"

دروازہ کھلا اور چالیس بیالیس سال کے ایک تندرست اور توانا شخص کا سرخ و سپید چہرہ نظر آیا "مجیب صیب؟" اس نے استفسار کیا پھر کوپے میں صفورہ کو دیکھ کر وہ بوکھلا گیا اور جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔

مجیب کو ہنسی آ گئی "آ جاؤ بھئی، میں ہی مجیب صیب ہوں۔" اس نے پکارا۔

دروازہ کھلا اور اس بار وہ شخص اندر آ گیا "میں افضل خان ہوں صیب۔ خلیل صیب کا.... آپ کا ڈریور۔"

"کیسے ہو افضل خان؟"

"ٹھیک ہوں صیب۔ سامان اٹھاؤں؟"

مجیب نے سامان کی طرف اشارہ کر دیا۔ افضل خان سامان سمیٹنے لگا۔

اسٹیشن کے باہر سوزوکی جیپ موجود تھی۔۔۔ پوٹوھار۔ افضل خان نے سامان رکھا اور ان کے لئے پچھلا دروازہ کھول دیا۔ "تشریف رکھو صیب۔"

وہ دونوں جیپ میں بیٹھ گئے۔ فضل خان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور انجن اسٹارٹ کیا۔ اسی لمحے مجیب نے اسے پکارا "سنو افضل خان' مری جانے سے پہلے ہمیں یہاں کچھ خریداری کرنی ہے۔"

"ٹھیک ہے صیب۔"



صفورہ حیران تھی۔ مجیب نے ضرورت کی ہر چیز کا خیال رکھا تھا۔ سب سے پہلے اس نے اس کے لئے ایک سوٹ کیس خریدا اور اس کے بعد روزمرہ کی ضرورت کی تمام چھوٹی موٹی چیزیں۔ اس نے اس کی کسی معمولی ضرورت کو بھی نظرانداز نہیں کیا۔ آخر میں وہ اسے ایک گارمنٹ اسٹور میں لے گیا "چلو۔۔۔ اب کپڑے بھی خرید لیں۔"

صفورہ کے لئے کپڑے بھی مجیب خود ہی پسند کرتا رہا۔ اس نے ایک بار بھی صفورہ سے اس کی پسند دریافت نہیں کی۔ نہ ہی کوئی مشورہ لیا۔ چار سوٹ خریدنے کے بعد وہ صفورہ کی طرف واپس مڑا۔ "اب ایک سوٹ تم بھی پسند کر لو صفیہ۔" اس نے صفورہ سے کہا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے۔ آپ ہی پسند کر لیں۔" صفورہ نے خشک لہجے میں جواب دیا۔

مجیب کو احساس ہو گیا کہ صفیہ کو اس کی من مانی اچھی نہیں لگی ہے مگر وہ کیا کرتا۔ صفیہ کے ذوق پر انحصار کرنا حماقت ہی ہوتی۔ وہ نجانے کیا پسند کرتی اور وہ بھی اس کے ساتھ تماشا بنتا۔ اس سے پہلے اسے بند کمرے کا تجربہ تھا لیکن اب اس لڑکی کے ساتھ تو اسے وقت گزارنا تھا اور باہر بھی آنا جانا تھا۔ بہرحال یہ سب وہ اس سے کہہ ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے برا لگتا "سوری صفیہ۔" اس نے نرم لہجے میں کہا "میں نے تم پر اپنی پسند صرف اس لئے تھوپی ہے کہ تمہیں مری کے موسم کا اندازہ نہیں ہے۔" وہ کہتے کہتے رکا۔ بات بہرحال سچی بھی تھی پھر اس نے مزید کہا "اگر تمہیں برا لگا ہے۔ یا یہ سوٹ اچھے نہیں لگے ہیں تو انہیں ڈراپ کر دو اور خود پسند کر لو۔"

"نہیں۔ یہ کپڑے تو بہت اچھے ہیں۔" صفورہ نے پوری سچائی سے کہا۔ تکدر بس اس بات کا تھا کہ مجیب اسے بدذوق کال گرل سمجھ رہا تھا۔

اس دوران میں مجیب کو ایک اور سوٹ پسند آیا اور بہت زیادہ پسند آیا۔ جی چاہا کہ

خرید لے لیکن اچھا نہیں لگا۔ وہ صفیہ کو بھی ایک موقع دینا چاہتا تھا "بس تو اب ایک سوٹ تم پسند کر لو۔" اس نے صفیہ سے کہا۔

صفورہ نے چند لمحے نظریں دوڑائیں۔ سیلز مین اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے ایک سوٹ کی طرف اشارہ کیا "یہ دکھایئے ذرا۔" اس نے بے حد اعتماد سے کہا۔

مجیب حیران رہ گیا۔ وہ وہی سوٹ تھا' جو اسے سب سے زیادہ پسند آیا تھا۔ صفیہ نے بس ایک سوٹ پسند کیا.... اور وہی پسند کیا۔ مجیب کو حیرت بھی ہوئی اور جھنجلاہٹ بھی۔ یہ لڑکی مسلسل اسے حیران کر رہی تھی۔ یہ کیسی کال گرل ہے۔ اس نے سوچا۔ خوش ذوق بھی ہے' خوش اطوار بھی اور خوش گفتار بھی۔ اس کے پاس لفظ بھی ہیں اور یہ انہیں برتنا بھی جانتی ہے۔

وہ اسٹور سے باہر آئے۔ مجیب نے پیکٹ جیپ میں رکھے پھر پرس سے دو ہزار روپے نکال کر صفیہ کی طرف بڑھائے۔ ہینڈ بیگ وہ پہلے ہی اسے لے کر دے چکا تھا "یہ لو۔ اب اپنے طور پر جو کچھ خریدنا چاہو' خرید لو۔ میں جیپ میں بیٹھا ہوں۔" اس نے کہا۔

صفورہ نے ممنونیت سے اسے دیکھا۔ اس سے پہلے وہ فکر مند تھی۔ اسے کچھ چیزوں کی ضرورت تھی' جو وہ مجیب کی سامنے نہیں لے سکتی تھی۔ اسے اس کی سمجھ داری پر پیار آ گیا "میں بہت شکر گزار ہوں مجیب صاحب۔ بے حد شکریہ۔"

اس لمحے مجیب کی جھنجلاہٹ عروج پر پہنچ گئی۔ لڑکی کا یہ رد عمل بھی مختلف تھا۔ اس قسم کی کوئی اور لڑکی ہوتی تو ایک خاص انداز سے نوٹ جھپٹتی اور خریداری کے لئے آگے بڑھ جاتی مگر اس کا رد عمل تو بیوی' ایک اچھی بیوی کا سا تھا۔ وہ ممنونیت.... وہ شکر گزاری' اسے سحاب کی یاد دلا رہی تھی "شکریئے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ رقم میں تمہارے آٹھ ہزار میں سے کاٹ لوں گا۔" اس نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

اور صفورہ اس کی بات سن کر یوں سمٹی جیسے اس نے اس کے جسم پر کوڑا مار دیا ہو۔ ایک لمحے کو اس نے زخمی نگاہوں سے مجیب کو دیکھا اور پھر پلٹ کر ایک اسٹور کی طرف چل دی۔

مجیب کو افسوس ہونے لگا۔ اس میں لڑکی کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ بس جیسی تھی' تھی' مگر وہ بھی کیا کرتا۔ اس لڑکی کے ساتھ اسے بہت وقت گزارنا تھا۔ یہ اس کی مجبوری تھی لیکن وہ تو ابھی سے اسے خوف زدہ کئے دے رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے اچھی لگے۔ جبکہ اس کا امکان قوی تر ہوتا جا رہا تھا۔

وہ دروازہ کھول کر جیپ میں بیٹھ گیا۔ اسے سحاب کی بات یاد آ گئی۔ اس نے کہا تھا کہ جو لڑکی پروفیشنل نہ ہو' جو مجبوری کے ہاتھوں اس پیشے میں آئی ہو اور اس سے خوش نہ ہو' وہ اس کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے' اسے پسند آ سکتی ہے' اس کے دل میں گھر کر سکتی ہے۔

صفیہ ابھی سے اسے ایسی ہی لڑکی معلوم ہو رہی تھی!

کوئی دس منٹ بعد صفیہ خریداری کر کے واپس آ گئی۔ مجیب نے اس کے لئے دروازہ کھولا "اب یہ سامان بھی اپنے سوٹ کیس میں رکھ لو۔" مجیب نے اس سے کہا پھر افضل خان کی طرف مڑا۔ "ہاں افضل خان' اب چل دو۔"



بنگلا بہت بڑا اور خوب صورت تھا۔ گیٹ سے داخل ہوتے ہی پورچ تھا۔ پورچ کے سامنے لان تھا۔ بنگلے میں بے حد وسیع و عریض ڈرائنگ روم' ٹی وی لاؤنج اور ایک اسٹڈی کے علاوہ چار بیڈ روم تھے۔ عقبی حصے میں باؤنڈری وال نہیں تھی۔ ایک بہت بڑا مسطح قطعہ زمین تھا' جو اپنے اختتام پر ایک پہاڑی ڈھلوان سے جا ملتا تھا۔ وہاں کئی پگڈنڈیاں تھیں' جو نیچے وادی کی طرف جاتی نظر آتی تھیں۔ ڈھلوان پر چیڑ کے اونچے درخت اتنی کثرت سے تھے کہ وادی نظر نہیں آتی تھی۔ بنگلے کی دونوں سائیڈوں میں سرونٹ کوارٹر بنے تھے۔

بنگلے میں ڈرائیور افضل خان کے علاوہ دو ملازم اور تھے.... شکور اور فاطمہ۔ وہ میاں بیوی تھے اور وہیں رہتے تھے۔ نیچے گاؤں میں ان کی آبائی زمین تھی۔ ان کے بچے وہیں رہتے تھے۔ شکور کی عمر پچاس کے لگ بھگ تھی۔ فاطمہ اس سے چند سال چھوٹی لگتی تھی۔ یہ میاں بیوی بنگلے کی رکھوالی کرتے تھے۔ صفائی ستھرائی' لان کی دیکھ بھال ان کے ذمے تھی۔ خلیل صاحب یا ان کا کوئی مہمان آتا تو فاطمہ ان کے لئے کھانا

پکاتی۔ باہر سے سودا سلف لانا شکور کے ذمے تھا۔ دونوں ایک جیسے تھے۔ خوش مزاج' ہمیشہ مسکرانے والے۔

مجیب کو مری پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی تھی۔ صفیہ راستوں سے ڈرتی رہی تھی۔ وہ ایک کونے میں سمٹی بیٹھی رہی تھی۔ مجیب نے اس کا خوف بھانپتے ہوئے اس سے پوچھا۔ "تم یہاں پہلی بار آئی ہو؟"

"جی.....جی ہاں۔"

"ڈر لگ رہا ہے؟"

"یہ راستے ہیں ہی اتنے خطرناک۔"

"اندھیرے کی وجہ سے زیادہ لگ رہے ہیں۔" مجیب نے کہا۔ "دن ہوتا تو خوب صورت لگتے۔ نظر ہٹائے نہ ہٹتی۔ خیر خود ہی دیکھ لینا۔"

کچھ اوپر گئے تو خنکی بڑھنے لگی "سردی لگ رہی ہے؟" مجیب نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" صفیہ کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

مجیب نے گرم شال نکال کر اسے دی۔ خود اس نے پنڈی سے نکلتے ہی سویٹر پہن لیا تھا۔

بنگلے پر پہنچنے کے بعد پہلے ملازمین سے تعارف ہوا پھر مجیب نے اپنے لئے بیڈ روم منتخب کیا۔ اپنا لکھنے کا سامان اس نے اسٹڈی میں پہنچا دیا۔ اسٹڈی اسے بہت پسند آئی تھی۔ میز کے سامنے کھڑکی تھی' جس سے عقبی باغیچہ نظر آتا تھا۔ لکھنے کے لئے بڑا آئیڈیل ماحول تھا۔

شکور نے کہا "صاحب جی' کھانا تیار ہے۔"

مجیب نے ذرا استعجاب سے اسے دیکھا "اوہ..... اچھا..... باتھ روم میں دس منٹ لگیں گے ہمیں۔"

"ٹھیک ہے صاحب۔ ہم کھانا لگاتے ہیں۔" شکور نے کہا پھر فاطمہ کی طرف مڑا۔ "چل فاطمہ!"

ان کے جانے کے بعد مجیب نے صفورہ سے کہا "جاؤ صفیہ' ہاتھ منہ دھو کر تازہ دم ہو جاؤ۔ کپڑے بھی بدل لو۔"

صفورہ اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں۔ اس کے انداز میں ہچکچاہٹ تھی۔ وہ مجیب کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟" مجیب نے پوچھا۔

"آپ اور میں..... ایک ہی کمرے میں!؟"

مجیب جھنجلا گیا "مجبوری ہے میری ورنہ میں اسے کبھی پسند نہ کرتا۔" اسے صفورہ کے اس انداز پر غصہ آیا تھا۔ وہ اسے ساتھ لایا ہی اسی لئے تھا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے مزید کہا "ویسے بھی تم جس حیثیت میں ہو' اس میں تمہیں یہ اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔" کہتے ہی اسے احساس بھی ہو گیا کہ اس نے بہت سخت اور ناروا بات کہہ دی ہے۔

صفورہ کے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی۔ آنکھیں نم ہو گئیں مگر وہ بولی تو اس کے لہجے میں مضبوطی تھی "میں آپ کو بتا چکی ہوں مجیب صاحب کہ ابھی میری وہ حیثیت نہیں' جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ میں شریف گھر کی ایک عام سی لڑکی ہوں' جو پہلی بار گھر کی چوکھٹ سے دور ہوئی ہے۔ اگر آپ یہ حقیقت قبول نہیں کر سکتے تو مجھے اجازت دیں۔ میں واپس چلی جاؤں گی۔"

"سوری صفیہ۔" مجیب نے ندامت سے کہا "لیکن میں بھی تم سے کوئی وعدہ کر چکا ہوں۔ تم میرے ساتھ محفوظ ہو مگر میں بات دہرانے کا عادی نہیں۔ مجھ سے یہ بات بار بار کہلوانے کی کوشش مت کرو۔" اس کا لہجہ نرم ہو گیا "اور سمجھنے کی کوشش کرو۔ یہاں سب تمہیں میری بیوی کی حیثیت سے جانتے ہیں۔"

صفورہ نے کچھ نہیں کہا۔ سوٹ کیس سے کپڑے نکالے اور باتھ روم میں چلی گئی۔ مجیب نے اپنے کپڑے نکالے اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔



کھانا مجیب کی توقع سے کہیں اچھا اور لذیذ تھا۔ بھوک بھی شدید تھی۔ اس نے ڈٹ کر کھایا۔ مرغی کا قورمہ تھا' چاول تھے' رائتہ تھا اور میٹھے میں کھیر۔ کھانے کی بعد فاطمہ اور شکور میز صاف کر رہے تھے۔ مجیب نے فاطمہ سے کہا "فاطمہ' کھانا تو تم بہت اچھا پکاتی ہو۔"

فاطمہ شرما گئی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے معصومیت اور بھولپن تھا "بڑی بیگم صاب نے سکھلیا ہے صاب جی۔ پر زیادہ نہیں آتا مجھے۔"

مجیب سمجھ گیا کہ بڑی بیگم صاب سے مراد خلیل صاحب کی بیگم ہوں گی "نہیں بھئی' بہت اچھا کھانا تھا۔"

"اور کچھ صاب جی؟"

"چائے پلا دو۔"

فاطمہ کے جانے کے بعد مجیب نے صفورہ سے کہا "تم نے ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا۔"

صفورہ... اسے اپنا حال کیا بتاتی۔ اس نے کھانا کھا لیا تھا۔ یہی بہت تھا۔ اس نے مجیب سے کہا "یہ بات نہیں۔ میری خوراک ہی کم ہے پھر کچھ اجنبیت بھی ہے۔"

چائے پینے کی بعد مجیب نے صفورہ سے کہا "چہل قدمی کرو گی؟"

صفورہ نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ دونوں عقبی باغیچے میں نکل آئے۔ باغیچہ پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ وہاں لگائے ہوئے پھول بھی تھے اور خود رو بھی۔ باغیچہ کافی بڑا تھا۔ ذرا فاصلے سے سنگیں بینچیں تھیں اور ہر بینچ کے قریب خوب صورت لیمپ پوسٹ تھے مگر روشنی کم تھی۔ وہ کچھ دیر تک ٹہلتے رہے پھر پہاڑی ڈھلوان کی طرف بڑھ گئے۔

اس وقت صفورہ کی عجیب کیفیت تھی۔ ہر دکھ' ہر پریشانی' ہر خدشہ دھل گیا تھا۔ اسے بس اتنا یاد تھا کہ وہ اس شخص کے ساتھ... بہت قریب ہے' جس سے وہ بے پناہ محبت کرتی ہے مگر جس کے ساتھ ایسی قربت اسے صرف خواب میں ہی نصیب ہو سکتی تھی۔ وہ تو جیسے بادلوں پر چل رہی تھی۔

ڈھلوان پر پہنچ کر وہ رک گئے۔ نیچے اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں چیڑ کے درخت متحرک گہری تاریکی کی طرح نظر آ رہے تھے... حرکت کرتے محسوس ہو رہے تھے۔

صفورہ نے جھرجھری لے کر کہا "کیسا ڈراؤنا منظر ہے۔"

مجیب ہنس دیا "ارے نہیں' صبح تم یہ سب کچھ دیکھو گی تو بہت حسین لگے گا مگر

میں تمہیں ابھی دکھاؤں گا... نیچے چل کر۔"

"نہیں۔ بس یہیں سے ٹھیک ہے۔" صفورہ نے گھبرا کر کہا۔

"تم یہیں رکو۔ میں فلیش لائٹ لے کر آتا ہوں۔" مجیب واپس جانے کے لئے مڑا پھر پلٹا "تمہیں ڈر تو نہیں لگے گا صفیہ؟"

صفورہ کو ڈر تو لگ رہا تھا مگر وہ بولی "نہیں... لیکن اس کی کیا ضرورت ہے۔ باغیچے میں ہی چہل قدمی ہو جائے گی۔"

"میں نے کھانا زیادہ کھا لیا ہے۔ نیچے اتر کر اوپر چڑھیں گے تو گرانی دور ہو جائے گی پھر یہاں کی بھوک کا کرشمہ دیکھنا تم۔" مجیب کہتے کہتے رکا "لیکن تم نہیں چاہتیں تو کوئی بات نہیں پھر سہی۔"

صفورہ نیچے جانا نہیں چاہتی تھی لیکن ایک تو مجیب کا ساتھ اسے اچھا لگ رہا تھا۔ دوسرے وہ اس کی خوشی خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے دھیرے سے کہا "آپ ٹارچ لے آئیں۔"

مجیب نے ممنونیت سے اسے دیکھا اور بنگلے کی طرف چلا گیا۔ صفورہ وہیں کھڑی نیچے ڈھلوان کو دیکھتی رہی۔ ذرا دیر میں اس کی نظر اندھیرے کی عادی ہو گئی تو اسے نیچے کچھ کچھ نظر آنے لگا۔ نیچے دیکھتے ہوئے اسے جو پہلا خیال آیا' وہ اپنے خوابوں کا تھا۔ حالانکہ یہ ویسا جنگل نہیں تھا لیکن پھر بھی ویسا ہی لگ رہا تھا' جیسا اس نے خواب میں دیکھا تھا' جہاں وہ اکیلی تھی اور ڈر رہی تھی۔

اچانک اسے ڈر لگنے لگا۔ یہ خواب نہیں تھا' حقیقت تھی اور وہ اکیلی تھی۔ نیچے دیکھتے ہوئے اسے خیال آیا کہ یہاں جنگلی وحشی جانور بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ آئی۔ اسی لمحے مجیب فلیش لائٹ لے کر آ گیا "کیا ہوا؟ ڈر رہی ہو؟" مجیب نے پوچھا۔

صفورہ نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا "یہاں جنگلی جانور بھی تو ہوں گے۔" اس نے کہا۔

"نہیں۔ یہاں نہیں ہیں۔ اوپر نتھیا گلی کی طرف بندر اور ریچھ ضرور ہوتے ہیں۔ آؤ چلیں۔"

صفورہ ڈر رہی تھی۔ انکار کرنا چاہتی تھی لیکن پھر اس نے سوچا' وہ شخص ساتھ ہے' جس کے قرب کی آرزو وہ کرتی رہی ہے۔ یہ تو کفران نعمت ہو گا۔

مجیب نے فلیش لائٹ روشن کر دی تھی۔ فلیش بہت طاقت ور تھی۔ ایک پل میں پورا منظر جگمگا گیا۔ صفورہ کو اپنے خوف پر ہنسی آ گئی۔ وہاں ڈرنے والی تو کوئی بات نہیں تھی۔

وہ نیچے اترنے لگے۔ اوپر درختوں کا جھنڈ اتنا گھنا تھا کہ لگتا تھا' نیچے اترنے کا راستہ ہے ہی نہیں۔ نیچے دیکھنا بھی ناممکن تھا مگر پہلے جھنڈ کے بعد درختوں کا درمیانی فاصلہ بتدریج بڑھنے لگا۔ نیچے کا منظر بھی نظر آنے لگا۔

اچانک ایک درخت کے پاس مجیب رک گیا۔ صفورہ نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

"نیچے تک کا فاصلہ میرے اندازے سے بھی زیادہ ہے۔" مجیب گہری سانس لے کر بولا "دن میں دیکھیں گے۔ اس وقت مناسب نہیں۔"

صفورہ کو مایوسی ہوئی۔ اب وہ نیچے جانے کا موڈ بنا چکی تھی۔ تاہم اس نے کچھ کہا نہیں۔

مجیب نے اس کی کیفیت سمجھ لی "عجیب لڑکی ہو تم بھی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "یا تو ڈر رہی تھیں۔ یا اب مایوس ہو رہی ہو۔"

"نہیں۔ کوئی بات نہیں۔"

واپس جاتے ہوئے' ذرا دیر میں ہی صفورہ کو اندازہ ہو گیا کہ مجیب کا فیصلہ درست تھا نیچے تو فلیش لائٹ کے باوجود زمین نظر نہیں آ رہی تھی۔ یقیناً بہت زیادہ فاصلہ تھا۔ جبکہ جتنا وہ چلے تھے' اس نے ہی اسے تھکا دیا تھا۔

اچانک مجیب نے کہا "ایک بات کہوں۔ برا تو نہیں مانو گی؟"

صفورہ نے چلتے چلتے چونک کر اسے دیکھا "جی نہیں۔ کہئے۔"

"تم یہاں فون کبھی نہ ریسیو کرنا۔ میں نہیں چاہتا کہ میری بیوی تمہاری آواز بھی سنے۔"

صفورہ کو تکلیف ہوئی.... اپنے لئے نہیں۔ مجیب اس وقت اسے ایک عام آدمی' ایک بے وفا شوہر لگا' جو بیوی کو اپنی رنگ رلیوں سے بے خبر رکھنا چاہ رہا ہو۔

باقی راستہ خاموشی میں کٹا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ کچھ سوچ رہے تھے۔

کمرے میں پہنچ کر مجیب نے پہلا کام یہ کیا کہ گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری ہی گھنٹی پر ریسیور اٹھا لیا گیا۔

صفورہ اس وقت باتھ روم میں تھی۔



بچوں نے اودھم مچا رکھا تھا۔ سحاب جھنجلا رہی تھی۔ تنگ آ کر اس نے بچوں کو ڈانٹا "کیا مصیبت ہے۔ تم لوگ سوتے کیوں نہیں۔ صبح اسکول جانا ہے۔"

"امی۔۔۔ نیند ہی نہیں آ رہی ہے۔" شاہد نے معصومیت سے کہا۔

سحاب کو اس پر پیار آ گیا۔ اس نے اسے لپٹا لیا۔ اس کا یہ بیٹا اظہار سے گھبراتا تھا۔ کبھی کسی کو بہت یاد کر رہا ہو تو اس کا نام بھی زبان پر نہ لاتا لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کی اور بچوں کی ایک ہی کیفیت ہے۔ وہ سو ہی نہیں سکتے تھے۔ انہیں فون کا انتظار تھا.... اس کی طرح۔

"امی' ابو فون کب کریں گے؟" حامد نے پوچھ ہی لیا۔

سحاب نے گھڑی دیکھی۔ دس بج رہے تھے۔ اب تک فون آ جانا چاہئے تھا۔ اسی لئے تو اسے تشویش ہو رہی تھی۔ تاہم اس نے پرسکون لہجے میں بچوں کو تسلی دی "آتا ہو گا بیٹے۔ جیسے ٹرین لیٹ ہو جاتی ہے' فون بھی لیٹ ہو جاتا ہے۔"

اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری گھنٹی بجتے ہی سحاب نے ریسیور اٹھا لیا "ہیلو؟"

"سحاب' میں بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے مجیب کی آواز سنائی دی۔

"معلوم ہے۔ مجھے یقین تھا کہ یہ آپ کا فون ہو گا۔ سفر کیسا رہا؟"

"میری آواز سے اندازہ نہیں ہو رہا ہے۔"

اتنی دیر میں بچوں نے ہنگامہ کر دیا۔ سحاب کے لئے سکون سے بات کرنا ممکن نہیں رہا "پہلے بچوں سے بات کر لیں آپ۔" اس نے ماؤتھ پیس میں کہا اور ریسیور شاہد کی طرف بڑھا دیا پھر وہ بیٹھی بچوں کو بات کرتے دیکھتی رہی "دیکھو' تھوڑا تھوڑا اچھا ہوتا ہے۔" اس نے انہیں نصیحت کی "فون پر لمبی بات اچھی نہیں ہوتی۔"

"لیکن امی...."

"لمبی بات کرو گے تو ابو ہر روز فون نہیں کر سکیں گے پھر ابو کی آواز سنے بغیر سونا پڑے گا۔"

یہ دھمکی کارگر ہوئی۔ مختصر بات کے باوجود بچے خوش تھے۔ وہ فوراً ہی سونے کے لئے لیٹ گئے۔ دوسری طرف سے مجیب نے بھی انہیں دھمکی دی تھی کہ اگر وہ ٹھیک وقت پر نہیں سوئیں گے تو وہ آئندہ فون نہیں کرے گا۔

بچوں کے جانے کے بعد سحاب نے بات کی۔ مجیب گھر اور بچوں کے لئے فکر مند تھا۔ سحاب نے اسے اطمینان دلایا پھر پوچھا۔ "رات کا کیا ہو گا؟؟"

"سب ٹھیک ہے۔ انشاء اللہ سکون سے سو جاؤں گا۔"

"اس کا مطلب ہے' کوئی رفیق مل گیا ہے۔" سحاب نے شوخ لہجے میں کہا۔

"ہاں' یہی بات ہے۔" دوسری طرف سے مجیب نے مختصراً کہا۔

"کیسی ہے؟؟"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی۔ سحاب نے خود ہی اس خاموشی کو توڑا "سمجھ گئی۔ وہ قریب ہی موجود ہو گی۔ اس لئے اس پر تبصرہ نہیں کرنا چاہتے۔"

"ہاں' بس سمجھ لو' ویسی ہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ بس یہ یاد رکھئے گا' میں آپ کو شیئر نہیں کر سکتی۔ مجھے یہ گوارا نہیں ہو گا کہ آپ کسی اور سے بھی محبت کریں۔"

"خوامخواہ.... خود ہی مجھے مشورہ دیا' حوصلہ افزائی کی اور اب...."

"ارے نہیں۔ میں تو یونہی کہہ رہی تھی۔ جانتی ہوں آپ کو۔ اسی لئے مشورہ دیا تھا۔" سحاب نے جلدی سے کہا۔

"اچھا' میں کل پھر فون کروں گا۔ دیر ہو جائے تو پریشان نہ ہونا۔ تم جانتی ہو' کام کے دوران میں مجھے ہوش نہیں رہتا۔"

"میں تو پریشان نہیں ہوں گی لیکن بچے آپ کی آواز سنے بغیر نہیں سوئیں گے۔"

"میں یاد رکھوں گا۔ اچھا اللہ حافظ!"

"اللہ حافظ۔" سحاب نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ اداس ہو گئی تھی۔ ابھی دوسرا ہی دن تھا اور وہ مجیب کو بری طرح مس کر رہی تھی۔ پچھلی بار ایسا نہیں ہوا تھا۔ شاید اس

لئے کہ وہ جانتی تھی کہ چند دنوں کی بات ہے۔ جبکہ اس بار لمبے عرصے کی جدائی تھی۔

"امی آ جائیں۔ مجھے اکیلے نیند نہیں آتی۔" شاہد کی پکار نے اسے چونکا دیا۔ اس نے سر جھٹک کر گہری سانس لی اور بیڈ روم کی طرف چل دی۔



مجیب نے ریسیور رکھ کر گہری سانس لی۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ سحاب کو صفیہ کے بارے میں بھی بتانا پڑے گا مگر وہ بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ بتاتا کہ صفیہ ایک شریف گھرانے کی ایک ایسی عام سی لڑکی ہے' جس نے اپنی دانست میں گندگی کے راستے پر ابھی پہلا قدم رکھا ہے۔ وہ خوش شکل' خوش گفتار' خوش اطوار اور خوش ذوق ہے۔ پڑھی لکھی ہے۔ لگتا ہے کہ ادبی ذوق بھی رکھتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اسے پسند کرنے سے بچنے کے لئے بڑے جتن کر رہا ہے۔

یہ سب سن کر تو سحاب بھڑک جاتی۔ اس کا ایک مشورہ تو اس نے مان لیا تھا مگر اس نے یہ مشورہ بھی تو دیا تھا کہ اس طرح کی لڑکیوں سے بچے' لیکن اسے صفیہ مل گئی تھی' جو ویسی ہی تھی' جس سے سحاب نے بچنے کا مشورہ دیا تھا۔

ایک لمحے کو مجیب کو اپنے ضمیر پر بوجھ محسوس ہوا مگر فوراً ہی اسے خیال آیا کہ اسے انتخاب کا تو موقع بھی نہیں ملا۔ یہ تو قسمت کا کھیل ہے کہ صفیہ ہی اس کے پاس آئی اور صفیہ بھی کم از کم بظاہر تو اس کے ساتھ آنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ وہ خوشامد کر کے' اپنی مجبوری بتا کے اسے اپنے ساتھ لایا تھا اور وہ جس وقت اس کے پاس اس کے کوپے میں آئی تھی' اس وقت وہ خوف کی بدترین کیفیت سے دوچار تھا۔ وہ اسے کیسے جانے دیتا۔

جس وقت فون پر سحاب نے پوچھا تھا کہ وہ کیسی ہے تو وہ گڑبڑا گیا تھا۔ اس نے سحاب سے کبھی کسی معاملے میں جھوٹ نہیں بولا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے "ویسی ہی ہے" کہہ کر بہرحال سچا جواب دیا تھا۔ کیونکہ "ویسی ہی ہے" کے دو حوالے موجود تھے۔ سحاب اس سے مطمئن ہو گئی' اچھا ہوا۔ سحاب نے خود فرض کر لیا کہ لڑکی قریب ہی موجود ہے' اس لئے وہ واضح جواب دینے سے گریز کر رہا ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

اب ایک سوال اسے پریشان کر رہا تھا۔ سحاب اس سے تفصیل ضرور پوچھے گی۔ تو وہ اسے کیا بتائے گا۔ سچ بولے گا تو سحاب پریشان رہے گی۔ ممکن ہے' عدم تحفظ کا شکار بھی ہو جائے تو کیا اب اسے سحاب سے جھوٹ بھی بولنا پڑے گا۔

وہ پہلے فون پر گفتگو میں اور اب اس الجھن میں اتنا منہمک تھا کہ اسے گرد و پیش کا احساس ہی نہیں تھا مگر اب چانک اس کی نظر باتھ روم کی طرف اٹھی تو اسے صفیہ نظر آئی۔ وہ ہاتھ میں ٹوتھ برش لئے ساکت کھڑی تھی۔

وہ جھنجلا گیا۔ تو کیا صفیہ اس کی باتیں غور سے.... دھیان سے سن رہی تھی۔ حالانکہ اس میں ایسی کوئی بات نہیں تھی پھر بھی مجیب کو غصہ آنے لگا "کیا کر رہی ہو؟" اس نے صفیہ کو پکارا "دانت برش کرو نا۔"

○

باتھ روم میں دانت برش کرتے ہوئے صفورہ نے مجیب کی فون پر بات کرنے کی آواز سنی۔ وہ وہاں سے ہٹ جانا' کمرے سے نکل جانا چاہتی تھی لیکن اس کے برعکس اس کے ہاتھ کی رفتار سست ہو گئی۔ تجسس اس کے پیروں کی زنجیر بن گیا تھا۔

مجیب نے اپنے بچوں سے بات کی۔ اس کی بات سنتے ہوئے صفورہ اندازہ کر سکتی تھی کہ دوسری طرف سے کیا کہا گیا ہو گا۔ مجیب کے لہجے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ بچوں سے کتنی محبت کرتا ہے۔

بچوں سے مختصر بات کے بعد مجیب پھر بیوی سے بات کر رہا تھا۔ وہ ویسی ہی چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں' جو بچھڑے ہوئے میاں بیوی کے درمیان ہوتی ہیں۔ مجیب بے ساختہ گفتگو کر رہا تھا۔ صفورہ اسے بہت غور سے دیکھتی رہی مگر وہ اتنا منہمک تھا کہ اسے اس کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوا۔

پھر اچانک بات کرتے کرتے مجیب یوں خاموش ہوا' جیسے اسے کوئی جواب نہ سوجھ رہا ہو۔ اس کے چہرے پر الجھن کا تاثر تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھا مگر باتھ روم میں صفورہ کی موجودگی کا اسے اب بھی احساس نہیں ہوا۔ چند لمحے گڑبڑانے کے بعد اس نے ماؤتھ پیس میں کہا "ہاں' بس سمجھ لو' ویسی ہی ہے۔"

دوسری طرف سے کئے گئے سوال کو سمجھنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا' صفورہ کی

سمجھ میں یہ بھی نہیں آیا کہ مجیب نے یہ جملہ کس سلسلے میں کہا ہے۔ اسے بس اتنا احساس ہوا کہ جیسے یہ جملہ کوڈ میں بولا گیا ہے مگر کیوں؟ کیا اس کے متعلق بات کی جا رہی تھی لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ مجیب کی بیوی کو اس کے متعلق کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔

مجیب نے اگلے روز فون کرنے کا کہہ کر ریسیور رکھ دیا مگر صفورہ اسی مکالمے کے متعلق سوچتی اور الجھتی رہی۔

"کیا کر رہی ہو؟ دانت برش کرو نا۔"

پہلے تو صفورہ کو احساس ہی نہیں ہوا مگر دوسری پکار پر اسے احساس ہوا کہ مجیب اس سے مخاطب ہے "جی.... جی ہاں۔" وہ.... گڑبڑا کر بولی۔

"کیا تم ہمیشہ اتنی تفصیل سے اور اتنا سوچ سوچ کر دانت برش کرتی ہو؟" مجیب کے لہجے میں خفیف سا طنز تھا۔

"جی نہیں۔ میں جان بوجھ کر دانت برش کرتے کرتے رک گئی تھی۔ آپ چاہتے ہیں نا کہ آپ کی مسز کو میری موجودگی کا علم نہ ہو' میری آواز تک انہیں سنائی نہ دے۔" صفورہ نے کھلا طنز کیا۔

مجیب کھسیا گیا "خیر.... ٹھیک ہے۔"

پانچ منٹ بعد صفورہ باتھ روم سے نکلی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ مجیب نے دو تکیے رکھ کر ایک بستر کاؤچ پر بنا دیا ہے۔ مجیب نے اس کی حیرت بھانپ لی "حیرانی کی کوئی بات نہیں۔ میں یہاں سوؤں گا۔"

صفورہ چند لمحے خاموش رہی پھر بولی "یہاں میں سو جاؤں گی۔ آپ بیڈ پر سو جائیں۔"

"نہیں بھئی۔ تم میری مہمان ہو۔ میں تمہیں تکلیف نہیں دینا چاہتا۔"

"اور آپ کو جو تکلیف ہو گی۔"

"مجبوری بھی تو میری ہے۔"

صفورہ نے مزید کچھ نہیں کہا۔ کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔

سونے کے لئے لیٹتے ہوئے مجیب نے پوچھا "تم روشنی میں سوتی ہو یا اندھیرے

میں؟"

"روشنی میں تو مجھے نیند ہی نہیں آتی۔"

"یہ بھی اچھا ہے۔ میں بھی پوری طرح اندھیرا کئے بغیر نہیں سو سکتا۔" مجیب نے کہا اور اٹھ کر لائٹ آف کر دی۔

اندھیرا ہوا تو صفورہ کا دماغ بھی جیسے تاریک ہو گیا۔ وہ روشنی کے بعد کا اچانک اندھیرا تھا' جس میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا مگر اسے اپنے لوگوں کے پریشان چہرے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ابا کا' اماں کا' رضوان بھائی اور صابر بھائی کا چہرہ۔ چچا' چچی اور چچا زاد بھائیوں کے چہرے۔ وہ سب ہراساں تھے۔ پریشان تھے۔ وحشت بھرے لہجے میں اس سے پوچھ رہے تھے.... یہ تم نے کیا کیا صفورہ؟ ہمیں تو کچھ پتہ ہی نہیں کہ تم پر کیا بیتی۔ جیتی بھی ہو یا مرگئی ہو مگر یہ تو بتاؤ کہ ہم کیا کریں؟ دنیا کو کیا بتائیں۔ کیا منہ دکھائیں؟ ہم تو بے عزت ہو کر زندہ درگور ہو گئے۔

وہ سب اس کے گرد جمع تھے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ گھیرا تنگ کر رہے تھے۔ ان کے چہروں پر اب پریشانی کی بجائے وحشت اور غیظ و غضب کا تاثر نظر آ رہا تھا۔ ان کے ہاتھ یوں آگے کی طرف پھیلے ہوئے تھے' جیسے اس کا گلا گھونٹنے والے ہوں۔

صفورہ کے چہرے پر پسینہ پھوٹ پڑا۔ وہ واقعی مجرم تھی۔ ان سب کی مجرم۔ نتائج کچھ بھی ہوں لیکن وہ سمجھتی تھی کہ اس کا قصور اتنا بڑا تو نہیں تھا۔ اس نے گھبرا کر کروٹ بدلی تو وہ سب نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ سامنے کاؤچ پر مجیب لیٹا نظر آیا۔ ایک لمحے کو وہ حیران ہوئی مگر فوراً ہی بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ یہ نہیں تھا کہ روشنی ہو گئی ہو۔ بس اتنا ہوا تھا کہ نگاہ نے اس تاریکی سے سمجھوتا کر لیا تھا.... اس کی عادی ہو گئی تھی۔ اس لئے جہاں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا' وہاں اب مجیب دکھائی دے رہا تھا لیکن وہ بھی بس ہیولا سا تھا۔ اس کا چہرہ' اس کی آنکھیں اسے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ سو رہا ہے یا جاگ رہا ہے پھر بھی اسے دیکھ کر اس کی وحشت کم ہو گئی۔

لیکن وہ اب بھی پریشان اور خوف زدہ تھی۔ یہ اپنوں سے' اپنے گھر سے دور

ایک اجنبی مقام پر اس کی پہلی رات تھی اور وہ بند کمرے میں ایک غیر مرد کے ساتھ تھی۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں تھی مگر یہ سب کیسے ہوا؟ اس نے یہ تو نہیں چاہا تھا۔ اس نے تو بس چھوٹی سے ایک آرزو کی تھی۔ اس کا یہ انجام ہوا!

تصور کے پردے پر فلم سی چلنے لگی اور وہ یہ فلم خود ہی نہیں دیکھ رہی تھی' اماں کو بھی دکھا رہی تھی۔ ایک وہی اس کی بات سمجھ سکتی تھیں۔ فلم چلتی رہی اور بالآخر اس تاریک خواب گاہ تک آ کر ختم ہو گئی' جہاں کاؤچ پر مجیب انور سو رہا تھا۔

"اب بتاؤ اماں' میری یہ نیت تو نہیں تھی۔" اس نے ماں سے فریاد کی۔ "وقت کا گرداب اب مجھے اڑا کر یہاں تک لے آیا۔ میں بے قصور ہوں۔"

"ننھے بچوں کی طرح بے سوچے سمجھے آرزو کرنے والے عاقل و بالغ لوگ بے قصور نہیں ہوتے پھر آرزو میں اور اٹھے ہوئے قدموں میں بہت فرق ہوتا ہے۔" اماں نے سرد لہجے میں کہا "تجھے اس سمت قدم اٹھاتے وقت گھر کا' ہمارا اور ہماری عزت کا خیال نہیں آیا!" اماں کے لہجے میں ملامت در آئی۔

"اماں' میں سوچ کر تو نہیں بڑھی تھی۔ میں تو بس ان کی ایک جھلک دیکھنا اور دو باتیں کرنا چاہتی تھی۔" اس نے صفائی پیش کی۔

"مگر تیری یہ خواہش بھی غلط تھی۔ تو قصور وار ہو کر بھی خود کو بے قصور سمجھ رہی ہے۔"

"لیکن اماں' میں نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں بے داغ ہوں۔"

"یہ سب میں تو سمجھ سکتی ہوں' دنیا کو نہیں سمجھا سکتی۔ دنیا کو کیا' میں تو تیرے ابا کو بھی نہیں سمجھا سکتی۔"

"میں کیا کروں اماں۔ اب کیا ہو گا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ تو ہمارے لئے مرچکی ہے.... سب کے لئے.... پوری دنیا کے لئے۔ اب کبھی زندہ مت ہونا۔"

اور اماں کا ہیولا بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ سامنے بس کاؤچ پر دراز مجیب رہ گیا۔

اماں نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ صفورہ نے سوچا۔ میں مرچکی ہوں' سب کے لئے....

پوری دنیا کے لئے اور وہ اپنی زندہ اور جوان موت کا ماتم کرنے لگی۔۔۔۔ رونے لگی۔ پھوٹ پھوٹ کر۔ یہ کیسی تنہائی ہے کہ میں زندہ ہوں مگر پوری دنیا کے لئے مر چکی ہوں۔ وجود ہی نہیں رکھتی۔ وہ خود ترسی میں مبتلا ہو کر سوچتی اور روتی رہی۔ خودکشی کر لوں۔ اس لمحے اس نے پوری سچائی سے ارادہ کر لیا کہ وہ مر جائے گی۔ خودکشی کر لے گی۔

اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد اسے توبہ کا خیال آیا۔ لبل نے ٹھیک کہا تھا۔ نیت اپنی جگہ لیکن اس کے عمل میں خرابی تو تھی۔ کیسے بچوں کی طرح اس نے آرزو کی تھی۔ ایسی آرزو' جس کا اسے کوئی حق نہیں تھا۔ وہ اللہ کے حضور گڑگڑانے لگی۔ آنسو اس کے رخساروں پر تیزی سے بہہ رہے تھے۔ تکیہ اور اس کے بال بھیگے جا رہے تھے۔ وہ اللہ سے اپنے اس گناہ پر مغفرت طلب کرتی رہی۔

اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کی توبہ قبول ہو گئی ہے۔ اسے یک لخت قرار سا آ گیا تھا۔ اس نے کہیں پڑھا تھا کہ توبہ قبول ہو جائے تو گناہ یادداشت سے مٹ جاتا ہے اور بندے کو سکون آ جاتا ہے۔

اور اسے سکون آ گیا تھا!

ایک بار پہلے بھی اسے ایسے ہی سکون آیا تھا اور یہ احساس ہوا تھا کہ اس کی دعا قبول ہو گئی ہے اور وہ دعا مجیب سے ملنے کی تھی۔ اس دعا کی قبولیت کا ثبوت اس وقت اس کے روبرو تھا۔ اس نے کاؤچ پر لیٹے مجیب کو دیکھا۔ وہ اس کے سامنے تھا۔ بے حد قریب مگر یہ کیسی قبولیت تھی۔ کتنا کچھ اس نے کھویا تھا' تب وہ دعا قبول ہوئی تھی اور یوں قبول ہوئی تھی کہ اس کے پاس مجیب کے سوا کچھ بھی نہیں بچا تھا۔

صفورہ کو اپنی وہ دعا یاد آئی۔ آئی اور لفظ بہ لفظ یاد آئی۔ اس نے دعا کی تھی۔۔۔۔

اے اللہ' زندگی میں ایک بار' صرف ایک بار ہی سہی' مجھے مجیب انور سے ضرور ملا دینا۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ اس سے مل کر نہ میں کبھی مایوس ہوں گی اور نہ ہی کبھی کوئی شکایت کروں گی۔

اپنی دعا کے آخری الفاظ یاد کر کے اس پر لرزہ چڑھنے لگا۔ اس نے اللہ سے وعدے کا پاس بھی نہیں رکھا تھا۔ وہ مایوس بھی تھی اور شکایت بھی کر رہی تھی۔

حالانکہ شکایت کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس نے جو مانگا تھا' وہی پایا تھا۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ دعا کرتے وقت بہت محتاط رہنا چاہئے۔ اس نے جو مانگا' اسے مل گیا۔ اب شکایت کیسی؟ اور مایوسی کا کیا جواز؟ اللہ نے ایک بار دعا سنی تھی۔ اسے بندوں کا دعا کرنا بہت پسند ہے۔ وہ اب بھی اس کی سنے گا۔

یہ سب سوچتے ہوئے اس کے اندر بہت بڑی تبدیلی آئی۔ مایوسی چھٹ گئی اور اسے اپنا وجود روشن روشن لگنے لگا۔ یہ درست کہ اس نے سب کچھ کھو دیا تھا مگر اسے وہ ملا تھا' جو اس نے مانگا تھا۔ سو اسے خوش رہنا تھا اور اللہ کا شکر ادا کرنا تھا اور دعا تو وہ اب بھی کر سکتی تھی۔

سوتے ہوئے مجیب کو دیکھتے دیکھتے اور دعائیں سوچتے سوچتے وہ سو گئی۔ اس کے بعد آنکھ سردی کے احساس سے کھلی۔ سردی اچانک ہی بڑھ گئی تھی۔ اس نے پیروں کے پاس پڑے کمبل کو اٹھا کر کھولا اور اوڑھ لیا پھر اس کی نظر مجیب پر پڑی جو گھٹنے پیٹ سے لگائے سو رہا تھا۔ یعنی اسے سردی لگ رہی تھی مگر نیند اتنی گہری تھی کہ اس کی آنکھ نہیں کھلی۔ وہ اٹھی اور اس نے اسے بھی کمبل اوڑھا دیا۔

اس بار وہ فوراً ہی سو گئی!

○

مجیب سورج نکلنے سے پہلے ہی اٹھ گیا۔ پہلی حیرت تو اسے یہ دیکھ کر ہوئی کہ وہ کمبل میں لپٹا ہوا ہے۔ اسے یاد تھا کہ وہ سونے کے لئے لیٹا تو اس کے پاس کمبل تھا ہی نہیں۔ اس نے بیڈ کی طرف نگاہ کی تو دوسری حیرت سے سابقہ پڑا۔ صفیہ وہاں موجود نہیں تھی۔

اس نے جھنجلا کر کمبل ہٹایا مگر فوراً ہی سردی کا احساس ہونے لگا تو یہ بات ہے۔ اس نے سوچا۔ رات میں کسی وقت سردی ہو گئی تھی۔ شاید صفیہ سردی کے احساس سے اٹھی ہو گی اور اس نے ہی اسے کمبل اڑھایا ہو گا۔

وہ اٹھا اور تیزی سے باتھ روم کی طرف لپکا۔ وہاں بھی ٹھنڈے پانی سے سابقہ پڑا۔ بہرکیف ٹھنڈے پانی نے اسے تازہ دم بھی کر دیا۔ باتھ روم میں اسے ایک خلش ستاتی رہی۔ باتھ روم سے نکلتے ہی اس نے کمرے کے دروازے کو چیک کیا۔ اسے یہ فکر تھی کہ صفیہ کمرے سے گئی ہو گی تو دروازہ کھلا رہ گیا ہو گا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ملازموں میں سے کوئی آئے اور کاؤچ پر بچھے بستر کو دیکھے۔ اس صورت میں وہ کم از کم یہ ضرور سوچے گا کہ میاں بیوی میں لڑائی ہو گئی ہے اور مجیب یہ نہیں چاہتا تھا۔

یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوا کہ دروازے میں چٹکی والا لاک تھا‘ جس میں باہر کوئی ہینڈل‘ کوئی ناب نہیں ہوتی۔ کمرے سے کوئی نکل کر جائے اور دروازہ بند کر دے تو اس صورت میں دروازہ بغیر لاک کے نہیں کھولا جا سکتا۔

دروازے کی طرف سے مطمئن ہو کر اس نے تکیہ اور کمبل کاؤچ سے اٹھایا اور بیڈ پر رکھ دیا پھر اس نے ڈریسنگ ٹیبل کی تلاشی لی۔ وہاں چابی موجود تھی۔ اس نے سویٹر پہنا اور چابی جیب میں رکھ کر وہ باہر نکل آیا۔ چابی کے معاملے میں احتیاط بہت ضروری تھی۔ ویسے اسے یقین تھا کہ باہر بھی کم از کم دو چابیاں موجود ہوں گی۔ شاید ایک شکور کے پاس ہو۔

باہر شکور مل گیا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا "بی بی صاب باغیچے میں ہیں صاب جی۔" اس نے بتایا پھر پوچھا "فاطمہ سے ناشتے کا کہوں صاب؟"

"ابھی نہیں۔ پہلے صبح کی سیر کر لیں ہم۔" یہ کہہ کر مجیب عقبی باغیچے کی طرف چل دیا۔

صفورہ عقبی باغیچے میں پھولوں کے پاس کھڑی نظر آئی۔ قدموں کی آہٹ سن کر وہ مڑی اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی "صبح بخیر‘ صاحب۔"

مجیب چڑ گیا "یہ کیا انداز ہے تخاطب کا؟"

"تو اور کس طرح مخاطب کروں آپ کو؟" صفورہ نے سادگی سے پوچھا۔

"یہ بھی مجھے ہی بتانا ہو گا۔" مجیب اور جھنجلا گیا۔

"اعتراض کریں گے تو بتائیں گے بھی نہیں۔" صفورہ کی لہجے میں خفیف سی شکایت تھی۔ اس کی سمجھ میں اس کے چڑنے کا سبب نہیں آیا تھا۔

"مجیب صاحب نہیں کہہ سکتیں؟"

"جو ظاہری رشتہ آپ نے قائم کیا ہے‘ اس میں یہ عجیب نہیں لگے گا نوکروں کو۔"

"مگر اکیلے میں تو اور بات ہے۔" مجیب کی جھنجلاہٹ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

"مجھ میں منافقت کی کمی ہے صاحب۔ یہ مشکل ہے کہ ملازمین کے سامنے کچھ کہوں اور اکیلے میں کچھ۔" صفورہ نے نہایت اطمینان سے کہا۔

مجیب کو احساس ہو گیا کہ وہ جنگ مغلوبہ لڑ رہا ہے‘ جو بے سود ہے۔ "چلو‘ چھوڑو اس بات کو۔" اس نے کہا۔

"مگر اب یہ تو بتا دیں کہ میں آپ کو کس طرح پکاروں۔"

"جس طرح پکار رہی ہو‘ یہی ٹھیک ہے۔" مجیب نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا پھر پوچھا "ناشتہ نہیں کیا تم نے؟"

"نیچے چلیں گے نا۔ واپسی پر ناشتہ کر لیں گے۔"

لڑکی کی خود اعتمادی مجیب کے لئے بہت تکلیف دہ ہوتی جا رہی تھی۔ وہ دھڑلے سے جمع کا صیغہ استعمال کر رہی تھی "میرا تو نیچے جانے کا موڈ نہیں۔" اس نے خشک

لہجے میں کہا۔

"رات آپ نے وعدہ کیا تھا۔"

"سنو' میں یہاں کام کرنے کے لئے آیا ہوں' تمہیں سیر کرانے نہیں اور تمہارا کام مجھے کمپنی دینا ہے مگر صرف اس وقت' جب مجھے اس کی ضرورت ہو۔"

ایک لمحے کو ایسا لگا کہ صفورہ رو دے گی مگر پھر اس نے بڑی تیزی سے خود کو سنبھال لیا۔ وہ پھولوں کے پاس سے ہٹ آئی اور ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔

مجیب اپنے رویئے پر خود بھی حیران تھا۔ وہ عقبی باغیچے کی طرف آیا ہی اس ارادے سے تھا کہ نیچے جائے گا لیکن صفیہ کو دیکھتے ہی اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔ اب وہ باغیچے میں ہی چہل قدمی کرنے لگا۔ ساتھ ہی وہ اپنے طرز عمل کو سمجھنے اور اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس میں اسے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ اصل میں صفیہ کی پہلی دید ہی اسے چڑانے کا سبب بن گئی تھی۔

وہ جس انداز میں پھولوں کے پاس کھڑی تھی' وہ خالص گھریلو انداز تھا... کسی عام لڑکی کا مگر پھر یہ بات اپنی جگہ تھی کہ وہ تھی ہی ایک عام لڑکی۔

مجیب سوچتے سوچتے الجھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ چاہتا کیا ہے۔ وہ اس کا انداز بازاری دیکھنا چاہتا تھا؟ لیکن نہیں۔ وہ اسے بیوی کی حیثیت سے متعارف کرا چکا تھا۔ صفیہ کا انداز خراب ہوتا تو اس میں اس کی پوزیشن خراب ہوتی' اس اعتبار سے تو وہ اس کے لئے ایک آئیڈیل لڑکی تھی لیکن اس کی سادگی' اس کا گھریلو پن اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کرتا تھا۔ کیوں؟ اگلے ہی لمحے اسے اس کا جواب مل گیا۔ لاشعوری طور پر اسے احساس ہو گیا تھا کہ کسی بھی لمحے اس لڑکی کی پسندیدگی اس کے سسٹم میں شامل ہو جائے گی اور یہ وہ نہیں چاہتا تھا۔

لیکن وہ لڑکی... صفیہ بہرحال اس سلوک کی مستحق تو نہیں تھی۔ رات کو اس نے خود اس سے نیچے چلنے کو کہا تھا... اور پھر خود ہی وعدہ کیا تھا کہ صبح نیچے چلیں گے۔ تو اب اس بری طرح انکار کرنا۔ پہلا سوال تو یہ تھا کہ اس نے اسے سیر کے لئے لے جانے کا کہا ہی کیوں۔ اس کی کیا ضرورت تھی۔ شاید اس نے صفیہ سے جو یہ کہا تھا کہ وہ یہاں کام کرنے آیا ہے' اسے سیر کرانے نہیں۔ تو اصل میں وہ خود کو یاد دلا رہا تھا...

خود سے کہہ رہا تھا یہ بات۔

اچانک وہ لرز کر رہ گیا۔ یہ خوف کہ کہیں وہ صفیہ کو پسند نہ کرنے لگے' یہ تو اس کی خود اعتمادی کی نفی کر رہا تھا۔ اسے اپنے کردار پر' سحاب کی محبت پر جو بے پناہ اعتماد تھا' کیا وہ اوپری تھا۔ اوپری نہ ہوتا تو وہ اس لڑکی سے کیوں خوف زدہ ہوتا لیکن وہ یہ سب شوری طور پر تسلیم نہیں کر سکتا تھا۔ تسلیم کر لیتا تو سب کچھ ختم ہو جاتا۔ کچھ بچتا ہی نہیں۔ وہ اپنے تجزیئے کو... استدلال کو جھٹلا بھی نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اس بات کو اپنی وقتی کمزوری کے طور پر قبول کر لیا اور اس سے لڑنے کا فیصلہ بھی کر لیا۔

اس فیصلے کے بعد وہ اس بینچ کی طرف چل دیا جہاں صفیہ بیٹھی تھی۔



صفورہ غم و غصے سے نڈھال تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مجیب کا برتاؤ اچانک اس کے ساتھ کیوں خراب ہو گیا تھا۔ اس نے تو ایسا کچھ نہیں کیا۔ کوئی غلطی نہیں کی۔ اب اس کے پاس مجیب کے سوا تو کچھ بچا بھی نہیں تھا۔ اس کی محبت ہی کی وجہ سے اس نے ایسی نادانی کی تھی کہ جیتے جی مر گئی تھی اور اب وہ بھی اس کے ساتھ ایسا سلوک کر رہا تھا۔ شاید یہی اس کی سزا تھی... ناروا خواہش کی' اندھی دعا کی سزا اور یہ وہ مجیب کو بتا بھی نہیں سکتی تھی۔

غور کرنے پر کچھ کچھ سمجھ میں آتا تھا۔ مجیب اسے اچھی لڑکی کی حیثیت سے نہیں جانتا تھا اور اس کی وضاحت کے باوجود اس نے اسے اچھی لڑکی کی حیثیت میں قبول بھی نہیں کیا تھا لیکن وہ وہ لڑکی تھی ہی نہیں جو مجیب اسے سمجھ رہا تھا۔ لہٰذا اس کا عمل اور رد عمل دونوں اس کردار سے مطابقت نہیں رکھتے تھے' جو وہ ادا کر رہی تھی۔ شاید یہی بات مجیب کو چڑاتی ہو گی لیکن وہ اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بری لڑکیوں کے سے انداز تو اختیار نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے سر اٹھا کر باغیچے میں چہل قدمی کرتے ہوئے مجیب کو دیکھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ اب تو جو بھی ہو' مجھے بھگتنا ہی ہے۔ صفورہ نے سوچا مگر اس کے ساتھ ہی ایک خیال اس کے دل میں آیا۔ کیا ایسا ہے کہ مجیب انور وہ نہیں' جو اپنی کہانیوں میں نظر آتا ہے۔ اس نے کہانیاں پڑھ کر جو اس کا تاثر لیا تھا' اس کے تحت وہ

ایک خوش مزاج آدمی تھا' جس کی حس مزاح بے حد توانا تھی۔ وہ ہمدرد طبیعت کا حساس آدمی تھا۔ وہ خوش اطوار' خوش گفتار اور اچھے کردار کا مالک تھا۔ مجموعی طور پر وہ بہت اچھا انسان تھا۔ اب جو وہ حقیقی زندگی میں اسے دیکھ رہی تھی تو وقتاً" فوقتاً" چھوٹی چھوٹی جھلکیوں میں وہ ایسا ہی نظر آیا تھا لیکن کبھی کبھی اس کے ساتھ اس کا رویہ خاصا خراب ہو جاتا تھا۔ ایسا کیوں ہے؟ صفورہ کو خیال آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ شرافت اور عظمت محض اس کے لباس ہوں۔ اندر سے وہ ایک عام انسان ہو' نفس ہی نفس' خواہش ہی خواہش اور ایسے میں خود پر تھوپی ہوئی نارسائی اور ناآسودگی اسے ستاتی ہو۔ جھنجلاہٹ میں مبتلا کرتی ہو۔ اس پر صفورہ کو ایک اور بات یاد آئی۔ وہ اپنی بیوی کو اس کی آواز تک نہیں سنوانا چاہتا تھا' اس کی موجودگی کا احساس بھی نہیں دلانا چاہتا تھا۔ اس نے اس کا برملا اظہار کیا تھا۔ اسے تاکید کی تھی کہ وہ کبھی فون ریسیو نہ کرے اور اس وقت اس نے..... صفورہ سفیان نے سوچا تھا کہ کیا وہ ایک عام آدمی' ایک بے وفا شوہر ہے۔ مگر محبت نے اس آواز کو' اس سوال کو دبا دیا تھا۔

لیکن اب وہ سوال پھر ابھر آیا تھا اور اس کے دماغ میں اپنا زہریلا ڈنک چبھو رہا تھا۔ محبت اب بھی اس سوال کو سنجیدگی سے لینے سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن سوال اس بار پہلے سے زیادہ توانا تھا۔

قدموں کی آہٹ سن کر وہ چونکی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اس بینچ کی طرف چلا آیا تھا۔

"آئی ایم سوری صفیہ۔" مجیب نے بینچ پر فاصلے سے بیٹھتے ہوئے کہا "مجھے احساس ہے کہ میں نے تمہیں تکلیف پہنچائی ہے۔ حالانکہ میں ایسا مرد نہیں ہوں۔"

صفورہ کا دل زور سے دھڑکا۔ اسے ایسا لگا' جیسے مجیب نے اس کی سوچیں پڑھ لی ہیں اور انہی کا جواب دے رہا ہے۔ تاہم وہ کچھ بولی نہیں۔

"دراصل کام کے عرصے میں میں ایسا ہو جاتا ہوں۔" مجیب نے مزید کہا "کام سر پر سوار ہو اور حسب منشا نہ ہو تو چڑچڑا پن آ جاتا ہے مجھ میں۔"

صفورہ سفیان اس لمحے واضح طور پر دو الگ الگ اور متصادم اکائیوں میں تقسیم ہو گئی۔ پہلی اکائی نے اس کی وضاحت کی معقولیت کو قبول کر لیا۔ اس نے سوچا' وہ تخلیقی

آدمی ہے۔ اس کے ساتھ یقیناً ایسا ہوتا ہو گا یہی بات ہے مگر دوسری اکائی جانتی تھی کہ اس نے اسے جو کچھ سمجھا ہے' وہ ویسا ہو بھی سکتا ہے۔ یہ۔۔۔ چڑچڑا پن..... جھنجلاہٹ اس شخص کی بھی تو ہو سکتی ہے' جس کی دانست میں بیل سے جھولتا ہوا انگوروں کا گچھا اس کی دسترس میں ہو' اسے انگور کھانے کی خواہش بھی ہو۔ لیکن وہ اس ڈر سے گچھے کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے کہ لوگ دیکھیں گے تو اسے ندیدا' پھل چور کہیں گے۔ وہ پست ہو جائے گا۔

"کچھ کہو نا۔ کیا بہت بری لگی ہے میری بات۔" مجیب نے کہا۔

صفورہ نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر اس سے محبت کرنے والی اکائی' اس پر شک کرنے والی اکائی پر حاوی آ گئی "بات تو بری لگنے والی تھی۔" صفورہ نے آہستہ سے کہا "لیکن اس کی وضاحت میرے دل کو لگتی ہے اور پھر شاید مجھے تو برا ماننے کا حق بھی نہیں۔" یہ کہتے کہتے اس کے لہجے میں شکایت در آئی۔

"ارے نہیں۔ ایسی بات مت کرو۔" مجیب نے کہا "اچھا چلو' نیچے سیر کر آئیں۔"

زخمی انا چاہتی تھی کہ صفورہ انکار کر دے۔ اس کا جواب اسے لوٹا دے کہ وہ یہاں کام کرنے کے لئے آیا ہے' اسے سیر کرانے نہیں لیکن برسوں سے ان دیکھے محبوب کو چاہنے والی صفورہ کے لئے وہ ترغیب بہت بڑی تھی۔ اس نے سوچا' اتنی بھاری قیمت ادا کر کے تو وہ اس تک پہنچی ہے اور انجام کا اسے علم نہیں۔ وہ بس یہ جانتی ہے کہ انجام اچھا ہونے والا نہیں۔ ایسے میں جتنی خوشیاں' جتنے یادگار لمحے وہ سمیٹ سکتی ہے' سمیٹ لینے چاہئیں۔ دامن میں گرتی خوشیوں اور لمحوں کو چھوڑ دینے میں تو خسارہ ہی خسارہ ہے۔

فیصلہ کچھ دشوار نہیں تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی "شکریہ' چلئے۔"



اس بار وہ پہاڑی ڈھلوان اوپر سے بھی خوب صورت لگی۔ ڈراؤنی تو وہ ہرگز نہیں تھی۔ رات شاید اندھیرے کی وجہ سے ایسا لگا تھا۔

نیچے اترتے ہوئے وہ چیڑ کے درختوں کے پہلے جھنڈ تک پہنچے تو انہیں سردی کی حدوں کو چھوتی ہوئی خنکی کا احساس ہوا۔ صفورہ نے خود کو شال میں اچھی طرح لپیٹ

لیا۔ اس نے کن انکھیوں سے مجیب کو دیکھا۔ وہ سویٹر پہنے ہوئے تھا۔

وہ اور نیچے اترنے لگے۔ اب نیچے وادی کے منظر کا ایک محدود۔۔۔ پگڈنڈی والا حصہ نظر آ رہا تھا۔ وہ بہت خوب صورت جگہ تھی۔ صفورہ کو احساس ہو گیا کہ نیچے پہنچنے کے بعد وہ جگہ اور خوب صورت لگے گی۔ راستہ اتنا حسین ہے کو منزل تو حسین ترین ہی ہو گی۔ اس نے سوچا۔

"یہ۔۔۔ بہت سرد مقام ہے۔ موسم گرما میں بھی ٹھنڈا رہتا ہے۔" مجیب نے چلتے چلتے کہا "ابھی تو بہار ہے۔ اس لئے زیادہ خنکی ہے اور بارش ہو جائے تو باقاعدہ سردی ہو جائے گی۔ کمرے میں آتش دان جلانا پڑے گا۔"

"اب میں سمجھ گئی کہ آپ نے خود میرے لئے کپڑے کیوں منتخب کئے تھے۔" صفورہ بولی۔

مجیب کو احساس جرم ہونے لگا۔ اصل وجہ سے تو وہ واقف تھا۔

نیچے اترتے اترتے اچانک ایک آواز ماحول میں شامل ہو گئی۔ وہ پانی کی آواز تھی۔ مگر پانی بہنے کی آواز سے مختلف تھی۔ وہ پانی گرنے کی آواز بھی نہیں تھی اور وہ آواز ان کے اترنے کے ساتھ ساتھ زیادہ بلند ہو رہی تھی۔ چند لمحے غور کرنے کی بعد صفورہ اس نتیجے پر پہنچی کہ وہ پانی بہنے اور پانی گرنے کے بین بین کوئی آواز ہے۔

"یہاں یقیناً کوئی پہاڑی جھرنا بھی ہے۔" مجیب نے کہا "یہ اسی کی آواز معلوم ہوتی ہے۔"

جھرنا! صفورہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس نے یہ لفظ سنا بہت تھا مگر جھرنا تصور میں بھی نہیں دیکھا تھا پھر بھی اسے ایک نامعلوم سے مگر بڑی خوشی کا احساس ہونے لگا۔

اور ذرا نیچے اترے تو وہ جھرنا انہیں نظر آ گیا۔ وہ ایک درخت کے پاس زمین سے پھوٹ نکلنے والا پانی کا ایک چشمہ تھا۔ جہاں وہ پھوٹا تھا' وہاں ایک خاصا بڑا گڑھا تھا' جو پانی سے لبالب بھرا تھا۔ وہاں سے وہ پانی نکل کر اس پگڈنڈی کے ساتھ بہتا ہوا نیچے جا کر گرتا تھا۔ اب ان کی سمجھ میں آیا کہ انہوں نے پانی کی بیک وقت دو آوازیں سنی تھیں۔ ایک پانی کے گڑھے سے نکل کر بہنے کی آواز اور دوسرے پانی کے نیچے وادی میں گرنے کی آواز۔ ان کی سمجھ میں یہ بھی آ گیا کہ پانی گرنے کی آواز پانی بہنے کی آواز

پر حاوی کیوں تھی۔ حالانکہ وہ دور کی آواز تھی۔ دراصل پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ زمین سے اور درختوں کی جڑوں اور تنوں سے چپک کر بہتے بہتے وادی سے خاصا اوپر ایک پہاڑی کٹاؤ کی وجہ سے پانی چپک کر بہنے کے بجائے براہ راست نیچے وادی میں گرنے لگا تھا۔ ہوا سے گزر کر پانی کے گرنے کی آواز پرشور تھی۔ یعنی اس مقام سے اس چشمے کے پانی نے جھرنے کا روپ اختیار کیا تھا۔

وہ دونوں چشمے کے پاس رک گئے۔ پانی۔۔۔ بہتا ہوا پانی آدمی کے وجود کو ایک عجیب سی سرشاری میں لپٹی خوشی سے بھر دیتا ہے۔ اس پانی نے ان دونوں کو سحر زدہ کر دیا تھا۔ دونوں پانی سے لبریز اس گڑھے کو تکے جا رہے تھے' جس کے اندر پانی زمین سے پھوٹتا یوں صاف دکھائی دے رہا تھا' جیسے وہاں کوئی آئینہ رکھا ہو۔۔۔۔ بہت بڑا آئینہ!

مجیب کئی بار پہاڑی علاقوں کی سیر کر چکا تھا۔ چشمے اور جھرنے اس کے لئے انوکھی چیز نہیں تھے مگر پہلی دید میں یہ نظارے ہزار بار دیکھنے والے کو بھی اسی طرح سحرزدہ کر دیتے ہیں۔ یہی تو ان کا جلوہ ہے۔ بہرحال مجیب ہی پہلے اس سحر سے نکلا اس نے غور سے صفیہ کو دیکھا' جو اب بھی اس سحر میں گرفتار تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ لڑکی نے پہلی بار ایسا کوئی منظر دیکھا ہے۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا لیکن صفیہ کی عبادت جیسی محویت وہ توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ کھڑا اسے تکتا رہا۔ اس کے چہرے پر بکھری ہوئی خوشی اسے بہت اچھی لگی۔ وہ یہ بھی بھول گیا کہ وہ خود سے۔۔۔۔ اپنی کمزوری سے جنگ کر رہا ہے۔

ان کے سروں کے اُوپر سے اپنی چہکاریں برساتا ایک پرندہ نہ گزرتا تو شاید صفورہ کی محویت ابھی نہ ٹوٹتی۔ بہرحال صفورہ نے چونک کر سر اٹھایا اور مجیب کو خود کو تکتے پایا۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "میں نے جھرنا پہلی بار دیکھا ہے۔" اس نے صفائی پیش کرنے والے انداز میں بڑی معصومیت سے کہا۔

"یہ جھرنا نہیں' چشمہ ہے۔" مجیب نے نرمی سے کہا "جھرنا تمہیں نیچے چلتے ہوئے نظر آئے گا۔"

"اچھا!" صفورہ کے لہجے میں حیرت تھی پھر وہ بچوں کی طرح بولی "پانی پی سکتے ہیں ہم؟"

"خود دیکھ لو۔ گڑھا کتنا شفاف ہے۔ نیچے پھوٹنے والا چشمہ تک صاف دکھائی دے رہا ہے۔"

صفورہ کنارے پر بیٹھ گئی اور چلو میں پانی لے کر پینے لگی۔ چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ پانی اسے بہت اچھا لگا ہے۔

"بس' پیٹ نہ بھر لینا۔" مجیب نے اسے ٹوکا "میں نیچے چل کر بھی پانی تمہیں پلانا چاہتا ہوں پھر ذائقے کا فرق دیکھنا۔"

صفورہ اٹھ کھڑی ہوئی "فرق کیسے ہو سکتا ہے۔ پانی تو یہی ہو گا۔" اس نے اعتراض کیا۔

"چلو تو.... میں دکھاؤں گا تمہیں۔"

وہ پھر چل دیئے۔ پانی ان کے ساتھ ساتھ بہہ رہا تھا "دیکھو.... پانی کہاں کہاں' کس کس چیز پر بہہ رہا ہے۔" مجیب نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

صفورہ نے دیکھا۔ وہ خالی زمین تو تھی ہی نہیں۔ کہیں گھاس تھی' کہیں خود رو پودے تھے۔ پھول تھے' جن پر سے پانی بہہ رہا تھا۔ "یہاں سبزہ کتنا ہے۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔

"ہاں.... یہاں پتھر پر بھی کچھ نہ کچھ اُگ جاتا ہے۔"

وہ اس مقام پر پہنچے' جہاں چشمے کا پانی جھرنے میں تبدیل ہوتا تھا۔ وہاں پہاڑی کٹاؤ تھا اور پانی کو بہنے کے لئے ملنے والا راستہ اچانک ہی معدوم ہو گیا تھا۔ اتنا اچانک کہ پانی کو راستہ بدلنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا اور اس سے ذرا اوپر کیونکہ ڈھلوان اچانک زیادہ سیدھی اور گہری ہوئی تھی' اس لئے پانی کا بہاؤ بھی بہت تیز ہو گیا تھا۔ اس مقام سے نیچے وادی ابھی کم از کم اسی فٹ کے فاصلے پر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ نیچے گرنے والا پانی بہت شور مچا رہا تھا۔

صفورہ نے نیچے دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔ نیچے گرتا ہوا پانی زمین سے ٹکرا کر اچھل رہا تھا' دور تک چھینٹے اڑا رہا تھا اور نیچے سفید جھاگ بنا رہا تھا۔ وہ پورا منظر بہت خوب صورت تھا۔

"آؤ.... چلیں۔" مجیب نے چیخ کر کہا۔ پانی کا شور اتنا تھا کہ اس کی آواز بمشکل

صفیہ تک پہنچی اور صفیہ کا انداز ایسا تھا' جیسے وہ ابھی یہاں سے ہٹنا نہیں چاہتی ہو۔ خود مجیب نے نیچے دیکھا تو اس کا دل بھی اٹکنے لگا "یہ منظر ہم واپسی میں رک کر بھی دیکھ سکتے ہیں صفیہ۔" اس نے کہا۔

اس بار صفورہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

لیکن ستر اسی فٹ کا یہ فاصلہ بہت دشوار تھا۔ راستے میں پہاڑی کٹاؤ زیادہ تھے اور پگڈنڈی جگہ جگہ ٹوٹ جاتی تھی۔ کہیں تو کٹاؤ اوپر سے چھ فٹ تک بھی تھا۔ کہیں متبادل طویل راستہ موجود تھا اور کہیں پھسل کر اترنے کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ مجیب کو صفورہ کی مدد کرنا پڑی۔ وہ پہاڑی راستوں سے بالکل ہی ناواقف تھی۔

نیچے پہنچ کر وہ بچوں کی طرح بے قابو ہو گئے۔ چشمے کے پانی کے راستے کا جہاں اختتام ہوا تھا' وہاں راستہ بہت چوڑا تھا۔ اس کے نتیجے میں پانی ایک بڑی چادر کی طرح نیچے گر رہا تھا' جیسے کوئی لہراتا ہوا آنچل اور پانی کی یہ چادر جن پہاڑی پتھروں پر گری تھی اس نے ان کے رنگ اڑا کر انہیں چکنا اور سفید کر دیا تھا پھر اس پانی نے چھوٹے سے ایک تالاب کی شکل اختیار کر لی تھی اور تالاب سے پانی پہاڑی نالے کی شکل میں ایک طرف بہتا چلا گیا تھا۔

انہوں نے پانی کے تالاب میں پاؤں ڈال دیئے۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا لیکن سردی کے بجائے فرحت کا احساس دلا رہا تھا۔ نیچے گرنے والے پانی کے چھینٹے دور دور تک اڑ رہے تھے.... ان تک بھی آ رہے تھے۔ ایک چھینٹا صفورہ کے رخسار سے ٹکرایا تو اسے.... گدگدی کا احساس ہوا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"اس پانی کے نیچے نہیں کھڑے ہو سکتے ہیں؟" صفورہ نے بچوں کے سے انداز میں پوچھا۔

"ہو سکتی ہو لیکن کپڑے بھیگ جائیں گے۔" مجیب نے سادگی سے کہا۔

صفورہ کو حیا آ گئی۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا اور اگر وہ بے سمجھے سوچے اس کے نیچے کھڑی ہو جاتی تو۔ اس کا چہرہ اس خیال سے گلنار ہو گیا۔

اس لمحے مجیب نے اسے غور سے دیکھا۔ حیا سے تمتماتے ہوئے اس کے چہرے کو دیکھ کر اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ کبھی کبھی اس لڑکی سے اتنا کیوں چڑنے لگتا ہے۔

ایسے لمحوں میں وہ اس عام سی لڑکی کی طرف کھچنے لگتا تھا۔ اس نے خود کو یاد دلایا کہ اس معاملے میں اسے اپنی بشری کمزوری سے لڑنا ہے اور یہ اس کے لئے کچھ مشکل نہیں لیکن اس سے پہلے وہ آسان ترین راستہ اختیار کرتا رہا ہے۔ یعنی یہ یاد دلانا کہ وہ کوئی عام گھریلو لڑکی نہیں ' بلکہ ایک کال گرل ہے۔ آگہی کے اس لمحے میں اس نے اعتراف کیا کہ یہ اس کا اوچھا پن اور کم ظرفی تھی۔ صفیہ جو کچھ تھی ' اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔

"میں یہ پانی پی سکتی ہوں؟" صفورہ نے پوچھا۔

"ضرور پیو اور فرق بھی بتاؤ۔"

صفورہ نے جھک کر پانی پیا پھر بولی "واقعی۔۔۔ فرق تو ہے۔ اس پانی میں طاقت اور فرحت زیادہ ہے لیکن کیوں؟"

"تم نے دیکھا نہیں۔ پتہ نہیں کتنی جڑی بوٹیوں کے درمیان سے گزر کر آیا ہے یہ۔۔۔" مجیب نے کہا۔

پانی کی خوشی ذرا کم ہوئی تو انہوں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ وہ خاصی کشادہ وادی تھی۔ سامنے کچھ فاصلے پر درختوں کا ایک بڑا جھنڈ نظر آ رہا تھا۔ صفورہ اس جھنڈ کی طرف چل دی۔ مجیب وہیں پانی میں کھڑا تھا پھر اس کا پانی پینے کو جی چاہا اور وہ وہیں بیٹھ گیا۔

صفورہ نے جھنڈ کا جائزہ لیا۔ وہ اتنے گھنے درخت تھے کہ سورج کی کرنیں بھی مشکل ہی سے وہاں اترنے کا راستہ بنا پاتی ہوں گی۔ اسے خیال آیا کہ کسی دن وہ اپنے ساتھ کپڑے لے کر اکیلی یہاں آئے گی۔۔۔ مجیب کے بغیر۔۔۔ اور جی بھر کے آبشار کے نیچے کھڑی ہو کر بھیگے گی۔ کوئی دیکھنے والا بھی نہیں ہو گا پھر وہ اطمینان سے اس جھنڈ میں آ کر کپڑے بدل لے گی مگر اگلے ہی لمحے اسے خوف سے جھرجھری آ گئی۔ اکیلے تو ڈر لگے گا اور جو کوئی آ گیا تو؟ اور کیا پتہ ' یہاں جانوروں کا گزر بھی ہوتا ہو۔

وہ آگے بڑھ کر دیکھنا چاہتی تھی کہ جھنڈ کے اختتام پر کیا ہے لیکن اب خوف اسے روک رہا تھا۔ آگے بڑھنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ اسی لمحے اسے مجیب کی پکار سنائی دی۔

"صفیہ۔۔۔ کہاں ہو؟ جلدی سے آؤ بھئی۔"

وہ آبشار کی طرف بڑھنے لگی۔

ادھر مجیب نے جیسے ہی پانی پیا ' پیٹ میں بھوک کی آگ ایسے بھڑکی کہ وہ بلبلا اٹھا۔ ناشتہ اس وقت پہلی ضرورت تھا۔ وہ فطرت کے حسن کو بھی بھول گیا۔ اس نے صفیہ کو پکارا۔ وہ جھنڈ سے نکلتی دکھائی دی تو اس نے چیخ کر کہا "اب میں نہیں رک سکتا بھئی۔ فوراً چلو۔"

"کیوں؟ کیا ہوا؟" صفورہ نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کے لہجے میں خوف تھا۔

"بھوک سے برا حال ہو رہا ہے۔ ناشتہ چاہئے۔"

صفورہ مسکرا دی۔ "چلئے لیکن ابھی یہاں بہت کچھ دیکھنا۔ گھومنا پھرنا تھا۔"

"اگلی بار سہی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہاں آتے وقت کھانے پینے کا سامان ضرور لانا چاہئے۔"

واپسی کا سفر ابتدا میں بہت دشوار ثابت ہوا۔ اس نے مجیب کا اور کباڑا کر دیا۔ جہاں پگڈنڈی ٹوٹ رہی تھی ' وہاں چڑھنا اترنے سے زیادہ دشوار تھا پھر صفورہ کو بھی مدد دینی تھی۔ ہر قدم بھوک ناقابل برداشت ہوئی جا رہی تھی۔

مشکل راستہ طے کرنے کے بعد وہ سانس درست کرنے کے لئے رکی۔ ایک پتھر پر بیٹھنے کے بعد انہوں نے نیچے آبشار کو دیکھا۔ اس کے چھینٹے اڑ کر ان تک آ رہے تھے اور اس بلندی سے آبشار کو دیکھتے ہوئے یہ گمان بھی کرنا مشکل تھا کہ وہ وہاں تک ہو کر آئے ہیں۔ یہاں سے وہ سب کچھ خواب جیسا لگ رہا تھا۔

ذرا دیر بعد وہ اٹھے اور چل دیئے۔ صفورہ اب بھی نہیں جانا چاہتی تھی لیکن اب اسے بھی بھوک ستا رہی تھی۔

چند قدم چلنے کے بعد مجیب نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "ساڑھے آٹھ بج گئے۔ مجھے کام بھی شروع کرنا ہے۔"

اس جملے نے جیسے کسی سحر کو توڑ ڈالا۔ صفورہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ابھی چند لمحے پہلے تک وہ جیسے جنت میں تھی اور وہ آدم و حوا تھے مگر اب اسے یاد آیا کہ یہ اس کا وہ پسندیدہ اور محبوب مرد ہے ' جس پر اس کا کوئی حق نہیں بلکہ اس کے بارے میں

وہ شکوک و شبہات میں مبتلا تھی۔ وہ اس کا آئیڈیل تھا' جس کے بارے میں اسے خوف تھا کہ وہ ٹوٹ جائے گا۔

اس کا کہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن بات بلا ارادہ اس کی زبان سے پھسل گئی۔

"ایک ذاتی بات پوچھوں' اگر آپ برا نہ مانیں تو۔"

مجیب نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ یہ سن کر بری طرح بھڑکا تھا لیکن اب اسے پوری طرح یاد تھا کہ وہ ایک جنگ لڑ رہا ہے اور وہ جنگ نظریں چرا کر نہیں جیتی جا سکتی۔ چنانچہ اس نے کہا "پوچھو۔"

مگر صفورہ نے وہ بات پوچھی' جو اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتی تھی۔

"اگر آپ کی مسز کو میری موجودگی کا' آپ کے ساتھ تنہا ایک کمرے میں سونے کا پتہ چل جائے تو کیا ہو گا؟" صفورہ نے پوچھا۔

مجیب کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگا "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میرے بارے میں جاننے کے بعد ان کا کیا رد عمل ہو گا؟ کیا آپ کی ازدواجی زندگی پر بہت برا اثر پڑے گا؟"

مجیب کی سمجھ میں یہ بات آئی تو اسے ہنسی آ گئی۔ وہ ہنستا چلا گیا۔ صفورہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی۔ بالآخر مجیب نے کہا۔ "اس لئے کہ یہ تجویز میری بیوی ہی کی تھی۔ وہ جانتی ہے کہ میں اکیلا نہیں سو سکتا۔"

صفورہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بہت الجھا دینے والی بات تھی "تو پھر آپ انہیں میری آواز سنوانے سے کیوں بچتے ہیں؟"

"وہ اور بات ہے۔" مجیب نے گہری سانس لے کر کہا اور پھر اسے سحاب کے تجزیئے کے متعلق بتا دیا۔

صفورہ اس پر تبصرہ کرنا چاہتی تھی کہ بیوی کی بدگمانی کا تو اسے ڈر ہے لیکن کوئی حس اسے بتا رہی تھی کہ ایسا کر کے وہ غلطی کرے گی۔ مجیب کو تو احساس بھی نہیں ہونا چاہئے کہ وہ یہ کمزوری سمجھ چکی ہے۔ اس نے جان لیا تھا کہ مجیب کو اسے یہ بات کسی

طور نہیں بتانی تھی۔ وہ بس کسی ترنگ میں اسے بتا گیا ہے۔

اور اسے بہت اہم بات معلوم ہو گئی تھی۔ اب وہ مجیب کے چڑنے اور جھنجلانے کا سبب سمجھ گئی تھی۔ مجیب خوف زدہ تھا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ اسے پسند کرنے لگے گا اور مجیب کا خوف اس کے لئے بے حد خوش آئند تھا۔

صفورہ نے بہت تیزی سے موضوع بدلا "بہت بھوک لگ رہی ہو گی آپ کو۔" اس نے کہا۔

"اب تو ایک قدم اٹھانا بھی دوبھر ہو رہا ہے۔" مجیب کراہا۔

صفورہ نے یہ سن کر رفتار بڑھائی۔ چند لمحے بعد ہی وہ دوڑ رہی تھی "اے.... تم دوڑ کیوں رہی ہو؟" مجیب نے اسے پکارا۔

"میں پہلے پہنچوں گی اور آپ کے پہنچنے تک ناشتہ لگوا لوں گی۔" صفورہ نے پلٹ کر کہا اور پھر بھاگنے لگی۔



ناشتے کے بعد مجیب نے کہا "اب میں کام شروع کروں گا۔"

"میرے لئے کیا حکم ہے؟" صفورہ نے پوچھا۔

"تم آزاد ہو۔ گھومو پھرو۔ جو جی چاہے کرو۔"

"اگر میں اسٹڈی میں بیٹھنا چاہوں تو؟"

مجیب نے چند لمحے سوچا۔ یہ گھر تو نہیں تھا' جہاں ارتکاز میں خلل پڑتا تو وہ وڈیو گیم کا سہارا لیتا۔ ملازمین سے وہ بات نہیں کر سکتا تھا۔ ایسے میں صفیہ اس کے کام آ سکتی تھی "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بشرطیکہ بار بار مجھے مخاطب نہ کرو۔"

"آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کو بالکل ڈسٹرب نہیں کروں گی۔"

"ڈسٹرب میں ہوں گا بھی نہیں۔ بس تم خود سے بات نہ کرنا مجھ سے۔"

"شکریہ۔ اس کا یہ فائدہ ہو گا کہ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو گی تو آپ مجھ سے کہہ سکیں گے۔" صفورہ نے کہا۔

مجیب نے سوچا کہ یہ بھی درست ہے۔ صفیہ کو دیکھتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن ہچکچا رہی ہے "کچھ کہنا ہے؟" اس نے کہا "جھجکو نہیں۔"

"مجھے کچھ پیسے دے دیجئے۔"

مجیب نے دو ہزار روپے اسے دے دیئے پھر وہ اسٹڈی کی طرف چل دیا۔ صفورہ کپڑے بدل کر افضل خان کی طرف گئی۔ "افضل خان مجھے بازار جانا ہے۔"

"ابھی گاڑی نکالتا ہوں بی بی صیب۔" افضل خان نے کہا۔

سب کے لئے زندگی کے نئے معمولات کا آغاز ہو رہا تھا۔



اس شام صابر گھر میں داخل ہوا تو اسے غیر معمولی پن کا احساس ہونے لگا۔ ابا میاں نے آواز دی تو اسے احساس ہوا کہ وہ ڈرائنگ روم میں موجود ہیں۔ "جی ابا میاں۔"

"یہاں آؤ صابر۔"

وہ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ ابا میاں کے لہجے میں تھکن محسوس کر کے اس کا دل پریشان ہو گیا تھا۔

"بیٹھو صابر۔" ابا میاں نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

صابر نے باپ کو غور سے دیکھا۔ وہ سخت پریشان نظر آ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک خط دبا تھا۔ اور وہ یقیناً بھارت سے آیا ہوا خط تھا۔ ابا میاں کی مٹھیاں بار بار بھنچ اور کھل رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بہت مضطرب ہیں۔

صابر چند لمحے ان کے بولنے کا انتظار کرتا رہا پھر اس نے کہا۔ "ابا میاں، خیریت تو ہے۔ کیا بات ہے؟"

"خیریت نہیں ہے بیٹے۔" غفران احمد نے ڈوبتی آواز میں کہا۔ "انڈیا سے بھائی جان کا خط آیا ہے....."

صابر کا دل بہت زور سے دھڑکا۔ اسے صفورہ کا خیال آیا "ہوا کیا ہے ابا میاں؟"

"صفورہ غائب ہے۔ وہ ٹرین میں موجود نہیں تھی۔"

چند لمحے تو صابر کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا "یہ کیسے ممکن ہے؟"

"یہ حقیقت ہے۔ یہ خط پڑھ لو۔" غفران احمد نے اس کی طرف خط بڑھایا۔

صابر نے خط کھول کر پڑھا اور تین بار پڑھا۔ خط بالکل واضح تھا۔ وہ پریشان ضرور

تھے لیکن خط انہوں نے اس یقین کے ساتھ لکھا تھا کہ صفورہ پاکستان میں محفوظ ہے اور اپنے چچا میاں کے گھر میں ہے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ صفورہ ٹرین پر سوار ہونے سے کیسے رہ گئی۔

"لیکن صفورہ ٹرین پر چڑھی تھی ابا میاں۔" اس نے باپ سے کہا "میں نے خود دیکھا ہے۔"

"مگر سرحد پر پہنچ کر بھائی جان وغیرہ نے ٹرین چھان ماری، وہ موجود نہیں تھی۔" غفران احمد نے کہا پھر پوچھا "تمہیں یاد ہے، تم نے اسے ٹرین میں دیکھا تھا؟"

"جی ہاں۔ شروع میں دیکھا تھا مگر اس کے بعد وہ کسی کو بھی نظر نہیں آئی۔ میں نے ... بلکہ سب لوگوں نے یہی سمجھا کہ وہ چھپ گئی ہے۔ رخصت ہوتے وقت وہ ہمیشہ یہی کرتی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ذرا دیر بعد ہی وہ ٹرین سے اتر گئی ہو گی۔" غفران احمد نے پرخیال لہجے میں کہا۔

"مگر ابا میاں، کس لئے؟"

"پانی پینے... یا پھر کوئی چیز خریدنے کے لئے۔"

"پانی کا کولر تایا کے ساتھ تھا۔" صابر نے کہا۔

"بہرحال یہ طے ہے کہ وہ ٹرین سے اتری تھی لیکن چڑھ نہیں سکی۔ شاید ٹرین روانہ ہوئی تو وہ پلیٹ فارم پر ہی تھی۔"

"تو پھر اسے ہمارے پاس آ جانا چاہئے تھا۔ اسے تو علم تھا کہ ہم کہاں ہوں گے۔"

"اللہ جانے کیا ہوا۔ بہرحال اب کیا کیا جائے؟"

صابر بہت تیزی سے سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن الجھی ڈور کا کوئی سرا ہاتھ میں نہیں آ رہا تھا۔ صفورہ کو ٹرین سے اترنے کی کیا ضرورت تھی، یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی مگر وہ جب بھی اس بارے میں سوچتا، نجانے کیوں اسے مجیب انور کا خیال آتا۔ حالانکہ دونوں باتوں میں کوئی ربط نہیں تھا۔ ٹرین لیٹ ہونے کی وجہ سے مجیب سے تو وہ خود بھی نہیں مل سکا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ صفورہ کو تو مجیب کی آمد کا علم ہی نہیں تھا۔

تو پھر صفورہ ٹرین سے کیوں اتری؟ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ بالکل شروع میں اس نے صفورہ کو ٹرین میں دیکھا تھا مگر اس کے بعد وہ آخر تک نظر نہیں آئی تھی۔ اب یہ تو ممکن نہیں کہ شروع میں وہ چھپ گئی ہو اور ٹرین چلنے میں ایک منٹ یا چند سیکنڈ پہلے ٹرین سے اتری ہو۔ یہ غیر منطقی بات تھی۔ وہ الوداعی اذیت سے بچنے کے لئے باتھ روم میں بند ہوئی ہوتی تو ٹرین کی روانگی سے پہلے ہرگز باہر نہ آتی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ابتدا ہی میں ٹرین سے اتر گئی تھی لیکن کیوں؟ اور اس کیوں کا صابر کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

صابر کے ذہن میں ایک خوف ناک لفظ ابھرا.... اغوا۔ یہی ایک بات سمجھ میں آتی تھی کہ صفورہ کو زبردستی ٹرین سے اتارا گیا ہو گا لیکن یہ بھی قرین قیاس نہیں تھا۔ بھری ٹرین سے جو اسٹیشن پر کھڑی ہو‘ جو مسافروں ہی سے نہیں‘ الوداع کہنے کے لئے آنے والوں سے بھی بھری ہو‘ کوئی کسی لڑکی کو کس طرح ٹرین سے یوں اتار سکتا ہے کہ کسی کو پتہ بھی نہ چلے۔ ہاں کوئی جاننے والا ہو اور پھسلا کر لے جائے تو اور بات ہے لیکن صفورہ کا تو یہاں کوئی جاننے والا ہی نہیں تھا۔

یہ وہ معما تھا‘ جس کے حل ہونے کی کوئی صورت صابر کو نظر نہیں آ رہی تھی۔ کیا ہوا تھا‘ یہ اللہ ہی بہتر جانتا تھا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" غفران احمد بڑبڑائے۔

"صفورہ اپنی مرضی سے کہیں نہیں جا سکتی۔" صابر نے کہا "یہ کوئی اور ہی چکر معلوم ہوتا ہے۔"

"ناممکن۔ وہ اپنی مرضی سے اتری ہے۔ کسی نے زبردستی کی ہوتی تو وہ شور مچا دیتی۔" غفران احمد نے بہت وثوق سے کہا۔

صابر جانتا تھا کہ ابا میاں کی بات معقول ہے لیکن اس کا استدلال اپنی جگہ وزن رکھتا تھا کہ ٹرین نکلنے کی صورت میں صفورہ کو ان سے آ ملنا چاہئے تھا۔ کیا پتہ‘ وہ کسی ضرورت سے اسٹیشن سے باہر گئی ہو لیکن بغیر بتائے اتنا بڑا قدم اٹھانا بھی ناممکن تھا۔ بہرحال حقیقت یہ تھی کہ صفورہ غائب تھی۔ اگر وہ کسی وجہ سے ٹرین سے اتری تھی اور اس نے ٹرین مس کر دی تھی اور ان لوگوں تک بھی نہیں پہنچ سکی تھی تو پھر اتنے

دن وہ کہاں رہی۔ کہاں رہ رہی ہے۔ تایا جان کی روانگی کو تو دو ہفتے ہو گئے۔ اتنے دن وہ اپنے طور پر تو نہیں رہ سکتی۔ اس کا مطلب ہے.... یہاں پھر وہی بدترین خیال سامنے آیا.... اغوا۔

صابر نے وہ سب کچھ ابا میاں سے کہہ دیا اور غفران احمد کے چہرے کے تاثر سے ثابت ہو گیا کہ یہ خدشہ بے حد منطقی ہے۔

"وہ ہمارے گھر نہیں پہنچ سکتی تھی؟" غفران صاحب کے لہجے میں سوال کم اور حسرت زیادہ تھی۔

"نہیں ابا میاں۔"

"تو ہمارا فون نمبر تو ہو گا اس کے پاس۔"

"ہو گا‘ لیکن اس کی ڈائری میں اور بیگ میں اور ابا میاں‘ مجھے یقین ہے کہ وہ خالی ہاتھ ہو گی۔ کچھ لے کر کیوں اترتی وہ۔"

غفران احمد نے سر پکڑ لیا "اب کیا کروں؟ بھائی جان کو کیا لکھوں؟ مجھ میں تو ہمت نہیں ہے۔ کیا گزرے گی ان پر۔"

"لیکن ابا میاں‘ اتنی بڑی بات چھپائی بھی نہیں جا سکتی۔ تایا جان سے پوچھے بغیر تو کوئی قدم بھی نہیں اٹھایا جا سکتا۔"

"کیسا قدم!" غفران احمد بری طرح بدکے "کیا کیا جا سکتا ہے؟"

"میری رائے میں اشتہار چھپوانا ضروری ہے.... اخبار میں۔ اگر اللہ نے بہتری کی ہو اور اسے کسی اچھے گھر میں پناہ مل گئی ہو تو وہ ہم تک پہنچ تو سکے۔"

"لیکن اس میں تو عزت...."

صابر نے ابا میاں کی بات کاٹ دی "ابا میاں‘ انسان اور اس کی بہتری سے بڑی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ عزت بھی نہیں۔"

"ٹھیک ہے لیکن اس کا فیصلہ کرنے کا حق صرف بھائی جان کو ہے۔" غفران احمد نیم رضا مند ہو گئے "اور انہیں تم خط لکھو گے۔ مجھ میں ہمت نہیں۔"

یوں بات طے ہو گئی۔



ایک سین بری طرح پھنس گیا۔ مجیب انور کو اس دشواری کا پہلے سے علم تھا۔ کہانی کے ایک بیانیہ جملے کو ناظرین تک پورے تاثر کے ساتھ پہنچانا آسان کام نہیں تھا۔ بعض اوقات اس کے لئے گھنٹوں سوچنا پڑتا تھا۔

پہلے تو وہ کھڑکی سے باہر باغیچے میں دیکھتے ہوئے اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر پھر اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کے لئے وقفے کی ضرورت پڑے گی۔ ایسے بات نہیں بنے گی۔ چنانچہ اس نے سر گھما کر صفیہ کو دیکھا' جو سائیڈ میں کرسی پر بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہ تھی۔

"چائے پئیں گے؟" مفورہ نے سر اٹھائے اور پوز تبدیل کئے بغیر پوچھا۔

مجیب ہمیشہ کی طرح حیران ہوا۔ حالانکہ اب اسے کسی بات پر بھی حیرت نہیں ہونی چاہئے تھی۔ صفیہ تو اس کے لئے جہان حیرت تھی۔ اس نے اسے اس مقام پر پہنچا دیا تھا' جہاں اب صفیہ کبھی اسے حیران نہ کرتی تو اسے حیرت ہوتی "ہاں.... چائے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

مفورہ نے کتاب بند کر کے میز پر رکھی۔ وہ پروین شاکر کی "ماہ تمام" تھی۔ "میں ابھی چائے لائی۔" اس نے کہا اور اسٹڈی سے چلی گئی۔

مجیب صفیہ کے بارے میں سوچنے لگا اور یہ وہ چاہتا نہیں تھا۔ اسے تو کہانی کے اس ایک بیانیہ جملے یعنی اس دیوار کے بارے میں سوچنا تھا' جو اچانک اسکرپٹ کی راہ میں حائل ہو گئی تھی۔ اسے اس دیوار کو گرا کر راستہ ہموار کرنا تھا۔

اس نے صفیہ کے بارے میں سوچنے سے بچنے کے لئے سامنے رکھی "قرض جاں" اٹھا لی۔ وہ رکاوٹ بننے والے جملے کو اس کے سیاق و سباق سمیت ذہن نشین کر لینا چاہتا تھا لیکن وہ تو اس صفحے کو کھول بھی نہیں سکا۔ کتاب نے اس کی سوچوں کو پھر وہیں پہنچا دیا' جہاں سے وہ بھاگنا چاہتا تھا.... صفیہ! دو ہفتے پہلے اس صبح جب اس نے مری

میں کام کا آغاز کیا تھا تو صفیہ نے اس سے پیسے مانگے تھے اور اس نے اسے دو ہزار روپے دے دیئے تھے' یہ تو اسے بعد میں پتہ چلا کہ صفیہ نے وہ پیسے کیوں لئے تھے۔ وہ تو کام میں منہمک ہو گیا تھا اور کام اتنا اچھا ہو رہا تھا کہ وہ سر اٹھانا ہی نہیں چاہتا تھا لیکن بارہ بجے کے قریب چائے کی طلب نے اسے سر اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ اس نے سوچا تھا کہ فاطمہ کو آواز دے گا اور اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ کچن میں گھنٹی کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ تاکہ وہ بوقت ضرورت فاطمہ کو بلا سکے۔

لیکن وہاں تو کرسی پر صفیہ بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں چھوٹا سا ایک گفٹ پیک تھا اور وہ اسے ہی تک رہی تھی۔ اس کے سر گھماتے ہی اسے کچھ کہنے کا موقع دیئے بغیر اس نے پوچھا "چائے لاؤں یا کافی؟"

"میں چائے کا عادی ہوں۔ کافی تو کبھی کبھار ہی پیتا ہوں۔" مجیب نے بے ساختہ کہا۔

"میں ابھی لاتی ہوں۔ دو منٹ میں۔" صفیہ اٹھی اور پیکٹ لئے اس کے پاس آئی۔ "آپ برا تو نہیں مانیں گے؟" اس کے لہجے میں جھجک اور گھبراہٹ تھی۔

"کس بات کا؟" مجیب ابھی تک لکھنے کے ارتکاز میں تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"میں آپ کے لئے کچھ لائی ہوں۔" وہ اور گھبرا گئی "تحفہ دینا چاہتی ہوں آپ کو۔"

مجیب اسے جھڑک دینا چاہتا تھا لیکن اپنا عہد یاد آ گیا "تو دے دو لیکن اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں صرف تمہیں دینے کا حق رکھتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے مجیب کے لہجے میں کاٹ آ گئی۔

لیکن اس بار وہ کاٹ بے اثر رہی۔ اس کی بات نے صفیہ کو خوش کر دیا تھا۔ صفیہ نے جلدی سے پیکٹ اسے دیا' جیسے بوجھ اتار رہی ہو "سالگرہ مبارک مجیب صاحب۔ میں چائے لے کر آتی ہوں۔"

یہ اور بڑا دھماکا تھا مجیب انور کے لئے۔ اپنا برتھ ڈے تو اس بار اسے بھی یاد نہیں تھا۔ صفیہ کو کیسے معلوم ہوا۔ اسے حیرت تھی کہ سحاب کو بھی یاد نہیں رہا۔ کیا آنکھ

اوجھل پہاڑ اوجھل والی بات ہے۔ اس نے پیکٹ کو ہاتھوں میں تولا۔ وہ یقیناً کوئی کتاب تھی۔

اس نے عادت کے برعکس بہت بے احتیاطی سے ریپر ہٹایا۔ وہ پھٹ گیا مگر کتاب کا سرورق سامنے آتے ہی وہ بت بن گیا۔ وہ اس کی اپنی کتاب قرض جاں تھی۔

کچھ دیر وہ کتاب ہاتھ میں لئے ساکت بیٹھا رہا۔ اس سے کچھ سوچا بھی نہیں گیا۔ اسے یہ علم تو تھا کہ غفور اس کی پہلی کتاب یہی چھاپ رہا ہے.... اور یہ کہ کتاب شائع ہونے والی ہے لیکن اس نے غفور سے رابطہ بھی نہیں کیا تھا۔ لاہور پہنچنے کی اطلاع اگر اس نے غفور کو دے دی ہوتی تو شاید کتاب اسے ٹرین میں ہی مل جاتی۔ اب اس کے لئے کتابیں غفور نے گھر بھیجی ہوں گی۔ اسے تو یہ علم ہی نہیں تھا کہ وہ مری آ چکا ہے۔

اپنی پہلی کتاب دیکھنا کسی مصنف کے لئے بے حد سنسنی خیز اور مسرت آمیز تجربہ ہوتا ہے۔ مجیب خاصی دیر تک تو کتاب کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا پھر اس نے کتاب کو کھولا۔ پہلا صفحہ سادہ تھا مگر صرف چھپائی کے اعتبار سے۔ اس سادہ صفحے پر صفیہ کی صاف ستھری، خوب صورت اور نفیس تحریر تھی...

مجھے اپنی خوش قسمتی پر ناز ہے کہ ایسے مواقع قسمت والوں کو ہی ملتے ہیں۔

صاحب کتاب کے لئے۔

ایک پرستار قاریہ کی طرف سے

بے حد خلوص اور محبت کے ساتھ، جنم دن کی مبارک باد۔

نیچے صفیہ کے دستخط تھے۔ اس کے نام کا صرف S دستخط میں تھا۔ آگے شاید اس کے والد کا نام ہو گا۔ وہ پڑھا نہیں جا سکتا تھا۔ بس اتنا تھا کہ وہ بھی S سے ہی تھا۔

مجیب نے ورق الٹا۔ آگے کتاب کا نام اور ناشر کا نام اور پتہ تھا۔ اس سے اگلے ورق پر اس کا انتساب تھا.... اپنی شریک حیات سحاب کے نام۔ اس سے آگے اس کا اپنا لکھا ہوا دیباچہ تھا مگر چھپنے کے بعد اسے پڑھتے ہوئے اسے لگا کہ وہ یہ تحریر پہلی بار پڑھ رہا ہے.... اور وہ اسے اپنی تحریر نہیں لگی۔

دیباچہ پڑھنے کے بعد وہ پھر ٹائٹل کو دیکھنے لگا۔ اسی وقت صفیہ چائے لے آئی۔

اس نے چائے کی پیالی میز پر اس کے سامنے رکھ دی "آپ کو میری یہ جسارت بری لگی ہو تو پلیز مجھے معاف کر دیں۔" اس نے مجیب سے کہا۔

"کون سی جسارت؟" مجیب نے کتاب سے نظریں ہٹاتے ہوئے پوچھا۔ اس کی نظریں صفیہ سے ملیں۔ صفیہ کی آنکھوں میں اسے التجا نظر آئی۔

"یہی کہ آپ کی تخلیق میں نے آپ کو یوں دی، جیسے یہ میری اپنی چیز ہو۔ میں نے اسے آپ کے نام کیا۔ اپنے دستخط کئے۔"

مجیب کو اس کی آنکھوں میں اب التجا کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے اس پر ترس آنے لگا "ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ تمہارا حق تھا اور سچی بات یہ کہ تم نے مجھے بہت بڑا تحفہ دیا ہے۔ میں تو تمہارا شکر گزار ہوں۔" اس نے بے حد سچائی سے کہا۔

اور وہ آنکھیں مسکرانے لگیں۔ بے حد روشن ہو گئیں "یہ آپ کی عالی ظرفی ہے۔" صفیہ نے آہستہ سے کہا۔

مجیب نے چائے کا ایک گھونٹ لیا۔ چائے بہت اچھی تھی۔ اس کی پسند کے عین مطابق پھر اس کی زبان پر وہ سوال پھسل آیا، جس کے بارے میں اس نے فیصلہ کیا تھا کہ صفیہ سے ہرگز نہیں کرے گا بلکہ اس طرف سے بے نیازی ظاہر کرے گا لیکن تجسس اتنا تھا کہ اس کا فیصلہ کمزور پڑ گیا "تمہیں کیسے پتہ چلا کہ آج میرا برتھ ڈے ہے؟" اس نے پوچھا۔

صفیہ مسکرائی اور وہ مسکراہٹ بڑی فاتحانہ تھی "آپ نے ہی بتایا تھا۔"

"میں نے؟" مجیب اچھل ہی پڑا "میں نے کب بتایا تمہیں۔"

"کوئی تین چار ماہ پہلے۔"

"جھوٹ۔ بالکل جھوٹ۔" مجیب نے بگڑ کر کہا "کل میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ میں جانتا ہوں کہ اس سے پہلے میں تم سے کبھی نہیں ملا۔"

"آپ مجھ سے ملتے رہے ہیں۔" صفیہ نے زور دے کر کہا۔ "میرا دعویٰ غلط نہیں۔ میں آپ کی پرستار ہوں۔ آپ کو پڑھتی رہی ہوں میں۔ آج میری حیثیت جو بھی سہی، لیکن آپ کے لئے میری پہلی حیثیت آپ کی پرستار قاریہ کی ہے۔"

مجیب کی سمجھ میں اب بھی نہیں آیا۔ وہ پھر جھنجلانے لگا۔ اس پر اسے غصہ آیا۔

یہ لڑکی جان بوجھ کر اس کی جھنجلاہٹ کا سامان کرتی تھی۔ لفظ حیثیت کا استعمال بھی اس نے ایک خاص حوالے سے کیا تھا۔

"اپنے انٹرویو میں آپ نے اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔" صفیہ نے کہا "اور اس بہت کچھ میں آپ کی تاریخ پیدائش بھی تھی۔"

اب مجیب کو خود پر غصہ آیا۔ اتنی سامنے کی بات.....! اسے پہلے ہی سمجھ لینا چاہئے تھا۔ وہ چائے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ صفیہ کو نظرانداز کر کے وہ چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا رہا۔ پیالی خالی کر کے جو اس نے دیکھا تو صفیہ کمرے میں موجود نہیں تھی۔

اس کے بعد مجیب سے کام نہیں کیا گیا۔ اس کے غصے کا رخ سحاب کی طرف مڑ گیا' جسے ازدواجی زندگی میں پہلی بار اس کا برتھ ڈے یاد نہیں رہا تھا اور ایک اجنبی لڑکی نے اسے وش کر کے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔

مگر اسی روز کھانے کے فوراً بعد جب وہ بیڈ روم میں قیلولہ کر رہا تھا' یہ شکایت بھی دور ہو گئی۔ فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا تو شاہد کی آواز سنائی دی "ہیپی برتھ ڈے ابو۔ میں نے آپ کے لئے تحفہ بھی خریدا ہے۔ آپ آئیں گے تو دوں گا۔"

تینوں بچوں کے بعد ریسیور پر سحاب کی آواز ابھری "جنم دن مبارک ہو آپ کو۔"

"شکر ہے' تمہیں یاد تو آ گیا۔" مجیب نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"بھولتی ہی کب ہوں کہ یاد کرنا پڑے۔ صبح فون کرتی مگر بچوں کا تو آپ کو معلوم ہے۔ اتنی دیر سے اٹھتے ہیں کہ گاڑی نکل جانے کا دھڑکا رہتا ہے اور بچوں کے بغیر فون کرتی تو آپ کی خوشی ادھوری رہ جاتی۔ بچوں کے اسکول سے آتے ہی فون کیا ہے۔" وہ کہتے کہتے رکی پھر شوخ لہجے میں بولی "گھر سے دور ہونے کی وجہ سے زود رنج ہو گئے ہیں جناب۔"

مجیب کی آنکھیں بھیگ گئیں "دور ہوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ تم مجھے مس کرو۔"

"یہ تو آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتے کہ میں کتنا مس کرتی ہوں آپ کو۔"

"میں بھی....."

خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ صفیہ چائے لے آئی تھی۔



دن متحرک تھے تو راتیں ساکت و جامد!

ہر دن دو حوالوں سے پچھلے دن سے مختلف اور کچھ آگے ہوتا تھا۔ ایک حوالہ مجیب کے لئے مثبت تھا تو دوسرا منفی اور جھنجلاہٹ بڑھانے والا۔ مثبت حوالہ کام تھا۔ پچھلے پندرہ دنوں میں وہ دو قسطیں ایوب ساغر کو بھجوا چکا تھا۔ ایوب سے کئی بار فون پر بات بھی ہوئی تھی۔ ایوب پوری طرح مطمئن تھا بلکہ اس کا کہنا تھا کہ اس قدر مکمل اسکرپٹ اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا "سر' آپ سکون سے کام کرتے رہیں۔ کوئی مسئلہ ہو' کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتا دیں۔" اس نے کہا تھا۔

دوسرا' منفی حوالہ صفیہ کا تھا۔ اس حوالے سے بھی ہر دن پچھلے دن سے آگے جا رہا تھا۔ صفیہ کو وہ صرف رات کی تنہائی سے بچنے کے لئے اپنے ساتھ لایا تھا لیکن وہ اس کی ضرورت بنتی جا رہی تھی۔ ہر روز اس کے معاملے میں کوئی چونکا دینے والی بات سامنے آتی۔ ہر روز اس کی کوئی صلاحیت ظاہر ہوتی۔ وہ اس سے مرعوب ہوتا' اس کی افادیت سے انکار کرنا بھی ممکن نہ ہوتا لیکن اسے قبول کرنے سے وہ ڈرتا۔ اس نے یہ دیکھ لیا تھا کہ یہ لڑکی چھا جانے والی ہے..... اور چھائی جا رہی ہے۔ ایسے لوگ تو کہیں بھی اپنی جگہ بنا سکتے ہیں..... دل میں بھی..... مضبوط بند دروازے کے باوجود بھی۔

مجیب اپنی اس پہلے دن کی چوک کو دل ہی دل میں برا کہتا تھا' جب اس نے صفیہ کو اسٹڈی میں بیٹھنے کی اجازت دی تھی مگر اس وقت اسے یہ کیا خبر تھی کہ یہ وہ لڑکی ہے' جسے پاؤں دھرنے کی جگہ دینا بھی مخدوش ہے۔ وہ تو دیکھتے ہی دیکھتے اسٹڈی پر' پھر پورے بنگلے پر چھا گئی۔ قابض ہو گئی' اور وہ اف بھی نہیں کر سکا۔ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ کوئی جواز ہی نہیں تھا اس کے پاس۔ وہ کبھی اس سے ڈسٹرب بھی تو نہیں ہوا۔ الٹا اس کی موجودگی اس کے لئے فائدہ مند تھی۔

عجیب جادو تھا اس لڑکی میں۔ اسٹڈی میں بیٹھی رہتی اور مجیب منہمک ہوتا یا نہ ہوتا' اسے اس کی موجودگی کا احساس تک نہ ہوتا اور مجیب سر گھما کر اسے دیکھتا تو کتاب

پر نظریں جمائے مطالعے میں مصروف پاتا لیکن وہ اس کی نظریں پہلے ہی لمحے میں محسوس کر لیتی تھی۔ یہی نہیں، وہ بغیر پوچھے اس کی ضرورت سے بھی باخبر ہو جاتی تھی۔ لوگوں کے اندر کا حال کھوج کر لکھنے والے مجیب کی سمجھ میں کبھی نہیں آیا کہ ایسا کیسے ہو جاتا ہے۔

ہوتا کچھ یوں تھا کہ جیسے ہی وہ اس کی طرف دیکھتا، وہ کتاب پر نظریں جھکائے جھکائے کہتی "پانی دوں آپ کو؟" اور مجیب کو حیرت ہوتی۔ کیونکہ اس وقت واقعی اسے پیاس ہی لگ رہی ہوتی اور جب اسے چائے کی طلب ہوتی تو وہ پوچھتی "چائے لاؤں آپ کے لئے؟" یا کہتی "کھانا لگا دوں؟" اور لطف یہ کہ اس کی طرف دیکھے بغیر وہ یہ بھی جان لیتی تھی کہ وہ اس کی طرف دیکھ رہا ہے بلکہ اس کی ضرورت بھی سمجھ لیتی۔

اس معاملے میں ایک خوف ناک بات بھی تھی۔ اس کا ادراک مجیب کو چند روز گزرنے کے بعد ہوا۔ ابتدا میں وہ یونہی تجسس کے تحت سر گھما کر اسے دیکھتا تھا۔ بہت غور سے دیکھتا تھا مگر وہ مطالعے میں یوں مستغرق ہوتی تھی، جیسے اسے گرد و پیش کی خبر ہی نہیں ہے۔ چنانچہ وہ بے تکلفی سے اسے دیکھتا رہتا۔ وہ کوئی بہت حسین لڑکی نہیں تھی۔ لیکن اس میں عجیب طرح کی دلکشی اور مقناطیسیت تھی۔ چہرے پر بھولپن اور معصومیت کے علاوہ دو ایسی چیزیں تھیں، جو بے حد خوب صورت اور کشش انگیز تھیں۔ اس کے بھرے بھرے سرخ ہونٹ... اور آنکھیں لیکن چپکے سے دیکھتے وقت آنکھیں نظر ہی نہیں آتی تھیں۔ مطالعہ کرتے وقت بالوں کی ایک لٹ ہمیشہ گری رہتی تھی اور اس کی ایک آنکھ کو سائیڈ سے چھپائے رکھتی تھی۔

ابتدا میں مجیب نے اسے یوں دیکھا، جیسے کوئی سرجن اپنے مریض کو دیکھ رہا ہو۔ پھر وہ اس دید کا عادی ہو گیا تو یوں ہوا کہ ایک مرد ایک عورت کو دیکھ رہا ہوتا۔ اس کے ہونٹ اس کی توجہ کا مرکز بنے رہے پھر ایک دن اسے خیال آیا کہ اس نے اس کا سراپا کبھی نہیں دیکھا۔ اس روز اس کی نظر نے نیچے کا سفر کیا اور پاؤں تک ہو کر مایوس لوٹ آئی اور ہونٹوں پر آ رکی۔ وہاں دیکھنے کو کچھ تھا ہی نہیں۔ یہاں بیٹھے ہوئے ہی نہیں، چلنے پھرنے کے دوران میں بھی وہ چادر اتنے سلیقے سے اوڑھتی تھی کہ پردے کا حق ادا ہو جاتا تھا۔

اس روز صفیہ کے تاثر میں پاکیزگی کا اور اضافہ ہو گیا۔ دلکشی اور مقناطیسیت کے علاوہ اس لڑکی میں پاکیزگی اور پراسراریت بھی تھی۔ اس روز مجیب کو یقین ہو گیا کہ یہ لڑکی ایک ایسی کتاب ہے، جسے سرورق سے آگے کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔ جس کا ایک لفظ بھی کسی نے نہیں پڑھا۔ جس کا ایک حرف بھی کبھی کوئی نہیں دیکھ سکا۔

اور اسی روز سے اس خوف ناک بات کا احساس ہوا!!

اس کا سروے کرنے کے بعد مجیب نے سر جھکایا مگر فوراً ہی پیاس کا احساس ستانے لگا۔ اس نے پھر سر گھمایا۔ صفیہ اسی طرح مطالعے میں مستغرق تھی۔ مجیب کے منہ پھیرنے اور دوبارہ سر گھما کر اسے دیکھنے کے درمیان بمشکل چند سیکنڈ کا فاصلہ تھا۔ اسی لئے سر جھکا کر پڑھتی ہوئی صفیہ کی آواز اسے بم کے دھماکے کی طرح لگی۔ وہ اچھل ہی تو پڑا۔

"پیاس لگی ہے آپ کو؟" صفیہ پوچھ رہی تھی۔

جھٹکا اس کے لئے اتنا بڑا تھا کہ وہ جواب میں کچھ کہہ نہیں سکا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس لڑکی نے ابھی سر گھماتے مجھے دیکھ لیا یا محسوس کر لیا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ دو سیکنڈ پہلے خود کو تکتے نہ دیکھا ہو۔ گویا وہ جب بھی چپکے چپکے اسے دیکھ رہا ہوتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے۔ وہ جانتی ہے۔ بے خبر نہیں ہوتی۔ تو پھر یہ کیا سمجھتی ہو گی مجھے۔ میرے بارے میں کیا تاثر ہو گا اس کا۔

اسے اپنے آپ پر شدت سے شرم آئی۔ اسے ایسا لگا کہ بھرے بازار میں چلتے چلتے جیسے جادو کے زور سے اس کے جسم پر موجود کپڑے غائب ہو گئے ہیں۔

اسے پتہ بھی نہیں چلا کہ صفیہ اٹھ کر اس کے لئے پانی لے آئی ہے "لیجئے نا۔" صفیہ نے کہا تو وہ چونکا۔

"مگر مجھے تو پیاس نہیں ہے۔" مجیب نے سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

اس کی بات سن کر وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتی رہی پھر ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں چمک نظر آئی۔ اگلے ہی لمحے وہ بولی۔

"کوئی بات نہیں۔ میں پی لوں گی۔" یہ کہہ کر وہ اپنی کرسی کی طرف چلی گئی اور بیٹھ کر پانی پینے لگی۔

مجیب کام کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن کام اب اس سے ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ایک تو جو شاک اسے لگا تھا' وہ ابھی تک اس سے نہیں سنبھلا تھا۔ دوسرے پیاس اسے ستا رہی تھی اور پانی کو وہ منع کر چکا تھا۔

پھر پیاس کی شدت اتنی بڑھی کہ وہ بے چین ہو گیا۔ پیاس تو پہلے ہی تھی لیکن شاک اور اس کی گھبراہٹ نے شاید اسے اور بھڑکا دیا تھا۔ اسے اپنے حلق میں کانٹے پڑتے محسوس ہو رہے تھے۔

وہ ضبط کرتا رہا کہ اب کیسے پانی مانگے۔ وہ تو خود بھی اٹھ کر پانی نہیں پی سکتا تھا۔ صفیہ کیا سوچتی مگر پانی ہوتے ہوئے اتنی شدید پیاس کو برداشت کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ پہلو بدلتا رہا۔ اسی اضطراری کیفیت میں بلا ارادہ اس نے سر گھما کر صفیہ کو دیکھا۔

"پانی پئیں گے؟" صفیہ نے ہمیشہ کی طرح نظریں اٹھائے بغیر پوچھا۔

اب ہٹ دھرمی ممکن نہیں تھی۔ مجیب نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا "ہاں....."

صفیہ اٹھی۔ پانی کا جگ صوفے کے سامنے والی میز پر رکھا تھا۔ اس نے گلاس میں پانی انڈیلا اور لے آئی۔ مجیب گھونٹ گھونٹ پانی پیتا رہا۔ وہ کھڑی رہی "جگ اور گلاس یہاں میز پر کیوں نہیں رکھ دیتیں۔ میں خود پانی پی لیا کروں گا۔ مجبوری کی بات اور ہے۔ ورنہ محتاجی مجھے اچھی نہیں لگتی۔" مجیب نے اندر کی تلخی نکالی۔ مجبوری سے اس کا اشارہ اپنی رات کی مجبوری کی طرف تھا۔

"محتاجی کیسی۔ میری تو اپنی غرض ہے اس میں۔ پانی پلانے کا بڑا ثواب ہے۔" صفیہ نے کہا پھر اس کے چہرے پر کرختی کا سایہ آتے دیکھ کر بولی "میز پر یہ ڈر ہے کہ ذرا ہاتھ لگا اور پانی گر گیا تو آپ کا لکھا ہوا دھل جائے گا۔"

مجیب نے گلاس خالی کر کے اسے دیا۔ وہ واپس اپنی جگہ آ کر بیٹھی تو مجیب وہ کتاب اٹھا چکا تھا' جو وہ پڑھ رہی تھی۔ اس نے وہ صفحہ دیکھا' جو بظاہر صفیہ کے زیر مطالعہ تھا۔ وہ اس کی چوری پکڑ کر دکھانا چاہتا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس کی طرف متوجہ بھی رہتی اور انہماک سے مطالعہ بھی کرتی "پروین شاکر بہت پسند ہے تمہیں؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"جی ہاں۔ بہت زیادہ۔" صفیہ نے جواب دیا "لیکن یہاں تک محدود نہیں اور

لوگ بھی پسند ہیں مجھے۔"

"اس وقت کیا پڑھ رہی تھیں؟"

"ایک غزل کا مطلع پڑھ رہی تھی۔ بادباں کھلنے سے پہلے کا اشارہ دیکھنا میں سمندر دیکھتی ہوں' تم کنارہ دیکھنا۔"

مجیب کو حیرت ہوئی۔ اتنی دیر بعد بھی اسے یاد تھا "اتنی دیر سے ایک ہی شعر پڑھ رہی تھیں؟" مجیب نے معترضانہ لہجے میں کہا۔

"یہ میری کمزوری ہے۔ جب تک ایک شعر کو اچھی طرح نہ سمجھ لوں' دوسرے شعر تک نہیں جاتی۔"

"تو بہت ہے' اس شعر کو رہنے دو۔" مجیب نے بے ساختہ کہا۔

"کیوں؟" صفیہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

مجیب گڑبڑا گیا "بس یونہی کہہ رہا تھا۔ شاید یہ تمہاری سمجھ میں نہ آ سکے۔" پھر وہ جان بچانے کے لئے کام پر جھک گیا۔

اس دن کے بعد اسے صفیہ کو چپکے چپکے دیکھنے کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔

صفیہ غیر معمولی مشاہدے کی مالک اور بے حد سمجھ دار لڑکی تھی۔ مجیب ہر روز صبح سویرے نہانے کا عادی تھا لیکن مری میں پانی کی ٹھنڈک نے اسے معمول کو تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ روز نہانے کا عادی نہائے بغیر تو نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ اس نے معمول بنا لیا کہ دوپہر کو کھانے سے پہلے نہانے لگا۔

وہ مری میں اس کا چوتھا دن تھا۔ وہ نہانے کے لئے باتھ روم میں داخل ہوا تو وہاں کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ کھونٹی پر اس کا تولیا ٹنگا تھا۔ واش بیسن پر اس کا شیمپو اور نہانے کا صابن موجود تھا۔ باتھ روم آئینے کی طرح چمک رہا تھا پھر اس کی نظر سب سے بڑی تبدیلی پر پڑی۔ وہ ایک دیواری کپ بورڈ تھا' جس میں شیشے کے سلائیڈنگ ڈور لگے تھے۔ باتھ روم کی مناسبت سے اس کی لمبائی یا اونچائی زیادہ تھی' جس کی وجہ سے وہ بھدا لگ رہا تھا۔ اس میں اسے اپنے کپڑے لٹکے نظر آئے۔ تازہ استری ہوئے کپڑے۔

"یہ تو کھونٹی پر بھی لٹکائے جا سکتے تھے۔" وہ بڑبڑایا "خوامخواہ باتھ روم کی خوب صورتی خراب ہوئی۔"

لیکن نہانے کے بعد اس نے دیواری کپ بورڈ سے اپنے کپڑے نکالے تو اس کی سمجھ میں آیا کہ نہانے کے دوران میں چھینٹے اڑنے سے کپڑے کہیں سے گیلے ہو جاتے تھے اور یہ اسے خود بھی ناگوار گزرتا تھا۔ اب کپڑے خشک ملے تھے۔

اس نے اکیلے میں شکور سے کپ بورڈ کے بارے میں پوچھا تو وہ بولا "بیگم صاحبہ لائی ہیں صاب جی اور میں نے لگایا ہے۔"

"اور میرے کپڑے......"

"بیگم صاب نے خود استری کئے ہیں۔"

مجیب کو برا نہیں لگا۔ وہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لئے نہانے کے بعد وہی اترے ہوئے کپڑے پہن لیتا تھا۔ اب کون استری میں وقت ضائع کرے۔ کبھی داخل ہوتے وقت وہ اپنا شیمپو بھول جاتا تھا تو صابن ہی سے سر دھو لیتا تھا۔ گزشتہ روز تو وہ تولیا بھی بھول گیا تھا اور نہانے کے بعد خود جھنجلا گیا تھا۔ بالآخر اس نے جسم خشک کئے بغیر ہی کپڑے پہن لئے تھے۔

اس کے بعد یہ معمول بن گیا۔ استری شدہ کپڑے، تولیا، شیمپو، ضرورت کی ہر چیز باتھ روم میں موجود ہوتی اور ایک روز اسے پتہ چلا کہ اس کے نہانے سے پہلے صفیہ ہی بہت اچھی طرح باتھ روم دھوتی ہے۔ اس روز وہ معمول سے کچھ پہلے ہی نہانے کے لئے آ گیا تھا۔

اور مری میں پہلی صبح جو مجیب نے اسے دو ہزار روپے دیئے تھے، وہ ان سے صرف کتابیں خرید کر لائی تھی۔ مجیب نے دیکھ لیا تھا کہ اس لڑکی کو صرف کتابوں کا شوق ہے اور مطالعہ اس کی واحد تفریح ہے۔ اب بیس دن گزارنے کے بعد وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کال گرل ایسی بھی ہو سکتی ہے۔ گفتگو میں پاکیزگی، انداز و اطوار میں حیا، جسم کو دکھانے کے بجائے چھپانے کی تہذیب، مطالعے کا شوق، شعر و ادب کا ذوق، خیال رکھنے کی خو، کچھ نہ کچھ کھینچتے رہنے کی بجائے کچھ دینے کا جذبہ۔ یہ سب ایک عام لڑکی میں تو ہو سکتا ہے مگر کوئی کال گرل، خواہ وہ اندر سے ایسی نہ ہو، مجبوریوں نے اسے بنا دیا ہو، ایسی تو نہیں ہو سکتی۔ مجبوری میں اس طرف آنے والی کی تو سب سے بڑی ضرورت پیسہ ہی ہوتا ہے بلکہ پیسے کی طرف سے اسے عدم تحفظ کا احساس بہت شدید ہوتا ہے۔

مجیب خود پر جھنجلاتا تھا۔ اسے اس بات کی فکر کیوں ہے کہ وہ لڑکی کیا ہے اور کیوں ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہو، اسے وہ اپنی ایک مجبوری اور ضرورت کے تحت اپنے ساتھ لایا تھا۔ اسے اس پر ریسرچ تو نہیں کرنی تھی۔ کہانی تو نہیں لکھنی تھی۔ وہ ایسی لڑکی تھی کہ اسے تو اس میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لینا چاہئے تھی۔ اس لئے کہ وہ دلچسپی کے لائق تھی اور وہ جانتا تھا کہ یہ بات خطرناک ہے۔

ہر دن آگے بڑھ رہا تھا تو ہر رات ساکت و جامد تھی۔ رات کا معمول وہی پرانا والا تھا۔ اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ رات کے کھانے کے بعد وہ چہل قدمی کرتا۔ صفیہ اس کے ساتھ ہوتی لیکن مجیب اس سے کوئی بات نہیں کرتا۔ جیسے رات کے وقت اس سے خوف زدہ ہو۔ چہل قدمی وہ صبح کو بھی کرتے تھے لیکن اس وقت وہ ہلکا پھلکا ہوتا تھا۔ اس پہلی صبح کے بعد دادی کا رخ انہوں نے بہرحال نہیں کیا تھا۔ رات کو وہ اسی طرح سوتے تھے۔ وہ صوفے پر اور صفیہ بیڈ پر لیکن جب تک وہ لائٹ آف نہ کر دیتا یا صفیہ سے لائٹ آف کرنے کو نہ کہتا، صفیہ سونے کے لئے لیٹتی نہیں تھی اور وہ صبح ہر حال میں اس سے پہلے بیدار ہوتی تھی۔

اس معمول سے بھی اسے الجھن ہونے لگی تھی۔ اس کی بھی ایک وجہ تھی۔ جب سے اس نے اس ڈر سے صفیہ کو چپکے چپکے دیکھنا چھوڑا تھا کہ وہ اس کی نظروں میں چوری سے باخبر ہوتی ہے، تب سے یہ مشکل پیدا ہوئی تھی۔ کام کرتے کرتے اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اسے دیکھے لیکن وہ ضبط کئے، نظریں جھکائے بیٹھا رہتا۔ یوں خود سے لڑنا اس کے لئے بہت تکلیف دہ ہوتا تھا۔ دھیان بٹانے کے لئے وہ اس پر غور کرنے لگتا کہ آخر وہ صفیہ کو اس طرح دیکھنے کی ضرورت کیوں محسوس کرتا ہے۔ اسے خوف آتا کہ وہ صفیہ کو کم از کم اپنی حد تک کھلی اہمیت دینے لگا ہے۔ جب وہ مجبور ہو جاتا ہے تو اسے پوری ڈھٹائی کے ساتھ نظریں جما کر دیکھتا کہ وہ ٹوکے پوچھے تو اپنی بھڑاس نکالے مگر صفیہ نے کبھی یہ احساس ہی نہیں ہونے دیا۔

وہ انسانی نفسیات کو سمجھنے والا آدمی تھا اور خود سے دوسروں کی نسبت کہیں زیادہ باخبر تھا لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ انسان جب کوئی بات خود سے بھی چھپانا چاہے تو یہ ذرا بھی مشکل نہیں ہوتا۔ لاشعور تو وہ چیز ہوتا ہے، جو کسی بات کا علم نہیں ہونے دیتا۔ وہ

جب اس معاملے کو کھنگالتا تو عجیب صورت حال پیش آتی۔

دل کہتا "کچھ بھی نہیں۔ بس تجسس ہے۔ وہ سراپا چھپا کر رکھتی ہے اور یہ بات انسانی فطرت کے مطابق مجھے متجسس بناتی ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ سراپا کیسی لگتی ہے۔" پھر اس دلیل کے بطن سے ایک اور دلیل پیدا ہوتی "اور یہی وہ چاہتی ہے۔ یہ بھی لبھانے کا ایک گر ہے.... کاروباری گر۔"

"وہ ایسی نہیں ہے۔" دماغ دل کی دلیل کو رد کرتا "ہوتی تو تم سے احترام کی شرط نہ منواتی۔ اپنی حیثیت کے معاملے میں وہ کتنی سخت ہو جاتی ہے اور جہاں تک تمہارے تجسس کا معاملہ ہے تو اس سے پہلے تمہیں کبھی کسی غیر عورت کے معاملے میں تجسس نہیں ہوا۔ یہ عنایت صفیہ کے لئے ہی کیوں؟"

"مطلب کیا ہے تمہارا؟" دل جھنجلایا۔

"تم کوئی عیاش آدمی نہیں ہو۔ تمہیں کسی غیر لڑکی کے جسم سے' اس کے سراپا سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھا۔ کہنا کیا چاہتے ہو؟" اس نے الجھ کر کہا۔

"مجھے لگتا ہے' تم اس میں دلچسپی لے رہے ہو اور اس بات کو تجسس کے پردے میں چھپا رہے ہو۔"

"تمہارا مطلب ہے رومانوی دلچسپی۔" دل نے تعجب سے کہا۔

"ہاں اور کیا۔"

"رومانوی دلچسپی اور وہ بھی بازار کی ایک لڑکی سے۔" دل نے مضحکہ اڑایا۔

"دلچسپی تو کسی کو بھی' کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ کسی بھی وقت ہو سکتی ہے۔" دماغ نے سکون سے کہا "لیکن تمہارا معاملہ اور ہے۔ نہ وہ بازاری لڑکی ثابت ہوئی ہے اور نہ ہی تم اسے ایسا سمجھتے ہو۔"

دل کو خود بھی پتہ نہیں تھا کہ اس نے شعور سے چھپا کر لاشعور کی طرف کیا دھکیلا ہے۔ وہ خوف زدہ ہو گیا۔ صحیح صورت حال کا اسے علم ہی نہیں تھا لیکن دلیل کے مقابلے میں ہار ماننا گویا اعتراف کرنا تھا اور یہ وہ کر نہیں سکتا تھا "یہ دلچسپی ایک بچے کی کسی کھلونے میں دلچسپی کی طرح ہے۔ بچے کو جس کھلونے میں دلچسپی ہوتی ہے' وہ

اسے حاصل کرنے کی ضد کرتا ہے' حاصل کر کے رہتا ہے پھر اس سے کھیلتا ہے۔ کم کھیلے' زیادہ کھیلے' بہت زیادہ کھیلے' بالآخر اس کا جی اس سے بھر جاتا ہے پھر یا تو وہ اسے توڑ کر پھینک دیتا ہے یا کسی کباڑ یا کونے میں ڈال کر اسے بھول جاتا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔ حقیقت پسندی سے کام لو تو سمجھ میں آئے گی۔"

"حقیقت پسندی اور تم۔" دماغ نے مذاق اڑایا "ازل سے آج تک تم کبھی حقیقت پسندی سے کام لینے والے نہیں رہے۔ کچھ چھپانا ہو تو حقیقت پسند بن جاتے ہو۔ میں خوب سمجھتا ہوں۔ خوب جانتا ہوں تمہیں۔"

"اچھا' اگر مجھے اس سے رومانوی دلچسپی ہے تو اس کا سراپا دیکھنے کا اشتیاق کیوں ہے مجھے؟"

"یہی تو میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔" دماغ نے الجھن بھرے لہجے میں کہا "تم نے کوئی بات مجھ سے چھپائی ہے مگر ضرور۔"

"بات وہی ہے' جو میں کہہ رہا ہوں۔"

"تو پھر تم اسے خطرناک کیوں سمجھتے ہو۔ اس سے ڈرتے کیوں ہو؟"

"وہ بھی میری اپنی سوچ نہیں۔ سحاب کا تھوپا ہوا فلسفہ ہے۔ میں اسے اہمیت دینا نہیں چاہتا مگر بے بس ہوں۔ سحاب کی بات کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس سے محبت جو کرتا ہوں۔"

دل و دماغ کی اس بحث سے مجیب کو یہ اندازہ ہو گیا کہ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔ ساتھ ہی اسے ایک دفاع بھی میسر آ گیا۔ اس کا لاشعور پہلے ہی فیصلہ کر چکا تھا۔ محبت میں الجھنا اپنے لئے پیچیدگیاں پیدا کرنا تھا۔ وہ محبت کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ہوس سادہ و آسان بھی تھی اور فطرت کے عین مطابق بھی۔ اس میں اپنی شخصیت پر بس ایک داغ ہی تو لگے گا۔ اس کا یہ نظریہ راسخ ہو گیا کہ صفیہ میں جسمانی دلچسپی ہے۔ اس لئے وہ اسے دیکھتا ہے۔

چنانچہ اب وہ اسے کھل کر دیکھنے لگا۔ کبھی اسے خود بھی برا لگتا تو وہ سوچتا کہ اس میں معیوب بات کیا ہے۔ وہ تو صرف دیکھتا ہے۔ جبکہ کال گرل تو کھیلنے کے لئے ہوتی ہے۔ یہ الگ بات کہ وہاں دیکھنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ صفیہ خود کو اتنے سلیقے سے

ڈھانک چھپا کر رکھتی تھی کہ اس کی نگاہوں کو مایوسی کے سوا کچھ نہ ملتا۔

اس ناکامی نے جسم کو اس کا کمپلیکس بنا دیا۔ وہ جسم اس کے لئے چیلنج بن گیا۔ وہ اسے قیاس کی حد میں بھی نہیں جانے دیتا تھا۔ قیاس کے لئے بھی تو کوئی بنیاد درکا[ر] ہوتی ہے۔ کم از کم سیکونس کا پہلا یقینی عدد تو موجود ہو۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں تھا۔

اس رات وہ سوتے سوتے جاگ اٹھا۔ لگتا تھا کہ اس نے کوئی خواب دیکھا ہے مگ[ر] یاد کچھ بھی نہیں تھا۔ ذہن بس ایک لفظ کی تکرار کئے جا رہا تھا۔۔۔۔ جسم۔۔۔۔ جسم۔۔۔۔ اس نے کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کی لیکن اس سے سویا نہیں گیا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

ایک خیال نے اسے چونکا دیا۔ اس وقت وہ صفیہ کو دیکھ سکتا ہے۔ سوتے میں ن[ہ] وہ خود کو چھپانے کا ایسا اہتمام نہیں کر سکتی۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ و[ہ] ٹٹولتا ہوا سوئچ بورڈ کی طرف بڑھا۔ اس نے سوئچ دبایا۔ کمرا روشنی میں نہا گیا۔ اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ یوں تو وہ اٹھ جائے گی۔ وہ خود اندھیرے میں سونے کا عادی تھا اور کتنی ہی گہری نیند سو رہا ہوتا' کوئی روشنی کرتا تو فوراً اس کی آنکھ کھل جاتی۔ کیا پتہ' صفیہ کا بھی ایسا ہی سسٹم ہو۔

اس نے جلدی سے نائٹ بلب کا سوئچ دبایا اور دوسری بتی بجھا دی۔ اب کمرے میں ہلکی سبز روشنی تھی۔ وہ دبے پاؤں بیڈ کی طرف بڑھا لیکن اس کی مایوسی کی کوئی حد نہیں تھی۔ صفیہ سر سے پاؤں تک کمبل میں لپٹی ہوئی تھی۔ اس پر وحشت طاری ہونے لگی۔ جی چاہا کہ کمبل اٹھا کر ایک طرف پھینک دے اور صفیہ کو جی بھر کر دیکھے۔

اس نے نائٹ بلب روشن رہنے دیا اور مرے مرے قدموں سے صوفے کی طرف آ گیا۔ کروٹ لے کر لیٹتے ہوئے اس نے اپنا رخ بیڈ کی طرف کر لیا۔ اس نے سوچا' صفیہ سوتے میں کروٹ تو بدلے گی ہی۔ کروٹ بدلے گی تو کمبل بھی ہٹے گا۔

اسے اپنی سوچ پر شرم آنے لگی۔ کیا وہ اتنا گر گیا ہے۔ اسے تو اپنے کردار پر بڑا غرور تھا۔ وہ شرم سار ہو گیا۔ اپنے آپ سے نفرت محسوس ہونے لگی لیکن اگلے ہی لمحے اس کے اندر سے کسی نے بے حد نرم لہجے میں کہا "یہ بشریت ہے مجیب انور۔ تم

بھی انسان ہو۔ نفسانی تقاضوں سے مبرا ہو ہی نہیں سکتے۔"

اسے سکون آ گیا۔ شرم ساری دور ہو گئی۔ اس نے سوچا' اس لڑکی کو تو کسی بھی وقت حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ تو ہے ہی حاصل کرنے کے لئے۔ وہ صفیہ کے کروٹ بدلنے کے انتظار میں اسے تکتا رہا۔ یہاں تک کہ صبح کا اجالا پھیلنے لگا۔ جاگنے کا وقت ہو گیا تھا لیکن اس نے تو رات کا دوسرا حصہ جاگتے ہوئے گزارا تھا۔

وہ باتھ روم میں چلا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ صفیہ اس کے بعد بیدار ہوئی۔ وہ باتھ روم سے نکلا تو صفیہ ہمیشہ کی طرح چادر میں لپٹی لپٹائی بیڈ پر پاؤں نیچے لٹکائے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور چہرے پر پریشانی تھی۔

وہ باتھ روم سے نکلا تو صفیہ اسے بہت غور سے دیکھنے لگی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ وہ اسے کبھی اس طرح نہیں دیکھتی تھی۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟" صفیہ نے پوچھا۔

مجرم ضمیر کی وجہ سے مجیب کا پہلا تاثر یہ تھا کہ وہ اس پر طنز کر رہی ہے لیکن فوراً ہی اس کی تشویش کا اندازہ ہو گیا "ٹھیک ہے۔ کیوں؟"

"یہ نائٹ بلب۔۔۔۔" صفیہ نے اشارہ کیا۔

مجیب پھر خود کو مجرم محسوس کرنے لگا۔ اب اسے کیا بتائے۔ "رات اندھیرے میں نیند نہیں آ رہی تھی۔ روشنی کرنی پڑی۔"

"نیند نہیں آ رہی تھی!" صفیہ نے دہرایا اور اسے بہت غور سے دیکھا "آپ کی آنکھیں سوج رہی ہیں۔ لگتا ہے' سوئے ہی نہیں۔"

"ہاں۔۔۔۔ وہی۔۔۔۔ نجانے کب آنکھ کھل گئی۔ اس کے بعد سویا ہی نہیں گیا۔" مجیب نے بے حد سچائی سے کہا۔

"کہیں۔۔۔۔ کہیں آپ کو ڈر تو نہیں لگا؟ تنہائی کی وجہ سے۔۔۔۔"

"ارے نہیں۔" مجیب نے جلدی سے کہا "اور تنہا میں کب تھا۔" اس نے غور سے صفیہ کو دیکھا۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی لیکن پریشانی کا تاثر اب بھی اس کے چہرے پر موجود تھا۔

"میری موجودگی کے باوجود ڈر لگا آپ کو۔" صفیہ نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کا مسئلہ حل نہیں کر سکی۔"

"میں نے کہا نا' ایسی کوئی بات نہیں۔" مجیب نے تیز لہجے میں کہا۔ اسے اس کی فکر مندی سے الجھن ہو رہی تھی۔

صفیہ کے چہرے پر اب کشمکش کا تاثر تھا۔ چند لمحے وہ جھجکتی رہی پھر بولی "آپ بیڈ پر سو سکتے ہیں..... میرے ساتھ۔" یہ کہتے کہتے اس کی نظریں جھک گئیں "اور آپ کسی ضرورت سے رات کسی بھی وقت مجھے اٹھانے کا حق رکھتے ہیں۔"

اس کے لہجے کے خلوص نے مجیب کو اور حقیر کر دیا "میں کہہ رہا ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں۔"

صفیہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ باتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ پر پہنچ کر وہ رکی۔ اس نے پلٹے بغیر سر گھماتے ہوئے مجیب کو دیکھا "میں یہاں آپ کی خدمت کرنے' آپ کو ہر پریشانی اور تکلیف سے بچانے کے لئے آئی ہوں اور آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ اس کی میں نے کتنی بھاری قیمت ادا کی ہے۔" پھر اس نے باتھ روم میں جا کر دروازہ بند کر لیا۔

مجیب کھڑا باتھ روم کے دروازے کو تکتا رہا۔ اس کی سمجھ میں یہ قیمت والی بات نہیں آ رہی تھی۔ چند لمحے بعد اس نے سر جھٹکا اور اپنے معمولات میں مصروف ہو گیا۔

○

سفیان احمد نے لفافہ ہاتھ میں لیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ دکان سے آتے ہی ناظورہ بیگم نے وہ انہیں تھما دیا تھا۔ سفیان احمد کو حیرت ہو رہی تھی۔ کیونکہ لفافے پر کوئی ڈاک ٹکٹ نہیں لگا تھا لیکن اس کی پشت پر صابر کا نام پتا اور فون نمبر موجود تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ خط پاکستان سے آیا ہے لیکن یہ کیسا خط ہے' جس پر ڈاک ٹکٹ بھی نہیں۔ انہوں نے سوچا' دستی بھجوایا ہو گا۔ ان کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ یہ اطمینان تھا کہ رضوان گھر میں موجود نہیں۔ اسے وہ دکان پر چھوڑ آئے تھا۔

"ڈاکیا لایا تھا' موٹر سائیکل پر تھا وہ۔" ناظورہ بیگم نے کہا۔

"ڈاکیئے موٹر سائیکل پر کب آتے ہیں۔" سفیان احمد نے جھنجلا کر کہا۔

"یہ تو میں نے بھی سوچا تھا۔" ناظورہ بیگم بولیں "لیکن اس نے آپ کا نام پوچھا۔ پھر کہا' آپ کا پاکستان سے خط آیا ہے پھر اس نے مجھ سے رسید پر دستخط بھی لیئے۔"

سفیان احمد کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا۔ انہوں نے دھڑکتے دل سے لفافہ کھولا۔ وہ صابر کا ہی خط تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ وقت کہ اہمیت کی وجہ سے وہ یہ خط کوریئر سروس کے ذریعے بھجوا رہا ہے۔ اس کے بعد خط اس جملے سے شروع ہو رہا تھا..... تایا جان' اللہ آپ کو صبر اور حوصلہ دے..... یہ پڑھ کر ہی سفیان احمد کا دل بیٹھنے لگا۔ انہیں یقین ہو گیا کہ ان کے لئے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔"

ناظورہ بیگم نے ان کے چہرے کی ہوائیاں اڑتے دیکھیں تو گھبرا کر بولیں "کیا بات ہے۔ کیا لکھا ہے اس میں؟"

"ابھی پڑھا نہیں ہے میں نے۔" سفیان احمد نے ڈوبتی آواز میں کہا۔

"تو پھر ایسے کیوں ہو رہے ہیں آپ؟"

"سمجھ گیا ہوں کہ اچھی خبر نہیں ہے۔"

ہر شخص کی زندگی میں کم از کم ایک بار ایسا موقع ضرور آتا ہے کہ اللہ دل کو

طاقت نہ دے تو پھٹ جائے۔ انسان مر جائے۔ وہ وقت سفیان احمد کی زندگی میں اس روز' اس وقت آیا تھا۔ خط پڑھتے ہوئے ان کے پورے وجود میں جیسے آندھیاں چل رہی تھیں۔ پہلی بار میں انہوں نے پڑھا کچھ نہیں۔ بس اتنا سمجھا کہ صفورہ بھائی کے ہاں بھی نہیں ہے۔ تو پھر وہ کہاں ہے؟ یہ خیال مسلسل ان کے دماغ میں اپنا زہریلا ڈنک گاڑے جا رہا تھا۔

اس بار ان کی حالت بالکل ہی غیر ہو گئی تھی۔ ناظورہ بیگم نے گھبرا کر پوچھا "کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟"

سفیان احمد اس وقت ہوش و حواس میں نہیں تھے۔ جواب کیا دیتے۔

ناظورہ بیگم نے انہیں جھنجوڑ ڈالا "کیا ہوا.... بتاتے کیوں نہیں؟"

سفیان احمد نے ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔ "صفورہ.... غفران احمد.... کے ہاں.... بھی.... نہیں ہے۔" انہوں نے یوں ٹوٹ ٹوٹ کر کہا' جیسے ہر لفظ کی ادائیگی کے دوران میں انہیں مرنا پڑ رہا ہو۔

ناظورہ بیگم پر بھی جیسے بجلی گر پڑی مگر سفیان احمد کی حالت دیکھتے ہوئے انہوں نے بہت تیزی سے خود کو سنبھالا۔ شوہر کو خطرے میں دیکھ کر ان کے ذہن نے بہت تیزی سے کام کیا۔ صفورہ کے معاملے میں تو کسی کے اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا لیکن شوہر کو وہ بچا سکتی تھیں۔ ویسے بھی عورت کے لئے شوہر اولاد سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ انہوں نے خود پر جبر کر کے بے حد تحمل سے کہا "تو کیا ہوا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اللہ سب سے بڑا رکھوالا ہے۔"

اور جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا۔ سفیان احمد کو احساس ہوا کہ اس بحران میں وہ اکیلے نہیں' جان نثار اور غم گسار بیوی ان کے ساتھ ہے۔ انہوں نے بے حد ممنونیت سے ناظورہ بیگم کو دیکھا۔ ان کی ایک پکار نے انہیں بچا لیا تھا۔ ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

"اور کیا لکھا ہے؟" ناظورہ بیگم نے دل کی ٹیسوں پر ضبط کرتے ہوئے بے حد عام سے لہجے میں ان سے پوچھا۔

"ٹھیک طرح سے پڑھا ہو تو بتاؤں۔" انہوں نے کہا "اب پڑھتا ہوں۔"

سفیان احمد خط پڑھنے لگے۔ ناظورہ بیگم اپنے آنسوؤں کو ضبط کرنے میں مصروف رہیں۔ ان کے دل سے چیخیں اٹھ رہی تھیں لیکن وہ جانتی تھیں کہ یہ وقت کمزور پڑنے کا نہیں۔ ورنہ سفیان احمد بھی ڈھیر ہو جائیں گے۔

خط پڑھنے کے بعد سفیان احمد نے سر اٹھایا اور بولے "یہ صابر بہت سمجھ دار لڑکا ہے مگر بے رحمی کی حد تک حقیقت پسند ہے۔"

شوہر کو مضبوط دیکھ کر ناظورہ بیگم کمزور پڑنے لگیں۔ ان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"کچھ بتائیں بھی مجھے۔"

"اس نے لکھا ہے کہ صفورہ وہاں موجود نہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ بھری ٹرین سے کوئی زبردستی اسے اتار نہیں سکتا تھا۔ اگر اس کی تمام چیزیں سامان میں موجود ہیں...."

"وہ تو ہیں۔" ناظورہ بیگم نے بے تابی سے کہا "اس کا بیگ' ڈائری' کتابیں' کپڑے' حد یہ کہ پرس بھی۔"

"میں جانتا ہوں۔" سفیان احمد بولے "اس کا مطلب ہے کہ کسی وقت ضرورت کے تحت آخری لمحے میں وہ ٹرین سے اتری اور دوبارہ سوار نہیں ہو سکی۔ کیونکہ وہ خالی ہاتھ تھی اس لئے غفران کا پتہ اور فون نمبر بھی اس کے پاس نہیں تھا اور ان کے گھر وہ پہنچ نہیں سکی ہو گی۔ پہچانتی بھی تو نہیں ہے۔"

"تو رہ گئی کہاں۔" ناظورہ بیگم کی کیفیت ہذیانی ہونے لگی۔

"یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ اگر اسے بھلے لوگ مل گئے تو وہ محفوظ ہو گی۔ ورنہ تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" یہ کہتے کہتے سفیان احمد کی آواز پھر ڈوبنے لگی۔ چہرہ سپید پڑ گیا۔

ناظورہ بیگم نے پھر خود کو سنبھالا "آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں...."

"کیسے نہ ہوں۔ تمام عمر عزت کی فکر رہی اور آخر میں اسی پر آ بنی۔"

ناظورہ بیگم کے دل کو دھکا سا لگا۔ وہ تو بیٹی کے غم اور پریشانی کو دبا رہی تھیں۔ اور شوہر کو جیتی جاگتی بیٹی کی نہیں' اپنی عزت کی فکر تھی "آپ کی عزت کو کوئی خطرہ نہیں۔" انہوں نے تنک کر کہا شوہر کی نگاہوں میں سوال دیکھ کر انہوں نے مزید کہا۔

"اصل بات کا علم صرف تین گھرانوں کو ہے۔ ہمیں' فرقان میاں کے ہاں اور غفران کے ہاں۔ یہاں سب یہی جانتے ہیں کہ ہم صفورہ کی پاکستان میں شادی کر آئے ہیں۔

اصل بات باہر نہیں نکلے گی۔ آپ کی عزت محفوظ ہے۔ فکر کرنی ہے تو بیٹی کی زندگی کی کریں۔ دعا کرنی ہے تو بیٹی کی آبرو کی کریں۔"

یہ سن کر سفیان احمد کچھ پرسکون ہوئے مگر اگلے ہی لمحے انہوں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا "لیکن صفورہ نہیں ملی تو کیا ہو گا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ یہ سمجھ لیجئے گا کہ وہ مرگئی۔ یہ یاد کر کے صبر کر لیجئے گا کہ آپ ہمیشہ ڈرتے تھے کہ وہ کبھی کسی ہندو سے شادی نہ کر لے۔ ایسا نہیں ہوا۔ آپ کی عزت محفوظ رہی۔" یہ کہتے ہوئے ناظورہ بیگم کا دل جیسے خون ہو گیا۔

چند لمحے خاموشی رہی پھر سفیان احمد نے کہا "صابر نے گمشدگی کا اشتہار شائع کرانے کی اجازت مانگی ہے۔"

"پھر آپ نے کیا سوچا؟"

"بے عزتی کی تشہیر کی اجازت کیسے دے دوں۔"

ناظورہ بیگم تڑپ کر کہنا چاہتی تھیں کہ آپ کو بیٹی کی زندگی سے زیادہ اپنی عزت کی فکر ہے۔ یہی فرق ہوتا ہے ماں کی مامتا اور باپ کی محبت میں لیکن وہ یہ کہہ کر شوہر کو تکلیف نہیں پہنچا سکتی تھیں۔ اتنی مشکل سے تو ان کا صدمہ کم ہوا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مصلحت سے کام لیا "صابر سمجھ دار لڑکا ہے" انہوں نے سمجھانے والے انداز میں کہا "ایک اچھا امکان موجود ہے۔ اللہ سے امید اور دعا کرنی چاہئے کہ صفورہ محفوظ ہاتھوں میں ہو۔ اشتہار چھپے گا تو اس صورت میں وہ صابر کے پاس پہنچ سکے گی۔ ورنہ نجانے آگے کیا ہو۔ ہمیں اسے بچانے کی ہر ممکن کوشش تو کرنی چاہئے۔"

سفیان احمد ہچکچا رہے تھے "لیکن....."

"آپ کی عزت پر حرف نہیں آئے گا" ناظورہ بیگم نے قدرے تیز لہجے میں کہا "وہاں پاکستان میں صفورہ کو کون جانتا ہے اور آپ کے نام سے کون واقف ہے۔ سوائے ان کے جو ہمارے راز دار اور خیر خواہ ہیں۔ اللہ بہتر کرے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" سفیان احمد نے نیم دلی سے کہا لیکن بات اب ان کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اگلے روز وہ صابر کے کہنے کی مطابق عمل کریں گے۔ صابر نے لکھا تھا کہ اشتہار کی تجویز کے بارے میں وہ ٹیلی گرام کے ذریعے مختصر

ترین جواب.... ہاں یا نہیں کے ذریعے مطلع کریں۔ تاکہ وقت ضائع نہ ہو۔

اس رات ناظورہ بیگم یہ سوچ کر تڑپتی رہیں کہ بیٹی نجانے کہاں اور کس حال میں ہو گی۔ وہ ایک پل کے لئے بھی نہیں سو سکیں۔



صفورہ نے مجیب کو اپنے خیالوں' اپنی سوچوں کا محور بنا لیا تھا۔ وہ صرف اور صرف اس کے بارے میں سوچنا چاہتی تھی۔ اپنے بارے میں سوچنا اسے گوارا نہیں تھا۔ کچھ یوں کہ ابتدا ہی سے مجیب اس کا محبوب و مطلوب تھا اور اسی سے ملنے کی چاہ میں وہ اس انجام کو پہنچی تھی اور کچھ یوں کہ اپنے' اپنے ماضی اور اپنے گھر والوں کے بارے میں سوچنا اس درجہ اذیت ناک تھا کہ اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ مرجائے گی۔ وہ اب کر تو کچھ بھی نہیں سکتی تھی۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ گھر خط لکھے لیکن لکھنے کو کیا تھا۔ سچ لکھتی تو وہ اماں اور ابا کے قتل کے مترادف ہوتا۔ ان کے دکھ کا' پریشانی کا وہ اندازہ کر سکتی تھی۔ اسی لئے ان کے بارے میں وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

وہ سوچتی کہ اپنی حماقت سے یا تقدیر کی عنایت سے اگر وہ سب کچھ کھو کر یہاں تک آ ہی گئی ہے تو ہنسی خوشی ایک اچھا کام کر لے۔ اس میں بھی اسے خوشی مل سکتی ہے۔ وہ مجیب کو ہر ممکن آرام اور سکون بہم پہنچائے۔ اسے خوش رکھنے کی کوشش کرے۔ مجیب کے ساتھ اس نے خوشیوں کی آرزو اور دعا کی تھی۔ اب اس کے ساتھ رہ کر بھی خوشی اس کے نصیب میں نہیں تو کیا ہوا۔ وہ اسے خوش رکھ کر بھی تو خوش رہ سکتی ہے۔ اب اس کے سامنے کوئی اور امکان تو ہے ہی نہیں۔

مری میں اس نے اپنے پہلے دن کا آغاز اسی جذبے سے کیا تھا مگر اس کے سامنے ایک مسئلہ تھا۔ مجیب کو اب لکھنے میں مصروف ہو جانا تھا۔ نہ ہو' تب بھی وہ جانتی تھی کہ وہ اس سے بات کم ہی کرے گا۔ وہ تو اس کے لئے بس رات کی ضرورت.... مجبوری تھی۔ چنانچہ اس کے پاس فرصت ہی فرصت ہو گی اور فرصت ہو گی تو وہ ان لوگوں کے بارے میں سوچے گی' جن کے بارے میں سوچنے کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ تو اسے کوئی مصروفیت تلاش کرنا تھی.... اور مطالعے کے سوا کوئی ایسا مشغلہ نہیں تھا' جو اسے خوش رکھ سکتا۔

مجیب سے دو ہزار روپے لے کر وہ افضل خان کے ساتھ گاڑی میں جناح روڈ گئی۔ وہاں سے کتابیں خریدنا تھیں۔ اسے یاد تھا کہ وہ مجیب کی سالگرہ کا دن ہے۔ اس کے لئے کوئی تحفہ بھی خریدنا تھا۔ خوش قسمتی سے یہ مسئلہ یوں حل ہو گیا کہ اسے بک شاپ میں مجیب کی کتاب قرض جاں نظر آ گئی۔ سب سے پہلے اس نے اس کتاب کی دو جلدیں خریدیں۔ ایک مجیب کو تحفہ دینے کے لئے اور دوسری اپنے لئے پھر اس نے اور کتابیں خریدیں۔

قرض جاں کے انتساب نے اسے سمجھایا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ وہ کتاب مجیب نے اپنی بیوی سحاب کی نام معنون کی تھی' جس نے دنیا جہاں کے تفکرات اپنے ذمے لے کر اسے بے نیاز اور لکھنے کے لئے آزاد کر دیا تھا۔ جس کے بغیر وہ اتنا کچھ اور اتنا اچھا نہیں لکھ سکتا تھا۔

مجیب نے ٹرین میں بھی اپنی بیوی کی تعریف کی تھی۔ اس کی خوش سلیقگی پر فخر کا اظہار کیا تھا مگر یہ کوئی خاص بات نہیں۔ بیوی سے دور ہوں تو بیشتر شوہر ایسا کرتے ہیں لیکن اس انتساب میں گہرائی تھی۔ صفورہ نے اس پر غور کیا تو بات سمجھ میں آنے لگی۔ اس نے مجیب کے گھر کا تصور کیا۔ گھر کے مسائل سوچے اور سوچا کہ اس کی بیوی کس طرح ان سے نمٹتی ہو گی۔ مجیب بے فکری سے لکھتا ہو گا اور وہ مسائل سے یوں نمٹتی ہو گی کہ مجیب کو پتہ بھی نہیں چلتا ہو گا۔ وہ مجیب کا کیسے خیال رکھتی ہو گی۔ کیسے اس کی ضرورتیں پوری کرتی ہو گی۔

یہ سب سوچتے ہوئے اس کا وجود اداسی سے بھر گیا۔ یہ کیسا زیاں تھا کہ وہ یہ سب کچھ کرنا چاہتی ہے لیکن کرنے کا حق نہیں رکھتی مگر اسی لمحے اس کے دل میں روشنی سی ہو گئی۔ کیوں نہیں۔ وہ بھی بہت کچھ کر سکتی ہے۔ کیا ہوا اگر اس کی آنکھوں میں مجیب کی بیوی بننے کا خواب ہے' لیکن اس کی بیوی بننا اس کی قسمت میں نہیں۔ وہ ہر وقت قسمت کی شکایت کیوں کرتی ہے۔ یہ تو اس کی خوش قسمتی ہے کہ وہ جس سے محبت کرتی ہے' اسے اس کی خدمت کرنے کا موقع ملا ہے۔ ورنہ تو وہ خواب و خیال میں بھی ایسا نہیں سوچ سکتی تھی۔ مجیب اسے اپنی ایک ضرورت کے تحت یہاں لایا ہے لیکن وہ اس کی اور ضرورتوں کا خیال بھی رکھ سکتی ہے۔ اسے جتائے' اسے احساس

دلائے بغیر وہ اس کی بیوی ہی کی طرح اس کا خیال رکھ سکتی ہے۔ بس وہ اس کی ایک ضرورت پوری نہیں کر سکتی۔ یہ سوچتے ہوئے وہ شرمندگی اور حیا کے بوجھ تلے دبنے لگی۔ وہ اس کی شرعی بیوی جو نہیں ہے۔

سو اس نے مجیب کی خدمت کو اپنا شعار بنا لیا۔ اس کا' اس کی ضرورتوں کا خیال رکھنے کو اپنا فرض سمجھ لیا۔ یہ اس کے لئے مشکل نہیں تھا۔ اپنے گھر میں اس نے ایک بہت اچھی بیوی دیکھی تھی۔ اپنی ماں۔ لڑکیاں ازدواجی زندگی کا انداز اپنے ہی گھر سے سیکھتی ہیں۔ وہ ان کی بنیاد ہوتی ہے' جو نئے گھر میں مختلف ماحول کے باوجود کبھی نہیں بدلتی۔

اس سے اسے بہت بڑا فائدہ ہوا۔ وہ اتنی مصروف اور اتنی سرشار ہو گئی کہ اپنے دکھ اور پریشانیاں بھول گئی۔ گزرنے والا ہر دن اسے تازگی دیتا گیا۔ اس کے پاس اپنے اور اپنے لوگوں کے بارے میں سوچنے کی مہلت ہی نہیں تھی۔ رات کو سوتے وقت یہ موقع ملتا تھا مگر وہ اتنی تھکی ہوئی ہوتی تھی کہ بستر پر لیٹتے ہی بے خبر ہو جاتی تھی۔ بہت گہری نیند آتی تھی اسے۔

پہلے دن کے بعد اسے احساس ہوا کہ مجیب اس سے کھنچ سا گیا ہے۔ اس کے بعد ہر روز اس نے اس کھچاؤ کو بڑھتا محسوس کیا مگر اسے کوئی گلہ نہیں تھا۔ اسے تو جو کچھ بھی مل رہا تھا' وہ بونس تھا۔ وہ صبح سویرے اور رات کے کھانے کے بعد عقبی باغیچے میں اس کے ساتھ چہل قدمی کرتی۔ وہ دن بھر اس کے قریب بیٹھتی۔ وہ کام کرتا تو چپکے چپکے اسے تکتی۔ وہ چائے' پانی اور اس کی دیگر ضرورتوں کا خیال رکھتی۔ موجودگی کے باوجود اس کی یکسوئی کا احترام کرتی۔ یہ سب تو اعزاز تھا اس کے لئے۔ کیا ہوا' جو وہ اس سے بات نہیں کرتا تھا۔ وہ اس کی وجہ بھی سمجھتی تھی۔ مجیب اسے بازاری لڑکی سمجھتا تھا اور کوئی شریف آدمی کسی بازاری لڑکی کو منہ لگانا اچھا نہیں سمجھتا۔ پاؤں کی غلاظت میں لتھڑی جوتی کو سر پر وہی رکھ سکتا ہے' جسے کوئی سفلہ غرض ستاتی ہو اور مجیب ایسا نہیں تھا۔

شروع میں وہ اس کے ساتھ بند کمرے میں سوتے ہوئے گھبرائی مگر دو تین راتوں میں ہی اس کا اعتماد بحال ہو گیا۔ اسے مجیب پر فخر ہونے لگا.... اور خود پر بھی کہ اس نے

اسے سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ وہ اس کا انتخاب تھا۔ بغیر دیکھے، بغیر سمجھے، بغیر جانے۔

اس کا مجیب سے اپنے تعلق کی گہرائی اور سچائی پر بھی یقین بڑھتا گیا۔ تعلق سچا نہ ہوتا تو وہ اس کی نظریں اٹھتے ہی باخبر کیوں ہوتی۔ یہی نہیں، وہ یہ بھی سمجھ لیتی کہ وہ کس ضرورت کے تحت اسے دیکھ رہا ہے۔ یہ جیسے اندر سے اندر کا رابطہ تھا اور ایسے رابطے سچائی کی دلیل ہوتے ہیں۔

پھر مجیب نے بغیر کسی ضرورت کے اسے دیکھنا شروع کیا تو اسے شروع میں بڑی الجھن ہوئی مگر ایسے موقعوں پر اس نے کبھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا، مجیب کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ دیکھے جانے سے باخبر ہے لیکن وہ یہ ضرور سوچتی کہ آخر وہ اسے کیوں دیکھ رہا ہے۔ اس کا اس سے گریزاں ہونا اور پھر چپکے چپکے دیکھنا اسے سمجھاتا تھا کہ وہ اس میں دلچسپی لے رہا ہے لیکن صفورہ کوئی خوش فہمی پالنا نہیں چاہتی تھی۔ یہ بہت بڑا معاملہ تھا۔ خوش فہمی دور ہونے کے بعد کی مایوسی وہ اس دربدری اور کسمپرسی کے عالم میں جھیل نہ سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے خوش فہمی کو شعور کی حد میں داخل ہونے سے پہلے ہی جھٹک دیا۔ بازاری لڑکی کو کوئی بھی کسی بھی وقت گھورنے کا حق رکھتا ہے۔ اور یہاں تو یہ بھی ممکن تھا کہ مجیب اسے کہانی سمجھ کر تجسس کے زیر اثر دیکھتا ہو۔

ایک دن اس اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی۔ مجیب نے اس سے کہا "مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"کیا مطلب؟" وہ گڑبڑا گئی۔

"اپنے بارے میں، اپنے گھر، اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے بارے میں۔"

"کیوں.... مجھ پر کہانی لکھیں گے؟" وہ بھڑک گئی۔

"پہلے ہی سے اس موضوع پر سوچ رہا ہوں۔ کچھ مواد اور بھی مل جائے تو کیا حرج ہے۔"

"یہ ممکن نہیں مجیب صاحب۔" اس نے خشک لہجے میں کہا۔ "میں ایک عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ اس کی بے آبروئی کی تشہیر گوارا نہیں کر سکتی۔"

"میں کہانی میں کبھی اصل نام استعمال نہیں کرتا۔ واقعات کا رنگ بھی بدلتا ہوں اور حقیقت میں افسانے کی آمیزش بھی کرتا ہوں۔"

"سوری مجیب صاحب۔ میرے بارے میں آپ کبھی نہیں جان سکیں گے۔" اب وہ اسے کیسے سمجھاتی کہ وہ اسے اپنی کہانی سنا ہی نہیں سکتی۔ کیوں کہ وہ خود بھی اس کا ایک کردار ہے۔

مگر پھر اسے مجیب کی نظریں اپنے جسم میں چبھتی محسوس ہونے لگیں۔ وہ بے چین ہو گئی۔ مجیب کے بارے میں کردار کے حوالے سے وہ کوئی ایسی ویسی بات سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ تو پھر اس نئی دلچسپی کا مطلب؟ خوش فہمی کی تو اس کے پاس گنجائش ہی نہیں تھی۔ اس نے خود کو سمجھایا کہ یہ فطرت کے مطابق ہے۔ بیوی سے دور ہو جانے والے ایک شوہر کا فطری رد عمل ہے لیکن اسے یقین تھا کہ بات ان نظروں سے آگے کبھی نہیں بڑھے گی۔ مجیب نہایت باکردار انسان ہے۔

اور پھر اس صبح اس نے نائٹ بلب جلتے دیکھا اور مجیب کی متورم آنکھیں دیکھیں تو اس کا دل کٹنے لگا۔ وہ پورے دن سوچتی رہی۔ میرے ہوتے ہوئے بھی وہ ڈریں، رات بھر سو نہ سکیں تو میرے اس وجود کا فائدہ۔ سب کچھ گنوا کر جو میں نے کمایا ہے، وہ بھی رائیگاں ہو جائے گا۔ یہ تو نہیں ہونا چاہیے۔

اس رات وہ سونے کے لئے لیٹنے لگی تو اس نے نائٹ بلب جلا دیا "یہ کیا کر رہی ہو؟" مجیب نے پوچھا۔

"آپ کے لئے...."

"لیکن تمہیں نیند نہیں آئے گی۔"

"آ جائے گی۔ ایسا بھی نہیں ہے۔ آدمی جو عادت بنانا چاہے، بن جاتی ہے۔"

"مجھے اس سے کیا فائدہ ہو گا۔"

"مجھے دیکھ سکیں گے اور کمرے میں اکیلے سونے کا احساس نہیں رہے گا۔"

اسے نہیں معلوم تھا کہ مجیب کو اپنی فکر بھی ہے۔ اس روشنی میں وہ سو ہی نہیں سکتا لیکن اب وہ یہ بات کہہ بھی نہیں سکتا۔

اگلی صبح مجیب کی آنکھوں کو دیکھ کر لگا کہ وہ رات بھر نہ سو سکا ہے۔ اسے اس

حال میں دیکھ کر صفورہ نے ایک فیصلہ کر لیا۔۔۔۔



اس رات مجیب دانت صاف کرنے کے بعد باہر نکلا تو اسے بیڈ کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ بیڈ پر الگ الگ دو تکیے اور پائنتی کی جانب دو کمبل رکھے تھے۔ صفورہ ایک سائیڈ پر بیٹھی تھی۔

مجیب اپنا تکیہ اٹھانے لگا تو صفیہ نے کہا "مجیب صاحب' اب آپ بیڈ پر ہی سوئیں گے۔"

مجیب نے چونک کر اسے دیکھا اور نفی میں سر ہلایا "سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"کیوں؟"

"میں نے تم سے کوئی وعدہ کیا ہے۔"

"اور وہ آپ نبھاتے رہے ہیں اور مجھے کبھی اس میں شبہ نہیں رہا کہ آپ اس کی خلاف ورزی کریں گے۔"

خاصی بحث ہوئی۔ مجیب نے اٹل لہجے میں کہا "میں یہاں نہیں سوؤں گا" اسے غصہ آ رہا تھا کہ وہ اس کی اتنی فکر کیوں کر رہی ہے۔ خوانخواہ اس نے گزشتہ روز کی بات سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ وہ خوف کی وجہ سے سو نہیں پا رہا ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی لیکن یہ بات وہ کہہ نہیں سکتا تھا۔

صفورہ نے جو اسے ہٹ دھرمی پر آمادہ دیکھا تو اسے مجبوراً نسوانی حربہ استعمال کرنا پڑا "آپ مجھ سے ڈر رہے ہیں یا خود سے؟" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

مجیب کو طرارہ آ گیا لیکن غصہ کمزوری کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لئے اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا "ایسی کوئی بات نہیں۔"

وہ بیڈ پر لیٹ گیا تو صفورہ نے اٹھتے ہوئے پوچھا "لائٹ آف کر دوں؟ کہیں تو نائٹ بلب روشن کر دوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔"

یوں اس رات ایک نئے معمول کا آغاز ہوا لیکن صفورہ کا سراپا مجیب کے لئے چیلنج ہی بنا رہا۔ وہ اتنے سلیقے سے سوتی تھی کہ مجیب اس کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکا۔

یہ مسئلہ اب اس کے سر پر سوار ہوتا جا رہا تھا۔ اس حد تک کہ اب وہ نتائج و عواقب سے بھی بے پرواہ تھا اور اسے اس کی سنگینی کا بھی احساس نہیں تھا۔



جو چیز ہر وقت پاس رہے۔۔۔۔ نظروں کے سامنے رہے' آدمی کو اس کی اہمیت اور نااہمیت کا احساس نہیں ہو پاتا۔ ہاں' وہ نظروں سے کچھ دیر کے لئے بھی اوجھل ہو جائے تو پتہ چلتا ہے۔ یہی کچھ مجیب انور کے ساتھ بھی ہوا۔ وہ پوری شدت سے صفیہ کی نفی میں مصروف تھا۔ اچانک ہی اسے احساس ہوا کہ وہ تو اس کے سسٹم میں شامل ہو چکی ہے۔

اس روز وہ کام کر رہا تھا۔ صفیہ اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے سر گھما کر دیکھنے پر دوبارہ وہ اسے پانی اور ایک بار چائے پلا چکی تھی۔ اس بار مجیب نے اپنے معمول کے مطابق صرف اسے دیکھنے کے لئے اس یقین کے ساتھ سر گھمایا کہ وہ اس کی نظروں سے بے خبر اپنے مطالعے میں مصروف رہے گی تو اسے جھٹکا لگا۔ صفیہ وہاں موجود نہیں تھی۔ اس نے ڈر کے مارے اپنا رخ کام کی طرف کر لیا کہ ممکن ہے' وہ کمرے میں موجود ہو اور اس نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔

کچھ دیر وہ یونہی بیٹھا رہا' جیسے اسکرپٹ کے کسی مسئلے پر سوچ رہا ہو لیکن درحقیقت اس وقت وہ مجسم سماعت بنا ہوا تھا۔ ذرا دیر میں ہی اسے احساس ہو گیا کہ صفیہ کمرے میں ہے ہی نہیں۔ چنانچہ اس نے بھی باریکی سے پورے کمرے کا جائزہ لیا مگر وہ وہاں ہوتی تو نظر آتی۔

یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ جب سے وہ مری آیا تھا' کبھی ایک بار بھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس نے سر گھما کر اسے دیکھا ہو اور وہ نظر نہ آئی ہو۔ مجیب کو الجھن ہونے لگی۔ کمرہ خالی خالی لگ رہا تھا۔ اس بات کا احساس ہوتے ہی وہ بری طرح بدکا۔ صفیہ میں اپنی کسی بھی نوع کی دلچسپی کے امکان سے وہ بری طرح گھبراتا تھا۔ یہ اسے گوارا نہیں تھا۔

"چلو۔۔۔ اچھا ہوا۔" اس نے خود کلامی کی "خوانخواہ بار بار ڈسٹرب ہوتا تھا۔ اب سکون سے کام کروں گا۔"

وہ کام کی طرف متوجہ ہوا لیکن اس کے لئے ایک لفظ بھی لکھنا ممکن نہیں تھا۔ وہ کیا لکھ چکا تھا' کیا لکھ رہا تھا اور کیا لکھنے والا تھا' یہ سب اس کے ذہن سے محو ہو چکا تھا۔ اس نے اپنا لکھا ہوا کئی بار پڑھا مگر پھر بھی یہ یاد نہیں آیا کہ آگے وہ کیا لکھنے والا تھا۔

اس نے سر توڑ کوشش کر لی مگر نامکمل مکالمے کو مکمل نہ کر سکا۔ بس اتنا یاد تھا کہ یہ مکالمہ بہت اہم تھا۔ اس میں وہ کوئی اہم بات کہنے والا تھا۔

بے بسی کا احساس اسے ستاتا رہا۔ وہ سر پٹکتا اور جھنجلاتا رہا لیکن بات نہیں بنی۔

”دیکھ لی اس کی اہمیت! اب اپنی دلچسپی کے بارے میں کیا کہو گے۔ کون سی دلیل لاؤ گے.... کون سی تاویل گھڑو گے؟“

دماغ کی کہی ہوئی یہ بات اس نے سنی نہیں لیکن یہ احساس واضح طور پر ہوا کہ دماغ یہ کہنے والا ہے اور یہ وہ سننا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے جلدی سے سر جھٹکا اور ادھر ادھر دیکھا۔ اسے راہ فرار کی تلاش تھی۔

اس کی نظر پانی کے جگ اور گلاس پر پڑی۔ وہ میز سے اٹھا ”یہ بات ہے نا۔“ وہ بڑبڑایا ”کب سے پیاس لگ رہی ہے۔ کام میں یہ بات سمجھ ہی نہیں سکا میں۔“

”اور وہ مطالعے میں مصروف ہونے کے باوجود صرف تمہارے سر اٹھانے سے سمجھ....“

اس نے پھر سر جھٹک کر اندر کی اس آواز کا گلا گھونٹ دیا۔ پانی کے دو گلاس پینے کے بعد وہ اپنی کرسی پر آ بیٹھا ”کچھ موڈ نہیں بن رہا ہے۔“ اس نے آگے کے لئے اپنا دفاع تیار کرنا شروع کیا۔ ”میرا ارتکاز ٹوٹ گیا ہے شاید۔“

اس دفاعی حصار میں مطمئن بیٹھ کر اس نے پھر کام کی طرف توجہ کی۔ اب کوئی آواز اسے صفیہ کے حوالے سے طعنہ نہیں دے سکتی تھی۔

لیکن لکھنے کا معاملہ اب بھی وہیں کا وہیں تھا۔ شاید وہ نامکمل مکالمے کو مکمل کر لیتا تو آگے بھی بڑھ جاتا مگر یہ مسئلہ بن گیا کہ نجانے وہ کس رخ سے اس مکالمے کو لکھنے والا تھا۔ کیا تیور تھے۔ نجانے منتخب لفظ کون سے تھے۔

اس پر سوچتے سوچتے دیر ہو گئی۔ اس کا دفاعی حصار چٹخنے لگا۔ اندر سرگوشیاں

قدرے بلند ہوتی محسوس ہونے لگیں۔ اس نے پھر گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ اس بار دیواری گھڑی اس کی مدد کے لئے آئی۔ بارہ بجے تھے۔

”اوہ.... میری چائے کا وقت ہو گیا۔“ وہ بڑبڑایا ”اسی لئے تو کام نہیں کیا جا رہا ہے۔“ صفیہ کا نام زبان پر آنے والا تھا کہ وہ نجانے کہاں چلی گئی مگر اس نے اس کے خیال کو ایک طرف دھکیلتے ہوئے خود سے کہا ”خود جا کر فاطمہ سے کہنا پڑے گا چائے کے لئے۔ ایک گھنٹی بھی ضروری ہے یہاں۔ خوامخواہ وقت ضائع ہوتا ہے۔“

وہ کمرے سے نکل ہی رہا تھا کہ ایک خیال تیزی سے اس کے ذہن سے گزرا۔ کہیں.... کہیں صفیہ کی طبیعت خراب تو نہیں۔

اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کچن کی طرف جانے کے بجائے بیڈ روم کی طرف چل دیا ہے۔ سامنے سے اسے شکور آتا دکھائی دیا ”کیا بات ہے صاب جی۔ کسی چیز کی ضرورت ہے؟“ شکور نے پوچھا۔

”ہاں' ایک گھنٹی کی ضرورت ہے۔“ اس نے بھنا کر کہا ”اور چائے کی بھی۔“

شکور کی سمجھ میں بات نہیں آئی ”گھنٹی صاب جی؟“

”ہاں۔ گھنٹی کچن میں ہو اور اس کا بٹن میری میز پر۔ تاکہ میں کچن سے کسی کو بلوا سکوں۔ ابھی لگواؤ.... فوراً اور چائے بھی بھجواؤ۔“

”بہتر صاب جی۔“

مجیب اس توقع پر بیڈ روم میں داخل ہوا کہ صفیہ اسے بستر پر دراز ملے گی لیکن بستر کیا' وہاں تو کمرا ہی خالی تھا۔ وہ واپسی کے لئے پلٹ ہی رہا تھا کہ عقبی باغیچے کی طرف کھلنے والی کھڑکی سے اسے صفیہ کی جھلک نظر آ گئی....



صفیہ بیڈ روم سے ایک کتاب لانے کے ارادے سے اسٹڈی سے نکلی تھی! اٹھنے سے پہلے اس نے مجیب کو دیکھا۔ وہ کام میں پوری طرح منہمک تھا۔ وہ اٹھی اور دبے پاؤں اسٹڈی سے نکل آئی۔ بیڈ روم میں آ کر کتاب اٹھاتے اٹھاتے اس نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ باہر دھوپ نہیں تھی۔ گویا مطلع ابر آلود ہے۔ اس نے کھڑکی کے قریب جا کر دیکھا تو جی خوش ہو گیا۔ ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔

بارش کی تو وہ شروع ہی سے دیوانی تھی۔ اتنے خوب صورت گرد و پیش میں گرتی ننھی منی پھوار نے اسے اور دیوانہ بنا دیا۔ اس نے کتاب وہیں رکھی اور عقبی باغیچے کی طرف لپکی۔ سامنے والے لان میں بھی بارش کا لطف اٹھایا جا سکتا تھا مگر اس وقت اس کا جی پگڈنڈی سے نیچے وادی میں جھانکنے کو مچل رہا تھا۔

باہر نکلتے ہی ننھی منی بوندیں اس کے چہرے اور ہاتھوں پر پڑیں تو گدگدی کا احساس ہونے لگا۔ وہ آپ ہی آپ ہنس دی۔ وہ بہت ننھی منی، مگر بے حد سرد بوندیں تھیں۔ پگڈنڈی کی طرف بڑھتے ہوئے اسے مایوسی ہونے لگی کہ تیز بارش کیوں نہیں ہو رہی ہے۔

پگڈنڈی کے پاس پہنچ کر اس نے نیچے جھانکا۔ درختوں کے جھنڈ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہاں شام ڈھلنے کے سمے جیسا اندھیرا تھا لیکن عجیب بات تھی کہ اس وقت وہ اندھیرا ڈراؤنا نہیں، بلکہ بے حد رومان انگیز لگ رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بوندوں کی ٹپ ٹپ کی ہلکی ہلکی آواز دھڑکنوں کو ایک مختلف اور خوب صورت لے سے روشناس کرا رہی تھی۔ موسم کا موڈ نظاروں کی کیفیت اور ان کے تاثر کو کیسے بدل دیتا ہے، اس نے سوچا۔

اسی لمحے نازک پھوار نے اچانک زور دار بارش کا روپ دھار لیا۔ وہ خوش ہوئی کہ آج بارش میں خوب بھیگے گی مگر اگلے ہی لمحے وہ سراسیمہ ہو گئی۔ اماں کی برسوں کی تلقین یاد آئی، اماں یاد آئیں۔ ان کی آواز کانوں میں گونجی۔ "کورے پنڈے کو بارش کا پانی راس نہیں آتا" پھر آگہی کا وہ پہلا لمحہ یاد آیا، جب اس نے بارش میں بھیگنے کے بعد خود کو دیکھا تھا، اماں کی بات اس کی سمجھ میں آئی تھی اور اس نے گھبرا کر سوچا تھا..... ایسے میں ابا یا بھائی آ جائیں تو؟ اور اسے حیا آ گئی تھی۔

سو اب وہ یہاں کیسے بھیگ سکتی ہے؟ یہاں مجیب موجود ہے، جو اس کی حد تک تو اس کا سب کچھ ہے لیکن درحقیقت کچھ بھی نہ ہے۔

وہ گھبرا کر بھاگی لیکن بارش کا زور اچانک ہی ٹوٹ گیا تھا۔ البتہ ننھی منی پھوار اب بھی جاری تھی۔ اس کی چادر تھوڑی سی بھیگ گئی تھی مگر ایسی بھی نہیں کہ اندر جا کر بدلنی پڑے۔ وہ قریبی بینچ پر جا بیٹھی، جس کے اوپر چھتری بھی لگی تھی۔

بوندوں کی رم جھم ٹپ ٹپ جاری رہی۔ باہر تو سماں بندھا ہوا تھا ہی، اندر بھی سماں بندھ گیا۔ ننھی منی ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار اسے اپنے دل کی برسوں سے تپتی دھرتی پر گرتی محسوس ہوئی۔ پہلے تو گرم بھبکے اٹھے پھر آہستہ آہستہ ٹھنڈک ہوتی گئی اور مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اٹھنے لگی۔ مستقبل کے ٹنڈ منڈ درخت پر نمو کے آثار نظر آئے۔ ارمانوں کی ٹہنیوں پر آرزوؤں کے شگوفوں نے سر اٹھایا۔ خواہشوں کی ننھی منی نازک کلیاں کھل اٹھیں۔ صفورہ نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا اور حسرت بھرے لہجے میں پوچھا "کیا میں بچپن کی طرح بارش میں اب کبھی نہیں نہا سکوں گی؟"

بارش کبھی چند منٹ کے لئے تیز ہو جاتی اور اس کے بعد پھر وہی ہوا۔ ایسا کئی بار ہوا۔ یہ پہاڑی علاقے کی متلون مزاج بارش اس کے لئے انوکھی اور سحر انگیز تھی۔ اس نے تو میدانی علاقے کی بارش دیکھی تھی۔ نہ برسے تو کئی کئی دن حبس میں گزر جائیں۔ برسے تو جل تھل کر دے۔ یہ تماشا دیکھتے ہوئے اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ باہر آئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو چکا ہے۔ وہ اس وقت اپنے ارمانوں کی دنیا میں تھی، جو صرف اور صرف مجیب کے نام تھی۔ وہی اس کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا لیکن حیرت انگیز طور پر اسے اس مجیب کا خیال ایک لمحے کو بھی نہیں آیا، جسے وہ اسٹڈی میں کام میں مصروف چھوڑ کر آئی تھی۔

اس لمحے اس نے سوچا، کاش میں بارش کی رم جھم میں مجیب کے ساتھ کبھی نیچے وادی میں جا سکوں، آبشار کو دیکھ سکوں اور نیچے بہتے پانی میں بارش کی رم جھم دیکھ اور سن سکوں۔ اگلے ہی لمحے اسے مجیب کی آواز بہت قریب سے سنائی دی "ارے..... تم یہاں بیٹھی ہو۔"

اس نے چونک کر دیکھا۔ مجیب پاس ہی کھڑا تھا "آپ.....!" اس نے تجسس سے کہا۔ وہ اسی کے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی اور اسے ہی بھولی بھی ہوئی تھی۔

مجیب یہ کیسے کہہ سکتا تھا کہ اسے دیکھ کر وہاں آیا ہے۔ اس نے کہا "یونہی باہر نکلا تھا۔ بارش ہوتی دیکھ کر۔ یہاں آیا تو تمہیں بیٹھے دیکھا۔"

صفورہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اس نے اس کی کمی محسوس نہیں کی لیکن جواب سے ڈر لگتا تھا "آئیے۔ بیٹھئے نا۔"

"تم کب سے یہاں بیٹھی ہو؟" مجیب نے بینچ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ کیا وقت ہوا ہے؟"

"سوا بارہ بج رہے ہیں۔"

"اوہ..... بہت دیر ہو گئی۔ میں ساڑھے دس بجے یہاں آئی تھی۔" صفورہ نے کہا پھر خواب ناک لہجے میں بولی "بارش بہت اچھی لگتی ہے مجھے۔"

"کسے نہیں لگتی۔" مجیب نے بے پروائی سے کہا "مجھ جیسے بے خبر کو بھی اچھی لگتی ہے بارش۔"

صفورہ جیسے خواب سے چونکی "ارے..... آپ کی چائے۔" اس نے بے ساختہ کہا۔ یک لخت اسے پشیمانی کا احساس ستانے لگا۔ وہ یوں مگن ہوئی کہ اس کی ضرورتوں کا بھی خیال نہیں رہا۔ اسے بارش بھی بری لگنے لگی اور اپنا آپ بھی۔

"چائے کی تم فکر نہ کرو۔ یہ تمہاری ذمے داری نہیں۔"

صفورہ شرمندہ ہو کر چپ ہو گئی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ اس کی ہر ضرورت اس کی ذمے داری ہے لیکن یہ کہنے کا اسے حق نہیں تھا۔

اسی وقت شکور ایک چھوٹی میز لئے آتا نظر آیا۔ پیچھے فاطمہ تھی' جس کے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے تھی۔ شکور نے میز ان کے سامنے لگائی اور فاطمہ نے ٹرے میز پر رکھ دی پھر وہ چائے بنانے لگی۔ "لو چائے بھی آ گئی۔ تم خوامخواہ پریشان ہو رہی تھیں۔" مجیب نے بے حد خوش دلی اور اپنائیت سے کہا۔

صفورہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ایسے تو اس نے پہلے کبھی بات نہیں کی تھی۔ کیا ان پر بھی موسم کا جادو چل گیا ہے..... ؟ اس نے سوچا۔

"اور صاب جی' افضل خان گھنٹی لگا رہا ہے جی۔" شکور نے مجیب کو بتایا "پھر آپ جب چاہیں' ہمیں بلا سکیں گے..... بیٹھے بیٹھے۔" شکور یوں خوش ہو رہا تھا جیسے بیٹھے بٹھائے کوئی اعزاز مل گیا ہو۔

اور صفورہ نے پھر چونک کر مجیب کو دیکھا۔ اس کا مطلب ہے کہ مجیب نے اسے مس کیا اور اس کی غیر موجودگی پر جھنجلایا بھی۔ ایک خوش فہمی اس کے اندر جاگی اور موسم ایسا تھا کہ اس نے اسے جھڑکا بھی نہیں۔

مجیب نے اس کی آنکھوں میں اس خوش فہمی کی چمک دیکھ لی تھی۔ فاطمہ نے چائے کی پیالیاں ان کے سامنے رکھیں پھر وہ اور شکور واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد مجیب نے کہا "کبھی کبھی تمہاری موجودگی سے میں ڈسٹرب ہوتا ہوں۔ کام میں حرج ہوتا ہے۔ اور تم موجود نہ ہو اور کسی چیز کی ضرورت پڑے تو کسی کو بلانا تو پڑے گا۔ اس لئے گھنٹی لگوانے کا خیال آ گیا۔"

لیکن صفورہ اس کی بات سننے کے بجائے سامنے آسمان کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں پھر وہ بچوں کی طرح تالیاں بجاتے ہوئے چلائی "آہا..... کتنی پیاری دھنک ہے۔"

مجیب نے ایک پل دھنک کو دیکھا' پھر سوچنے لگا اس موقع پر اس نے کبھی کبھی کا حیلہ کیوں کیا۔ صفیہ سے صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیا کہ وہ اسٹڈی میں نہ بیٹھا کرے۔ کیا اس لئے کہ اسے صفیہ کا وہاں بیٹھنا اچھا لگتا ہے؟

وہ اس سوال پر سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگائی اور خود بھی دھنک کو دیکھنے لگا۔



لیکن بات نہ صرف صفورہ تک پہنچ چکی تھی بلکہ اسے زخمی بھی کر گئی تھی۔

اس صبح وہ ہمیشہ کی طرح اسٹڈی میں اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھی لیکن مجیب کے کام شروع کرنے سے پہلے اس نے کہا "جب ڈسٹرب ہونے لگیں تو مجھے بتا دیجئے گا۔ میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

اس کے لہجے میں دکھ چھپا تھا۔ مجیب کو بہت شدت سے غصہ آیا لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ غصہ اسے صفیہ پر آیا ہے یا خود پر۔ غصہ دونوں پر ہی آ سکتا تھا۔ خود پر اس لئے کہ اس نے ایسی احمقانہ بات کیوں کی اور کی ہی تھی تو اسے یہاں بیٹھنے سے منع ہی کر دیا ہوتا اور صفیہ پر اس لئے کہ ان کے درمیان کوئی ایسا تعلق نہیں تھا کہ اس کی بات پر وہ یوں دکھی ہوتی۔ اسے حق ہی نہیں تھا اس کا۔

غصہ ٹھنڈا ہوا تو وہ شرمندہ ہو گیا۔ اسی لئے چائے اور پانی کی ضرورت کے سوا اس نے صفیہ کی طرف دیکھنے کی ہمت ہی نہیں کی۔ اسے ڈر تھا کہ اس نے بلا ضرورت اسے دیکھا تو وہ کہے گی۔۔۔ ڈسٹرب ہو رہے ہیں۔ تنہائی کی ضرورت ہے۔۔۔ اور اٹھ کر چلی جائے گی۔ وہ اس بات کو یہیں ختم کر دینا چاہتا تھا۔

نہ اس نے صفیہ سے اٹھنے کو کہا' نہ ہی وہ خود اٹھ کر گئی اور جب وہ اٹھ کر گئی تو مجیب نے جان لیا کہ وہ اس کے نہانے کا اہتمام کرنے گئی ہے۔

اس روز دوپہر کے کھانے پر صفورہ نے مجیب کے انداز میں بے رغبتی محسوس کی۔ اس کے دل میں ایک خیال آیا لیکن اس خیال سے کہ اس بے رغبتی کا سبب اس کا تکدر بھی ہو سکتا ہے' اس نے اپنے خیال کو اہمیت نہیں دی۔ البتہ رات کو بھی مجیب کی بے رغبتی کا وہ عالم دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ اس کا خیال درست تھا۔ اس کا اپنا بھی یہی حال تھا۔ وہ تو گزشتہ کئی روز سے رغبت سے نہیں کھا پا رہی تھی۔

فاطمہ دیہاتی عورت تھی۔ اسے زیادہ کھانے پکانے نہیں آتے تھے اور دال وغیرہ

کو وہ رئیسوں کا کھانا نہیں سمجھتی تھی۔ لہٰذا وہ بس وہی دو ایک سالن پکاتی رہتی تھی' جو اس نے اپنی بیگم صاحبہ سے سیکھے تھے۔ اس لئے اس کی اور مجیب کی۔۔۔ میں بھلا ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں۔۔۔ والی کیفیت ہو گئی تھی۔

اگلے روز مجیب نے کام شروع کیا تو صفیہ اسٹڈی میں نہیں تھی۔ اس نے سوچا' شاید اس روز کی بات کا رد عمل اب سامنے آیا ہے۔ لیکن دس بجنے میں پانچ منٹ تھے کہ صفیہ ایک ٹرے پر پانی کا جگ' گلاس اور بھاپ اڑاتی چائے کی پیالی لئے کمرے میں آئی۔ ٹرے دوسری میز پر رکھ کر پہلے اس نے مجیب کو پانی دیا پھر چائے کی پیالی میز پر اس کے سامنے لا کر رکھ دی۔ اس کے بعد اس نے چھوٹی سائڈ ٹیبل لا کر رائٹنگ ٹیبل کے پہلو میں رکھی پھر اس نے پانی کا جگ اور گلاس لا کر سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور کمرے سے چلی گئی۔ ان کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

مجیب کو یقین ہو گیا کہ وہ ناراض ہے۔ اس پر اسے اور غصہ آیا۔ بے شک وہ اسٹڈی میں نہ بیٹھے۔ اس نے اس سے بیٹھنے کو کہا بھی نہیں تھا لیکن ناراض ہونے اور ناراضی کا اظہار کا اسے کوئی حق نہیں۔ اسی غصے میں وہ کام کرنے بیٹھ گیا اور اس سے کام کر بھی لیا گیا۔ شاید اس نے لاشعوری طور پر اسے چیلنج بنا لیا تھا۔ میں تو تنہائی میں ہی زیادہ اچھا کام کرتا ہوں۔ اس کی موجودگی تو بس مروتاً برداشت کر رہا تھا۔ کام تو اب ہو گا۔ یہ دکھا دوں گا۔

پیاس لگی تو اس نے ہاتھ بڑھا کر جگ اٹھایا' گلاس میں پانی انڈیلا اور پی لیا۔ ذرا دیر بعد اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا۔ چند ہی لمحے بعد شکور اندر آیا تو اس نے اسے چائے لانے کو کہا۔ پانچ منٹ بعد ہی شکور چائے لے آیا۔

شکور جانے لگا تو مجیب نے اسے روک لیا۔ چائے صورت ہی سے صفیہ کی بنائی ہوئی لگ رہی تھی۔ ایک گھونٹ لینے سے تصدیق بھی ہو گئی "کس نے بنائی ہے چائے؟" اس نے پوچھا۔

"بی بی نے صاب جی۔"

"فاطمہ نے کیوں نہیں بنائی؟"

"بی بی صاب نے بنا دی صاب جی۔" شکور نے کندھے جھٹکتے ہوئے بیک وقت

اپنی اور فاطمہ کی بے بسی ظاہر کی۔

مجیب کچھ کہنا چاہتا تھا مگر خاموش رہا۔ مناسب نہیں تھا۔ ڈر تھا کہ میاں بیوی کے درمیان ناراضی کا فسانہ نہ بن جائے۔

وہ کام کرتا رہا اور سچ یہ تھا کہ اس روز اس نے زیادہ کام کیا۔ بارہ بجے بغیر مانگے ہی چائے مل گئی۔ ایک بجے اس نے ہاتھ روکا۔ باتھ روم جاتے ہوئے اسے ڈر تھا کہ نہا کر یہی کپڑے پہننے پڑیں گے لیکن باتھ روم روز کی طرح اس کی آمد کا منتظر تھا۔ تولیا اسٹینڈ پر صاف ستھرا تولیا تھا۔ واش بیسن پر شیمپو رکھا تھا اور کیبنٹ میں اس کے کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔

پھر کھانے کی میز پر اسے صفیہ کا مسکراتا چہرہ نظر آیا۔ اس کے چہرے پر تکدر کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ مجیب کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسٹڈی سے اس کے بائیکاٹ کو کیا سمجھے۔ وہ ناراض تو ہرگز نہیں لگ رہی تھی۔

مگر سالن کی قاب اٹھاتے ہی اس کی ہر الجھن دور ہو گئی۔ کوفتے اسے پسند تھے لیکن یہاں وہ کوفتے کھانے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا پھر بھی کوفتے اس کے سامنے تھے اور قاب سے اشتہا انگیز خوشبو اٹھ رہی تھی۔

مجیب بت بنا دیکھتا رہا۔ صفورہ نے اسے ٹوکا "حیران کیوں ہیں آپ؟"

"یہاں کوفتے نظر آنا ایسا ہی ہے جیسے کسی صحرا میں سوئمنگ پول نظر آ جائے۔"

"مگر یہ سچ مچ کے ہیں۔"

"کھا کر معلوم ہو گا۔"

اس روز مجیب کو لگا کہ بڑے عرصے کے بعد اس نے پیٹ بھر کر... بلکہ ڈٹ کر کھانا کھایا ہے۔ فرق روٹی کا بھی تھا۔ گھر سے نکلنے کے بعد پہلی بار اس نے ہاتھ کی روٹی کھائی تھی ورنہ تندوری نان پر ہی گزارہ ہو رہا تھا پھر وہاں میٹھے میں بھی اس کی پسندیدہ چیز تھی.... ایگ پڈنگ۔

کھانے کے بعد مہلت ملی تو اس نے سوچا۔ تو یہ تھا صفیہ کے غائب ہونے کا راز۔ ایک لمحے کو اسے مایوسی ہوئی کہ شاید اس لڑکی کو ناراض ہونا نہیں آتا۔ بہرحال اس نے بڑے خلوص سے کہا۔ "بھئی آج تو دل سے دعا نکلی ہے تمہارے لئے۔"

"میں تو پہلے لمحے سے ہی خود کو آپ کی دعاؤں کا حق دار بناتی آ رہی ہوں۔"

مجیب شرمندہ ہو گیا' کھسیا گیا "بھئی اتنا ڈٹ کر کھانے کے بعد تو قیلولہ واجب ہوا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

صفورہ بڑی طمانیت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ خود اس نے بھی اتنے عرصے میں پہلی بار کوئی بڑی خوشی کمائی تھی۔ اس کے اندر ایک آواز ابھری.... مرد کے دل کا راستہ معدے سے ہو کر گزرتا ہے۔ اس نے اس آواز کا گلا گھونٹ دیا۔

دن کے دوسرے حصے میں صفورہ پھر اسٹڈی میں بیٹھی تھی۔ مجیب لکھ رہا تھا۔ ایک مصروفیت بڑھ گئی تھی۔ ایک نیا معمول شروع ہو گیا تھا۔



غفران احمد صابر کے ساتھ ناشتے پر بیٹھے تھے۔ بظاہر وہ اخبار بھی پڑھ رہے تھے۔ لیکن ان کا دھیان اخبار میں نہیں تھا۔ صابر انہیں بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ بہت کمزور ہو گئے تھے۔ صابر جانتا تھا کہ وہ اندر ہی اندر غم کر رہے ہیں۔

"پریشان ہونے سے کچھ نہیں ہو گا ابا میاں۔ خود کو سنبھالیں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"بھائی جان اور بھابی جان کی پریشانی کا خیال کرتا ہوں تو دل کٹنے لگتا ہے میرا۔" غفران احمد سر اٹھا کر بولے۔

"ہم اپنی سے کوشش تو کر رہے ہیں نا ابا میاں لیکن مشیت سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔"

"پریشانی اتنی بڑی ہو تو آدمی مشیت کے بارے میں کب سوچتا ہے۔ اشتہار دیئے ہوئے آج ساتواں دن ہے' کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔"

"اتنی جلدی کی تو مجھے امید بھی نہیں تھی۔ کل دوسرا اشتہار چھپے گا اور اگلے اتوار کو تیسرا۔ انشاء اللہ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔" صابر نے انہیں دلاسا دیا۔ اگرچہ وہ خود اتنا پرامید نہیں تھا۔

"کاش.... اللہ بہتری فرمائے۔" غفران احمد نے سرد آہ بھر کر کہا "لیکن کوئی مجرم اپنا ثبوت عدالت کے سامنے بھی لاتا ہے۔"

"آپ اس انداز میں کیوں سوچ رہے ہیں۔" صابر جھنجلا گیا۔ "یہ اشتہار صرف اس صورت میں کام آ سکتا ہے کہ صفورہ بھلے لوگوں کی پاس ہو اور پتہ اور فون نمبر نہ ہونے کے سبب سے ہم تک نہ پہنچ پا رہی ہو۔ دعا کریں کہ یہی بات ہو۔"

غفران احمد نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں "اور اگر صفورہ خدانخواستہ..... خدانخواستہ....." ان سے بات پوری نہیں کی جا رہی تھی "...تو پھر وہ کیا منہ لے کر آئے گی۔ نہیں.... وہ نہیں آئے گی۔ وہ مرجائے گی' دیکھ لینا۔"

"ابا میاں' آدمی کو ہر حال میں اچھی امید رکھنی چاہئے۔"

"یہ بھی تو اچھی امید ہی ہے۔" غفران احمد نے دل گرفتگی سے کہا پھر اچانک بولے "بھائی جان کو خط بھی لکھا تم نے؟"

"نہیں ابا میاں' کوئی اچھی خبر ہو تو لکھوں۔"

"خط ضرور لکھو۔ دلاسا دیتے رہو ورنہ وہ پریشان ہوتے رہیں گے۔"

"ٹھیک ہے ابا میاں۔ میں آج ہی انہیں خط لکھوں گا۔"

"یہ ضروری ہی بیٹے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ مشکل کام ہے۔ مجھ سے تو لکھ نہیں جائے گا۔ ہمت ہی نہیں....."

"آپ فکر نہ کریں ابا میاں۔ میں موجود ہوں۔" صابر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس وہ پہلی فرصت میں خط لکھنا چاہتا تھا۔



صفورہ کا ہر طرح سے خیال رکھنا' اس کے پکائے ہوئے کھانے' جہاں عجیب آسودگی فراہم کرتے تھے' وہاں اس کے لئے مسئلہ بھی بن گئے تھے۔ سحاب اسے بہت زیادہ اور بہت شدت سے یاد آنے لگی تھی اور یہ بات اس کی سمجھ سے باہر تھی۔ وہ یہاں اکیلا ہوتا اور اس آرام اور ان سہولتوں سے محروم ہوتا' جو سحاب سے اسے ملتی تھیں' تب تو سحاب کو یاد کرنا فطری تھا لیکن اس صورت میں کہ اسے یہاں وہی گھر کا ماحول مل گیا تھا' سحاب کی یاد کیوں آ رہی تھی۔ اس کا اس کے پاس جواب نہیں تھا۔

دوسری بات یہ تھی کہ صفیہ کے بغیر اس کا کام بھی نہیں چلتا تھا اور صفیہ سے

چڑنے بھی لگا تھا۔ وہ اسٹڈی میں ہوتی تو وہ اسے دیکھ دیکھ کر تاؤ کھاتا اور نہ ہوتی تو اس کے لئے کام کرنا مشکل ہو جاتا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اس سے نفرت بھی کرتا ہے اور وہ اس کے بغیر رہ بھی نہیں سکتا۔ اس چڑ کا سبب بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ جتنا وہ اس کا خیال رکھتی' اسے سکھ پہنچاتی' اتنا ہی وہ اس سے چڑتا۔ ایسا کوئی نارمل آدمی تو نہیں کر سکتا۔

اسے یہ گھبراہٹ بھی ہوتی کہ اب سوال تو بہت اٹھتے ہیں لیکن اس کے پاس ان کے جواب نہیں ہوتے۔ سحاب اتنی شدت سے کیوں یاد آتی ہے..... وہ صفیہ سے اتنا کیوں چڑتا ہے؟ اس کے پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ ایسا تو ان لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے' جو خود سے بے خبر رہتے ہوں۔ جنہیں اپنے اندر پلنے والے محرکات اور کمپلیکسز کا علم نہ ہو۔ وہ تو ایسا نہیں تھا۔ اس کی زندگی کبھی کسی پیچیدگی کا شکار نہیں ہوئی تھی۔ اس کے پاس تو لوگ اپنے نجی مسئلے لے کر آتے تھے..... اندر کے مسئلے اور وہ انہیں صائب مشورے دیا کرتا تھا۔ تو اب وہ اپنے ہی بارے میں اندھیرے میں کیوں ہے۔

ان تمام باتوں کا اثر کام پر بھی پڑ رہا تھا۔ تیسری قسط وہ ابھی تک مکمل نہیں کر سکا تھا۔ کچھ یہ بھی تھا کہ وہ قسط تھی ہی بہت مشکل۔ اس میں بہت سے بیانیہ جملوں کو visuals میں تبدیل کرنا تھا۔ عام حالات میں یہ کام اسے بہت اچھا لگتا تھا۔ کیونکہ وہ سخت چیلنج پسند کرنے والا تھا اور وہ ایسے کام بہت خوبی سے کرتا تھا۔ لیکن اب مشکل اس لئے پیش آ رہی تھی کہ وہ ذہنی یکسوئی سے محروم تھا۔ جب بھی ایسی کوئی رکاوٹ پیش آتی تو وہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتا۔

صفیہ کے سراپا کا جو چیلنج اس نے قبول کیا تھا' اس میں اسے ہار ماننا پڑی۔ وہ اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ خود کو چھپانا جانتی تھی لیکن اسے یہ نہیں پتہ چلا کہ اس چیلنج سے اس کی دستبرداری کو اس کے شعور نے تسلیم نہیں کیا ہے بلکہ یہ چیلنج خود قبول کر لیا ہے اور کسی عیار دشمن کی طرح چالیں سوچ رہا ہے..... گھات لگائے بیٹھا ہے۔

اس روز پھر ایک رکاوٹ سامنے آئی اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔

صفیہ وہیں بیٹھی تھی۔ وہ کھنکھاری تو اس نے چونک کر اسے دیکھا "کیا بات ہے؟ آپ اتنا الجھ کیوں رہے ہیں؟" صفیہ نے اس سے پوچھا۔

"بے بسی میں اور کیا کر سکتا ہوں۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔

"مسئلہ کیا ہے؟"

مجیب توہین آمیز لہجے میں کہنا چاہتا تھا کہ تم سے کیا کہوں۔ تم کیا سمجھو گی۔ لیکن پھر اسے خیال آیا کہ بعض اوقات دیواروں سے باتیں کر لینے سے ہی مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ کیوں نہ اسے دیوار ہی سمجھ لے۔ سو وہ اسے سب کچھ بتانے لگا "ایک جملہ ہے۔ وہ اس سے بہت محبت کرتی تھی۔ اب ڈرامے میں یہ جملہ کمنٹری کے طور پر نشر نہیں کیا جا سکتا۔ ٹی وی ڈراما visual ہے۔ لہٰذا ہم اس محبت کے چند بے حد متاثر کن مظاہرے دکھا کر ناظرین تک یہ تاثر منتقل کر سکتے ہیں۔ کہانی پر اسکرپٹ لکھنے میں تن آسانی برتی جائے تو تاثر کم ہو جاتا ہے اور visuals کے ذریعے بیان کئے ہوئے تاثر کو ناظرین تک پہنچانا بہت مشکل کام ہے۔"

صفورہ اس کی بات بڑی توجہ اور انہماک سے سن رہی تھی۔ وہ خاموش ہوا تو اس نے پوچھا "اس وقت آپ کہاں اٹکے ہیں؟"

مجیب نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس بار وہ اپنا جملہ نہ روک سکا "تم کیا سمجھو گی؟ یہاں تو میں بھی عاجز ہوں۔"

"میں تو شاید کچھ نہ کر سکوں۔" صفورہ نے برا مانے بغیر کہا "لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ دشواری بیان کرتے کرتے آدمی کو اس کا حل سوجھ جاتا ہے۔"

مجیب کو حیرت ہوئی۔ یہی سوچ کر تو اس نے اتنی بات بھی کی تھی لیکن وہ اب بھی ہچکچا رہا تھا۔

"آپ بے فکر ہو کر بتائیں۔ قرض جاں میری کئی بار کی پڑھی ہوئی کہانی ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ مجھے زبانی یاد ہے۔" صفورہ نے کہا۔

"تو پھر تم جانتی ہو کہ اس کی ہیروئن ایک ایسی لڑکی ہے' جس کی عمر نکلی جا رہی ہے۔ اس سے کبھی کوئی مرد متاثر نہیں ہوا۔ اسے کبھی پروا بھی نہیں ہوئی لیکن اب پہلی بار اسے کوئی اچھا لگا ہے۔ یہ مرد اسے پسند کرتا ہے لیکن مزاج کا دھیما اور ڈرپوک

ہے۔ احساس کمتری کا شکار ہے۔ کیونکہ معاشی اعتبار سے کمزور ہے اور لڑکی بڑے گھر کی ہے۔ دوسری طرف لڑکی تند و تیز محبت کی تمنائی ہے۔ انا پرست ہے۔ اظہار محبت اور محبت طلب کرنا اس کے لئے ناممکن ہے پھر ایک ایسا شخص اس کی زندگی میں آنا چاہتا ہے' جو نڈر' بے باک اور خود غرض ہے۔ وہ اس کی دولت کے چکر میں اسے پھنسانا چاہتا ہے۔ لڑکی نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف بڑھ جاتی ہے۔"

"میں سمجھ گئی۔ ہیرو ہیروئن سے ملنے آتا ہے۔ اسی وقت ولن کا فون آتا ہے' جو اسے پارٹی میں بلاتا ہے۔ ہیروئن ہیرو کو مایوس چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ اس موقع پر آپ نے لکھا ہے.... وہ کبھی نہ بجھنے والے دیئے کو چھوڑ کر اس بھڑکیلے فانوس کی طرف بڑھ گئی' جو روشنی خود اس سے مستعار لینا چاہتا تھا۔"

مجیب نے حیرت سے اسے دیکھا۔ غضب کی یادداشت تھی اس کی۔ ایک لفظ بھی ادھر ادھر نہیں ہوا تھا "ہاں اور اس بیانیئے میں پوری کیفیت ہے اور اس کیفیت کو ناظرین تک پہنچانا ضروری ہے ورنہ آسان طریقہ تو یہ ہے کہ ہیرو کے مایوس چہرے پر ولن کے مسکراتے چہرے کو سپرامپوز کریں پھر وہ نظر اٹھا کر ایک طرف دیکھے۔ اس کی آنکھوں میں مکر نظر آئے اور اس کے بعد ہم کٹ کر کے پارٹی میں ہیروئن کی انٹری دکھائیں اور ولن اس کی طرف بڑھے لیکن یوں کر لیں تب بھی مسئلہ ہے۔ اس کے بعد کی سچویشن کو کیسے دکھایا جائے۔" یہ کہتے کہتے وہ مجوب ہو گیا۔ اس کا اشارہ ہیروئن کے لٹنے کی طرف تھا۔

صفورہ جیسے کہیں کھو سی گئی "میں اس منظر کو تصور میں یوں دیکھتی ہوں۔ ایک لق و دق تپتا صحرا ہے۔ ہیروئن وہاں چلی جا رہی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر پیاس سے پپڑیاں جمی ہیں۔ اس کی زبان بھی ہونٹوں کو تر نہیں کر پا رہی ہے۔"

مجیب چونکا اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ بے حد توجہ سے اس کی بات سن رہا تھا۔

"پھر میں اس لڑکی کو جنگل میں دیکھ رہی ہوں۔ بے حد گھنا جنگل ہے۔ پہاڑی جنگل۔ وہ جنگل سے نکلتی ہے۔ وہ خوب صورت سرسبز جگہ ہے۔ جگہ جگہ درخت بھی ہیں۔ جیسے یہ اپنا مری ہے۔ اس کے ہونٹ اب بھی پیاس سے تڑخ رہے ہیں۔ اچانک پھوار پڑنے لگتی ہے۔ لڑکی بے تاب ہو کر دونوں ہاتھ پھیلاتی ہے۔ پھوار میں وہ بھیگ

بھی رہی ہے اور دونوں ہاتھوں میں پانی بھی جمع کر رہی ہے۔ ذرا سا پانی جمع ہوتا ہے تو وہ بے تابی سے پینے کی کوشش کرتی ہے لیکن بس ہونٹ تر کر پاتی ہے اور پھر دونوں ہاتھ پھیلا لیتی ہے۔ اس دوران میں اسے گرتے آبشار کی آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ بے تابی سے لپکتی ہے۔ یہ ویسا ہی آبشار ہے' جیسا یہاں ہے۔ بس وہاں ایک ایسا چٹانی چھجا ہے' جہاں سے آبشار گرتا نظر آ رہا ہے۔ لڑکی بے تابانہ اس چھجے کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ادھر پھوار طوفانی بارش کا روپ دھار گئی ہے۔ لڑکی بھیگ گئی ہے لیکن اپنی طلب کی وجہ سے اس کو بارش کا ہوش بھی نہیں ہے۔ وہ چھجے تک پہنچتی ہے اور ہاتھ بڑھا کر آبشار کے گرتے پانی کو چلو میں لینے کی کوشش کرتی ہے لیکن پانی اتنی طاقت سے گر رہا ہے کہ ہاتھوں کے پیالے میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں رکتا۔ ادھر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ اب اس کے بعد آپ لڑکی کو ولن کے ساتھ پارٹی سے رخصت ہوتے دکھاویں۔"

مجیب سحر زدہ بیٹھا سن رہا تھا "اور اس کے بعد کی سچویشن؟"

"میں اصطلاحات تو نہیں جانتی لیکن ہیروئن کے ولن کے ساتھ جانے کے سین کے اوپر پھر ہیروئن کو بھی دکھایا جائے' جو آبشار کا پانی پکڑنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اچانک اس کا پاؤں پھسلتا ہے اور آبشار کے بہاؤ کی ساتھ نیچے گرتی چلی جاتی ہے۔"

"کیا کہنے۔ تم نے تو کمال کر دیا۔" مجیب نے بے ساختہ کہا۔ اس کے لہجے میں ستائش تھی۔ اس وقت وہ ایک پروفیشنل تھا' جسے کام کے معاملے میں اپنی پسند ناپسند کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ اپنے کام سے مخلص تھا اور اچھے آئیڈیئے کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ تعریف کو کبھی نہیں روکتا تھا۔ خواہ وہ کسی ناپسندیدہ ہستی کی ہو۔

صفورہ شرمندہ ہو گئی "میں.... میں تو...."

"کیا خوب صورت خیال ہے۔" مجیب اپنی کہے جا رہا تھا "اور تم نے کردار نگاری بھی ملحوظ رکھی۔ ایک لڑکی ہے' جو صحرا کی طرح پیاسی ہے۔ محبت کی ایک بوند کو ترس رہی ہے۔ پھوار گرتی ہے تو وہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں پانی بھرنا چاہتی ہے۔ جو ممکن نہیں۔ وہ بھیگی ہتھیلیوں سے ہونٹ تر کرتی ہے۔ کیا کردار نگاری ہے۔ کوئی عام لڑکی ہوتی تو چہرہ اوپر کر کے آسمان کی طرف منہ کھول کر کھڑی ہو جاتی لیکن وہ تو ا

پرست ہے۔ اور پھر صحرا کی پیاس.... وہ پھوار سے کہاں بجھتی ہے۔ وہ آبشار کی طرف لپکتی ہے۔ پیاس اتنی پرانی اور اتنی شدید ہے کہ وہ پھوار کے موسلا دھار بارش کے امکان کے بارے میں سوچتی بھی نہیں' جو بے حد قوی ہے۔ وہ آبشار کی طرف لپکتی ہے مگر بارش تیز ہو جانے کا اسے پتا ہی نہیں چلتا۔ وہ ابھی بھی نہیں سمجھتی کہ آبشار کسی کو پیالہ بھر پانی نہیں دے سکتی۔ وہ تو پرشور اور کم ظرف ہوتی ہے اور آخر میں آبشار سے.... بلندی سے پستی کی طرف گرنا.... واہ.... کمال کر دیا تم نے۔ یہ پورا منظر میں ایسے کا ایسا ہی لکھوں گا۔"

صفورہ حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ کیسے بچوں کی طرح ایکسائیٹڈ ہو رہا تھا۔ کیسا سچا فنکار تھا وہ۔

"اس وقت تم نے میرا جمود توڑ دیا صفیہ۔ میں بہت شکر گزار ہوں تمہارا۔"

"میں جانتی ہوں' آپ بہت ڈسٹرب ہیں ورنہ آپ اسے اس سے بہت اچھا لکھتے۔"

"یہ تو ممکن ہی نہیں۔ بہت ہوتا تو اسے ایسا ہی لکھ لیتا میں۔ تم نے کمال کر دیا صفیہ۔" وہ کام کی طرف مڑا "اچھا' اب اسے لکھ لوں میں۔"

صفورہ جانتی تھی کہ اس میں اس کا کوئی کمال نہیں۔ اس نے تو بس ان لڑکیوں کے بارے میں سوچا تھا' جنہیں اچھے رشتے نہیں ملے تو انہوں نے ہندوؤں سے شادی کر کے خود کو تباہ کر لیا اور پھوار اور آبشار کے حوالے اسے یہیں سے ملے تھے۔ جبکہ صحرا کی پیاس سے وہ خود ہی خوب واقف تھی۔

وہ اداس ہو گئی!

جو کچھ بھی ہوا' اس واقعے کے بعد مجیب' صفورہ کا احترام کرنے پر مجبور ہو گیا۔ صفورہ نے اس پر خود کو ثابت کیا تھا.... خود کو منوایا تھا اس سے اور بے انصافی مجیب کے مزاج میں تھی ہی نہیں۔ اب یہ ہوا کہ وہ کام سے اکتاتا تو صفورہ سے گفتگو کرنے لگتا۔ اردو ادب ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ صفورہ کے مطالعے کی وسعت' گہرائی اور اس کی سمجھ بوجھ نے اسے اور متاثر کیا۔ ایک دن وہ بولا "صفیہ.... تم بہت پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہو۔"

"جی... پڑھی تو بہت ہوں۔ لکھی بالکل نہیں ہوں۔"

"واہ... خوب کہا تم نے۔" مجیب ہنسنے لگا۔ "لیکن تعلیمی قابلیت اب بھی نہیں بتائی۔"

"میں گریجویٹ ہوں۔" صفورہ نے جھوٹ بولا۔

صفورہ مجیب کے اس بدلے ہوئے رویئے پر بہت خوش تھی لیکن ایک عجیب بات تھی۔ گفتگو کرتے کرتے بالکل اچانک' بغیر کسی تنبیہی علامت کے مجیب کے لہجے میں بے رخی در آتی۔ نگاہوں سے بے مہری جھلکنے لگتی پھر وہ اسے یوں بے نیازی سے دیکھتا' جیسے اس کے نزدیک وہ موجود ہی نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ مڑتا اور اپنے کام پر جھک جاتا۔ یہ رنگ صفورہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

مگر مجیب اس کا سبب جانتا تھا۔ وہ ایک ایسے ساتھی کی حیثیت سے صفورہ کا احترام کرتا تھا' جس کے ساتھ من پسند اور پرمغز گفتگو کر کے وہ محظوظ ہو سکتا تھا اور اس کے نزدیک ساتھی کی کوئی جنس نہیں تھی لیکن جیسے ہی صفورہ کو دیکھتے ہوئے اسے اس کے لڑکی ہونے کا احساس ہوتا' اس کی چڑ جاگ اٹھتی۔

دو تین دن کے بعد اچانک کام کرتے کرتے اس کا ارتکاز ختم ہو گیا۔ اس پر تھکن اور اضمحلال طاری ہونے لگا۔ ایسا لگا کہ اب وہ کام کر ہی نہیں سکے گا۔ اسے گھر اور بیوی بچے بہت شدت سے یاد آنے لگے۔ اس وقت تیسری قسط کا تھوڑا سا کام باقی تھا۔

"کیا بات ہے؟ پھر کہیں اٹک گئے ہیں؟" صفورہ نے پوچھا۔

"نہیں۔ ارتکاز سے محروم ہو گیا ہوں۔" اسے اس پر ہی حیرت ہو رہی تھی کہ اب تک کام کیسے چل گیا۔ گھر سے نکلے اسے ایک ماہ ہونے والا تھا۔

"گھر پر بھی ایسا ہوتا ہے؟"

"گھر پر تو زیادہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات دن میں کئی کئی بار بھی ہوتا ہے۔"

"کوئی تفریح نہیں ہے نا۔ آدمی مشین کی طرح کام تو نہیں کر سکتا۔ آپ کہیں گھومنے پھرنے بھی تو نہیں جاتے۔"

مجیب کہنا چاہتا تھا کہ اس کی وجہ سے ہی کہیں نہیں جاتا کہ اسے بھی ساتھ لے جانا پڑے گا لیکن اس نے خود کو روک لیا۔

"وہاں آپ اس کمی کو کیسے پورا کرتے ہیں... کیسے regain کرتے ہیں؟"

"دو ہی طریقے ہیں میرے پاس... بچوں کا وڈیو گیم مجھے مکمل ارتکاز فراہم کرتا ہے۔ اس کے علاوہ وی سی آر پر فلمیں اور گیت مالا دیکھ لیتا ہوں۔"

"تو یہاں ایسا کیوں نہیں کرتے۔"

"کیسے کروں؟"

"گیم آپ خرید کر لا سکتے ہیں۔" صفورہ نے کہا "اور وی سی آر یہاں موجود ہے۔"

مجیب کو حیرت ہوئی "مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا۔"

"آپ نے تو کبھی ٹی وی بھی نہیں دیکھا۔ یہاں پر تو وڈیو کیسٹس کا بہت بڑا کلیکشن موجود ہے۔" صفورہ نے انکشاف کیا۔

صفورہ اسے ٹی وی لاؤنج میں لے گئی۔ بہت بڑا ٹی وی لاؤنج تھا لیکن مجیب نے پہلی بار دیکھنے کے بعد کبھی اس پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ وہاں 26 انچ کا ٹی وی تھا اور کیسٹس کیبنٹ دیکھ کر تو اس کا جی خوش ہو گیا۔ واقعی... بہت بڑا کلیکشن تھا "تمہیں کبھی کچھ دیکھنے کا خیال نہیں آیا؟" مجیب نے صفورہ سے پوچھا۔

"وقت ہی کہاں ملتا ہے اور ویسے بھی اکیلے فلم دیکھنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"اب میرا مسئلہ حل ہو جائے گا۔" مجیب نے کہا پھر اس نے فلم موسم نکالی اور وی سی آر میں لگا دی "گلزار کی فلمیں مجھے بہت پسند ہیں۔ ہر فلم کئی کئی بار دیکھی ہے۔"

"مجھے بھی..." صفورہ بولی۔

وہ فلم دیکھتے رہے۔ اس رات مجیب نے بہت دیر تک کام کیا۔ اس کا بڑا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ اس نے تیسری قسط مکمل کر لی۔



گھر، ابا اور اماں کے متعلق تو صفورہ سوچنے سے بھی گھبراتی تھی لیکن ایک خیال، ایک سوال اسے بہت زیادہ ہراساں کر دیتا تھا۔ مجیب انور سے جب یہ وقتی تعلق ٹوٹے گا تو اس کا کیا بنے گا؟ اس کا مستقبل کیا ہے؟

گھر، ابا اور اماں کی طرح اس خیال سے بھی اسے ہول آتا تھا لیکن نجانے کیا بات تھی کہ جہاں بچھڑنے والوں کے متعلق سوچنے سے بچنے پر اس کا اختیار تھا، وہاں اس سوال کے آگے اس کی ایک نہ چلتی تھی۔ وہ تو کسی بھی وقت اس کے دماغ میں سانپ کی طرح پھن کاڑھ کر کھڑا ہو جاتا۔ وہ اس سے نظریں چراتی، اسے اہمیت نہ دیتی تو وہ ہٹتا بھی نہیں تھا بلکہ وہ اسے تسلسل سے ڈستا رہتا۔ یہاں تک کہ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے پر مجبور ہو جاتی۔ اس کے بعد نظریں چرانا ممکن ہی نہیں تھا۔

اس کا مستقبل صرف ایک صورت میں محفوظ ہو سکتا تھا۔ اس کی مجیب سے شادی ہو جائے۔ جب وہ اس سے ملی تھی تو یہی ایک خواب دیکھتی تھی۔ یہی ایک دعا کرتی تھی۔ اس نے تو مجیب کو خط تک لکھ دیا تھا۔ یہ الگ بات کہ اپنا نام اور پتہ نہیں لکھا مگر اس کا ایک خط محبت کے اظہار کے اعتبار سے مکمل تھا تو دوسرا شادی کی خواہش کا اظہار تھا۔

پھر جب وہ مجیب سے ملی.... اس کے ساتھ آئی تو کچھ دن اس نے اور زیادہ شدت سے یہ آرزو کی اور بات ٹھیک بھی تھی۔ صرف دکھاوے کے لئے اس کی بیوی بننا اتنا خوش کن تھا تو درحقیقت ایسا ہونے میں اسے کتنی خوشی ملے گی، یہ وہ خوب سمجھ گئی تھی۔

لیکن یہ صورت حال صرف تین چار دن رہی۔ اس کے بعد اس کی سوچوں کا رخ بدل گیا۔ اصل میں اس تبدیلی کا آغاز مری میں قیام کے پہلے دن ہی ہو گیا تھا اور اس تبدیلی کا سبب تھا مجیب کی بیوی سحاب۔ اسے یقین تھا کہ سحاب اپنے نام کی طرح خوب

صورت اور فیض رساں ہو گی۔ یہ بات اس نے بتدریج سمجھی تھی۔

مری میں پہلی صبح مجیب نے اسے بتایا تھا کہ وہ اپنی بیوی ہی کی تجویز پر اسے اپنے ساتھ لایا ہے۔ وہ پہلا موقع تھا کہ اس کے دل پر سحاب کی عظمت کا انمٹ تاثر نقش ہوا تھا۔ وہ بیوی کیسی ہو گی، جو شوہر کو شیئر بھی نہ کرنا چاہے اور اسے اپنے شوہر کا اس قدر خیال بھی ہو کہ اسے اذیت سے بچانے کے لئے وہ یہ تجویز پیش کرے کہ اس کا شوہر خوف سے محفوظ رہنے کے لئے کسی لڑکی کو رات بھر اپنے ساتھ رکھے۔ ایک دو رات نہیں، مہینوں۔ اس میں مجیب کی بڑائی کا پہلو بھی تھا۔ وہ اعتبار کے قابل ہو گا۔ تبھی تو سحاب نے ایسا کہا ہو گا لیکن پھر سحاب کا پلہ بھاری تھا۔ کردار کی کیسی ہی مضبوطی اور کتنا ہی اعتماد ہو، خود صفورہ، سحاب کی جگہ ہوتی تو کبھی اس کی اجازت نہ دیتی۔

پھر اسی روز اس نے کتاب میں انتساب دیکھا تو وہ تاثر اور گہرا ہو گیا۔ اس انتساب کے ایک ایک لفظ میں سچائی کی خوشبو تھی اور جیسے جیسے دن گزرتے گئے، اس کے دل پر سحاب کی عظمت کا نقش گہرا ہوتا گیا۔ صفورہ اس بیوی کا تصور کرتی، جو شوہر کو احساس دلائے بغیر ہر کام پر کمربستہ رہتی ہے۔ تاکہ اس کا شوہر بغیر کسی مداخلت کے اپنا کام کرتا رہے۔ وہ ہمیشہ سوچتی کہ سحاب کیا کیا کرتی ہو گی۔ بچوں کو اسکول کی گاڑی میں بٹھا کر آنا، اسکول کا کوئی معاملہ ہو تو وزٹ کرنا۔ باہر سے سودا سلف لانا۔ گیس، بجلی اور فون کے بل جمع کرانا۔ ضرورت پڑنے پر پلمبر کو بلانا۔ جبکہ گھر اور بچوں کو سنبھالنا اور کھانا پکانا تو اس کی ذمے داریاں تھیں ہی۔ مجیب کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے گھر میں کوئی ملازمہ نہیں ہے۔

ایک ایسی ہی بیوی شوہر کا گھر سے لمبے عرصے کے لئے دور ہونا برداشت کر سکتی ہے۔ وہ پہلے بھی سب کچھ کرتی تھی، سو اب بھی کر رہی ہو گی لیکن ایک بہت بڑا فرق تھا۔ ہر وقت نظروں کے سامنے رہنے والا شوہر اب اس سے دور تھا۔ وہ کیسے اسے مس کرتی ہو گی۔ کتنا یاد کرتی ہو گی اور سب سے بڑی بات یہ کہ اسے معلوم تھا کہ وہاں اس کے شوہر کے ساتھ ایک لڑکی بھی رہ رہی ہے، جو اس کے ساتھ ایک کمرے میں سوتی ہے اور ایسا اس کی اپنی تجویز پر ہوا ہے۔

مجیب روز رات کو گھر فون کرتا تھا۔ صفورہ کو یہ تو نہیں معلوم تھا کہ کیا گفتگو ہوتی ہے لیکن وہ درست اندازہ لگا سکتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ سحاب صرف مجیب کا حوصلہ بڑھانے' اسے دلاسا دینے والی باتیں کرتی ہے۔ وہ کبھی کوئی مسئلہ بنا کر اسے پریشان نہیں کرتی تھی۔

بہرکیف رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ صفورہ' سحاب کی محبت میں گرفتار ہوتی گئی' یوں جیسے وہ اس کی بہن ہو.... بہت اپنی۔ سحاب اس کا آئیڈیل بنتی گئی اور اس کا خواب دھیرے دھیرے ٹوٹتا گیا۔ وہ وہی صفورہ تھی' جس نے دوسرے خط میں مجیب کو لکھا تھا.... مجھے یقین ہے کہ آپ شادی شدہ ہیں۔ آپ کے بچے بھی ہوں گے لیکن پھر بھی آپ مجھ سے شادی کرسکتے ہیں۔ یہ ناممکن بھی نہیں اور خلاف شرع بھی نہیں۔ مذہب نے اس کی اجازت دی ہے۔ یہ بات اس وقت بھی درست تھی اور اب بھی درست تھی لیکن اب وہ سحاب سے بھی محبت کرتی تھی۔ اس نے مجیب سے شادی کے تصور کو ناممکن قرار دے دیا تھا۔ اب وہ سوچتی تھی کہ مرد ضرور دوسری شادی کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ پہلی بیوی سے اسے کوئی شکایت ہو۔ یا وہ اس کی ضرورتیں پوری نہ کرپاتی ہو۔ اس کی زندگی ناآسودہ ہو لیکن جب بیوی سحاب جیسی ہو تو شوہر کو دوسری شادی کا کوئی حق نہیں اور نہ ہی عورت ہونے کے ناتے کسی دوسری عورت کو اس کے حق پر ڈاکا ڈالنے کا حق ہے۔ یہ تو کھلی بے انصافی ہو گی۔

یعنی وہ مسئلہ اپنی جگہ تھا۔ مجیب اپنی سیریل کا اسکرپٹ مکمل ہونے تک مری میں تھا اور اس وقت تک وہ اس کی ضرورت تھی۔ وہ اسے اور اس کی صورت حال کو جانتا بھی نہیں تھا۔ اپنی دانست میں تو وہ اس قربت کا معقول معاوضہ ادا کر رہا تھا۔ گویا ضرورت پوری ہوئی.... نہ رہی تو کھیل ختم اور پیسہ ہضم۔ ایک کاروباری تعلق تھا' جو میعاد پوری کر چکا۔ دونوں راہی اپنی اپنی راہ چل دیں لیکن رونا یہ تھا کہ صفورہ کا کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ مجیب تو اپنے گھر چلا جاتا۔ وہ بے گھر' بے نام و نشان کہاں جاتی۔

مجیب کا ساتھ چھوٹ جانے پر وہ اس اتنی بڑی اور بے رحم دنیا میں بے یار و مددگار ہو گی' یہ خیال ہی اس کے لئے لرزہ خیز تھا۔ یہ فیصلہ کرنا بہت آسان تھا کہ بے آبروئی کی زندگی کے مقابلے میں حرام موت کو قبول کرتے ہوئے وہ ذرا بھی نہیں

ہچکچائے گی۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ انسان بہت بے بس ہوتا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے مر بھی نہیں سکتا۔

ایسے میں اللہ کا خیال بے حد تقویت بخش تھا۔ وہی بے آسرا لوگوں کا سہارا ہے۔ وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ اللہ کے حضور.... گڑگڑانے لگی "اے اللہ' میرا عمل بگاڑ لانے والا تھا اور تو بگڑی بنانے والا ہے۔ میں خطا کار ہوں مگر تو بڑا رحم والا اور بخشنے والا ہے۔ تو ہمیشہ مجھے اپنے فضل و کرم کے سائے میں' اپنی امان میں رکھنا۔ مسائل میں نے کھڑے کئے اپنے لئے' تو مسبب الاسباب میرے لئے بہتری کرنا۔ ہمیشہ میری حفاظت فرما...."

وہ دیر تک دعا کرتی رہی۔ یہ بھی عجیب بات تھی کہ وہ جب بھی دل کی گہرائی سے دعا کرتی تھی' اسے سکون آ جاتا تھا۔ سو اس وقت بھی آ گیا۔ فی الوقت تو مجھے صرف مجیب کا' ان کی ضرورتوں کا خیال رکھنا ہے۔ اس نے سوچا۔



اس صبح سحاب بہت اداس تھی۔ بچوں کو اسکول بھیجنے کے بعد وہ ناشتہ کرنے بیٹھی تو اس سے ناشتہ بھی نہیں کیا گیا۔ گھر میں سناٹا تھا۔ اس کا بھائی سرفراز ابھی سو رہا تھا اور امی اپنے وظائف میں مصروف تھیں۔

وہ یونہی بے مقصد ادھر ادھر ڈسٹنگ کرتی پھری لیکن بے چینی کا احساس ستاتا رہا۔ مجیب کو گئے ہوئے ایک ماہ ہو چکا تھا۔ اب تک تو اسے پتہ نہیں چلا تھا مگر آج وہ بہت زیادہ یاد آ رہا تھا بلکہ جتنی شدت سے وہ یاد آ رہا تھا' اس سے پتہ چلتا تھا کہ اتنے دن جو وہ اس کی یادوں کو دبا کر' گھونٹ کر رکھ رہی ہے تو اب وہ موقع پا کر پوری قوت سے ابھر آئی ہیں۔

وہ جھاڑن لئے اسٹڈی میں چلی آئی۔ یہ وہ کمرا تھا' جہاں بیٹھ کر وہ کام کرتا تھا۔ وہ ہوتا تھا تو میز کباڑ خانہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ دن میں کئی بار اس کی میز صاف کرتی' کاغذ اور اس کی بکھری ہوئی چیزیں سمیٹ کر ایک طرف رکھتی' کتابوں کو ترتیب سے رکھتی.... کہتی۔ دیکھیں' ان میں سے جن کتابوں کی ابھی ضرورت نہیں' وہ مجھے بتا دیں۔ میں ہٹادوں گی اور وہ جھنجلا کر کہتا "بھئی تم بہت ڈسٹرب کرتی ہو مجھے۔"

پھر وہ اس کے لئے چائے لے کر آتی تو کمرا سگریٹ کے دھوئیں سے بھرا ہوتا۔

"کھڑکی تو کھول دیا کریں۔" وہ کھڑکی کی طرف بڑھتے ہوئے کہتی "اس طرح تو آپ ایک سگریٹ دس دس بار پیتے ہیں۔"

"زیادہ سے زیادہ استفادے کی شکل ہے یہ۔" وہ ہنس کر کہتا۔

"مذاق نہیں۔ کھڑکی کھول دیا کریں۔ دھوپ آتی ہے تو کمرا روشن ہو جاتا ہے اور تازہ ہوا بھی کتنی اچھی لگتی ہے۔"

"بس خیال ہی نہیں رہتا مجھے۔"

سحاب نے سر گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔ کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ کمرا روشن تھا۔ تازہ ہوا بھی تھی۔ میز صاف ستھری تھی' جہاں ہر چیز ترتیب سے رکھی تھی۔ اچانک اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہوا۔ سب کچھ تھا لیکن وہ نہیں تھا تو روشن کمرا ایک بہت برا ویرانہ لگ رہا تھا۔ اسے وحشت ہونے لگی تو وہ گھبرا کر کمرے سے نکل آئی۔ اس کے قدم بلا ارادہ اٹھ رہے تھے۔

پلک جھپکی تو اس نے خود کو پلے روم میں پایا۔ مجیب جب بھی کہانی میں منتشر ہوتا تو یہاں آکر کھیلنے لگتا تھا۔ اس نے بھی گیم لگایا' ٹی وی آن کیا اور وہی ٹینک والا گیم کھیلنے لگی لیکن پانچ منٹ میں تین بار گیم اوور ہوا تو اسے اندازہ ہو گیا کہ یہ اس کے بس کا نہیں' پھر اندر کی وحشت اور بے چینی اب بھی ویسی ہی تھی۔

وہ دوبارہ اسٹڈی میں آئی اور مجیب کی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اتنی دیر میں پہلی بار.... موہوم سا ہی سہی.... بہرحال اسے طمانیت کا احساس ہوا۔ اس نے سامنے رکھی ایش ٹرے کو اپنی طرف کھسکایا۔ وہ سگریٹ کے ٹوٹوں سے لبالب بھری تھی۔ نجانے کیوں' اس نے اسے خالی نہیں کیا تھا۔ بے اختیار اس نے سگریٹ کا ایک ٹوٹا اٹھایا اور ہونٹوں میں دبا لیا۔ ایک دم اسے ایسا لگا جیسے مجیب اس کے پاس بے حد قریب موجود ہے۔

وہ ٹوٹا منہ سے لگائے یونہی خوامخواہ کش لیتی رہی۔ اچھا لگ رہا تھا۔ حالانکہ سگریٹ کی بو اسے ہمیشہ بری لگتی تھی اور بجھے ہوئے ٹوٹے کی بو تو سگریٹ سے کہیں.... کہیں زیادہ ہوتی ہے پھر بھی اسے اچھا لگ رہا تھا۔

محبت میں انسان کیسا بدل جاتا ہے۔ جب وہ لڑکی تھی تو سگریٹ کی بو اس کے لئے

ناقابل برداشت تھی۔ وہ جہاں ہو' وہاں کوئی سگریٹ پیئے تو اس کی طبیعت بگڑ جاتی تھی۔ یہ سوچتے ہوئے اسے اپنا کزن اشفاق یاد آیا۔ اس کا خالہ زاد بھائی جو امریکہ سے آیا ہوا تھا۔ خاندان کے سب لڑکے لڑکیاں اسے گھیرے رہتے تھے۔ وہ امریکا کے' اپنے گھر کے قصے سناتا رہتا۔ وہ چین اسموکر تھا۔ ہر وقت اس کے ہاتھ میں سگریٹ ہوتا۔ سحاب خود پر جبر کئے اس کمرے میں بیٹھی رہتی۔ ایک تو یوں کہ اس کی باتیں بہت اچھی لگتی تھیں اور دوسرے یہ کہ وہ بس مہینے دو مہینے کا مہمان تھا۔ اسے پھر امریکہ واپس جانا تھا۔

مگر اس روز دھواں پیتے پیتے اس کی طبیعت بری طرح بگڑنے لگی۔ اشفاق نے جو اس کا فق چہرہ دیکھا تو پوچھا "ارے.... تمہیں کیا ہوا؟"

"اشفاق بھائی' سگریٹ بجھا دیں پلیز ورنہ مجھے کچھ ہو جائے گا۔"

"سگریٹ کے بغیر اپنا تو کام نہیں چلتا۔" اشفاق نے کندھے جھٹکے۔

"بجھا دیں اشفاق بھائی۔" صوفیہ نے سفارش کی "آپ نہیں جانتے' صرف آپ کی محبت میں یہ دھواں برداشت کرتی ہے ورنہ یہ بے ہوش ہو جائے۔"

اشفاق بھائی نے استہزائیہ نظروں سے اسے دیکھا "اپنے ہاتھ پر بجھانا چاہو تو بجھا لو۔"

"اور بجھا لی تو؟" سحاب نے پوچھا۔

"تو تمہاری موجودگی میں کبھی سگریٹ نہیں پیوں گا۔"

سحاب نے سگریٹ اس کے ہاتھ سے لی اور اپنے دوسرے ہاتھ کی پشت پر پوری قوت سے دبا کر اسے بجھا دیا۔ کمرے میں اتنے لوگ تھے مگر کوئی اسے نہ روک سکا۔ شاید اس لئے کہ انہیں امید ہی نہیں تھی۔ وہ سحر زدہ سے دیکھتے رہے۔ سگریٹ بجھا تو اس کے ہاتھ کی پشت پر جلد کے نیچے سے چربی جھانک رہی تھی۔

"ارے.... دوا لاؤ جلدی سے۔" اشفاق بھائی نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پکارا۔

"پگلی ہو تم تو۔" اس نے سحاب سے کہا "اور جو تمہاری شادی کسی سگریٹ پینے والے سے ہو گئی تو؟"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ میں ایسے شخص سے کبھی شادی نہیں کروں گی۔"

لیکن اس کی شادی ہوئی مجیب سے، جو بے تحاشا سگریٹ پیتا تھا اور لطف یہ کہ ایک بار کے بعد اس نے کبھی مجیب سے نہیں کہا کہ وہ سگریٹ چھوڑ دے۔ اس نے کتنی آسانی سے اسے قبول کر لیا اور اب.... اس نے میز پر ہاتھ پھیلا کر سگریٹ سے جلنے کے اس نشان کو دیکھا، جو کبھی مٹ نہیں سکا تھا۔ اب مجیب نہیں ہے تو وہ اس کے پیئے ہوئے سگریٹ کے ٹوٹے سے سکون حاصل کر رہی ہے۔

اس نے ٹوٹا ہونٹوں سے ہٹا کر غور سے دیکھا "اب یہ تو میں نے پی لیا۔ اسے پھینک دینا چاہئے۔" اس نے خود سے کہا اور ٹوٹے کو ڈسٹ بن میں پھینک دیا پھر اس نے اپنے اس ہاتھ کی انگلیوں کو سونگھا۔ ان سے سگریٹ کی بو آ رہی تھی۔

اس کی وحشت کچھ کم ہو گئی تھی لیکن اب بھی موجود تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ وہ کرسی سے اٹھی اور وارڈ روب کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ مجیب کے کپڑے ہینگرز میں لٹکے ہوئے تھے۔ اس نے ایک شلوار قمیص سوٹ کھینچ لیا اور اسے سونگھنے لگی۔ دھلے ہوئے کپڑے میں سے بھی آدمی کے جسم کی مہک کیسے آتی ہے۔ اس نے سوچا۔ یہ کیا جادو ہے۔

اچانک نجانے کیا اس کے جی میں آئی کہ وہ مجیب کے کپڑے لے کر باتھ روم میں چلی گئی۔ اپنے کپڑے اتار کر اس نے وہ کپڑے پہنے اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر خود کو دیکھا۔ کپڑے اسکو بہت ڈھیلے اور لمبے تھے اور بہت مضحکہ خیز لگ رہے تھے۔ لیکن اسے بہت اچھا لگ رہا تھا اور کچھ تو اس کے بس میں نہیں تھا۔ اس نے آستینیں فولڈ کر کے اوپر کر لیں۔ باہر نکلی تو اسے شرم آنے لگی۔ امی اور سرفراز اسے اس حال میں دیکھیں گے تو کیا سمجھیں گے، اس نے جلدی سے کمرے کا دروازہ لاک کر دیا۔

پھر اس نے میز کے نیچے رکھے مجیب کے سلیپر پاؤں میں ڈالے اور کرسی پر آ بیٹھی۔ اس نے میز کی اوپری دراز کھولی۔ اسے کھولنا بند کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ مجیب کے فین میل سے ٹھسی ہوئی تھی.... بے ترتیب، کوئی چیز سلیقے اور ترتیب سے نہیں رکھتے۔

اچانک ایک خیال اس کے دماغ میں چمکا۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی چیزیں بری طرح بکھیریں۔ کاغذات پھیلا دیئے۔ اب میز ویسی لگ رہی تھی، جیسی مجیب کی موجودگی

میں ہوتی تھی۔ اب میں میز کی صفائی کروں گی۔ وہ بڑبڑائی۔

خدمت کی خو بھی ایک نشے کی طرح ہوتی ہے۔ خدمت کرنے والا اس سے محروم ہو جائے تو بری طرح تڑپتا ہے۔ اسے اس کے بغیر چین نہیں آتا۔ سحاب اس بات کو سمجھتی نہیں تھی پھر بھی اس نے اپنا علاج خود ڈھونڈ لیا تھا۔

میز صاف کرنے اور سب کچھ ترتیب سے رکھنے کے بعد اسے فین میل کا خیال آیا۔ کئی بار اس نے سوچا تھا کہ تمام خطوط فائلوں میں لگائے گی اور نام پتے رجسٹر میں نوٹ کرے گی لیکن موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ اب مجیب کی غیر موجودگی میں یہ کام بہت آسانی سے کیا جا سکتا تھا۔ پہلے مرحلے میں خطوط کو حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دے لینا بہتر تھا۔ اس طرح جن لوگوں کے ایک سے زیادہ خط ہوں گے، وہ یکجا ہو جائیں گے اور رجسٹر میں درج کرنا بھی آسان ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر اس نے دراز سے تمام خطوط نکال لئے اور لکھنے والوں کے ناموں کے پہلے حرف کے لحاظ سے انہیں ترتیب دینے لگی۔

پھر ایک خط نے اسے چونکا دیا۔ وہ ایک نامکمل محبت نامہ تھا۔ خط کا دوسرا حصہ بھیجنے کے لئے خط لکھنے والی نے شرط رکھی تھی کہ مجیب شاہکار ڈائجسٹ کے ذریعے اسے ہاں یا نہیں کا اشارہ دے۔ وہ خط مجیب کے لئے لڑکی کی بے پایاں محبت کا غیر معمولی اظہار تھا۔ وہ لڑکی بھی غیر معمولی ہو گی۔ کیونکہ اس نے اپنا پتہ نہیں لکھا تھا۔ گھر کی عزت کا اتنا خیال تھا اسے۔ بس وہ محبت کے ہاتھوں مجبور ہو گئی تھی۔

وہ خط پڑھ کر سحاب سوچ میں پڑ گئی۔ کیا مجیب نے ہاں کا اشارہ دیا ہو گا؟ نہیں.... یہ ناممکن ہے لیکن اس نے یہ خط مجھے پڑھوایا نہیں! ذہن میں شک کے سانپ نے پھن اٹھایا۔ کیوں؟ یہ سوچ کر کہ تمہیں اس خط سے تکلیف ہو گی۔ ممکن ہے، تم حاسد بن جاؤ۔ دل نے جواب دیا لیکن دماغ کا شک دور نہیں ہوا۔ دل نے دوسری دلیل دی۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوتی تو وہ اس خط کو کھلی دراز میں کیوں رکھتا، جہاں یہ کسی بھی وقت تمہیں نظر آ سکتا تھا اور نظر آ گیا۔ وہ اسے جلا بھی سکتا تھا اور چھپا کر بھی رکھ سکتا تھا۔ دماغ اب بھی مطمئن نہیں ہوا تو دل نے چیلنج کیا۔ تو اچھی طرح دیکھ لو۔ اس خط کا دوسرا حصہ موجود ہوا تو تم شک کرنے میں حق بجانب ہو گی۔

چنانچہ سب کچھ بھول کر سحاب اس خط کا دوسرا حصہ ڈھونڈنے میں لگ گئی۔ اس خط کا دوسرا حصہ تو نہیں ملا لیکن سحاب کو کچھ اسی طرح کے دو اور خط مل گئے۔ وہ دونوں ایک ہی لڑکی کے لکھے ہوئے تھے اور اس لڑکی نے اپنا نام بھی نہیں لکھا تھا۔ سحاب نے وہ دونوں خط بڑی توجہ سے کئی بار پڑھے۔ ان خطوں کی معصوم بے باکی نے اس کے دل کو چھو لیا۔ شاید اس لئے کہ اس لڑکی نے رابطے کا کوئی امکان چھوڑا ہی نہیں تھا۔ اس نے تو بس اپنی بات مجیب تک پہنچانے.... اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے وہ خط لکھے تھے۔

پہلا خط اظہار محبت تھا۔ لڑکی نے چیلنج کیا تھا کہ مجیب ظاہری طور پر کیسا ہی بھدا اور بدنما ہو' اس کے باوجود وہ اس کا محبوب ہے۔ دوسرے خط میں لڑکی نے بھارت میں مسلمانوں کے لئے ایک اہم اور گمبھیر مسئلے کی نشان دہی کی تھی پھر اس نے شادی کی بات بھی کی تھی اور کہا تھا کہ شرعاً ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ پاکستانی مسلمانوں کو بھارتی مسلمانوں کی مدد کرنا چاہئے۔

وہ دونوں خط سحاب کے لئے فکر انگیز تھے۔ انہوں نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ اس کی سوچ ہی بدل ڈالی۔ وہ عورت تھی اور عورت کا دکھ درد سمجھ سکتی تھی۔ ان دو خطوں نے اسے بدل کر رکھ دیا۔ وہ' وہ نہ رہی' جو تھی۔ اس نے بارہا مجیب سے کہا تھا کہ وہ دوسری شادی جب چاہے کر سکتا ہے۔ اسے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ بس ایک شرط ہوگی۔ محبت وہ اس کے سوا کسی سے نہیں کرے گا۔ وہ اس کی محبت شیئر نہیں کر سکتی اور مجیب نے مذاق میں' لیکن بے حد سچائی سے کہا تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ جس سے شادی کرے' اس سے محبت نہ کرے۔

میری بہن' کاش.... کاش تم نے اپنا پتہ لکھا ہوتا۔ سحاب نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ میں خود تمہیں جواب دیتی۔ تم وہ ہو' جس کے ساتھ میں اپنے شوہر کو بھی شیئر کر سکتی ہوں اور اسکی محبت کو بھی۔ کاش.... تم نے اپنا پتہ لکھا ہوتا۔

سحاب بہت بے بسی محسوس کر رہی تھی۔ اس کا جذبہ بے حد سچا تھا۔ پتہ موجود ہوتا تو وہ مجیب کو زبردستی اس شادی پر رضامند کرتی۔ اب وہ سمجھ سکتی تھی کہ مجیب نے وہ خط اسے کیوں نہیں پڑھوائے۔ وہ کتنی محبت کرتا ہے اس سے۔ تبھی تو وہ ا

حسد کی آگ میں جلنے سے بچانا چاہتا ہے۔

اس نے سوچا' رات فون آئے گا تو مجیب سے اس لڑکی کے متعلق بات کرے گی لیکن پھر خیال آیا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لڑکی کو کسی طرح تلاش کرنا ممکن نہیں۔ کاش..... وہ بار بار یہی سوچے جا رہی تھی۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ اس گمنام لڑکی کو کبھی نہیں بھول سکے گی۔ یہ خلش ہمیشہ اس کے دل میں رہے گی۔

دروازے پر دستک کی آواز نے اسے چونکا دیا "باجی.... سو رہی ہیں کیا؟" سرفراز اسے پکار رہا تھا۔

"اٹھ گئی ہوں۔ تم چلو' میں ناشتا بناتی ہوں۔" اس نے جواب میں پکارا اور کپڑے بدلنے کے لئے باتھ روم کی طرف لپکی۔ اس حلیئے میں تو وہ اس کے سامنے نہیں جا سکتی تھی۔



اس روز صبح ہی سے مجیب کا بہت برا حال تھا۔ سحاب بہت زیادہ یاد آ رہی تھی۔ صبح وہ دیر تک گھر کی البم میں سحاب اور بچوں کی تصویریں دیکھتا رہا پھر کام کرنے بیٹھا تو کام نہیں کیا گیا۔ عجیب سی بے چینی تھی۔ جی چاہتا تھا' اڑ کر گھر پہنچ جائے۔

جی بہلانے کے لئے وہ ٹی وی لاؤنج میں چلا گیا لیکن اس کا جی فلم میں بھی نہیں لگا۔ صفیہ کچن میں تھی۔ وہ باہر نکلا اور نیچے آبشار والی وادی کی طرف چلا گیا۔ وہاں وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا۔

وہ اوپر آیا تو صفیہ اسے عقبی باغیچے میں ڈھلوان کے اوپر کھڑی ملی۔ وہ پریشان لگ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی بولی "کہاں چلے گئے تھے آپ؟"

مجیب کو اس کا بیویوں والا انداز بہت برا لگا۔ ویسے ہی سحاب کے یاد آنے کی وجہ سے وہ چڑچڑا ہو رہا تھا "دیکھتی نہیں' نیچے سے آ رہا ہوں۔"

صفورہ کھسیا گئی۔ مجیب کے لہجے میں بے گانگی تھی۔

"تمہیں کیوں فکر ہو گئی؟" مجیب نے اسے ایک اور چابک مارا۔

صفورہ کو اندازہ ہو گیا کہ آج بہت کرب سہنا ہو گا "نہائیں گے نہیں آپ؟"

"نہاؤں یا نہ نہاؤں' تمہیں کیا۔" مجیب رکنے والا نہیں تھا۔ "میں معمولات پر

چلنے والا آدمی نہیں ہوں۔ آج نہیں نہاؤں گا۔" اسے غصہ آ رہا تھا۔ اس لڑکی کو کیا حق ہے مجھ سے پوچھنے کا۔ باتھ روم دھو کر' میرے کپڑے استری کر کے احسان جتاتی ہے مجھ پر۔

صفورہ مجیب کے پیچھے چلتی رہی "آپ home sick ہو رہے ہیں؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "گھر یاد آ رہا ہے؟"

"تم کیا جانو' home sickness کیا ہوتی ہے۔" مجیب نے پلٹ کر دیکھے بغیر زہر اگلا۔

دنیا میں کون ہے جو مجھ سے زیادہ home sickness کے کرب سے واقف ہو۔ صفورہ نے دل میں کہا۔

اب وہ بنگلے میں پہنچ گئے تھے "کھانا لگا دوں؟" صفورہ نے پوچھا۔

مجیب نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ڈھائی بج رہے تھے۔ اسے بھوک نہیں تھی لیکن کچھ وقت کھانے میں گزر جاتا۔ چنانچہ اس نے کہا "لگا دو۔ میں ہاتھ دھو کر آتا ہوں۔"

کھانے کی میز پر بریانی دیکھ کر اسے پھر سحاب یاد آئی۔ وہ بہت ہی اچھی بریانی پکاتی تھی' اس بریانی کی خوشبو بھی زبردست تھی۔ اس نے اپنی عادت کے مطابق پلیٹ میں تھوڑی سی بریانی نکالی۔ ایک شامی کباب بھی لے لیا۔ کھا کر دیکھا تو بہت اچھا لگا۔

"رائتہ بھی لیں نا۔" صفورہ نے کہا۔

"بریانی بہت اچھی پکی ہو' اس میں کوئی کمی نہ ہو تو میں رائتہ کبھی نہیں ڈالتا۔" مجیب نے کہا۔ صفورہ کی آنکھوں میں چمک دیکھ کر اس کا چڑچڑاپن پوری شدت سے ابھرا۔ اس نے بریانی پر خوب رائتہ ڈالا اور زہریلے لہجے میں بولا "بریانی پکانا تو بس سحاب پر ختم ہے۔ تم نے کیوں پکالی بریانی۔"

اس بار صفورہ کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ اس وقت مجیب پر کیا گزر رہی ہے۔ مجیب نے بے ساختہ سچی تعریف کر دی تھی بریانی کی۔ وہ تو بعد میں اس نے چڑ کر رائتہ ڈالا تھا۔ یہ جتانے کے لئے کہ بریانی اسے اچھی نہیں لگی۔

لیکن مجیب کی پلیٹ کی طرف دیکھ کر اسے افسوس ہوا۔ اس نے بہت تھوڑی

بریانی نکالی تھی اور پھر جذباتی ہیجان میں بہت سارا رائتہ ڈال لیا تھا۔ بریانی پتلی ہو گئی تھی۔ ایسے میں کیا اچھی لگے گی۔ ذائقہ سچ مچ ہی تباہ ہو گیا ہو گا۔

پھر جب مجیب پلیٹ سرکا کر کھڑا ہونے لگا تو اسے بہت ہی قلق ہوا۔ اتنی سی بریانی بھی اس نے پوری نہیں کھائی تھی۔ کباب بھی آدھا پلیٹ میں رکھا تھا "میں شرمندہ ہوں کہ کھانا بدمزہ ہونے کی وجہ سے آپ بھوکے رہ گئے۔" اس نے بے حد خلوص سے کہا۔ "کباب ہی کھا لیجئے۔"

"کباب بہت سخت ہیں۔" مجیب نے بدمزگی سے کہا۔

صفورہ جانتی تھی کہ کباب سخت نہیں بلکہ بہت ہی مزے کے ہیں لیکن اس وقت اس کی کسی بات کی تردید کرنا مناسب نہیں تھا۔ "اچھا... یہ کھیر ہی لے لیں۔" اس نے بڑے عجز سے کہا۔

"منہ کا ذائقہ ہی خراب ہو گیا۔ اب کیا کھایا جائے گا۔" مجیب نے کہا اور پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ اس نے پانی بھی نہیں پیا تھا۔

صفورہ سے بھی کھانا نہیں کھایا گیا۔ اپنی تو اسے پروا نہیں تھی لیکن اس نے سمجھ لیا کہ اس روز مجیب کے سامنے نہ آنا ہی بہتر ہے۔ اسے تکلیف ہو گی۔ وہ چڑے گا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ آج مجیب کا سامنا کرنے سے حتی الامکان بچے گی لیکن ذرا دیر بعد اسے یہ خیال ستانے لگا کہ اس عام حالات میں بھی بہت پانی پینے والے نے آج کھانے کے بعد بھی پانی نہیں پیا.... اور اس کا جو حال ہے' اس میں اسے خیال بھی نہیں آئے گا۔

چنانچہ وہ پانی کا گلاس لے کر بیڈ روم میں گئی۔ مجیب وہاں موجود نہیں تھا۔ بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ کھائے بغیر قیلولہ کون کر سکتا ہے۔ اس نے اسٹڈی میں دیکھا۔ وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ اب ٹی وی لاؤنج کے سوا کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔

اور وہ وہیں بیٹھا ملا۔ وہ گلزار کی مزاحیہ فلم انگور دیکھ رہا تھا.... اور خاصا پرسکون دکھائی دے رہا تھا۔ صفورہ نے گلاس اسے دیا۔ اس نے فلم روکی اور پانی پیا "اور لاؤں؟" صفیہ نے پوچھا۔

"تمہیں زحمت ہو گی۔" وہ خوش اخلاقی سے ہچکچایا۔

"ارے نہیں۔ ابھی لاتی ہوں۔ آج آپ نے پانی پیا ہی نہیں!"

اس بار وہ پانی کا جگ لے کر آئی تو وہ ویسے ہی بیٹھا تھا۔ فلم ابھی شروع نہیں کی تھی۔ پانی کے دو مزید گلاس پی کر اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا "شکریہ صفیہ۔" پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد بولا "میں اپنے رویئے پر نادم ہوں صفیہ۔ میں تمہیں بہت تکلیف پہنچاتا ہوں.... اور وہ بھی ناروا۔"

"مجھے کوئی شکایت نہیں آپ سے۔ میں آپ کا کرب سمجھتی ہوں۔" صفورہ نے بے حد خلوص سے کہا "میں آپ کو سمجھنے لگی ہوں۔ اس لئے برا نہیں لگتا۔"

"مگر میں ایسا نہیں ہوں۔ اس لئے بہت شرمندگی ہوتی ہے مجھے۔"

"وقت' وقت کی بات ہوتی ہے۔ کبھی آدمی کمزور ہو جاتا ہے۔ آپ اتنی اہمیت نہ دیں اسے۔ مجھے برا نہیں لگا۔"

"اس پر تو تمہیں انعام ملنا چاہئے۔" مجیب مسکرایا۔

صفورہ حیران رہ گئی۔ اس وقت تو وہ بالکل بدلا ہوا تھا۔

مجیب اس کی حیرت بھانپ گیا "یہ فلم میں نے اتنی بار دیکھی ہے کہ گنتی بھی یاد نہیں۔ ڈپریشن کی تو یہ دشمن ہے۔ آؤ تم بھی بیٹھو۔ ری وائنڈ کروں؟"

صفورہ بیٹھ گئی۔ اس نے سر ہلا دیا۔

وہ بیٹھے فلم دیکھتے رہے۔ صفورہ بھی اس فلم سے بہت محظوظ ہوئی۔ فلم ختم ہوئی تو انہوں نے شام کی چائے پی پھر صفورہ کچن کی طرف چلی گئی اور مجیب اسٹڈی میں۔ وہاں اس نے کچھ دیر کام کیا لیکن پھر فلم کا اثر زائل ہو گیا اور پھر وہی ڈپریشن۔ سحاب اسے بہت یاد آ رہی تھی۔

اس کا فرسٹریشن بڑھتا گیا۔ رات کے کھانے تک وہ مزاج کے اعتبار سے وہیں پہنچ گیا' جہاں دوپہر کے کھانے کے وقت تھا۔

کھانے کے بعد شکور اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ "ایک بات ہے صاب جی۔"

"کہو۔" اس نے چڑچڑے پن پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"کل میرے بھائی کی دھی کا بیاہ ہے جی۔" شکور نے عاجزی سے کہا۔

مجیب نے جیب سے نوٹ نکالے اور پانچ سو روپے گن کر اس کی طرف بڑھائے۔

شکور کا ہاتھ نہیں بڑھا "یہ بات نہیں صاب جی۔ اگر آپ ہماری عزت بڑھا دیں تو...."

"تمہارا مطلب ہے' میں شادی میں شریک ہوں؟"

شکور نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

مجیب نے چند لمحے سوچا پھر نرم لہجے میں بولا "دیکھو شکور' کام کا معاملہ نہ ہوتا تو میں ضرور چلتا۔"

"صاب جی' بی بی صاب کے لئے بھی خوشی ہو گی۔" شکور نے پھر ہاتھ جوڑ دیئے۔

اوہ.... تو یہ صفیہ کی سازش ہے۔ اس ذہنی کیفیت میں مجیب کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے صفورہ کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔ وہ ملتجیانہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ چلو اچھا ہی ہے۔ اس نے سوچا۔ یہ مصیبت میں نے خود اپنے اوپر مسلط کی ہے۔ ایک دن کے لئے جان چھوٹ رہی ہے تو کیوں نہ فائدہ اٹھایا جائے۔ اس نے شکور سے کہا "ٹھیک ہے۔ تم بی بی کو لے جانا۔" پھر وہ صفورہ کی طرف مڑا "صفیہ' تم کل چلی جانا۔"

"لیکن.... آپ...."

"میری تم فکر نہ کرو۔" مجیب نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے اس وقت بھی ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا تھا۔



اگلے روز ناشتے کے بعد مفورہ اس کے سامنے ہی نہیں آئی۔ اسے یہ اندازہ تھا کہ وہ صبح معمول سے خاصا پہلے اٹھ گئی تھی۔ خود اس کا اپنا موڈ ٹھیک تھا۔ رات کو وہ سکون سے سو گیا تھا۔ یہ خیال خوش آئند تھا کہ اگلی صبح ایک نئی طرح کا دن طلوع ہو گا' جس میں صفیہ نہیں ہو گی۔ تبدیلی کی اسے ضرورت تھی۔

اس روز اس نے بڑے جوش و خروش سے کام شروع کیا۔ کام ہو بھی بہت اچھا رہا تھا۔ پانی کا جگ اور گلاس اس کے پاس ہی رکھا تھا۔

دس بجے مفورہ اس کے لئے چائے لائی "آپ بھی چلے چلتے تو اچھا تھا۔" اس نے چائے اس کے سامنے رکھتے ہوئے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"نہیں' تم جاؤ۔" مجیب نے نرم لہجے میں کہا پھر پانچ سو روپے اس کی طرف بڑھائے "یہ دلہن کو دے دینا۔"

"پیسے میرے پاس ہیں۔"

"رکھ لو۔ دے دینا۔" اب مجیب کے لہجے میں سختی تھی۔

مفورہ نے نوٹ لے لئے۔ "کھانا میں نے پکا دیا ہے۔ آپ لے لیجئے گا۔ چائے کا تھرموس میں یہاں رکھ جاؤں گی۔"

"کیوں زحمت کی تم نے۔ میں سینڈوچ بنا لیتا۔"

مفورہ نے زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا لیکن وہ اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ کمرے سے چلی گئی۔ مجیب چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے کام میں لگا رہا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد مفورہ آئی تو جانے کے لئے تیار ہو چکی تھی۔ اس نے پانی کی بوتل سے جگ بھرا' چائے کا تھرموس اور پیالی رکھی' "میں جا رہی ہوں۔" اس نے کہا۔ اس کے لہجے میں عجیب سی بے بسی اور یاسیت تھی۔

مجیب نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ میک اپ سے پاک تھا۔ وہ وہی لباس

پہنے ہوئے تھی' جو اس نے خود پسند کیا تھا۔ جو مجیب کو بھی بہت زیادہ پسند آیا تھا۔

وہ اس پر اور زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے صفیہ۔ گو اینڈ انجوائے یور سیلف۔"

مفورہ کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔ اس نے سر جھکا کر اسے خدا حافظ کہا اور کمرے سے نکل آئی۔

ذرا دیر بعد شکور اور فاطمہ اجازت لینے کے لئے آئے۔ مجیب نے شکور سے کہا۔ "تمہیں وہاں زیادہ دن رکنا ہو گا؟"

"دو دن رکنا تھا صاب جی مگر ہم نہیں رکیں گے۔" شکور بولا۔

"کیوں بھئی۔ سگی بھتیجی کی شادی ہے۔"

"ہم کیسے رک سکتے ہیں صاب۔ آپ کو پریشانی ہو گی۔"

لیکن اس وقت اردگرد کے لوگوں کو بھگانے کے معاملے میں مجیب حاتم طائی ہو رہا تھا۔ اس نے کہا "تم میری فکر نہ کرو۔ پرسوں آ جانا۔"

"لیکن صاب....."

"میں خود کہہ رہا ہوں نا تم سے۔"

شکور اور فاطمہ بھی چلے گئے۔ اب وہ اکیلا تھا۔

کچھ دیر تو وہ سکون سے کام کرتا رہا۔ کام کے دوران میں تو اسے گرد و پیش کا ہوش ہی نہیں رہتا تھا۔ چائے کی طلب کی وجہ سے اس نے سر گھما کر دیکھا تو مفورہ کی خالی کرسی نظر آئی۔ اب بھی وہ انہماک کے عالم میں تھا۔ اس نے گھنٹی کا بٹن دبایا لیکن کوئی آیا نہیں پھر اس دوران میں اس کی نظر چائے کی تھرموس اور پیالی پر پڑی۔ اسے سب کچھ یاد آ گیا۔

یہ وہ لمحہ تھا جب اس کا ارتکاز ختم ہو گیا!

اس نے اٹھ کر تھرموس سے چائے انڈیلی۔ چائے بغیر دودھ کے تھی۔ وہیں دودھ بھی رکھا تھا۔ اس نے چائے میں دودھ ڈال لیا لیکن چائے میں لطف بالکل نہیں آیا۔ بار بار اس کی نظر مفورہ کی خالی کرسی کی طرف اٹھ جاتی تھی اور لگتا تھا کہ ابھی وہ کرسی پر آ بیٹھے گی۔

کئی بار ایسا ہوا تو اسے غصہ آنے لگا کیوں بار بار نظر اٹھتی ہے اس کی طرف۔ جبکہ وہ اس سے ڈسٹرب ہوتا ہے۔

پھر وہ کام میں لگ گیا اور سب کچھ بھول گیا۔ اس کے بعد ایک رکاوٹ سامنے آئی اور اس نے مدد کے لئے صفورہ کی طرف دیکھا۔ وہ موجود نہیں تھی۔

وہ جھنجلا گیا۔ یہ وہ وقت تھا' جب وہ پوری طرح منقسم آدمی بن گیا۔ اس کے اندر دو متصادم شخصیتیں ابھر آئیں۔ ان میں ایک اندر دبی ہوئی تھی۔ دوسری وہ تھی' جس سے وہ خوب واقف تھا۔

"پہلے تو اسے بھیج دیا۔ اب جھنجلا رہے ہو۔" دبی ہوئی شخصیت نے سر ابھارتے ہوئے کہا۔

"اس کے نہ ہونے پر نہیں جھنجلا رہا میں۔ یہ کام رک جانے کی جھنجلاہٹ ہے۔" اس کی جھنجلاہٹ اور بڑھ گئی "اس کی موجودگی سے تو ڈسٹرب ہوتا ہوں میں۔"

"تو اب تو کام بہت اچھا ہونا چاہئے۔ وہ تو نہیں ہے نا۔" اندر والا زہریلے لہجے میں بولا۔

"یہ رکاوٹ تو کام کی ہے اور کوئی بات نہیں۔"

"احسان فراموش ہو۔ اس نے تمہیں کبھی ڈسٹرب نہیں کیا۔ الٹا مدد کی تمہاری۔"

"گویا مجھے لکھنا نہیں آتا۔" اس نے تنک کر کہا "اور اس سے پہلے جو کچھ لکھا ہے' وہ ناقص تھا۔"

"صرف ایک بات مان لو۔ ڈسٹرب تم خود ہوئے ہو۔۔۔ اپنے آپ میں۔۔۔ اپنی وجہ سے۔ اس کا سبب صفیہ ہے لیکن وہ اس کی ذمے دار نہیں۔"

"یہ غلط ہے۔"

"تو پھر وہ نظر نہیں آتی تو پریشان کیوں ہوتے ہو۔ مان لو۔ ہوا یہ ہے کہ پہلے تم اس کے عادی ہوئے اور پھر غیر محسوس طور پر' بغیر تفہیم و تسلیم کے اس کی محبت میں گرفتار ہوتے گئے۔ وہ ہے ہی ایسی کہ اس کی محبت چپکے چپکے دل میں گھر کر جائے اور پتہ بھی نہ چلے۔"

"محبت۔۔۔ اور اس سے۔ کیا فضول بات ہے۔" مجیب استہزائیہ انداز میں ہنستا چلا

گیا۔

"کیوں۔۔۔ ایسی کیا ناممکن بات ہے یہ۔"

"میں۔۔۔ مجیب انور۔۔۔ ایک طوائف سے محبت کروں۔۔۔ ایک کال گرل سے۔"

"وہ وہ نہیں ہے' جو تم کہہ رہے ہو۔ میں تو اس کے لئے یہ لفظ سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"ممکن ہے' فی الوقت نہ ہو لیکن اسے یہی بننا ہے۔ وہ اس راستے پر قدم اٹھا چکی ہے۔ میں نہ ملا ہوتا اور وہ میرے ساتھ نہ آئی ہوتی تو اب تک طوائف بن چکی ہوتی۔"

"مگر ابھی نہیں بنی ہے۔ اس لئے محبت کے قابل ہے۔" اندر کے مجیب نے ٹھنڈے دل سے کہا۔

"پھر وہی محبت۔" مجیب نے مشتعل ہو کر کہا "تم مجھ سے وہ اعتراف کرانا۔۔۔ وہ کچھ کہلوانا چاہتے ہو' جو میں کہنا نہیں چاہتا۔"

"سب کچھ کہہ دینا چاہئے۔ کم از کم خود سے ضرور کہہ دینا چاہئے۔ تاکہ مسائل چھپے نہ رہیں۔ صحیح شکل میں سامنے آجائیں۔ اس طرح انہیں حل کیا جا سکتا ہے۔"

اندر کی معقولیت نے مجیب کو اور مشتعل کر دیا۔ اب وہ تھر تھر کانپ رہا تھا "تو پھر سنو۔ سچ یہ ہے کہ میں اسے وہی سمجھتا ہوں جو وہ ہے اور جسے تم محبت سمجھ رہے ہو' وہ ہوس ہے۔ یہ جھنجلاہٹ بھی اس کی ہے۔ میں اسے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم اور ہوس!؟"

"کیوں۔ میں انسان نہیں۔ میرے جسم کے تقاضے نہیں۔" اب وہ کف اڑا رہا تھا۔

اندر کا آدمی اب بھی پرسکون تھا۔ "تو رکاوٹ کیا ہے۔ حاصل کر لو اسے۔ قابل عزت تو تم اسے سمجھتے ہی نہیں۔"

"اسے نہیں سمجھتا لیکن خود کو تم محترم جانتا ہوں۔ خود کو گرانا نہیں چاہتا۔"

اندر کا آدمی مطمئن نہیں تھا لیکن اس بات کے جواب میں اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ دوسری طرف مجیب سوچ رہا تھا کہ یہ محبت کا طعنہ بری طرح پیچھے پڑ

گیا ہے۔ کیا اس کے لئے مجھے کال گرل کو کال گرل بنانا پڑے گا۔ اس کے بعد کوئی طعنہ نہیں دے سکے گا لیکن خود کو اتنا گرانا.... نہیں' یہ اچھا نہیں۔

اپنی دانست میں وہ ہوس کو اپنے لاشعور سے باہر نکال لایا تھا۔ یہ الگ بات کہ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے لاشعور میں درحقیقت کیا چھپا ہے۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس نے تمام روایتی اصول الٹ دیئے تھے۔ عام طور پر ولن اندر چھپا رہتا ہے اور آدمی ظاہری طور پر ہیرو بنا رہتا ہے۔ وہ خود کو ظاہری طور پر ولن بنا رہا تھا۔

بہرحال کام تو دھرے کا دھرا رہ گیا اور اس کے باوجود وقت گزارنا اس کے لئے دوبھر ہو گیا۔ اس نے کئی فلمیں لگائیں لیکن کوئی بھی دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہ دیکھ سکا۔ وہ بری طرح الجھ رہا تھا اور سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا۔

تین بجے اسے خیال آیا کہ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا اور اسے نہانے کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔ نہانے کا تو اب بھی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ کھانے کے لئے کچن میں چلا گیا۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ صفیہ نے ہرے مسالے کا قیمہ پکایا تھا' جو اسے بہت پسند تھا۔ ایک طرف سلاد اور رائتہ موجود تھا۔ ہاٹ پاٹ میں روٹیاں تھیں۔

اس نے پلیٹ میں سالن نکالا اور کچن میں ہی کھانے بیٹھ گیا لیکن تین لقموں کے بعد وہ نہ کھا سکا۔ کہاں تو اتنی شدید بھوک لگ رہی تھی' جو پسندیدہ کھانا دیکھ کر اور بھڑک گئی تھی اور کہاں تین لقموں کے بعد یہ احساس ہونے لگا کہ وہ حلق تک بھر چکا ہے۔ یہ دوسرا دن تھا کہ وہ ٹھیک سے کھانا نہیں کھا پا رہا تھا۔

اس نے روٹی اور سالن وہیں چھوڑا اور کچن سے نکل آیا۔ ہاتھ دھونے کے لئے باتھ روم میں گیا تو دیکھا کہ وہاں معمول کے مطابق ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ دھلے ہوئے استری شدہ کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کے حساب سے تو صفیہ نے جانے کی جلدی میں جلدی جلدی کام نمٹایا تھا۔ ایسے میں باتھ روم کا خیال آنا ہی نہیں چاہئے تھا۔

کچھ بھی ہو' وہ خوش ہو گیا۔ گزشتہ روز بھی وہ نہیں نہایا تھا۔ چنانچہ جی بھر کے نہایا۔ اس دوران میں اسے کچھ یاد نہیں آیا لیکن باہر نکلتے ہی پھر وہی مہیب تنہائی۔ وہ اسٹڈی میں چلا گیا لیکن کوشش کے باوجود کام نہیں کیا گیا۔ کام ہی نہیں' وہ کچھ بھی

نہیں کر سکا۔ پانی سامنے رکھا تھا۔ چائے بھی موجود تھی لیکن خواہش کے باوجود اس سے ذرا سی زحمت نہیں کی گئی۔

وہ یونہی بیٹھا رہا۔ نجانے کب اندھیرا ہو گیا۔ احساس ہوا تو اس نے لائٹ آن کی۔ مگر اب بند اکیلے گھر میں گھبراہٹ ہونے لگی۔ اس نے پورے بنگلے میں روشنی کر دی اور اس کے بعد باہر نکل آیا۔ کچھ دیر وہ لان میں بیٹھا رہا۔ عقبی باغیچے کی طرف جانے کی اسے ہمت نہیں ہوئی۔ پہلی بار اسے احساس ہو رہا تھا کہ یہاں اتنی ویرانی اور سناٹا ہے۔

ذرا دیر اور گزری تو سوچوں کا رخ بدلنے لگا۔ اسے خیال آیا کہ اس ویرانے میں وہ بنگلے کا دروازہ کھولے باہر بیٹھا ہے۔ کوئی چور آ جائے تو کیا ہو گا لیکن اس بار وہ ہمیشہ جیسی وحشت نہیں تھی۔ وہ اندر نہیں گیا۔ اندر جاتا تو بھی اسے ذرا دیر بعد واپس ہی آ جانا تھا۔ وحشت تو بند گھر میں ہوتی تھی۔

اس نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ صفیہ کو اب تک آ جانا چاہئے تھا۔ اسے تو معلوم ہے کہ وہ تنہا رات نہیں گزار سکتا۔

اچانک اسے خیال آیا کہ شکور اور فاطمہ کو اس نے پرسوں تک کی اجازت دی ہے۔ کیا پتہ' وہ صفیہ کو بھی اس اجازت میں شامل سمجھ لیں۔ یہ خیال بے حد پریشان کن تھا۔ اس نے فوراً ہی اسے جھٹک دیا۔ صفیہ خود ہی رکنے سے انکار کر دے گی۔ اسے انکار کر دینا چاہئے۔ اس نے اسے تو رکنے کی اجازت نہیں دی۔

یہ سوچتے سوچتے ایک دم اسے غصہ آنے لگا۔ اسے لگ رہا تھا کہ صفیہ اس پر اپنی اہمیت ثابت کرنے کے لئے گئی ہے۔ اس صورت میں وہ واپس کیوں آنے لگی۔ خیر.... نہ آئے۔ اس نے غصے سے سوچا۔ میں خود ثابت کر دوں گا کہ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ میرا کام اکیلے بھی چل سکتا ہے۔ میں کسی کا محتاج نہیں۔

اس زعم میں تھوڑی دیر وہ پراعتماد انداز میں اکڑا بیٹھا رہا لیکن جب تنہا پوری رات گزارنے کا خیال آیا تو اکڑ کے غبارے سے ساری ہوا نکل گئی۔ وہ خود کو یقین دلانے لگا کہ صفیہ ہر حال میں واپس آئے گی۔ وہ نہیں آئی تو بھی افضل خان تو گاڑی لے کر آئے گا ہی۔

نو بجے۔۔۔ ساڑھے نو بجے۔ کوئی نہیں آیا۔ اب وہ اندر ہی اندر ابلنے لگا۔ کیا وہ پوری رات یہیں۔۔۔ لان میں بیٹھا رہے گا؟ اب ہر گزرتا لمحہ اعصابی دباؤ بڑھا رہا تھا۔ گیارہ بجتے بجتے اس کا حال ابتر ہو گیا۔ اب وہ ہر ایک منٹ بعد گھڑی دیکھ رہا تھا۔

ساڑھے گیارہ بجے کے قریب درختوں پر متحرک روشنی نظر آئی۔ وہ یقیناً کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس تھیں پھر گاڑی کی آواز سنائی دی۔ جیپ بنگلے کے گیٹ سے اندر آئی تو اسے سکون ہوا۔ جیپ ڈرائیو وے میں رکی۔ صفورہ گاڑی سے اتر کر اس کی طرف لپکی۔ "آپ۔۔۔ آپ ٹھیک تو ہیں نا۔ بہت پریشان ہو رہے ہوں گے۔" وہ بولی۔

غصہ اتنی تیزی سے امنڈا کہ مجیب اس پر برس پڑتا لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اسے تو بے نیازی کا مظاہرہ کرنا چاہئے تھا "پریشان کیوں ہوتا۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

صفورہ ایک لمحے کو مطمئن نظر آئی پھر اس کی نظر مجیب کے پیروں کے قریب مسلے ہوئے سگریٹ کے ٹوٹوں پر پڑی۔ وہ کم از کم بارہ چودہ تھے اور مجیب کے ہاتھ میں جلتا ہوا سگریٹ تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا "آیئے۔۔۔ اندر چلیں۔" اس نے کہا۔

"تم چلو۔ میں آتا ہوں۔"

صفورہ اندر چلی گئی۔ مجیب اپنی بات رکھنے کو وہاں رکا۔ سگریٹ کے گہرے کش لیتا رہا۔ درحقیقت اس کا جی اندر جانے کو چاہ رہا تھا۔

سگریٹ ختم کر کے وہ اندر گیا۔ وہ بیڈ روم میں پہنچا ہی تھا کہ صفورہ باتھ روم سے نکلی۔ اس نے لباس تبدیل کر لیا تھا "تم آ کیوں گئیں۔ رک جاتیں نا۔" مجیب نے کہا۔

صفورہ نے چونک کر اسے دیکھا لیکن مطمئن ہو گئی۔ وہ طنز نہیں کر رہا تھا۔ اس کے لہجے میں خلوص تھی "کیوں رکتی؟؟"

"یہاں کی شادی اور اس کے رسم و رواج تمہیں مختلف اور دلچسپ لگے ہوں گے۔"

"یہ تو ہے۔ وہ لوگ روک بھی بہت رہے تھے لیکن میں کیسے رک سکتی تھی۔"

"کیوں؟ کیا حرج تھا رکنے میں؟؟"

"آپ کو تنہا چھوڑ دیتی۔۔۔ رات بھر۔ جبکہ مجھے معلوم ہے۔۔۔ اور آپ اسی لئے مجھے لائے ہیں۔ اتنی غیر ذمے دار تو نہیں ہوں میں۔"

"واپسی میں اتنی دیر کر دینا غیر ذمے داری نہیں۔" مجیب نے غصے سے کہا مگر فوراً ہی خود کو سنبھالا "یہ نہیں کہ مجھے کوئی فرق پڑا ہو۔ میں تمہارے نقطہ نظر سے کہہ رہا ہوں۔"

صفورہ نے اس کے لہجے میں تلخی اور غصہ محسوس کر لیا تھا۔ سگریٹ کے ٹوٹوں نے جو کچھ اسے بتایا تھا' اس کی اب تصدیق ہو گئی تھی۔ وہ مطمئن نہیں تھا۔ نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا "میں نے غیر ذمے داری نہیں کی۔" اس نے آہستہ سے کہا "میں سات بجے وہاں سے چل دی تھی۔ راستے میں دو جگہ ٹائر پنکچر ہوئے۔ راستہ بہت خراب تھا۔ افضل خان کو پنکچر لگوانے بہت دور جانا پڑا۔ اس لئے دیر ہو گئی۔"

"خیر' ٹھیک ہے۔" مجیب نے بے پروائی سے کہا۔

صفورہ کمرے سے چلی گئی۔ سب سے پہلے وہ اسٹڈی میں گئی۔ وہاں تھرموس میں چائے تقریباً پوری کی پوری موجود تھی۔ دودھ دان بھی دودھ سے بھرا ہوا تھا۔ بس پیالی سے ثابت ہوتا تھا کہ مجیب نے ایک چائے پی ہو گی۔ وہ سمجھ سکتی تھی۔ اس نے اپنے طور پر پورا بندوبست کیا تھا لیکن مجیب کو چائے پینے کے لئے اٹھ کر پیالی دھونا اور دودھ گرم کرنا پڑتا۔ لہٰذا اس نے چائے ہی نہیں پی۔

کچن میں جا کر پتہ چلا کہ اس نے کھانا بھی ٹھیک سے نہیں کھایا تھا۔ آدھی روٹی اب بھی پلیٹ میں رکھی تھی۔ سالن کا بھی یہی حال تھا۔ صفورہ کا دل کٹنے لگا۔ خود پر غصہ آنے لگا اسے۔ اسے جانا ہی نہیں چاہئے تھا۔ خواہ وہ ناراض ہو جاتا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ کیسی ناز برداریوں کا عادی ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہئے تھا کہ وہ نہ کچھ کھائے گا' نہ پئے گا۔ بہرکیف اب پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

یہ سوچ کر اسے اور افسوس ہونے لگا کہ مجیب گزشتہ روز سے ہی بھوک کی اذیت میں مبتلا ہے۔ پچھلے روز نہ اس نے دوپہر میں ٹھیک سے کھانا کھایا تھا' نہ رات کو اور دوسرا دن بھی یونہی گزر گیا۔

اس نے سالن گرم کرنے کے لئے دھیمی آنچ پر رکھا اور بیڈ روم میں چلی آئی۔

مجیب بیڈ پر خاموش بیٹھا تھا "میں کھانا لگا رہی ہوں۔ چلئے۔" اس نے کہا۔

مجیب نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کھانا تو میں نہیں کھاؤں گا۔" وہ بولا۔

"کیوں؟ رات کا کھانا تو آپ نے نہیں کھایا ہے۔" صفورہ دانستہ اسے احساس دلانے سے بچ رہی تھی کہ اسے اس کے گزرے دن کا حال اور کیفیت پوری طرح معلوم ہے۔ وہ جانتی تھی کہ اس بات سے وہ اور چڑے گا۔

"کھانا تو نہیں کھایا ہے۔ اکیلے کھانا اچھا نہیں لگتا۔" وہ پھر جھنجلا گیا۔

"میں نے بھی نہیں کھایا ہے۔ آپ آ جائیں۔"

مجیب انکار کرنے والا تھا مگر اسی لمحے شدید بھوک کا احساس ہونے لگا۔ اتنی شدید اعصابی کشیدگی، فرسٹریشن اور ڈپریشن کے بعد صفیہ کو دیکھ کر پرسکون ہوا تھا تو بھوک لگنی بھی لازمی تھی "ٹھیک ہے۔ میں آتا ہوں۔"

کھانے کے دوران میں مجیب نے صفورہ سے کہا "صفیہ..... تمہیں تو وہاں سے کھا کر آنا چاہئے تھا۔"

"میں رات کے کھانے سے پہلے ہی چل دی تھی۔" صفورہ نے کہا۔ وہ اسے کیا بتاتی کہ اس نے تو دوپہر کو بھی کھانا ڈھنگ سے نہیں کھایا تھا۔ بس دکھاوے کے لئے زہر مار کر لیا تھا۔

کھانے کے فوراً بعد مجیب اٹھ ہی رہا تھا کہ صفورہ چائے لے آئی۔ مجیب نے حیرت سے اسے دیکھا۔ یہ معمول کے خلاف تھا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ چائے نہیں پیتا تھا۔ لیکن چائے دیکھ کر خواہش ہونے لگی۔ شاید اس لئے کہ دن بھر میں اس نے صرف ایک پیالی چائے پی تھی۔ وہ شام کی چائے سے بھی محروم رہا تھا۔

چائے کے بعد صفورہ برتن سمیٹنے لگی۔ مجیب چہل قدمی کے لئے عقبی باغیچے میں چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ٹہلنے ضرور آئے گی لیکن وہ معمول سے زیادہ ٹہل لیا اور وہ نہیں آئی۔ وہ بینچ پر بیٹھ گیا۔ اس کے نہ آنے سے اسے مایوسی ہو رہی تھی۔

اچانک اندر کے آدمی نے اسے چھیڑا "اس کا انتظار کیوں کر رہے ہو۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"اور پورا دن اسے مس کرتے رہے۔ کتنا خراب وقت گزارا ہے تم نے۔ اس

کے آنے کے بعد سب نارمل ہو گیا۔ اس کو کیا کہو گے؟"

"وہ ضرورت کا معاملہ تھا۔" اس نے دلیل دی "صفیہ نے میری عادتیں بگاڑ دی ہیں۔ کھانا اور تن آسان تو میں پہلے ہی تھا۔ اس لئے دن بھر کوفت ہوتی رہی۔"

"اس صورت میں تمہیں بیوی کو یاد کرنا چاہئے تھا۔ اصل میں تو تمہاری عادتیں اس نے بگاڑی ہیں مگر تمہیں تو اس کا خیال بھی نہیں آیا۔ سوچو ذرا۔"

اور مجیب سناٹے میں آ گیا۔ یہ بات بے حد منطقی تھی۔ ایسے میں اسے گھر کی، سحاب کی یاد آنی چاہئے تھی لیکن اس نے تو آج سحاب کو فون بھی نہیں کیا۔ یہ یاد ہی نہیں رہا کہ روز وہ اسے فون کرتا ہے۔

"سوچو ذرا۔" اندر کے آدمی نے اسے پھر چھیڑا "اب بھی تم اس کی آمد کے منتظر ہو۔ تمہیں گھر فون کرنے کا خیال بھی نہیں آیا۔"

مجیب نے پھر خود کو ولن بنا لیا "مجھے تسلی ہے لیکن بات وہی ہے۔ جسمانی تقاضے جب سر اٹھاتے ہیں تو کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتے۔ آخر میری بات ہی سچ ثابت ہوئی نا۔" پھر وہ مزید بحث سے بچنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا "اب نیند آ رہی ہے۔"

بیڈ روم میں روشنی تھی لیکن صفورہ بے خبر سو رہی تھی۔ صرف اس کا چہرہ چادر سے باہر تھا۔ بہت تھک گئی ہو گی۔ اسی لئے ٹہلنے کی بھی ہمت نہیں ہوئی۔ مجیب نے لائٹ آف کرتے ہوئے سوچا پھر وہ باتھ روم میں چلا گیا۔ واپس آ کر وہ اپنی جگہ سونے کے لئے لیٹ گیا اور اسے فوراً ہی نیند آ گئی۔

اس رات پہلا موقع تھا کہ وہ خواب میں سحاب کو دیکھ رہا تھا۔ خواب دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلتے ہی نظر سحاب پر پڑی، جو برابر لیٹی سو رہی تھی۔ وہ اس وقت سونے اور جاگنے کی درمیانی کیفیت میں تھا۔ سحاب کا جسم چادر میں چھپا تھا اور چہرہ باہر تھا۔ کب سے اس نے اس حسین چہرے کو نہیں چھوا تھا۔ کب سے وہ اپنے بیڈ روم میں نہیں سویا تھا۔ ایک دم اس کا وجود خواہش سے بوجھل ہو گیا۔ اس نے سحاب کے چہرے کو چھونے..... انگلی سے اس کے نقوش کو چھونے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اس کے ہاتھ میں لرزش تھی۔ وہ اس وقت پانی سے لدے پھندے بادل کی طرح تھا، جو برس جانے کو بے تاب ہو۔

اس نے سحاب کی پیشانی کو چھوا پھر اس کی انگشت شہادت اس کے رخسار کی طرف تھرکنے لگی۔ سحاب بدستور بے خبر سو رہی تھی اور مجیب کو یہ بھی معلوم تھا کہ اگلے مرحلے میں وہ کیا کرے گا۔ وہ سحاب کے جسم سے چادر کھینچے گا اور......

اسی لمحے کمرے میں کلاک کی آواز ابھری.... ٹن.... ٹن.... ٹن اور پھر خاموشی چھا گئی۔ تین بجے تھے۔ اس کا ہاتھ' اس کی انگلی جہاں تھی' جم کر رہ گئی۔

تین بجنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن اسے اس خیال نے چونکایا کہ اس کے گھر میں' اس کے بیڈ روم میں کوئی ٹن ٹن کر کے وقت کا اعلان کرنے والا کلاک تو موجود ہی نہیں۔ تو پھر وہ کہاں ہے؟ اس کے ساتھ ہی اسے یاد آگیا کہ وہ مری میں ہے اور نجانے کیسے' سحاب کے نقوش سمٹے' سکڑے اور تبدیل ہونے لگے۔ اگلے ہی لمحے اس کے سامنے صفیہ کا چہرہ تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ یوں کھینچا' جیسے نادانستگی میں جلتے ہوئے انگارے کو چھو لیا ہو۔

مگر غنودگی میں ڈوبا ہوا دماغ اصرار کر رہا تھا کہ وہ سحاب ہی ہے۔ آنکھوں نے اسے ڈپٹ دیا۔ یہ صفیہ ہے۔ وہ اس بچے کی طرح مایوس ہوا' جس سے اس کا من پسند کھلونا ممنوعہ کہہ کر چھین لیا گیا ہو۔ یہ بھی سحاب ہی ہے۔ نیم خوابیدہ ذہن نے دلیل دی۔ اسی طرح میرا خیال رکھتی ہے۔ ہر پریشانی' ہر زحمت سے بچاتی ہے۔

اس کا ہاتھ بڑھنے لگا۔ چادر اتارنے کی غرض سے۔

اندر کے آدمی کو موقع مل گیا "میں نے یہی کہا تھا۔" اس کا لہجہ فاتحانہ تھا "تم اس لڑکی سے ویسی ہی محبت کرتے ہو.... اپنی بیوی جیسی۔"

سوئے ہوئے ذہن پر وہ آواز کوڑے کی طرح برسی۔ وہ پوری طرح بیدار ہو گیا۔ ہر وہم مٹ گیا۔ ایک لمحے میں اسے اندازہ ہو گیا کہ اسے بے خبری میں چھاپ لیا گیا ہے اور وہ بدترین شکست سے دوچار ہونے والا ہے "اپنی کمزوری اور گھٹیا پن کا اعتراف میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔" مجیب بڑبڑایا "اور اس وقت وہ پوری طرح ثابت ہو گیا ہے۔ میں اسے روند ڈالنا چاہتا ہوں۔"

"تم نے اسے ہوس سے نہیں' محبت سے چھوا تھا۔" اندر کی آواز نے کہا۔

اس کے جواب میں مجیب کا جی چاہا کہ صفیہ کے جسم پر پڑی چادر کھینچے اور اپنی

بات عملاً ثابت کر دے لیکن اس وقت تک وہ پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ محض ایک بات ثابت کرنے کے لئے خود کو پستی میں گرا دینا ٹھیک نہیں۔

اس نے سر جھٹکا اور بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے وہ دروازہ کھول کر کمرے سے نکل آیا۔ عقبی باغیچے کی طرف کھلنے والا دروازہ کھولتے ہی پہلے تو سرد بھیگی ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا پھر پانی کی ٹھنڈی بوندیں۔ اسے اندازہ ہوا کہ اچھی خاصی پھوار پڑ رہی ہے۔ اسے ٹھنڈ لگنے لگی۔ باہر اندھیرا بھی تھا۔ آسمان سیاہ گھٹا سے بھرا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ معمولی پھوار پر ختم نہیں ہو گی۔ بارش ہو گی اور خوب ہو گی۔

باہر نکلنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ بیڈ روم میں واپس جانے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ وہ اسٹڈی میں چلا گیا۔ اپنی کرسی پر بیٹھ کر وہ اس الجھن پر سوچنے لگا۔

اس وقت کئی گتھیاں سلجھ گئی تھیں۔ پچھلے دو دن سے سحاب اسے بہت یاد آنے لگی تھی۔ اور اس نے سوچا تھا کہ اگر یہاں وہ گھر کے آرام سے محروم' تکلیفیں اٹھا رہا ہوتا تو سحاب کو یاد کرنا فطری تھا مگر اس صورت میں کہ یہاں اسے وہی گھر کا ماحول مل گیا ہے' سحاب کی یاد نہیں آنی چاہئے اور دوسری الجھن یہ کہ صفیہ کا شکر گزار ہونے کے بجائے وہ اس سے چڑنے کیوں لگا ہے۔

اب اس کی سمجھ میں آگیا کہ دونوں سوالوں کا ایک ہی جواب ہے اور وہ جواب یہ ہے کہ صفیہ' سحاب جیسی ہے۔

اس خیال نے جیسے ہی شعور کی زمین کو چھوا' اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ بجلی سی چمکی اور سب کچھ روشن ہو گیا۔ صفیہ' سحاب جیسی ہے.... اس خیال کی کئی جہتیں تھیں۔ اب اس کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ پہلے وہ نہیں سمجھا تھا تو صرف اس لئے کہ وہ سمجھنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

مگر اب سمجھ میں آ رہا تھا۔ صفیہ ہر اعتبار سے سحاب جیسی تھی۔ ظاہری طور پر بھی۔ اور باطنی طور پر بھی۔ ظاہری طور پر تو سب کچھ سامنے تھا۔ کم از کم اس کے معاملے میں۔ صفیہ کو کوئی ضرورت نہیں تھی کہ وہ اس کا خیال رکھے۔ کام کرنے کے لئے اچھا ماحول بنائے۔ صفیہ اسے ڈسٹرب نہیں کرتی تھی۔ چائے کی یا کسی چیز کی

ضرورت ہوتی تو بغیر کہے حاضر کر دیتی۔ اس کے کپڑے استری کر کے باتھ روم میں لٹکا دیتی۔ ضرورت کے وقت باتھ روم میں ہر چیز موجود رہتی پھر اس نے کھانے کی معاملے میں اسے بدمزہ ہوتے دیکھا تو کھانے کا شعبہ بھی خود ہی سنبھال لیا اور سحاب کی طرح وہ بھی بہت اچھا کھانا پکاتی تھی۔ بالکل سحاب کے اسٹائل میں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ کون زیادہ اچھا پکاتا ہے۔

پھر سحاب کی طرح صفیہ کی بھی پسند ناپسند اس سے ملتی جلتی تھی۔ صفیہ کو بھی بغیر بتائے معلوم ہو گیا تھا کہ کھانوں میں اسے کیا پسند ہے اور کیا ناپسند۔ کن باتوں سے وہ خوش ہوتا ہے اور کن باتوں سے چڑتا ہے اور وہ اس کا احترام کرتی تھی۔ وہ کام نہیں کرتی تھی' جو اسے ناپسند ہو۔ یہاں صفیہ کو سحاب پر فوقیت حاصل تھی۔ سحاب اس کی بیوی تھی۔ کامیاب ازدواجی زندگی کے لئے اس پر لازم تھا کہ ان باتوں کا خیال رکھے لیکن صفیہ کے لئے یہ ضروری نہیں تھا پھر بھی وہ خیال رکھتی تھی پھر سحاب کی طرح صفیہ اس کے بدلتے موڈ کے' اس کی چڑچڑاہٹ کے جبر کے خاموشی سے سہہ لیتی تھی۔ کبھی شکایت نہیں کرتی تھی۔ وہ بھی سحاب کی طرح سب کچھ دیئے جاتی تھی۔ کبھی کچھ طلب نہیں کرتی تھی۔

اور اندر سے بھی صفیہ' سحاب جیسی تھی۔ اس حقیقت سے نظریں تو چرائی جا سکتی تھیں۔ لیکن انکار ممکن نہیں تھا۔ سحاب کی طرح صفیہ کی باطنی شخصیت کی بنیاد بھی ایثار پر تھی۔ مجیب کو یاد تھا' جب وہ پہلی بار اس کے کوپے میں آئی' تو معذرت کرنے کے لئے آئی تھی کہ اس کے ساتھ نہیں جا سکے گی۔ وہ صرف یہ بتانے آئی تھی۔ اسے واپس جانا تھا۔ لیکن اس کی وجہ سے وہ واپس نہیں گئی اور اس نے صلے میں اس کے سوا کچھ نہیں چاہا کہ وہ اس کا احترام کریں' اس کی تحقیر اور تذلیل نہ کرے اور جس طرح وہ اداس اور پژمردہ ہوئی تھی' اس سے انداز ہوتا تھا کہ واپس نہ جانا اس کے لئے بہت بڑا نقصان رہا ہو گا۔ اگرچہ وہ اس کا اندازہ نہیں کر سکا۔ بس وہ اتنا سمجھ گیا تھا کہ اس نے اسی کے لئے ایثار کیا ہے۔

دوسرا وصف تھا خدمت گزاری۔۔۔۔ بے غرض خدمت گزاری۔ وہ لاکھ خود کو یقین دلائے کہ وہ آٹھ ہزار روپے ماہانہ ادا کر رہا ہے لیکن حقیقت وہ جانتا تھا کہ صفیہ کو

روپے پیسے سے دلچسپی نہیں۔ اس نے کتابوں کے لئے اس سے پیسے ضرور مانگے مگر اور کبھی کچھ نہیں مانگا اور اب ایک ماہ سے دس دن اوپر ہو گئے ہیں اور اس نے رقم کا مطالبہ بھی نہیں کیا۔ اسے تو شاید یہ خیال بھی نہیں اور اگر ایسا ہے بھی تو آٹھ ہزار روپے میں اس نے صرف صفیہ کا ساتھ خریدا ہے۔ تنہائی سے بچنے کے لئے۔ یہ ایثار اور خدمت گزاری تو اسے مفت مل رہی ہے۔ اس کا تو وہ صلہ دے ہی نہیں سکتا۔

صفیہ کا حال تو یہ تھا کہ وہ اس کا چڑچڑا پن اور اس کا توہین آمیز رویہ خندہ پیشانی سے برداشت کر رہی تھی۔ حالانکہ اسے چھوڑ کر جانے کے لئے آزاد تھی وہ اور اگر وہ جانے کا کہتی تو وہ اس کی خوشامد کر کے اسے روکتا۔

اب پچھلے روز ہی کی مثال لے لو۔ صفیہ وہاں شادی میں رک سکتی تھی۔ اسے اچھا بھی لگ رہا تھا لیکن وہ اس کی خاطر نہیں رکی۔ وہاں سے نکل آئی اور جب پنکچر ہوا' تب بھی اس کے لئے یہاں آنے کی نسبت واپس چلا جانا زیادہ آسان تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے تکلیف اٹھائی' کوفت سہی لیکن واپس آ کر رہی۔ مجیب کو یاد آیا کہ سحاب بھی اسے تنہائی سے بچانے کے لئے ایسا کرتی رہی ہے۔ وہ آدھی رات کو بھی واپس آ جاتی تھی۔

اور صفیہ کی اس غیر حاضری میں اس پر کیا گزری تھی۔ دن بھر وہ عضو معطل کی طرح رہا۔ کچھ بھی نہیں کر سکا۔ کچھ کرنا کیسا' وہ تو اچھی وقت گزاری بھی نہیں کر سکا اور شام کے بعد سے صفیہ کے آنے تک وہ خوف زدہ رہا۔ تو صفیہ تو اس سے اپنی ہر بات منوا سکتی ہے۔ وہ ماننے پر مجبور ہو گا مگر وہ خاموشی سے اس کا چڑچڑا پن برداشت کرتی ہے۔ اپنی توہین سہتی ہے۔

تو دونوں سوالوں کا جواب مل گیا۔ ہر آرام' آسائش اور خدمت کے باوجود وہ سحاب کو یاد کرتا رہا۔ اس لئے کہ اس کے سامنے سحاب جیسی صفیہ موجود تھی۔ اسے دیکھ کر' اس کا ایثار' اس کی خدمت گزاری' اس کا صبر و تحمل اور برداشت دیکھ کر سحاب یاد آتی تھی۔ اور جتنا وہ سحاب کو یاد کرتا تھا' اتنا ہی صفیہ سے چڑتا تھا۔ اس لئے کہ صفیہ سحاب جیسی ہونے کے باوجود سحاب نہیں تھی۔ اس لئے کہ صفیہ' سحاب کی طرح اس کی بیوی نہیں تھی۔ اس لئے کہ صفیہ' سحاب کی طرح اس سے محبت نہیں

کرتی تھی۔

تو پھر صفیہ' سحاب کی طرح کیوں میرا خیال رکھتی ہے۔ کیوں میری زیادتیاں برداشت کرتی ہے۔ یہ سوال ذہن کو چبھنے لگا۔ یہ تو طے ہو چکا ہے کہ وہ پیسے کے لئے ایسا نہیں کرتی۔ چند لمحے غور کرنے کے بعد مجیب نے اس سوال سے نظریں چرا لیں۔

وہ سوچوں کا رخ بدلنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہاں مری میں آنے کے بعد سے یہ اس کی فطرت ثانیہ بنتی جا رہی تھی۔ وہ نظریں چراتا تھا۔ مسائل کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھتا تھا۔ کچھ بھی ہو جائے۔ صفیہ' سحاب کی طرح نہیں ہو سکتی۔ کہاں سحاب' کہاں وہ۔ وہ تو بس ایک کال گرل ہے۔

وہ بے چین ہو کر اٹھا اور اسٹڈی سے نکل آیا۔ اس بار اس کا رخ ٹی وی لاؤنج کی طرف تھا۔ اس نے کھڑکی کے پردے سرکائے۔ باہر گھٹا کا وہی عالم تھا اور اب باقاعدہ بارش ہو رہی تھی۔ اس نے لائٹ آن کی اور کاؤچ پر دراز ہو گیا لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

وہ پھر سوچنے لگا۔ گزشتہ روز وہ تنہا بھی رہا اور ہر آرام' ہر آسائش سے دور بھی۔ اصولاً اسے سحاب کو بہت یاد کرنا چاہئے تھا لیکن اس نے ایک پل بھی اسے یاد نہیں کیا بلکہ وہ تو اسے یکسر بھولا رہا۔ اسے فون کرنے کا بھی خیال نہیں آیا اسے۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ صفیہ کو مس کر رہا تھا۔ نہیں۔۔۔۔ یہ تو غلط ہے۔ وہ ہرگز ایسا نہیں کر رہا تھا۔ بالکل ٹھیک۔ وہ اسے یاد کرنے سے بچنے کے لئے اس پر جھنجلا رہا تھا اور اس کا یہ رویہ مستقل ہے۔ وہ جھنجلاتا ہی رہتا ہے۔ کبھی محبت سے گھبرا کر اور کبھی یاد کرنے سے بچنے کے لئے۔ اس نے خود کو اچھا خاصا نفسیاتی مریض بنا لیا ہے۔

اب وہ اس بات پر بھی جھنجلا گیا۔ کیسی محبت' کیسی یاد۔ صفیہ کو دیکھ کر مجھے سحاب کی یاد آتی ہے اور مجھے تجسس ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا صفیہ جسمانی طور پر بھی سحاب کی طرح خوب صورت ہے۔ اس لئے میں اس کا سراپا دیکھنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ جس دن بھی یہ تجسس دور ہو گیا' میں مطمئن ہو جاؤں گا اور سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اب تو مجھے ایسی کسی طلب نے نہیں ستایا۔

مگر سوال یہ تھا کہ وہ صفیہ کو بے حجاب کیسے دیکھے۔ وہ تو بہت محتاط ہے۔ یہ

تجسس کیسے دور ہو گا۔

اسے علم نہیں تھا کہ اس کی بے خبری میں لاشعور منصوبہ بندی کرتا رہا ہے۔ کوٹھری میں چھپا بیٹھا وہ سازشی بہت عیار منصوبہ ساز تھا۔ اس نے چپکے سے ایک بنا بنایا منصوبہ شعور کی طرف بڑھا دیا۔ شعور اس کی نوک پلک درست کرنے اور جزئیات طے کرنے میں مصروف ہو گیا۔

پانچ منٹ بعد مجیب ہلکا پھلکا اور تر و تازہ ہو گیا۔ منصوبے پر اسی روز عمل کیا جا سکتا تھا۔ قسمت بھی ساتھ دے رہی ہے۔ اس نے باہر ہونے والی بارش کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ بس اسے وقت گزاری کرنی ہے۔

وہ اٹھا اور وڈیو کیبنٹ کی طرف چل دیا۔ کوئی اچھی سی فلم تلاش کرتے ہوئے اچانک اس کی نظر ایک طرف رکھی ہوئی پاکستانی فلموں کے کلیکشن پر پڑی۔ وہ ذائقہ بدلنے کے لئے اس طرف چلا گیا پھر اسے نیلا پربت کا کیسٹ نظر آ گیا۔ اس نے کیسٹ نکالا اور وی سی آر میں لگا کر ری وائنڈ کا بٹن دبا دیا۔

نیلا پربت زمانوں پہلے اس نے سینما میں دیکھی تھی۔ فلم یاد تو نہیں تھی لیکن یہ تاثر موجود تھا کہ وہ ایک غیر معمولی فلم تھی۔ بے حد بولڈ سبجیکٹ پر اور صرف بالغان کے لئے ریلیز کی گئی تھی۔

اس نے اسٹارٹ کا بٹن دبایا اور فلم میں کھو گیا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس وقت یہ فلم اس کی زندگی کا رخ ہی تبدیل کر دے گی۔

فلم کا موضوع جنس اور نفسیات تھا۔ اس کے کردار غیر معمولی تھے۔ ایک بے حد معزز قبائلی بوڑھا تھا' جو روایات کی پاس داری کرنے والا شخص تھا۔ اس کی بیوی مر چکی تھی۔ بیٹا جوان تھا۔ اس کی بھتیجی بیٹے سے منسوب تھی اور وہیں رہتی تھی۔ ان دونوں کے بے حجاب تعلقات فلم میں عمل انگیز کا کردار ادا کر رہے تھے۔ جنس کو دکھانے کے لئے حشرات الارض کو بہت خوبصورتی سے بطور علامت استعمال کیا گیا تھا۔ فلم دیکھتے ہوئے مجیب کو بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ فلم اس پر کیا تاثر مرتب کر رہی ہے۔

فلم میں ایک کردار کا اضافہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی نفسیاتی پیچیدگیاں شروع ہو گئیں۔ وہ ایک جوان اور خوب صورت لڑکی تھی' جو عزت دار بوڑھے قبائلی کے ایک

جگری دوست کی بیٹی تھی۔ اس دوست نے مرتے وقت بیٹی کو اس کے پاس بھیج دیا کہ اس کے بعد وہ بے سہارا رہ جائے گی۔ دوست اس کی نگہداشت کرے اور وقت آنے پر اس کی کہیں شادی کر کے حق دوستی ادا کرے گا۔

عزت دار قبائلی کے لئے روایت کے مطابق وہ لڑکی بیٹی کی طرح تھی اور دوست کی مقدس امانت تھی لیکن ہوا یہ کہ وہ اس لڑکی کی جسمانی کشش کے سامنے بے بس ہو گیا۔ جنسی طور پر وہ محروم تھا لیکن اہلیت سے محروم نہیں تھا۔ فطری تقاضے سر اٹھانے لگے۔

مگر شعور اس پیچیدگی سے بالکل بے خبر تھا۔ وہ ایک عزت دار قبائلی کا شعور تھا۔ روایتوں کی پاس داری کی سخت تربیت ہوئی تھی اس کی۔ وہ لڑکی اس کے لئے سگی بیٹی کی طرح تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ نفس کی طلب ایسے بنے ہوئے رشتوں کو خاطر میں نہیں لاتی پھر بھی اس کے شعور میں اس خیال کا گزر بھی ناممکن تھا۔ مر جانے کے مترادف تھا۔ اس لئے یہ سب کچھ لاشعور میں پلتا رہا۔ بیٹے اور اس کی منسوبہ کی جنسی و جسمانی بے تکلفی عمل انگیزی کا کام کرتی رہی۔ اس کی شہوانیت کو مہمیز کرتی' اکساتی رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لاشعور اپنی گنجائش سے زیادہ بھر گیا۔ طاقت ور ہو گیا اور اظہار پر مجبور بھی ہو گیا۔

شعور کے جاگتے ہوئے لاشعور کچھ بھی نہیں کر سکتا لیکن شعور کے سوتے ہی وہ وجود کی پوری ملکیت پر شب خون مار سکتا ہے.... قبضہ کر سکتا ہے۔ سو یہی ہونے لگا۔ لاشعور سوتے میں اسے اٹھاتا اور سفلہ خواہشوں سے لاد کر لڑکی کی خواب گاہ میں لے جاتا مگر جیسے ہی لڑکی کو چھونے کی کوشش کرتا' شعور بیدار ہو جاتا۔ عزت دار قبائلی شرمسار ہوتا اور اس بات پر شکر ادا کرتا کہ لڑکی نہیں جاگی ہے۔ اسے کچھ معلوم نہیں۔

پھر لڑکی کو بھی احساس ہو گیا۔ معلوم ہو گیا۔ ادھر لاشعور سے جنسی خواہش شعور میں آ گئی۔ وہ بہت پاور فل کلائی میکس تھا۔

فلم ختم ہوئی تو مجیب سن بیٹھا تھا۔ وہ اسٹاپ کا بٹن دبانا بھی بھول گیا مگر اب بھی اسے اندازہ نہیں تھا کہ فلم نے اسے کتنا زیادہ موو کیا ہے۔

ذرا دیر بعد وہ اٹھا۔ کیسٹ نکالا اور کیبنٹ میں رکھا۔ لائٹ آف کر کے وہ باہر آیا تو ساڑھے چھ بجے تھے۔ صفیہ کو اٹھ جانا چاہئے تھا۔ اس وقت تو وہ کچن میں ہوتی تھی۔ لیکن شاید گزشتہ روز کی تھکن اور کوفت نے اسے زیادہ سونے پر مجبور کر دیا تھا۔

مجیب نے عقبی دروازہ کھول کر دیکھا۔ بارش رک چکی تھی لیکن گھٹا کے تیور اور بگڑے ہوئے تھے۔ گویا صورت حال اس کے حق میں تھی۔

وہ بیڈ روم میں گیا تو صفیہ بیڈ پر نہیں تھی۔ بند دروازے سے اندازہ ہوا کہ وہ باتھ روم میں نہیں۔ مجیب چہل قدمی کے ارادے سے باہر نکل آیا۔

ناشتا کرتے ہوئے مجیب نے صفیہ سے کہا "ناشتے کے بعد تیار ہو جاؤ۔"

مغورہ کی آنکھیں چمکنے لگیں "کہیں چلنا ہے؟"

"ہاں۔ سوچ رہا ہوں کہ تمہارا بینک اکاؤنٹ کھلوا دوں پھر تمہاری رقم منتقل کر دوں گا۔ جب جی چاہے' نکال سکو گی۔"

رقم کے حوالے پر مغورہ کی رنگت متغیر ہو گئی لیکن اگلے ہی لمحے چمک پھر لوٹ آئی۔ اس کے لئے یہ تصور ہی خوش کن تھا کہ وہ مجیب کے ساتھ کہیں جا رہی ہے۔



صفورہ کو دیکھ کر مجیب نے سکون کی سانس لی۔ سب کچھ توقع کے عین مطابق ہو رہا تھا۔ صفورہ نے کوئی گرم کپڑا نہیں پہنا تھا۔ اس نے بس کپڑے بدلے تھے اور چادر میں خود کو لپیٹ لیا تھا۔ خود مجیب نے چمڑے کی جیکٹ ہاتھ میں رکھی تھی۔ ابھی پہننے کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ کیونکہ دھوپ نکل آئی تھی۔ البتہ دور دور اب بھی سیاہ گھٹا نظر آ رہی تھی۔ اس کے باوجود اسے ڈر تھا کہ گھٹا ارادہ بدل لے گی اور سب کچھ دھرا رہ جائے گا۔

وہ گیٹ کی طرف چلے تو صفورہ نے حیرت سے کہا "گاڑی میں نہیں چلیں گے۔"
"ارے نہیں۔ اسی بہانے سیر بھی ہو جائے گی۔ زیادہ فاصلہ تھوڑا ہی ہے۔" پھر مجیب نے چونک کر اسے دیکھا "تم تھک تو نہیں جاؤ گی۔"
"مجھے تو پیدل چلنا اچھا لگتا ہے۔" صفورہ نے کہا۔ وہ جملے میں.... آپ کے ساتھ.... بھی لگانا چاہتی تھی لیکن مجیب کا موڈ خراب کرنے کا رسک وہ نہیں لے سکتی تھی۔

وہ سکون سے سڑک پر چلتے رہے "یہاں پیدل چلنے میں لطف بھی بہت آتا ہے۔" مجیب بولا "واپسی میں ایڈونچر کریں گے۔ سڑک پر چلنے کے بجائے پہاڑی راستوں سے آئیں گے۔ تب دیکھنا۔"

بینک میں صفورہ کا اکاؤنٹ کھلوانے میں دیر لگی۔ اس کا لحاظ نہ ہوتا تو شاید اکاؤنٹ کھل ہی نہ پاتا۔ شناختی کارڈ کا مسئلہ سامنے آیا۔ وہ صفورہ کے پاس تھا ہی نہیں۔ بہرکیف اکاؤنٹ کھلا اور چیک بک ملی تو گیارہ بج چکے تھے۔
"اب جلدی سے گھر چلیں۔" بینک سے نکل کر صفورہ نے کہا۔
مجیب نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ دھوپ غائب ہو چکی تھی اور گھٹائیں جمع ہو رہی تھیں، جیسے آغاز جنگ سے پہلے کوئی فوج۔ خنکی بھی ہو گئی تھی۔ مجیب نے اطمینان

کی گہری سانس لی اور بے پرواہی سے بولا "جلدی کیا ہے؟"
"کھانا بھی پکانا ہے۔"
"آج باہر ہی کھا لیں گے۔" مجیب بدستور بے پرواہی کے موڈ میں تھا۔ صفورہ نے چونک کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وضاحت کی "آج تمہیں مری ہی دکھا دوں لیکن پہلے کافی پی لی جائے۔"
ایک ریسٹورنٹ میں انہوں نے کافی پی۔ باہر نکلے تو گھٹا اور گہری ہو چکی تھی۔ جناح روڈ پر بادلوں کے پرے کے پرے۔ اتر آئے تھے "کتنا خوب صورت لگ رہا ہے۔" صفورہ نے مسحور لہجے میں کہا پھر بچوں کی طرح پوچھا "یہ سچ مچ کے بادل ہیں نا؟"
"تو اور کیا۔" مجیب نے کہا پھر بولا "موسم کتنا خوبصورت ہے.... بھیگنے کا۔ چلو گھومتے ہیں۔"
ان لمحوں میں صفورہ بہت خوش تھی۔ اس کا پسندیدہ موسم تھا۔ ساتھی بھی پسندیدہ تھا۔ اور مقام بھی خوب صورت۔ ایسے خوب صورت لمحے تو حاصل زندگی ہوتے ہیں۔
مگر مری میں کوئی بہت زیادہ تو نہیں گھوم سکتا۔ گھومنے کو وہاں ہے ہی کیا۔ انہوں نے ادھر ادھر ایک چکر لگایا پھر مجیب صفورہ کو جناح پارک میں لے آیا۔ وہاں وہ بیٹھ گئے۔ صفورہ ادھر ادھر دیکھتی رہی پھر اس نے کہا "اس پارک سے زیادہ سرسبز تو باہر کے عام راستے ہیں۔"
مجیب ہنسنے لگا "یہ پارک یہ ثابت کرنے کے لئے بنایا گیا ہے کہ یہاں پارک کی ضرورت نہیں۔"
ایک بجے انہوں نے کھانا کھایا۔ باہر آئے تو گھٹا پھر بغیر برسے پسپا ہو چکی تھی۔ کہیں کہیں ہلکی ہلکی دھوپ بھی نظر آ رہی تھی۔ اب اور رکنے کا جواز بھی نہیں تھا۔ اسے مایوسی ہونے لگی۔ اب تو واپس جانا ہی تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید آبشار سے کچھ مدد مل جائے۔
آتے ہوئے وہ راستوں کو سمجھنے اور سمتوں کے متعلق اندازے لگانے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ چنانچہ ایک مقام پر وہ سڑک سے اترا اور صفورہ کو ساتھ لئے ایک پہاڑی

پگڈنڈی سے اترنے لگا۔ اسے یقین تھا کہ اس پر چل کر وہ آبشار والی وادی میں پہنچ جائیں گے۔

پہاڑی راستوں پر اترتے ہوئے پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہم کتنے نیچے آ گئے ہیں۔ دس منٹ بعد انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا تو لگا کہ پاتال میں پہنچ چکے ہیں۔ اب جا بجا درختوں کے جھنڈ تھے۔ وہ مقام تو نظر ہی نہیں آ رہا تھا' جہاں وہ سڑک چھوڑ کر اترے تھے۔

ذرا دیر بعد وہ ایک وادی میں پہنچ گئے۔ وہاں زمین ہموار اور مسطح تھی۔ وادی کے اطراف میں بلند و بالا پہاڑ تھے۔ پیچھے وہ راستہ تھا' جس سے وہ یہاں تک پہنچے تھے اور سامنے کچھ بھی نہیں تھا سوائے اس وادی کے۔ ہاں دور.... بہت دور درختوں کا ایک بہت بڑا جھنڈ نظر آ رہا تھا۔

اب تو مجیب کو شبہ ہونے لگا کہ وہ بھٹک گیا ہے۔ اسے سمتوں کا احساس بھی نہیں رہا تھا لیکن ان کے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہ تھا کہ سامنے کے.... اس جھنڈ کی طرف بڑھتے رہیں۔ صفورہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اسے کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔

اچانک ان پر ایک افتاد آ پڑی۔ بغیر کسی تنبیہی اشارے کے یک لخت موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بارش اتنی تیز تھی کہ لگتا تھا' آسمان پھٹ پڑا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ پانی بہت سرد تھا۔ چند سیکنڈ میں ہی صفورہ کو تھرتھری چڑھ گئی۔ اس کے جسم پر تو چادر کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔ مجیب تو جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔

"بھاگو۔" مجیب نے صفورہ کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ وہ جھنڈ کی طرف بھاگنے لگے' جو اب بھی کافی دور تھا۔

چند منٹ تو ایسے تھے کہ ان میں کسی کو خیال' کسی احساس کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اچانک افتاد آدمی کو ایسے ہی سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں چھوڑتی مگر بھاگتے بھاگتے اچانک مجیب کو احساس ہوا کہ صفیہ کا ہاتھ برف کی طرح سرد ہو رہا ہے۔ کوئی بات ذہن تک پہنچی لیکن سمجھ میں نہیں آئی پھر بھی وہ بھاگتے بھاگتے رک گیا۔ صفورہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اسے جھٹکا لگا اور وہ اس سے ٹکرائی "کک.... کیا.... ہو.... ہو.... ہوا؟" صفورہ نے پوچھا۔

مجیب نے غور سے اسے دیکھا۔ اس کے دانت بھی بج رہے تھے۔ اس لمحے اسے

یاد آیا کہ یہ بارش بھی اس کے سازشی منصوبے کا ایک حصہ تھی مگر یہ ہوئی تو اس نے سب کچھ بھلا دیا۔ کیا اس لئے کہ بنیادی طور پر وہ سازشی آدمی نہیں ہے۔

اس نے اس خیال کو ذہن سے جھٹکا۔ یہ سب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ صفورہ کی حالت بہت خراب تھی۔ اس کے دانت بج رہے تھے اور یہ سب اس کی.... اس کی خراب سوچ اور گندی سازش کی وجہ سے ہوا تھا۔ اس نے صرف ایک سرسری نظر صفورہ کی بھیگی ہوئی چادر پر ڈالی اور تیزی سے فیصلہ کر لیا۔ اس نے صفورہ کا ہاتھ چھوڑا اور جلدی سے اپنی جیکٹ اتار کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے منہ پھیر لیا "لو صفیہ.... بھیگی ہوئی چادر اتار دو اور یہ جیکٹ پہن لو۔"

"لیکن آپ...."

"بحث مت کرو۔ فوراً پہن لو۔" اس نے نہایت درشت لہجے میں کہا۔

صفورہ ہچکچائی لیکن اس نے جیکٹ پہن لی "مگر آپ بھیگ جائیں گے۔ بہت تیز اور ٹھنڈ کی بارش ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ بس اب دوڑو۔ جلد از جلد جھنڈ تک پہنچنا ہے ہمیں۔"

لیکن چند ہی منٹ میں اس کا اپنا بھی وہی حال ہو گیا۔ دانت بج رہے تھے۔ جسم جیسے سن ہو گیا تھا اور وہ کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں تھا۔ ذہن میں بس ایک ہی خیال تھا۔ درختوں کا وہ جھنڈ ہی ان کے لئے عافیت کدہ ہے۔

پتہ نہیں کتنی دیر میں وہ اس جھنڈ تک پہنچے۔ وہ یقیناً چند منٹ رہے ہوں گے لیکن مجیب کو وہ میلوں پر محیط فاصلہ لگا' جو شاید اس نے کئی گھنٹوں میں طے کیا تھا۔

جھنڈ کے اندر اندھیرا تھا۔ پانی وہاں بھی برس رہا تھا لیکن کچھ جگہیں بالکل خشک تھیں۔ وہ ایسی ہی ایک جگہ کھڑے ہو گئے۔ "اب آپ جیکٹ لے لیں۔" صفورہ نے کہا۔

"اس کی ضرورت نہیں۔" مجیب نے اس سے نظر ملائے بغیر جواب دیا۔

سردی اب بھی لگ رہی تھی مگر سرد پانی کی بوچھاڑ کے مقابلے میں وہ بہت بڑی امان میں تھے۔ ذرا سکون ملا تو اوسان ٹھکانے آئے پھر انہوں نے ایک ساتھ ہی پانی کی وہ آوازیں سنیں۔ وہ کئی اور مختلف آوازیں تھیں۔ ایک پرشور انداز میں بہنے کی آواز

اور دوسری بلندی سے پانی گرنے کی آواز۔ آواز سامنے کی سمت سے آ رہی تھی۔ انہیں تجسس بھی ہوا اور خوف بھی۔

وہ جاننے کے لئے آگے بڑھے اور جھنڈ کے اختتام تک پہنچے۔ وہاں جو کچھ نظر آیا' اسے دیکھ کر مجیب نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ آبشار والی وادی ہی تھی۔ سامنے آبشار اور تالاب نظر آ رہا تھا۔ تالاب سے نکلنے والا پانی بارش کی وجہ سے بہت زیادہ بڑھ گیا تھا اور نہایت پرشور انداز میں بہہ رہا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ نالا مخالف سمت میں جا رہا تھا۔

سردی کے احساس نے مجیب کو سوچنے ہی نہیں دیا تھا ورنہ اگر وہ ایسے میں اس امکان کے بارے میں سوچتا کہ وہ راستہ بھٹک گئے ہیں تو کس قدر خوف زدہ ہوتا۔ کیونکہ اس صورت میں تو ان کے بنگلے تک پہنچنے کی کوئی ضمانت ہی نہ ہوتی مگر اب یہ اطمینان تھا کہ وہ بنگلے کے بہت قریب ہیں۔

انہیں اس جھنڈ میں بہت دیر ہو گئی لیکن بارش تھمنا تو دور کی بات ہے' اس کا زور تک نہیں ٹوٹا۔ مجیب نے گھڑی دیکھی۔ پانچ بج چکے تھے۔ بارش اگلے روز تک بھی یونہی ہوتی رہی تو کیا ہو گا۔ اس پر ہول چڑھنے لگا۔ وہ رات کا انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے پاس ٹارچ بھی نہیں تھی۔ اوپر بنگلے تک جانے والا راستہ بارش میں اور خطرناک ہو گیا ہو گا۔ اندھیرا ہو جانے کی صورت میں وہ اوپر جا ہی نہیں سکتے تھے۔ اوپر والے جھنڈ سے نیچے تک پگڈنڈی جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھی اور عمودی چٹانوں پر چڑھنا ہوتا تھا۔ اب بارش میں تو اوپر سے پانی بھی پورے زور کے ساتھ پگڈنڈی پر بہتا آ رہا تھا۔

صفیہ سے بات کر کے اسے پریشان کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مجیب نے فیصلہ کیا کہ اب صرف آدھا گھنٹا بارش رکنے کا انتظار کیا جا سکتا ہے۔ بارش نہیں رکی تو بھی ساڑھے پانچ بجے وہ چل دیں گے۔ اندھیرا ہونے..... رات پڑ جانے سے پہلے ہی بنگلے تک پہنچنے میں عافیت ہے۔

کپڑے اب بھی بھیگے ہوئے تھے۔ ان کے سوکھنے کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ سردی اب بھی لگ رہی تھی۔ البتہ دانت بجنے میں کچھ کمی ہو گئی تھی۔

مجیب کبھی گھڑی دیکھتا اور کبھی باہر بارش کا جائزہ لیتا۔ بارش میں انیس بیس کا فرق بھی نہیں پڑا تھا۔ ساڑھے پانچ بجتے ہی اس نے صفورہ سے کہا "صفیہ' اب ہم بارش رکنے کا اور انتظار نہیں کر سکتے۔ ہمیں اسی حال میں چلنا ہو گا۔"

صفورہ نے اسے پرتشویش نظروں سے دیکھا۔ وہ اس کی طرف سے پریشان تھی لیکن سمجھ رہی تھی کہ مجیب ٹھیک کہہ رہا ہے۔

باہر نکلتے ہی بارش سرد کوڑے کی طرح برستی ملی۔ مجیب کو کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔ اتنی دیر جھنڈ کی پناہ میں رہنے کے بعد یہ تو ہونا ہی تھا بلکہ اسے تو لگ رہا تھا کہ بارش اور تیز ہو گئی ہے۔

اب کی بار انہیں آبشار کو دیکھنے کا خیال بھی نہیں آیا۔ سامنے ایک دشواری جو تھی۔ دونوں جانتے تھے کہ اس بارش میں اوپر بنگلے تک پہنچنا کارے دارد ہے۔ کاش وہ نیچے نہ اترے ہوتے۔ مجیب نے سوچا مگر سب اس کا اپنا کیا دھرا تھا اور نیت کتنی خراب تھی اس کی۔ یہ الگ بات کہ وقت آیا تو وہ اپنے مذموم ارادے کو بھی بھول گیا۔ یہ تو بس رب کی عنایت ہی تھی۔

اوپر جانے والی پگڈنڈی پر چڑھنا اس وقت بہت مشکل کام تھا۔ اوپر سے آنے والے بارش کے پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا۔ راستے پر پھسلن بھی بہت ہو گئی تھی۔ یہ غنیمت تھا کہ وہ پھسلے نہیں۔ اس مشکل مرحلے نے مجیب کو بارش کی بوچھاڑ سے بھی بے نیاز کر دیا جو جسم پر ہنٹر برسا رہی تھی۔

وہ ذرا سا اوپر چڑھے تھے کہ اور مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ پہلا پہاڑی کٹاؤ سامنے آیا۔ بارش اور اوپر سے آنے والے پانی کے بہاؤ نے اسے اور دشوار کر دیا تھا۔ مجیب تین چار بار پھسلا۔ اس کی کہنی اور گھٹنے چھل گئے لیکن تکلیف کا احساس نہیں ہوا۔ جسم بھی سرد ہو رہا تھا۔ اوپر سے سرد بارش نے اسے اور سن کر دیا تھا۔ جیسے تیسے اوپر چڑھ کر اس نے ہاتھ بڑھایا اور صفورہ کو اوپر کھینچ لیا۔ اسے اس پر بہت ترس آ رہا تھا۔ کیا دھرا اس کا تھا اور سزا میں وہ بھی شامل تھی۔

تھوڑا سا چلے تو دوسرا کٹاؤ سامنے آ گیا۔ یہاں بھی دو بار اس کا پاؤں پھسلا۔ خراشوں کا اضافہ بھی ہوا۔

ان کے چڑھنے کی رفتار بہت سست تھی۔ ستراسی فٹ کا دشوار راستہ پورا نہیں ہوا تھا کہ رات کا اندھیرا پھیلتا محسوس ہوا۔ روشنی تو خیر اس سے پہلے بھی میسر نہیں تھی۔ لیکن اب جو اندھیرا ہو رہا تھا' وہ خوف زدہ کر دینے والا تھا پھر بھی شکر کی بات یہ تھی کہ انہوں نے بیشتر فاصلہ طے کر لیا تھا۔ پہاڑی کٹاؤ اب شاید صرف ایک رہ گیا تھا۔ اس کے بعد سیدھی سادی پگڈنڈی تھی۔ مجیب کے لئے حوصلہ افزا بات یہ تھی کہ اس نے صفیہ کے خراش بھی نہیں لگنے دی تھی۔ وہ اپنی بدنیتی کی تلافی کر رہا تھا۔

آخری کٹاؤ زیادہ ہی پریشان کن ثابت ہوا۔ ایک کٹاؤ بڑا تھا۔ دوسرے اندھیرے نے اسے اور دشوار بنا دیا تھا۔ بڑی دشواری سے مجیب چڑھا مگر صفورہ کو اوپر کھینچتے ہوئے اس کا پاؤں پھسلا اور وہ نیچے جا گرا۔ خوش قسمتی سے اس بار بھی صفورہ چوٹ سے محفوظ رہی۔

ان چوٹوں نے مجیب کو اور نڈھال کر دیا۔ تیز سرد بارش سہنے والے جسم کو چوٹوں نے اور مضمحل کر دیا تھا۔ اس کے جسم کا بند بند دکھ رہا تھا اور پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔

بالآخر وہ اس آخری کٹاؤ پر بھی چڑھ گئے۔ اب فاصلہ کم بھی رہ گیا تھا اور آسان بھی تھا لیکن مجیب تھکن اور اذیت سے چور ہو چکا تھا۔ اب اس کے لئے قدم اٹھانا بھی دوبھر تھا۔ وہ۔۔۔ لڑکھڑا رہا تھا۔ صفورہ نے اس بات کو محسوس کر کے اسے سہارا دیا۔ اس نے اسے جھٹکا بھی نہیں بلکہ اپنی شکرگزاری پر اسے حیرت ہوئی۔

درختوں کے جھنڈ میں پہنچ کر اسے اطمینان ہوا۔ یہ بڑی بات تھی کہ وہ جس حال میں بھی سہی' اوپر پہنچ گئے تھے۔ اندھیرا اب پوری طرح ہو چکا تھا۔ شام کو رات کے سامنے سپر ڈالے دیر ہو چکی تھی۔ اوپر روشنیاں نظر آئیں تو انہوں نے سکون کی سانس لی۔

اوپر عقبی باغیچے میں حسب معمول روشنی تھی۔ بنگلے میں انہیں ملازموں کے پریشان چہرے دکھائی دیئے "صاب جی۔۔۔ کہاں چلے گئے تھے آپ لوگ۔ آپ ٹھیک ہیں؟"

"سب ٹھیک ہے۔" مجیب نے بمشکل کہا۔

بیڈ روم میں پہنچتے ہی صفورہ نے شب خوابی کا لباس نکال کر مجیب کی طرف بڑھایا۔ پھر تولیا باتھ روم میں لٹکایا "تولیئے سے جسم اور سر اچھی طرح خشک کر کے کپڑے بدل لیں۔" اس نے کہا۔

مجیب نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ لہجہ ہی نہیں' الفاظ بھی سحاب کے تھے۔ ایسے ایک موقع پر اس نے بالکل اسی لہجے میں لفظ بہ لفظ یہی کچھ کہا تھا "اور تم۔۔۔؟"

"میں بھی بدل رہی ہوں۔۔۔ دوسرے باتھ روم میں۔"

مجیب باتھ روم سے کپڑے بدل کر نکلا اور بے جان سے انداز میں بیڈ پر گر گیا۔ صفورہ کپڑے بدل کر کچن میں چلی گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ دودھ کا گلاس لے کر کمرے میں آئی۔ گلاس کو سائڈ ٹیبل پر رکھ کر اس نے مجیب کو ہلایا "سنئے۔۔۔ ذرا اٹھئے۔"

مجیب نے جیسے سنا ہی نہیں۔

صفورہ نے اسے ہاتھ لگایا تو پتہ چلا کہ اس کا جسم پھنک رہا ہے۔ اس نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ مجیب دھیمی آواز میں بڑبڑا رہا ہے۔ اس نے جھک کر سننے کی کوشش کی مگر وہ بے معنی' بے ربط باتیں تھیں۔ بخار بہت شدید تھا اور اس کی کیفیت بحرانی تھی۔

اس نے سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر مجیب کو اٹھایا۔ اس کی آنکھیں کھلیں "کیا بات ہے؟" وہ بڑبڑایا۔

"میں ڈاکٹر کو بلواتی ہوں مگر پہلے یہ دودھ پی لیں۔ میں نے ہلدی ملائی ہے اس میں۔ جسم کی دکھن کم ہو جائے گی۔"

مجیب کو دودھ پلا کر لٹانے کے بعد اس نے اس پر کئی کمبل ڈالے۔ اس کے جسم میں تھرتھری تھی اور دانت بج رہے تھے۔ اس نے جا کر شکور سے کہا "افضل خان کو ساتھ لے کر جاؤ اور ڈاکٹر کو لے کر آؤ۔ صاب جی کی طبیعت بہت خراب ہے۔"



صفورہ نے مجیب کی پیشانی کو چھو کر دیکھا۔ وہ اب بھی بخار سے پھنک رہا تھا۔ ڈاکٹر کو گئے تین گھنٹے ہو چکے تھے مگر مجیب کی کیفیت اب بھی سرسامی تھی۔ وہ مسلسل

ہذیان بکتا رہا تھا۔ ڈاکٹر نے اطمینان دلایا تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ یہ ایک معجزہ ہی تھا کہ نمونیہ نہیں ہوا لیکن بخار کو ایک دم اتارنا ٹھیک نہیں۔ یہ خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ وہ دوائی بھی دے گیا تھا اور چوٹوں پر لگانے کے لئے دوا بھی۔ دوا کی ایک خوراک صفورہ نے فوراً ہی دے دی تھی۔ چوٹوں پر بھی دوا لگا دی تھی۔ اب وہ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق مجیب کی پیشانی پر سادہ پانی کی پٹیاں بدل بدل کر رکھ رہی تھی مگر بخار اب بھی بہت تیز تھا۔

"ہر چیز اپنے مقام پر ہی اچھی لگتی ہے۔" مجیب بڑبڑا رہا تھا۔ "کوئی چیز اپنے مقام سے ہٹی ہوئی نظر آئے تو اسے اس کے مقام پر پہنچا دو....."

صفورہ سوچ میں پڑ گئی کہ یہ کس چیز کی بات ہو رہی ہے..... سرسام کسی پاگل پن کا نام نہیں۔ اس میں آدمی جو کچھ بولتا ہے' کم از کم اس کی حد تک وہ سچ بھی ہوتا ہے اور اہم بھی۔ خواہ دبا ہوا ہو۔

"تم میرے پاس آؤ نا۔ میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔" مجیب کی بڑبڑاہٹ جاری تھی "میں ترس رہا ہوں تمہیں دیکھنے کو اور تم کتنا ہی چھپالو خود کو۔ اگر میں نے ارادہ کر لیا تو تمہیں دیکھ کر ہی رہوں گا۔"

صفورہ اس کا سرسام سنتے ہوئے پٹیاں بدل کر رکھتی رہی۔ ابھی تک اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ اس کی باتیں بے ربط بھی تھیں اور مبہم بھی۔

اچانک مجیب نے آنکھیں کھولیں اور ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے چلایا "وہ..... وہ دیکھو' کتنی بڑی چھپکلی ہے اور وہ سانپ..... وہ اژدھا..... وہ گرگٹ دیکھو۔ وہ سانڈا بھی ہے۔ کتنے مکروہ ہیں یہ سب....."

"کہیں کچھ بھی نہیں۔ وہم ہے آپ کا۔" صفورہ نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

"نہیں۔ وہ سب سچ مچ موجود ہیں۔" مجیب کا لہجہ تند تھا۔

صفورہ سمجھ گئی کہ اسے بچے کی طرح بہلانا ہو گا "آپ آیۃ الکرسی پڑھ کر پھونک دیں۔ سب غائب ہو جائیں گے۔"

"ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔" مجیب نے کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

بارہ بجے کے بعد صفورہ کو محسوس ہوا کہ مجیب کے بخار میں کچھ کمی ہوئی ہے۔ اس نے پٹیاں بدل کر رکھنے کا عمل جاری رکھا۔ پانی بار بار گرم ہو جاتا تھا۔ صرف پٹیوں کی گرمی سے..... اور وہ جا کر دوبارہ تازہ پانی لے آتی تھی۔ بخار میں بتدریج کمی ہوتی رہی۔ سوا دو بجے اس نے ٹمپریچر لیا تو بخار 100 اور 99 کے درمیان تھا۔

اتنی دیر میں پہلی بار اس نے سکون کی سانس لی اور مجیب کے بارے میں ذرا بے فکری ہوئی تو اپنے بارے میں بھی اندازہ ہونا شروع ہوا۔ اس کا اپنا بھی بہت برا حال تھا لیکن مجیب کی پریشانی نے اپنے بارے میں سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ اب ذرا پرسکون ہوئی تو اسے لگا کہ وہ بکھر جائے گی۔ اس کے باوجود اس نے خود کو سنبھالے رکھا۔ پٹیاں رکھنے کا سلسلہ اس نے موقوف کر دیا اور نیم دراز ہو کر اس کا سر سہلانے لگی۔

ان لمحوں میں اس نے مجیب کے چہرے کو دیکھا تو اس پر بڑی محبت آئی۔ وہ اس کی احسان مند تھی۔ مجیب کا جو حال بھی ہوا تھا' اس کی ہی وجہ سے ہوا تھا۔ حماقت اس کی تھی اور سزا مجیب نے بھگتی تھی۔ اس نے خیال نہیں کیا کہ بارش کا امکان بھی ہے۔ اس نے جاتے وقت کوئی گرم کپڑا بھی نہیں لیا۔ مجیب کے کندھے پر جیکٹ دیکھ کر بھی اسے خیال نہیں آیا۔ اس کے نتیجے میں تیز بارش میں مجیب کو اپنی جیکٹ اسے دینا پڑی اور وہ خود بھیگتا رہا پھر دشوار راستے پر مجیب بار بار پھسلتا رہا۔ اس نے چوٹیں کھائیں۔ لیکن ہر بار اس نے اسے بحفاظت اوپر چڑھا لیا ورنہ اتنا بھیگنے اور اتنی چوٹیں کھانے کے بعد اس کا حال مجیب سے کہیں زیادہ ابتر ہوتا۔ اسے تو شاید نمونیہ ہی ہو جاتا۔

وہ مجیب کو محبت بھری نظروں سے تکتی اور اس کا سر سہلاتی رہی۔ تھکا ہوا نڈھال جسم فریادیں کرتا رہا۔ نجانے کب وہ نیم دراز پوزیشن سے پھسل کر پوری طرح دراز ہو گئی اور دھیرے دھیرے اپنے آپ سے بھی بے خبر ہو گئی۔ سر سہلانے والا ہاتھ سر پر ٹھہر کر رہ گیا۔

وہ سو چکی تھی!

عجیب محسوس کر رہا تھا کہ اس کا وجود ایک غبارے کی طرح ہلکا پھلکا ہو گیا ہے۔ ایک ایسا غبارہ جس میں بے حد گرم ہوا بھری ہوئی ہے۔ وہ ٹھہرا ہوا نہیں تھا بلکہ ایک بہت بڑے خلا میں تیرتا پھر رہا تھا۔ عجیب بے وزنی کی سی کیفیت تھی اس کی۔ دوسری طرف ذہن سوچوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ بہت ہی مختلف اور متنوع سوچیں تھیں۔ وہ انہیں شناخت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ان میں فرق بھی نہیں کر سکتا تھا اور وہ اس کے تعاقب میں بھی نہیں تھیں۔ لطف یہ کہ اسے پتہ بھی نہیں چل رہا تھا کہ کس لمحے وہ کیا سوچ رہا ہے۔ بس اسے اتنا معلوم تھا کہ اس کی سوچیں بہت تیزی سے بدل رہی ہیں۔ ان لمحوں میں صرف بصارت تھی' جو اس کا ساتھ دے رہی تھی۔ وہ فلم کے شاٹس جیسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھے' جو تیزی سے اس کی نظروں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ کبھی کوئی ٹکڑا سمجھ میں آ جاتا تھا مگر بیشتر بغیر سمجھ میں آئے گزر کر اوجھل ہو جاتے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی آنکھیں بند ہیں۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ آنکھیں کھولنے پر بھی اسے وہی کچھ نظر آتا تھا' جو بند آنکھوں سے نظر آ رہا تھا۔

اسے یہ احساس بھی نہیں تھا کہ وہ مسلسل بولے جا رہا ہے۔

اس نے ہر طرح کے حشرات الارض دیکھے۔ اہم بات یہ تھی کہ وہ جسامت کے اعتبار سے نارمل نہیں تھے۔ وہ بہت بڑے' بے حد جسیم تھے۔ انہیں دیکھ کر کراہت احساس بھی ہوتا تھا اور خوف بھی آتا تھا مگر وہ کچھ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ آنکھیں بند ہوں یا کھلی' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ اس کیفیت میں کتنا وقت گزر گیا ہے۔ ہاں یہ احساس تھا کہ وہ عرصہ بہت طویل ہے..... مہینوں..... بلکہ شاید برسوں پر محیط اور اس کیفیت ختم کرنا..... اس سے نکلنا اس کے اختیار میں نہیں ہے۔

پھر اچانک مگر بتدریج ایک کیمیاوی تبدیلی رونما ہوئی۔ وجود کے غبارے سے گرم ہوا تھوڑی تھوڑی کر کے نکلنے لگی۔ وہ جیسے نیچے آنے لگا۔ سوچیں اس کے ذہن کی گرفت میں آنے لگیں لیکن صرف پل دو پل کے لئے پھر وہ ذہن کی گرفت سے پھسل جاتیں اور وہ کسی سوچ' کسی بات پر ذہن مرکوز کرنے کے قابل نہیں تھا۔

اچانک سحاب اس کے سامنے آ گئی "یہ کیا حال بنا لیا ہے تم نے۔" وہ محا

بھرے لہجے میں بولی پھر اس نے بانہیں پھیلا دیں۔ "آؤ..... مجھ سے لپٹ جاؤ۔ میں تمہیں اپنی آغوش میں چھپا کر ہر پریشانی سے بچا لوں گی۔"

وہ اس کی طرف بڑھا مگر عین وقت پر جیسے جادو کے زور پر سحاب کے چہرے کے نقوش تبدیل ہونے لگے۔ وہ اپنی جگہ ساکت' اس تبدیلی کو دیکھتا رہا۔ سحاب کا جسم البتہ ویسا ہی تھا۔ صرف چہرہ بدل رہا تھا۔

اور جب تبدیلی کا وہ عمل مکمل ہوا تو وہ حیران ہو گیا۔ اس کی نظروں کے سامنے صفیہ کا چہرہ تھا۔

"آپ میرا سراپا دیکھنا چاہتے تھے نا۔" صفیہ شیریں آواز میں گنگنائی۔ وہ کچھ بول نہ سکا۔ صفیہ نے مزید کہا "میرا جسم ایسا ہی ہے..... یہی ہے۔ اب جی بھر کے دیکھ لیں اسے۔"

وہ گنگ تھا۔ اسے دیکھے جا رہا تھا۔

"آیئے نا۔ روند ڈالیئے مجھے۔ مجھے میرے مقام پر پہنچا دیجئے۔" صفیہ عجیب سے لہجے میں کہہ رہی تھی "ورنہ میں اسی طرح آپ کے لئے پیچیدہ مسئلہ بنی رہوں گی۔ مجھے میری اوقات پر پہنچا دیجئے۔"

اس کے اندر ایک سوچ ابھری۔ یہ درست ہے۔ یہی اس مسئلے کا حل ہے۔ اس نے صفیہ کی طرف ہاتھ بڑھایا' مگر صفیہ اچانک ہی تحلیل ہو گئی۔ جیسے تھی ہی نہیں۔

اب آنکھوں کے سامنے اندھیرا تھا۔ گھپ اندھیرا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ خوف زدہ ہو گیا۔ اس کے حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔ پیاس شدید سے شدید تر ہو گئی لیکن وہ پکارنے کے قابل نہیں تھا۔ حلق سوکھ رہا تھا۔ زبان اینٹھ رہی تھی۔

اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں پہچان سکے گا لیکن اس نے مری والے بنگلے کے بیڈ روم کو پہچان لیا۔ کمرے میں روشنی تھی۔ اس نے پانی کے لئے صفیہ کو پکارنا چاہا لیکن آواز نہ نکلی۔ اسی لمحے اس کی نظر صفیہ پر پڑی۔ اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ وہ ایسا ہی ہوش ربا' مگر جیتا جاگتا منظر تھا۔

صفیہ کی انگلیاں اس کے بالوں میں تھیں۔ وہ یوں دراز تھی کہ اس کا جسم اس

سے چپکا ہوا تھا۔ اس کا سر اور چہرہ دور تھا مگر سب سے بڑی بات اس کا لیٹنے کا انداز تھا۔ وہ ایک ایسی کتاب کی طرح ورق ورق بکھری ہوئی تھی' جس کی بائنڈنگ جواب دے گئی ہو اور ہر ورق آزاد ہو گیا ہو۔

وہ سحر زدہ اسے تکتا رہا!

تو یہ وہ سراپا ہے' جسے دیکھنے کی اس کی ہر شریفانہ کوشش ناکام ہو گئی۔ جسے دیکھنے کی اسے بڑی خواہش تھی۔ یہ وہ جسم ہے' جسے صفیہ سینت سینت کر چھپا چھپا کر رکھتی تھی۔ رکھنا بھی چاہئے۔ یہ ہے ہی ایسا۔ اندر سے اشتیاق اور ستائش میں ڈوبی ایک آواز ابھری۔

وہ بہت اشتیاق اور بے حجابی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ جی بھر کے' سیر ہو کے اسے دیکھنا چاہتا تھا مگر دیکھتے ہی دیکھتے وجود میں دیوانگی کی ایک تند لہر اٹھی۔ صرف دیکھنے کی چیز کو دیکھنا چاہئے۔ کھانے کی چیز کو کھانے کی بجائے' پینے کی چیز کو پینے کے بجائے اور برتنے کی چیز کو برتنے کے بجائے محض دیکھنا حماقت بھی ہے اور اس چیز کی توہین بھی۔

اس کا ہاتھ صفیہ کے چہرے کی طرف بڑھا تو اس میں لرزش تھی اور وہ لرزش کمزوری کی وجہ سے نہیں' ایک سفلہ جذبے کی طاقت کی وجہ سے تھی۔ اس کی صفیہ کے چہرے کو چھونے والی انگلی خواہش کے بوجھ سے لرز رہی تھی۔

اس نے صفیہ کی بھوؤں کو انگلی سے سہلایا۔ جیسے وہ وہاں ہوں نہیں' وہ انگلی سے انہیں بنا رہا ہو پھر وہ اس کی آنکھوں کے پپوٹوں پر تھرکی۔ اس کی پیشانی کو سہلاتی ہوئی اس کے ایک رخسار سے دوسرے رخسار تک گزری اور اس کے ہونٹوں پر لرزنے لگی۔

اسی لمحے اس کے اندر دھماکا سا ہوا.....

سوتے سوتے صفورہ کو اپنے چہرے پر کسی متحرک لمس کا احساس ہوا۔ نیند اگرچہ بہت گہری تھی لیکن لمس کا وہ تجربہ اس کے لئے پہلا اور بالکل نیا تھا۔ سو اس کی نیند اچٹ گئی۔

نیم وا آنکھوں سے اس نے جو کچھ دیکھا' وہ اس کے لئے خواب سا تھا۔ مجیب

بڑی نرمی سے اس کے چہرے کو انگلی سے سہلا رہا تھا۔ شعوری طور پر اس کے لمس کو محسوس کرتے ہی وہ بے خود ہو گئی۔ جسم میں سرشاری سی دوڑنے لگی۔

وہ خواب ہی ہو گا۔ حقیقت میں تو یہ ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ مجیب بہت محبت سے اسے چھو رہا تھا۔ وہ لمس کی زبان خوب سمجھتی تھی اور وہ بہت سچا..... بہت محبت بھرا لمس تھا۔ اس کی آنکھیں سرشاری میں پوری طرح کھل ہی نہیں پا رہی تھیں ورنہ وہ اس کے چہرے کو دیکھتی تو شاید ڈر جاتی لیکن اس کے پاس تو اس وقت بھی بس وہی ایک حوالہ تھا۔ لمس کا۔ وہی اس سے باتیں کر رہا تھا۔ وہی اسے خواب دکھا رہا تھا۔

مجیب کی انگلیاں اس کے ہونٹوں پر لرز رہی تھیں۔ وہ ہلکی ہلکی پھوار تھی مگر پھر اچانک ہی وہ تند بارش کا روپ دھار گئی۔ وہ سرشاری کی اسیری شروع میں تو کچھ سمجھ ہی نہیں سکی۔ اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ رنگینی سنگینی سے اور والہانہ پن وحشت سے بدلتا جا رہا ہے۔ جب اسے احساس ہوا تو بات کافی آگے بڑھ چکی تھی۔ وہ کمزور آواز میں' فریاد کناں لہجے میں۔ نہیں..... کی گردان کرتی رہی لیکن فاتح پیش قدمی کرتے ہوئے شہر پناہ کے کھلے دروازے سے اندر آ چکا تھا۔ وہ تو بس جنگ مغلوبہ لڑ رہی تھی لیکن نہیں..... مغلوبہ کیسے وہ تو جنگ ہی نہیں تھی۔ وہ تو مزاحمت بھی نہیں تھی۔ وہ..... نہیں' نہیں تو ایسے تھی کہ فاتح کو الٹا جارحیت پر اکسا رہی تھی۔ وہ برائے نام مزاحمت بھی سپردگی کے لباس میں تھی۔

"نہیں مجیب..... نہیں..... خدا کے لئے..... نہیں۔" وہ آواز صدا بصحرا تھی' جو کسی سماعت کے لئے نہیں ہوتی۔

مجیب کے ذہن نے احتجاج کرنے کی کوشش کی تھی "کیوں خود کو پستی میں گراتے ہو۔" لیکن بخاری تپش اور دن بھر کی پریشانی اور تکلیف سے نڈھال ذہن کی آواز طاقت ور سفلہ خواہش کے اس سمندر میں ڈوبنے کے لئے تنکے کا سہارا بھی نہیں تھی۔

مجیب کو اتنا احساس ضرور ہوا۔ اور رہا کہ اس نے اس سرزمین پر قدم رکھا ہے' جہاں پہلے کبھی انسانی قدم پہنچے ہی نہیں تھے۔ وہ ان چھوئی' اچھوتی سرزمین تھی۔

لیکن طوفان میں بہہ جانے والوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ طوفان کے بعد بچ نکلنے والوں کے لئے کیسی راحت' اور بہہ جانے والوں کے لئے کتنی اذیتیں ہوتی ہیں!

ناظورہ بیگم سوتے سوتے گھبرا کر اٹھ بیٹھیں۔ ان کا دل دھڑ دھڑ کر رہا تھا اور جسم پسینے سے شرابور تھا۔ انہوں نے خواب ہی ایسا دیکھا تھا۔

انہوں نے خواب یاد کرنے کی کوشش کی لیکن خواب کے آخری منظر کے سوا انہیں کچھ بھی یاد نہیں تھا۔ پورا خواب ذہن سے محو ہو چکا تھا لیکن جو دہشت ان پر طاری تھی' وہ آخری منظر ہی کی تھی۔ انہوں نے صفورہ کو ایک بہت اونچے پہاڑ کی چوٹی پر دیکھا تھا۔ پھر صفورہ کا پاؤں پھسلا اور وہ وہاں سے گرتی نظر آئی اور جو گہرائی انہوں نے دیکھی' وہ نامعلوم تھی۔

بستر پر بیٹھی کچھ دیر وہ بے قابو دل کو سنبھالنے کی کوشش کرتی رہیں مگر بار بار انہیں خواب کا وہ منظر یاد آتا' پھر صفورہ کا خیال آتا اور اس کے ساتھ ہی دل گھبرانے لگتا۔

صفورہ نے جدا ہوئے انہیں ڈیڑھ ماہ ہو چکا تھا اور اخبار میں تین اشتہار شائع ہونے کے باوجود اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ نہ اچھی نہ بری۔ یہ ان کے لئے بہت بڑا صدمہ تھا مگر زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ وہ اس کا غم بھی نہیں کر سکتی تھیں.... کھل کر رو بھی نہیں سکتی تھیں۔ شوہر کی خاطر انہیں خود کو سنبھال کر رکھنا تھا۔ ورنہ سفیان احمد ڈھیر ہو جاتے اور رضوان کو تو کچھ معلوم ہی نہیں تھا۔

ان کے پاس بس دن کا وقت تھا' جس میں وہ صفورہ کے متعلق سوچ سکتی تھیں۔ کیونکہ اس وقت وہ رو بھی سکتی تھیں اور صفورہ کی یاد اور ان کا رونا لازم و ملزوم تھے۔ شام کو سفیان احمد گھر آ جاتے تو ناظورہ بیگم کو اپنے چہرے پر نقاب چڑھانی پڑتی۔ وہ خود کو بے فکر اور مطمئن ظاہر کرتیں۔ سفیان احمد وقتاً" فوقتاً" پریشان ہوتے رہتے۔ ان کی پریشانی بیٹی کی گمشدگی نہیں تھی۔ انہیں بس اپنی عزت اور اس کی آبرو کی فکر تھی اور وہ انہیں اسی طرح بہلاتیں' جیسے پہلی بار بہلایا تھا "آپ کی عزت محفوظ ہے۔ اس کی

آپ فکر نہ کریں۔"

"کیوں نہ کروں۔ فکر تو ہے مجھے۔"

"بھئی آپ تو شکریہ ادا کریں خدا کا۔ اس پردہ رکھنے والے نے آپ کی عزت بچا لی۔ پریشان ہو کر ناشکرا پن کیوں کرتے ہیں۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔ کہیں صفورہ...."

"بے کار کی بات ہے۔" ناظورہ بیگم ذرا غصے اور جھنجلاہٹ سے کہتیں "جو کسی طرح معلوم نہیں ہو سکتا اور جس سے آپ بے خبر ہیں' اس کے بارے میں واہمے سوچ کر خود کو پریشان کرنے سے کیا حاصل اور جو ہو چکا' اس میں آپ کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے۔ بس اچھی امید رکھیں اللہ سے اور دعا کریں۔"

تو جہاں آدمی کو دکھ اور پریشانی ستاتی ہو لیکن اسے کسی اور کو سنبھالنا اور دلاسا دینا ہو تو وہ اپنا اظہار تو نہیں کر سکتا۔ اپنی بھڑاس تو نہیں نکال سکتا۔ وہ بوجھل ہوتا رہتا ہے اور کمزور ہوتا جاتا ہے۔ ایسے میں وہ خواب بھی نہ دیکھے....!

ناظورہ بیگم نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ دوسری چارپائی پر سفیان احمد بے خبر سو رہے تھے۔ گویا اس وقت وہ رو بھی سکتی تھیں۔

وہ اٹھیں اور باہر آنگن میں چلی آئیں۔ وہاں بھی چارپائی موجود تھی۔ شام کو اکثر صفورہ اسی چارپائی پر بیٹھ کر کچھ سوچتی رہتی تھی اور کبھی وہ کوئی رسالہ پڑھتی ہوتی تھی۔ اس وقت وہ صفورہ کی یادوں سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ ہر حوالہ صفورہ کا تھا۔ ہر بات' ہر چیز صفورہ سے متعلق تھی۔ بچپن سے لے کر آخری دن تک کی اس کی تمام یادوں نے انہیں گھیر لیا تھا۔

وہ ان سے کھیلتی رہیں۔ اسے یاد کر کے دکھی دل سے روتی رہیں پھر اچانک انہیں وہ خواب یاد آیا' جس کی وجہ سے ان کی آنکھ کھلی تھی۔ انہوں نے سوچا کہ صبح پہلی فرصت میں وہ اس کا صدقہ نکالیں۔ صدقہ اللہ نے ایک ایسی نعمت عطا فرمائی ہے' جو بلاؤں کو دور کرتا ہے۔ گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالتا ہے۔

اسی لمحے قریب کی مسجد سے فجر کی اذان کی آواز ابھری۔

صدقہ تو دینا ہی ہے لیکن نماز پڑھ کر صفورہ کے لئے عافیت کی دعا کرنا بھی ضروری

ہے۔ وہ اٹھیں اور وضو کرنے کے لئے چل دیں۔

انہوں نے بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھی پھر انہوں نے گڑگڑا کر اللہ سے دعا مانگی "اے اللہ' میری صفورہ کی جان اور آبرو کی حفاظت فرما۔ ہماری عزت پر حرف نہ آنے دینا اے مالک...."

انہیں نہیں معلوم تھا کہ اس دعا کا وقت نکل چکا ہے!

لیکن ایسے کتنے لوگ ہیں جو جان کر بھی نہیں جانتے' سمجھ کر بھی نہیں سمجھتے کہ دعا کبھی رائیگاں نہیں ہوتی!



طوفان گزر چکا تھا اور ڈوبنے والی کشتی کے دونوں مسافروں کو موجیں ساحل پر پھینک گئی تھیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ شرمندہ تھے۔

صفورہ دیر تک روتی رہی تھی مگر پھر اچانک ہی اس کے آنسو خشک ہو گئے تھے۔

اس نے بس یہ سوچنے کی کوشش کی تھی کہ وہ کیوں رو رہی ہے اور اس کا رونا موقوف ہو گیا تھا۔ کیونکہ اصل سوال کا جواب تو نہیں' لیکن اس کے کئی ثانوی اور منفی جواب تیزی سے سامنے آئے تھے۔ وہ اس لئے نہیں رو رہی تھی کہ اس کے ساتھ ظلم ہوا تھا۔ مجیب نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ وہ اس لئے نہیں رو رہی تھی کہ وہ لٹ گئی تھی۔ وہ اس لئے بھی نہیں رو رہی تھی کہ ٹرین سے اتر کر جو جذباتی حماقت اس نے کی تھی' انجام کار اس کا منطقی نتیجہ یہی نکلنا تھا۔ وہ اس لئے بھی نہیں رو رہی تھی کہ تباہی کی طرف جانے والا یہ راستہ اس نے خود منتخب کیا تھا۔

اتنے کوڑے کھانے کے بعد اسے اس سوال کا جواب ملا۔ وہ اس لئے رو رہی تھی کہ اس نے تو مزاحمت بھی نہیں کی۔ بہت آسانی سے۔ بلکہ ہنسی خوشی خود کو ہار دیا۔

اس نے خود کو بہت اچھی طرح ٹٹولا۔ گہرائی میں جا کر ٹٹولا۔ بہت سچائی کے ساتھ اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ جو کچھ ہوا' اس میں مجیب بالکل قصور وار نہیں ہے۔ وہ تو ایسا مرد ہے کہ اگر وہ اسے جھٹک دیتی تو وہ شرمندہ ہو کر رہ جاتا۔ وہ ایسا ہوتا تو اتنے دن اتنی راتیں عافیت میں کیسے گزرتیں اور اگر فرض کر بھی لیں کہ اس معاملے میں وہ ایک عام مرد ہے تو بھی اس بیماری اور کمزوری کے عالم میں وہ اس کے ساتھ زبردستی

نہیں کر سکتا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس نے مزاحمت کی ہی نہیں۔ تو ذمے دار وہ خود ہے۔

تو اس نے خود کو گرا لیا! بے آبروئی قبول کر لی! کیوں؟ اس کیوں کا جواب کسی حد تک اشک شوئی کرنے والا تھا۔ صرف اور صرف محبت کی وجہ سے۔ اگر اسے مجیب سے محبت نہ ہوتی تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ نہ ہی وہ یہاں آتی' نہ گھر سے بے گھر ہوتی نہ یہ داغ لگتا۔

مگر ضمیر پوری طرح جاگ رہا تھا اور بے رحمی پر بھی آمادہ تھا۔ محبت بلندیوں کی طرف لے جانے والا اعلیٰ و ارفع جذبہ ہے۔ اس نے اعتراض کیا۔ وہ ذلت کی گہرائیوں میں' بے آبروئی کی پستیوں میں نہیں لے جاتا۔ اب سوچو' کیا یہ محبت ہے؟ کیا محبت خود کو گندگی کے ڈھیر میں گرا لینے کا.... گندگی بن جانے کا نام ہے۔ کیا محبت گناہ ہے؟ یہ محبت نہیں' ہوس ہے۔

وہ یوں سمٹی' جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اس موقع پر.... اپنا پوری طرح سامنا کرنا' وقوعے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حقائق تلاش کرنا ضروری تھا۔ وہ ایسی ہے تو نہیں پھر کیوں یہ سب ہونے دیا؟ اس کی وجہ تو محبت کے سوا کچھ اور نہیں۔ ہو بھی نہیں سکتی مگر محبت کے علاوہ ایک سب سے بڑی وجہ کمزوری ہے۔ کمزوری' جس نے اس کے اندر کی مزاحمت کو اس کی بے خبری میں توڑ کر رکھ دیا تھا۔

پہلی کمزوری اسے ابا نے سونپی تھی۔ ابا کا یہ خوف کمپلیکس بن گیا تھا کہ وہ کسی ہندو سے شادی کر کے ان کی عزت اور عاقبت دونوں کو داغ لگا دے گی۔ شاید یہ کمزوری اسے نہ ملی ہوتی تو وہ مجیب کی محبت کو اپنا سہارا نہ بناتی۔ وہ سوچتی اور بہت سوچتی۔ اس کی عمر کے بارے میں' اس کے بیوی بچوں کے بارے میں.... اور اس کے بعد بھی مجیب کی محبت اس کے دل میں رہتی تو وہ اس سے لڑتی ضرور۔ اسے خود پر حاوی نہ ہونے دیتی۔ لیکن مجیب سے محبت میں اس کے نزدیک فائدہ ہی فائدہ تھا۔ وہ صرف خوابوں تک محدود تھی اور اسے مضبوطی بھی عطا کرتی تھی۔ اس کی موجودگی میں ابا کا خوف کبھی عملی روپ میں نہیں آ سکتا تھا۔

پھر مجیب کی محبت نے اسے خواب دیئے۔ خواب سکون کے ساتھ محرومی کی خلش بھی دیتے ہیں مگر جب مجیب سے ملنے کا امکان سامنے آیا تو اپنی بے خبری میں وہ اور کمزور ہو گئی۔ وہ اس سے ملاقات کے لئے تڑپ رہی تھی۔ اس خواہش نے اس سے ہوش مندی بھی چھین لی۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ اس طرح ٹرین سے اتر کر مجیب سے ملنے نہ جاتی۔ وہ عمل بھی تو اس کی باطنی کمزوری کا مظہر تھا۔

وہ مجیب سے ٹرین میں ملی تو اسے عجیب حال میں دیکھا۔ وہ خوف زدہ تھا۔ اسے اس کی ضرورت تھی۔ طویل عرصے کی محبت کے بعد اس سے ملنے کا خواب پورا ہوا تو مجیب کی کمزوری بھی اس کی اپنی کمزوری میں آ ملی۔ وہ اور زیادہ کمزور ہو گئی۔ قوت فیصلہ سے محروم ہو گئی۔ اسے مجیب کو ایک نظر دیکھ کر ٹرین سے اتر آنا چاہئے تھا لیکن وہ ایسا نہ کر سکی اور اس کے بعد اس کے اختیار میں کچھ بھی نہ رہا۔ وہ بس' بے بس ہو کر رہ گئی۔

مری آنے کے بعد وہ ہر طرح کی طاقت سے محروم ہو گئی۔ وہ ایسا بدترین تحفظ کا احساس تھا کہ شاید دنیا میں کوئی اس سے دوچار نہیں ہوا ہو گا۔ اس کے پاس کمزوریاں ہی کمزوریاں تھیں' طاقت کوئی نہیں تھی۔ اس سرزمین پر اس کی موجودگی غیر قانونی تھی۔ اس کے وجود کی کوئی سرکاری حیثیت نہیں تھی۔ اپنے گھر والوں' رشتے داروں سمیت پوری دنیا کے لئے اس کا وجود اور عدم وجود برابر ہو گیا تھا۔ صرف مجیب تھا' جس کے لئے وہ وجود رکھتی تھی۔ جس کے پاس وہ محفوظ تھی۔ مجیب کام مکمل کر کے جائے گا تو اسے چھوڑ دے گا۔ یہ یقینی امر اور اس کا خیال اس کے لئے سوہان روح بن گیا تھا۔ وہی تو بدترین احساس عدم تحفظ تھا۔ مجیب سے جدا ہونے کے بعد کیا ہو گا۔ وہ ایک ہندوستانی لڑکی کی حیثیت سے پکڑی بھی جا سکتی تھی۔ وہ غلط لوگوں کے ہتھے چڑھ کر آبرو سے بھی محروم ہو سکتی تھی اور زندگی سے بھی اور ایسا نہ ہوتا تو بھی وہ اکیلی معاش کے سلسلے میں کیا کرتی۔ جبکہ یہاں اس کے وجود کی کوئی قانونی حیثیت ہی نہیں تھی۔ یہ عدم تحفظ تین پھل والا ترشول تھا' آبرو' زندگی اور معاش کا عدم تحفظ۔ وہ زندگی کے پہاڑ سے موت کی ہزاروں فٹ گہری کھائی میں پھسل رہی تھی کہ مجیب انور نامی وہ کمزور دھاگا اس کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ شکر کی بات یہ تھی کہ وہ پہاڑ سے بہت

قریب اور کھائی سے بہت دور تھی۔ وہ دوبارہ زندگی کے پہاڑ پر قدم جمانے کی کوشش کر رہی تھی' جو ناممکن نہیں تھا۔ لیکن ایسے میں وہ دھاگا ٹوٹ جاتا تو.... تو کیا ہوتا۔

ایسی صورت حال میں مزاحمت بچ سکتی ہے؟ طاقت رہ سکتی ہے انسان میں؟ اس کی کمزوری کا تصور تو کرو۔ اس نے ضمیر سے اپیل کی۔

ایسے میں اس کمزوری سے لدی پھندی نازک لڑکی پر' طاقت' مزاحمت اور مدافعت سے محروم لڑکی پر آزمائش کا وہ لمحہ آیا اور اس کے لئے کمزوری کا لمحہ بن گیا۔ اسے مجیب کی بیماری کی فکر بھی تھی۔ وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ اسے تکلیف میں نہیں دیکھ سکتی تھی اور پھر مجیب نے تو اس کی بلا اپنے سر لی تھی۔ اس کے لئے ایثار کیا تھا۔ وہ دل و جان سے اس کی خدمت کر رہی تھی۔ ایسے میں وہ کمزور لمحہ آ گیا۔

اس کے پاس ابا کی بے اعتنائی اور ان کے خوف و خدشات کی کمزوری تھی۔ اس کے پاس ان خوابوں کی کمزوری تھی' جن میں وہ مجیب انور کی قربت کی تمنا کرتی رہی تھی۔ اس کے پاس بدترین عدم تحفظ کی کمزوری تھی۔ اس کے پاس طاقت کہاں تھی' مزاحمت اور مدافعت کہاں تھی۔ اسے تو ہارنا ہی تھا۔

ضمیر کی عدالت نے کافی لعنت ملامت کے بعد اسے بے عزت بری کر دیا۔

اس نے سکون کی سانس لی لیکن فوراً ہی پریشان ہو گئی۔ یہ تو جو ہو چکا تھا' اسی کا مقدور تھا اور اب جو نتائج نکلیں گے آگے کیا ہو گا.... اسے کیا کرنا چاہئے.... وہ کیا طرز عمل اختیار کرے.... یہ اتنے سارے سوال بھی تو منہ کھولے کھڑے تھے۔

فیصلہ مشکل نہیں تھا۔ دھاگے کا سہارا بھی بہت اہم تھا۔ اسے نہ توڑا جا سکتا ہے' نہ کمزور کیا جا سکتا ہے۔ جرم اسی کا تھا' سزا بھی اسی کی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اب وہ مجیب کے سامنے نظر نہیں اٹھا سکتی لیکن وہ اس سے لڑ بھی نہیں سکتی' اسے چھوڑ بھی نہیں سکتی اور اب تو وہی اس کا سب کچھ ہے۔ اب تو وہ ناتے بھی ٹوٹ گئے' جو پہلے موہوم رہ گئے تھے۔

صبح ہو رہی تھی۔ اس نے مجیب کو دیکھا۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اس نے اس کی پیشانی چھو کر دیکھی اور سکون کی سانس لی۔ بخار اتر چکا تھا مگر وہ کمزور بہت ہو گیا ہو گا۔ دیکھنے میں بھی لگ رہا تھا۔ اسے اس کا بہت خیال رکھنا تھا۔

وہ اٹھی اور باتھ روم میں چلی گئی۔



طوفان گزرتے ہی مجیب کو ہوش آ گیا تھا!

ہوس کی، جذبات کی آندھی رکی تو ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ جیسے ہوا نے بھی دم سادھ لیا ہو۔ سہم کر کہیں دبک گئی ہو۔ ایسے میں اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ گرا ہے..... اور بہت بلندی سے گرا ہے۔ بخار کی گرمی، جسم کی دکھن اور خراشوں کی ٹیسیں..... سب اس کا ساتھ چھوڑ گئیں۔ بس ایک بدبو کا احساس رہ گیا، جو اسے اپنے وجود سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

"تو آخر تم نے خود کو گرا ہی لیا۔" اس کے اندر سے کسی نے نفرت بھرے لہجے میں کہا "تم..... تم تو محبت کے آدمی تھے۔ خوامخواہ خود کو ہوس کی دلدل میں پھنسا لیا۔"

اس آواز کے جواب میں اس کا پہلا رد عمل مدافعانہ تھا مگر دوسرے ہی لمحے اس کی گردن اکڑ گئی۔ "اتنا کافی ہے کہ تم نے مجھے آدمی کہا۔" اس نے اندر کے آدمی کو ڈپٹا۔ "اس ایک لفظ میں تمہاری ہر بات کا جواب موجود ہے۔ میں آدمی ہوں۔ خطا کا پتلا ہوں۔ میں شروع سے ہی کہہ رہا ہوں کہ بشری تقاضے مجھے بھی ستاتے ہیں۔ ثابت ہو گیا کہ میں یہی چاہتا تھا۔"

"صرف ایک غلط بات ثابت کرنے کے لئے تم نے خود کو گرا لیا؟" اندر کی آواز نے تاسف سے کہا۔

"میں بیوی سے دور، اس کے قرب سے محروم تھا۔" اسے پھر پسپا ہونا پڑا "یہ تو ہونا ہی تھا۔"

"اپنے آپ پر شرم نہیں آ رہی ہے تمہیں؟"

مجیب سناٹے میں آ گیا۔ واقعی..... زیاں تو بہت بڑا ہے اور جو ہو چکا ہے، اسے مٹایا بھی نہیں جا سکتا۔ وہ جھنجلانے لگا۔ اب وہ کبھی پہلے جیسا نہیں ہو سکتا۔ سحاب سے..... بلکہ اپنے آپ سے بھی نظر نہیں ملا سکتا۔ یہ کیا ہو گیا۔

"اب خود غرض بن کر خود کو اور پست کر رہے ہو۔" اندر کی آواز کوڑے کی طرح لہرائی۔

"کیا مطلب؟"

"اپنا غم کر رہے ہو۔ اس کے بارے میں نہیں سوچتے، جسے تم نے لوٹ لیا۔ جبکہ قصور اس کا نہیں، تمہارا ہے؟"

مجیب بری طرح بھڑکا "اس کا کیا ہے۔ وہ تو ہے ہی اسی راستے کی مسافر۔"

"تم جانتے ہو کہ تم اس کی زندگی میں آنے والے پہلے مرد ہو۔"

"میں نہ ہوتا تو کوئی اور ہوتا۔ یہ تو ہونا ہی تھا؟" اس نے غصے سے کہا "وہ گناہوں کی دلدل میں پاؤں رکھنے کے لئے بڑھ رہی تھی کہ راستے میں اسے میں مل گیا۔ بس اتنی سی بات ہے؟"

"بس اتنی سی بات نہیں۔ اس کی ہر ایسی رات کا عذاب تمہیں بھی پہنچے گا، جو گناہوں سے لتھڑی ہوئی ہو گی۔ اس کی پوری زندگی کے عذاب میں تمہارا برابر کا حصہ ہو گا۔"

"کیوں بھئی۔ آدمی اپنے عمل کا جواب دہ ہوتا ہے، دوسروں کے عمل کا نہیں؟" اس نے زہرخند کیا۔

"کچھ اعمال مرتے دم تک پیچھا نہیں چھوڑتے۔ ثواب جاریہ کی طرح عذاب جاریہ بھی ہوتا ہے۔ تم اسے خراب کرنے والے پہلے مرد ہو۔ اس کے ہر خرابی میں تمہارا برابر کا حصہ ہو گا؟"

"فضول بات ہے۔ تم بلاوجہ مجھے احساس جرم میں مبتلا نہیں کر سکتے۔"

"ایک نظر اسے دیکھ لو۔ جنہیں خراب ہونا ہوتا ہے، خراب ہونے پر ان کا ایسا حال نہیں ہوتا؟"

مجیب نے سر گھما کر دیکھا۔ نجانے کب صفیہ نے کروٹ بدل لی تھی۔ وہ دوسری طرف منہ کئے لیٹی تھی۔ غور سے دیکھنے پر مجیب کو اس کے جسم میں لرزش محسوس ہوئی۔ یہ بات یقینی تھی کہ وہ رو رہی ہے۔

اسے صفیہ پر غصہ آنے لگا۔ وہ اسے دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ خوامخواہ اس کا رونا اس کے ضمیر کے لئے بوجھ بن جائے گا۔ ضمیر بے چارہ تو ہر ایک کا بوجھ اٹھانے کے لئے تیار رہتا ہے۔

لمحہ بہ لمحہ اس کا غصہ بڑھتا گیا۔ سنا تھا کہ اس طرح کی عورتیں بہت مکار ہوتی ہیں۔ اب دیکھ بھی لیا۔ بھلا اس کے رونے کی کیا تک ہے۔ اس نے کوئی زبردستی تو نہیں کی تھی اس کے ساتھ۔ کسی بھی مرحلے پر صفیہ نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ وہ ہر مرحلے میں سپردگی میں لپٹی اس کے ساتھ تھی۔ اگر اس نے اسے روکا ہوتا... سختی سے منع کیا ہوتا تو وہ تو اس وقت اس کا شکر گزار ہوتا۔ وہ فوراً رک جاتا۔ شرمندہ ہو جاتا اور گرنے سے بچ جاتا مگر اس نے اسے روکا ہی نہیں۔ وہ یہی چاہتی تھی۔ یقیناً یہی بات ہے۔

اور اب وہ رو رہی ہے۔ جبکہ سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہوا ہے۔ وہ اس لئے رو رہی ہے کہ یوں اس کا ضمیر خود کو مجرم محسوس کرے گا۔ وہ خود اپنی ملامت کے تیر سہے گا اور اس کی نتیجے میں تلافی کی کوشش کرے گا۔ اسے زیادہ سے زیادہ نوازے گا۔ بلکہ ممکن ہے' عملی تلافی....

اس نے زور سے سر جھٹکا۔ ایسا ہو گا نہیں۔ میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔

اسے بری طرح چکر آئے تو احساس ہوا کہ وہ کمزور بہت ہو گیا ہے۔ سر جھٹکنا قیامت ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ ایسی حالت میں زیادہ سوچنا بھی ٹھیک نہیں۔ اس نے خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کی۔ نجانے کب اسے نیند آ گئی۔

آنکھ کھلی تو دن چڑھ چکا تھا۔ کھڑکی کے پردے سرکے ہوئے تھے۔ اس نے دیکھا کہ عقبی باغیچہ دھوپ سے بھرا ہوا ہے۔ اس نے سر گھما کر دیکھا۔ صفیہ موجود نہیں تھی۔ کیا وہ آج بھی اپنے معمول کے مطابق اٹھی ہو گی؟ اس نے سوچا مگر چڑ کر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

رات جو کچھ ہوا تھا' وہ اب اسے خواب سا لگ رہا تھا۔ اسے یقین ہونے لگا کہ ایسا کچھ نہیں ہوا ہے۔ وہ اٹھ کر بیٹھا تو اسے چکر سے آنے لگے۔ بیڈ سے پاؤں لٹکا کر اس نے سلیپر تلاش کئے مگر کھڑے ہونے کی کوشش کی تو وہ لڑکھڑا کر گر گیا۔

چند لمحے وہ بیڈ پر ساکت پڑا رہا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنا کمزور ہو گیا ہے۔ صرف ایک رات ہی تو بخار میں گزری ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کی یادداشت پوری طرح بحال ہو گئی۔ اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ اپنی پلاننگ بھی اور اس کا

نتیجہ بھی اور پھر وہ واقعہ بھی۔ اسے پھر غصہ آ گیا۔ وہ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ کتنا گر گیا وہ۔ یہ غم اسے ستا رہا تھا۔ صفیہ کے متعلق وہ بے رحمی سے سوچ رہا تھا۔ استعمال کی چیز تھی' سو استعمال ہو گئی۔

چلو' نقصان تو بڑا ہوا لیکن وہ محبت کا الزام تو غلط ثابت ہو گیا۔ اس نے سوچا۔

باتھ روم جانے کے ارادے سے وہ اٹھ رہا تھا کہ صفیہ آ گئی "ارے.... اٹھیں مت۔ میں ابھی سب بندوبست کر دوں گی۔"

مجیب نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ باقی سب کچھ ویسا ہی تھا۔ وہی چادر میں لپٹا ہوا جسم' وہی انداز۔ اس کے دل میں تمسخر سا ابھرا۔ کم از کم اب تو یہ چادر میں خود کو چھپانے کا ڈھونگ ختم کر دے لیکن نہیں۔ یہ لڑکی بہت مکار ہے "اس کی ضرورت نہیں۔ میں اٹھ سکتا ہوں۔" وہ بولا۔

"ہرگز نہیں۔" صفیہ نے نظریں اٹھائے بغیر کہا "آپ بیٹھے رہیے۔ میں ابھی آئی۔" یہ کہہ کر وہ واپس چلی گئی۔



شکور نے خالی تسلہ لا کر بیڈ کے پاس فرش پر رکھ دیا پھر وہ باتھ روم سے پانی سے بھری ہوئی بالٹی لایا۔ اس میں مگ بھی موجود تھا۔ صفیہ شاید اسے پوری طرح سمجھا کر لائی تھی۔ وہ خود ابھی باتھ روم میں تھی۔

چند منٹ بعد وہ باتھ روم سے نکلی تو اس کے کندھے پر تولیہ تھا۔ ایک ہاتھ میں مجیب کا ٹوتھ برش جس پر ٹوتھ پیسٹ لگا تھا اور دوسرے ہاتھ میں صابن دانی تھی۔ اس نے ٹوتھ برش مجیب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "لیجئے.... دانت برش کر لیں۔"

"یہ کیا مذاق...." مجیب نے احتجاج کیا۔

"پلیز' جیسا میں کہتی ہوں' کریں۔" صفیہ نے صابن دانی نیچے تسلے کے پاس رکھ دی۔

مجیب دانت برش کر رہا تھا۔ صفیہ نے اپنے کندھے سے تولیہ اتار کر اس کے گرد لپیٹ دیا پھر وہ باتھ روم میں گئی اور دوسرا تولیہ بھی لے آئی۔

مجیب نے اشارہ کیا کہ وہ دانت برش کر چکا ہے۔ صفیہ نے مگ میں پانی لے کر

اسے دیا "نیچے تسلے میں کلی کر دیں۔"

دانت صاف ہو چکے تو صفیہ نے صابن سے پہلے اس کے ہاتھ دھلائے پھر منہ دھلوایا۔ مجیب کے گرد لپٹا ہوا تولیہ کہیں کہیں سے گیلا ہو گیا تھا۔ صفیہ نے دوسرے تولیے سے اس کا چہرہ خشک کیا پھر پوچھا "بھوک لگ رہی ہے آپ کو۔"

"نہیں۔" مجیب نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"پھر بھی آپ کو ناشتا کرنا ہے اس کے بغیر دوا نہیں لے سکتے۔"

"لیکن اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔" مجیب نے احتجاج کیا۔

"میں نے فون پر ڈاکٹر سے بات کی ہے۔ آج دوا اور پینی ہے۔ پرہیز کا بھی میں نے معلوم کر لیا ہے۔ آپ کو سب کچھ شیڈول کے مطابق ملے گا۔ ابھی دلیہ۔ دوپہر میں ساگو دانہ۔ شام کو مٹن اور سبزیوں کا سوپ۔ رات کو دلیہ اور آپ اٹھیں گے بالکل نہیں۔ مکمل آرام کرنا ہے آپ کو۔"

ہاتھ منہ دھلوائے جانے سے لے کر اب تک مجیب کو یہی لگ رہا تھا کہ ہونٹ صفیہ کے ہل رہے ہیں مگر سحاب بول رہی ہے۔ اسے بیمار دیکھ کر سحاب کا رد عمل بھی یہی ہوتا تھا۔ اس لمحے اسے شدت سے سحاب یاد آئی۔

شکور بالٹی باتھ روم میں رکھ کر آیا اور تسلہ اٹھا کر باہر لے گیا۔ صفیہ ہاتھ دھونے کے لئے باتھ روم میں چلی گئی۔ اتنے میں فاطمہ ناشتہ لے آئی۔

صفیہ نے مجیب کے نیپکن باندھا۔ پیالے میں دلیہ نکال کر اس میں دودھ اور شہد ملایا۔ پھر مجیب کے سامنے دستر خوان بچھا کر اس پر ٹرے رکھ دی۔ مجیب نے کھانے کی کوشش کی لیکن اس کا چمچے والا ہاتھ لرز رہا تھا۔ صفیہ نے خود اسے اپنے ہاتھ سے کھلایا۔ اس دوران فاطمہ کمرے میں موجود رہی۔

ناشتے کے بعد صفیہ نے اسے دوا دی پھر برتن سمیٹ کر فاطمہ کو دیئے اور خود بھی اٹھنے لگی "اب آپ آرام کریں۔"

"مجھے دو دن ہو گئے گھر فون کئے ہوئے۔" مجیب نے کہا۔ اسے شدت سے سحاب کی یاد آ رہی تھی۔

صفیہ فون اٹھا لائی اور بیڈ کے پاس تپائی پر رکھ دیا "کسی چیز کی ضرورت ہو تو آواز

دے لیجئے گا۔ فاطمہ باہر موجود ہو گی۔" اس نے کہا اور کمرے سے چلی گئی۔

مجیب نے گھر کا نمبر ملایا "آپ خیریت سے تو ہیں؟" اس کی آواز سنتے ہی سحاب نے دوسری طرف سے پوچھا "میرا دل بہت گھبرا رہا تھا۔"

"ٹھیک ہوں۔ بس بخار ہو گیا تھا۔" مجیب نے کہا۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا۔ عام حالات میں وہ سحاب کو اپنی طبیعت کے متعلق بتا کر کبھی پریشان نہ کرتا۔ اتنی دور ہونے کی وجہ سے وہ کتنی پریشانی اور بے بسی محسوس کرے گی لیکن یہاں تو دو دن فون نہ کرنے کا.... اور ان دو دنوں میں رونما ہونے والے واقعات کا بوجھ تھا۔ بیماری ہی آڑ بن سکتی تھی۔

سحاب بہت پریشان ہو گئی۔ مجیب نے اسے اطمینان دلایا کہ ملازم موجود ہیں اور ہر طرح سے اس کا خیال رکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر کو بھی بلا لائے تھے۔

بڑی مشکل سے سحاب قدرے مطمئن ہوئی۔



وہ دن اور وہ رات سوتے جاگتے گزری۔ شاید ڈاکٹر نے نیند کی دوا بھی دی تھی۔ اس کی نیند سپاٹ تھی۔ ایسی نیند جس میں خواب کا گزر بھی نہیں تھا۔

اگلی صبح وہ جاگا تو صفیہ گزشتہ روز کا معمول دہرانے کے لئے بالکل تیار بیٹھی تھی۔ شکور اور فاطمہ بھی کمرے میں موجود تھے۔ اسے اٹھتا دیکھ کر فاطمہ کمرے سے چلی گئی۔

"یہ سب کچھ نہیں ہو گا آج۔" مجیب نے چڑچڑے پن سے کہا "اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"ابھی کمزوری ہے۔ آج اور برداشت کر لیں۔" صفیہ بولی "پلیز.... کل تک انشاء اللہ آپ نارمل ہو چکے ہوں گے۔"

شکور کمرے میں موجود نہ ہوتا تو وہ صفیہ کو جھڑک دیتا لیکن اسے احساس تھا کہ میاں بیوی والی آڑ بھی بہت اہم ہے۔ صفیہ تو اپنا تاثر ملازمین پر ڈال چکی تھی کہ وہ بہت اچھی، خدمت گزار اور محبت کرنے والی بیوی ہے۔

وہ اٹھنے لگا تو صفیہ نے اسے ٹوکا "مجھے باتھ روم جانا ہے۔" مجیب نے چڑچڑے پن سے کہا۔

مگر وہ اٹھا تو لڑکھڑا گیا۔ کمزوری ابھی موجود تھی۔ باتھ روم کے دروازے تک شکور نے اسے سہارا دیا۔

مجیب نے سوچا تھا کہ اب باتھ روم سے دانت صاف کر کے اور ہاتھ منہ دھو کر ہی نکلے گا لیکن وہاں کوئی چیز موجود ہی نہیں تھی۔ مجبوراً اسے باہر آنا پڑا۔ وہاں وہ گزشتہ روز والی تمام کارروائیوں سے گزرا۔

اس روز اسے وقفے وقفے سے نیند بھی نہیں آئی۔ لہٰذا وہ اس کے لئے بہت بور دن تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ اٹھ کر کام شروع کر دیتا لیکن صفیہ تمام وقت سر پر سوار رہی۔ اور اس نے چالاکی یہ کی کہ تمام وقت شکور یا فاطمہ میں سے کسی ایک کو اپنے ساتھ رکھا۔ جانتی تھی کہ ان کی موجودگی میں وہ اس کے ساتھ سختی نہیں کر سکتا۔

اس روز اسے بھوک بھی بہت لگی۔ یہ اچھی علامت تھی پھر صفیہ نے بڑے حساب سے اسے کھلایا پلایا۔ شام ہوتے ہوتے وہ خود کو خاصا توانا محسوس کرنے لگا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر صفیہ نے اسے روک دیا "رات کے کھانے کے بعد چل کر دیکھئے گا۔ ممکن ہے، تھوڑی سی چہل قدمی کر سکیں۔"

رات کے کھانے کے بعد وہ اپنے قدموں پر کھڑا ہوا تو اسے مضبوطی کا احساس ہونے لگا۔ کمزوری بڑی حد تک رفع ہو چکی تھی۔ ہاں قدم اٹھاتے ہوئے گھمیری کا سا احساس ہوتا تھا بہرحال اس نے صفیہ کے ساتھ عقبی باغیچے میں تھوڑی سی چہل قدمی کی مگر ذرا دیر میں ہی وہ تھک گیا۔ دونوں بینچ پر بیٹھ گئے۔

لیمپ کی روشنی میں مجیب نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بدستور نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔ جب سے اب تک اس نے ایک بار بھی اس سے نظر نہیں ملائی تھی۔ اسے اس پر ترس آنے لگا "جو کچھ تم نے ان دو دنوں میں میرے لئے کیا، میں اس پر تمہارا شکر گزار ہوں۔"

صفیہ نے پہلی بار نظر اٹھائی اور مجیب کو آنکھیں بولتی محسوس ہوئیں، جیسے طنز کر رہی ہوں، کہہ رہی ہوں..... جو تم نے میرے ساتھ کیا، میں بھی اس پر تمہاری شکر گزار ہوں مگر فوراً ہی صفیہ کی نظریں جھک گئیں "شکریہ کیسا۔ یہ تو میرا فرض تھا۔"

مجیب کو اس کی نظروں نے ویسے ہی تپا دیا تھا۔ اس جملے نے تو اس کے تن بدن

میں آگ ہی لگا دی "نہیں، یہ تمہارا فرض نہیں تھا۔ اسی لئے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ میرا خیال رکھنا، میری دیکھ بھال اور تیمار داری تمہارے فرائض میں شامل نہیں۔ میں تمہیں معاوضہ صرف تمہاری کمپنی کا ادا کر رہا ہوں..... فزیکل کمپنی کا۔" یہ آخری اضافہ اس نے خاص طور پر کیا اور زور دے کر کیا۔

مگر بظاہر صفیہ پر کوئی اثر نہیں ہوا "تو ٹھیک ہے۔" اس نے آہستہ سے کہا "میں اس شکر گزاری پر آپ کی شکر گزار ہوں۔"

مجیب کا خیال تھا کہ صفیہ معاوضے کے حوالے سے اس کی فزیکل کمپنی کی اصطلاح کو چیلنج کرے گی۔ کہے گی کہ معاوضہ اس کے جسم کو استعمال کرنے کا نہیں تھا۔ تب وہ بات آگے بڑھائے گا اور تلافی کی صورت نکل آئے گی۔ درحقیقت وہ اس سلسلے میں بہت بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ اسے اپنی بھڑاس بھی نکالنی تھی اور اپنے لئے سکون کا سامان بھی کرنا تھا۔

لیکن صفیہ نے چیلنج ہی نہیں کیا۔ یہ بات اس کے لئے مایوسی کا باعث تھی۔



چار دن گزر گئے۔ بظاہر وہ نارمل ہو گیا۔ اس نے کام بھی شروع کر دیا۔ لیکن درحقیقت نہ وہ نارمل تھا اور نہ ہی صورت حال نارمل تھی۔ اس کے ضمیر نے اسے پریشان کر رکھا تھا۔ وہ مسلسل اسے کچوکے دیئے جاتا تھا۔ دوسری طرف صفیہ نے اسٹڈی میں بیٹھنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ انداز سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اس سے گریزاں ہے لیکن وہ اس کا خیال اب بھی پہلے ہی کی طرح رکھتی تھی۔ پانی کا جگ اور گلاس اس کے پاس رکھا رہتا تھا۔ ضرورت کے وقت وہ خود اسے چائے لا کر دیتی تھی۔ باتھ روم اس کے نہانے کے وقت آئینے کی طرح چمک رہا ہوتا تھا۔ استری شدہ کپڑے موجود ملتے تھے لیکن وہ اس کے پاس نہیں بیٹھتی تھی۔ بلکہ وہ تو اس سے نظر بھی نہیں ملاتی تھی۔

رات کو وہ اسی طرح سوتے تھے۔ صفیہ ہمیشہ کی طرح ویسے ہی سوتی تھی کہ اس کا جسم چادر میں پوری طرح چھپا ہوتا تھا۔ عام طور پر وہ دوسری طرف کروٹ لیتی تھی۔ اس کا چہرہ بھی مجیب کے سامنے نہیں ہوتا تھا۔ خود مجیب کو اب آسانی سے نیند نہیں

آتی تھی۔ وہ سوچتا اور جھنجلاتا بہت تھا۔

سحاب کو وہ معمول کے مطابق فون کرتا تھا لیکن اس سے بات کرتے ہوئے اسے مستقل شرمساری کا احساس ستاتا تھا۔ اس بے چاری کو تو معلوم بھی نہیں کہ اس کا قابل فخر شوہر خیانت کا مرتکب ہو چکا ہے۔

اسے اندازہ نہیں تھا کہ سحاب سے بات کرتے ہوئے وہ شرم ساری اس کی آواز' اس کے لہجے میں اتر جاتی ہے.... سحاب تک بھی پہنچ جاتی ہے "آپ کو کیا ہو گیا ہے؟" دوسری طرف سے سحاب نے کہا۔ اس کے لہجے میں الجھن تھی "بجھے بجھے لگ رہے ہیں۔ پہلے کی طرح پُراعتماد اور گرم جوش بھی نہیں رہے۔" سحاب نے اسے ٹوکا تو اسے احساس ہوا۔

"کچھ بھی نہیں۔ بخار کے بعد کمزوری کا اثر ہے اور کچھ کام کا دباؤ ہے۔" اس نے بات بنائی۔

"میں اتنی دور ہوں کہ کچھ کر بھی نہیں سکتی۔" سحاب تاسف سے بولی "پلیز' آپ اپنا خیال رکھیں اور خوش رہنے کی کوشش کریں۔"

دوسری طرف ضمیر نے اس کا جینا دوبھر کیا ہوا تھا' جب ذرا فرصت ہوتی' وہ اسے گھیر لیتا "اب تمہیں جسمانی تقاضے نہیں ستاتے؟"

"میں جسم سے نہیں' ذہن سے سوچنے والا آدمی ہوں۔" وہ ٹھنڈے دل سے کہتا "میری طلب بہت زیادہ نہیں ہے۔"

اندر کا آدمی اور طرح سے چھیڑتا تھا "اب وہ یہاں نہیں بیٹھتی تو کیوں اتنا برا لگتا ہے؟"

اور یہ سچ تھا۔ صفیہ کے بغیر مجیب کو اسٹڈی خالی خالی محسوس ہوتی تھی۔ سب کچھ بے رنگ سا لگتا تھا "توہین کا احساس ہوتا ہے۔ اسے ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

"لٹیروں سے ہر کوئی بھاگتا ہے۔" اندر کا آدمی زہریلے لہجے میں کہتا۔

"تم ہر بار اس کے پیشے کو کیوں بھول جاتے ہو۔" مجیب جھنجلاتا۔

"تم سے زیادہ کون جانتا ہے کہ اس کا کوئی پیشہ نہیں۔ وہ ایک پاک دامن' اچھوتی لڑکی ہے۔ بس تم یہ نہیں جانتے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔ کتنا ہی چھ

آخر میں ماننا پڑے گا۔۔۔ اور وہ بھی ذلیل ہو کر۔"

"ربش.... یہ کیا بکواس ہے۔ محبت والی تھیوری تو آپ ہی غلط ثابت ہو گئی۔"

اس واقعے سے مجیب کو ایک بڑی مضبوطی حاصل ہوئی تھی۔ وہ اپنے اندر کے ہیرو اور ضمیر کو لاجواب کر دیتا تھا لیکن غیر شعوری طور پر اسے احساس تھا کہ اسے اور زیادہ مضبوطی کی ضرورت پڑے گی۔ وہ جانتا تھا کہ صفیہ کو اس کی حیثیت میں فکس کرنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنے اندر کے ویلن کو بھی تقویت پہنچانی ہے۔

پانچویں روز صفیہ اس کے لئے چائے لے کر آئی تو اس نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ نظریں جھکا کر بیٹھ گئی۔ مجیب چند لمحے اسے بغور دیکھتا رہا پھر بولا "اس رات جو کچھ ہوا' مجھے اس پر افسوس ہے۔"

"افسوس مجھے بھی ہے.... شاید آپ سے بہت زیادہ۔"

مجیب نے سوچا کہ اب یہ اپنی مظلومیت کا رونا رو کر اس کے سر پر سوار ہونے کی کوشش کرے گی لیکن وہ جانتا تھا کہ اسے اس سے کیسے نمٹنا ہے "تم میری برابری کر رہی ہو؟" اس نے خطرناک حد تک نرم لہجے میں کہا۔

"یہی ایک معاملہ تو ہے کہ جس میں آپ کی برابری کر سکتی ہوں میں۔" صفیہ کی نظریں اب بھی جھکی ہوئی تھیں۔

"جبکہ تم نے مجھے اپنے افسوس کی وضاحت بھی نہیں کرنے دی۔" مجیب بولا "اور تمہارا کہنا ہے کہ تمہیں مجھ سے بہت زیادہ افسوس ہے۔"

"وضاحت کی ضرورت نہیں۔ میں جانتی ہوں اور یہی تو وہ مقام ہے' جہاں میں اور آپ متفق ہو گئے ہیں۔"

"لیکن تمہیں اور بات پر تاسف ہے اور مجھے اور بات پر...."

"جی نہیں۔ آپ کا اور میرا تاسف ایک ہی ہے۔" صفیہ نے بڑے اعتماد سے کہا "مجھ سے زیادہ کون جانتا ہے کہ میرے ساتھ یہی ہونا تھا۔ اسی انجام کی مستحق تھی میں لیکن آپ بلند آدمی تھے۔ آپ خوامخواہ گر گئے.... میری وجہ سے۔ مجھے اس زیاں پر کتنا افسوس ہے' آپ اس کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے۔" وہ کہتے کہتے رکی "لیکن عزت ذلت' بلندی' پستی اللہ کی طرف سے ہے۔ میری دعا ہے کہ وہ آپ کو ہمیشہ ایسا ہی

سربلند رکھے۔ آپ کو اور بلندی عطا کرے۔"

مجیب سن ہو کر رہ گیا۔ یہ تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ تو صفیہ کو ذلیل کرنا.... اس کی اوقات یاد دلانا چاہ رہا تھا۔ اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

صفیہ چند منٹ بعد اٹھنے لگی "اب میں جاؤں؟"

اگر وہ اس وقت چلی جاتی تو مجیب ہمیشہ کے لئے کھسیانا ہو کر رہ جاتا۔ اسے روکنا ضروری تھا "بیٹھو تو۔" اس نے کہا "تم نے یہاں میرے پاس بیٹھنا ہی چھوڑ دیا۔ کیوں؟"

"میں پہلے ہی جانتی تھی کہ میرے یہاں بیٹھنے سے آپ ڈسٹرب ہوتے ہیں مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ اتنا زیادہ ڈسٹرب ہوتے ہوں گے اور میں آپ کو ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتی۔" اس نے سادگی سے کہا۔

مجیب تک اس کی بات پوری طرح پہنچ گئی۔ وہ شرمندہ ہوا۔ صفیہ اس کی نظر بازی سے واقف تھی۔ اس نے خود کو جتنا نہاں رکھنے کی کوشش کی تھی' اس سے کہیں زیادہ عیاں ہو گیا تھا۔



مجیب کے دماغ پر جسمانی تقاضے بری طرح سوار ہو گئے تھے۔ یہ اس کے لاشعور کی کارروائی تھی' جس نے سمجھ لیا تھا کہ اس تیر سے باآسانی دو شکار کئے جا سکتے ہیں۔ صفیہ کو اس کی اوقات یاد دلا کر اس میں رہنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے اور محبت کے فتنے کو بھی ختم کیا جا سکتا ہے۔

اس رات وہ حسب معمول سونے کے لئے لیٹنے تو وہ بہت بے چین تھا۔ اس کے اندر ایک کشمکش ہو رہی تھی۔ وہ خود سے لڑ رہا تھا' بالآخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گیا۔ صفیہ اس کی طرف پیٹھ کئے لیٹی تھی مگر وہ جانتا تھا کہ وہ ابھی سوئی نہیں ہے۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر صفیہ کو سیدھا کیا اور اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

صفورہ جانتی تھی کہ یہ مرحلہ آئے گا۔ اس نے خود کو اس کے لئے پوری طرح تیار کر لیا تھا۔ وہ اس کی کیفیت خوب سمجھ رہی تھی۔ بڑا آدمی گرتا ہے تو بہت زبردست دھماکا ہوتا ہے۔ اپنے گرنے کے صدمے میں وہ مزید گرتا رہتا ہے۔ گرتا چلا

جاتا ہے۔ اسے رنج تھا کہ یہ سب کچھ اس کی وجہ سے ہوا۔ وہ اس سے محبت کرتی تھی۔ اس کی محبت میں کوئی کھوٹ نہیں تھی اور یہ بھی نہیں کہ اسے اس سے محبت کا حق نہ ہو۔ محبت تو کسی کو بھی ہو جاتی ہے.... کسی سے بھی ہو جاتی ہے۔ اس پر کب کسی کا اختیار ہے لیکن اس کے آداب ہوتے ہیں۔ جہاں محبت کا حق نہ ہو اور محبت ہو جائے' وہاں محبت کرنے والے کو اپنے ساتھ بہت سختی سے کام لینا ہوتا ہے۔ اسے خود کو باندھ کر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس نے محبت میں ناروا قدم اٹھایا تھا اور اس کی سزا اسے بھگتنی تھی لیکن بری بات یہ تھی کہ اس میں مجیب کو نقصان پہنچ گیا تھا اور قصوروار وہ تھی۔

اسی لئے تو وہ خود کو بھول کر اس کے لئے اس کی سربلندی کے لئے دعائیں کرتی رہی تھی لیکن اسے یقین تھا کہ قیامت کی گھڑی تمام نہیں ہوئی۔ وہ بار بار آتی رہے گی۔ بلکہ ممکن ہے کہ ہر رات آئے۔

اس نے سر گھما کر دیکھا تو اور رنج ہوا۔ مجیب کا دلکش چہرہ وحشت کی وجہ سے مسخ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دیوانگی تھی۔

"میں تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔" مجیب نے اس کی چادر نوچ کر پھینک دی "اس کے لئے خوب تڑپایا' خوب اکسایا ہے تم نے مجھے۔"

صفورہ نے سانس روک لی۔ آنکھیں بند کر لیں۔ مجیب پر وحشت طاری تھی۔ یہ کیسی توہین' کیسی تذلیل برداشت کر رہی ہوں میں۔ ایسا تو کبھی تصور میں بھی نہیں تھا۔ صفورہ کی آنکھیں آنسوؤں سے جلنے لگیں۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مجیب اس کے آنسو دیکھے۔ جانتی تھی کہ آنسو دیکھ کر اس کی وحشت اور سوا ہو جائے گی۔ اس کا رد عمل اور شدید ہو گا۔ چنانچہ بند آنکھوں کے پیچھے ہی اس نے آنسوؤں کو پی لیا اور وہ آنسو زہریلے تھے۔ وہ دل پر گرے تو دل میں آگ سی لگ گئی۔ بلکہ لگتا تھا' دل ہی جل رہا ہے۔

قیامت کی گھڑی گزر گئی۔ اس نے آنکھیں اب بھی نہیں کھولیں لیکن چادر کھینچ لی۔ آہٹوں سے پتہ چلا کہ مجیب اٹھ کر ایک طرف گیا ہے۔ چند لمحے بعد وہ واپس آیا اور بستر پر بیٹھتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر ہتھیلی پھیلائی' اس پر کچھ رکھا اور مٹھی بند کر

دی۔ ”یہ رکھ لو۔ یہ تمہارا حق ہے۔“

صفورہ نے تڑپ کر آنکھیں کھولیں اور مٹھی کھول کر دیکھا۔ وہ دو نوٹ اسے اندھیرے میں بھی نظر آ گئے ”یہ...یہ...یہ کیا...؟“ اس نے بمشکل کہا۔

”یہ معاہدے سے ہٹ کر ہے۔ اسے اوور ٹائم سمجھ لو۔“

صفورہ کو پورے جسم کا خون سمٹ کر اپنے چہرے پر آتا محسوس ہوا۔ اسے لگا کہ وہ دھماکے سے پھٹ جائے گی۔ یا اللہ... میرے محبوب کے ترکش میں اور کتنے تیر باقی ہیں۔ کیا باقی زندگی مجھے ہر لمحہ مرنا ہو گا۔ اس کے دل نے فریاد کی۔ یہ کیسی سزا ہے۔ کبھی ختم بھی ہو گی؟

اس نے نوٹ یوں پھینک دیئے‘ جیسے وہ بچھو ہوں اور انہوں نے اس کے ہاتھ پر ڈنک مار دیا ہو۔ لفظ اوور ٹائم دماغ پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا۔

”کیوں... کیا ہوا؟“ مجیب نے معصومیت سے پوچھا ”کم ہیں؟“

”پلیز مجیب صاحب... پلیز‘ آپ ایسا نہ کریں۔“ وہ ڈوبتی آواز میں بولی ”مجھے کچھ بھی نہیں چاہئے۔“

مجیب کو اسی موقعے کا انتظار تھا۔ وہ اسے کچل دینا چاہتا تھا ”اب تم کہو گی کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ اس لئے کاروبار نہیں کرو گی۔“ اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

”جی نہیں۔ میں پاکیزہ دعووں کو بہت محترم سمجھتی ہوں۔ انہیں توہین و تذلیل کے راستے پر پاؤں تلے روندے جانے کے لئے کبھی نہیں بچا سکتی۔ بس آپ ایسا نہ کریں۔“

”کیوں... توہین کا احساس ہوتا ہے؟“

”نہیں۔ جو اپنا لکھا ہوا مقدر ہو‘ اس کا احساس کیا کرنا۔ آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ اپنے ساتھ ایسا نہ کریں۔“

”کیا مطلب...؟“

”دیکھئے۔ شاید یہ راستہ میری تقدیر بن چکا ہے۔ آپ سے بچھڑنے کے بعد نہیں میرا کیا ہو۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ ساری عمر خود کو الزام دیں۔ یہ سوچ پچھتاووں کے بوجھ تلے سسکیں کہ مجھے اس راہ پر ڈالنے والے پہلے آدمی آپ تھے۔“

مجیب لرز کر رہ گیا۔ یہی بات تو اس کے ضمیر نے کہی تھی اس سے ”مگر تم مجھے کیوں بچانا چاہتی ہو احساس جرم سے؟“

”اس لئے کہ مجرم آپ نہیں‘ میں ہوں۔ اس راستے پر آپ نے مجھے نہیں ڈالا۔ میں نے خود کو ڈالا ہے۔ آپ کو تو کچھ بھی معلوم نہیں۔“

مجیب کو اس پر پیار آنے لگا تھا۔ لہٰذا فوراً ہی اس نے سختی اوڑھ لی ”یہ تو تمہیں لینے ہی پڑیں گے۔“

”سوری مجیب صاحب۔ آپ میرے ساتھ جو چاہے کریں‘ مجھے شکایت نہیں ہو گی لیکن یہ ممکن نہیں۔“ صفورہ کے لہجے میں قطعیت تھی۔

”یہ نہ لے کر تم میری تباہی کا سامان کر رہی ہو۔“

”میں سمجھی نہیں۔“

اپنی اس بات کا مطلب مجیب اس وقت خود بھی نہیں سمجھا تھا ”دیکھتی رہو۔ سمجھ میں آ جائے گا۔“ اس نے بے رخی سے کہا اور کروٹ بدل لی۔

دونوں نوٹ فرش پر پڑے رہے۔



نفس امارہ ایک ایسے منہ زور گھوڑے کے مانند ہوتا ہے‘ جسے باگیں کھینچ کر سختی سے قابو میں رکھنے ہی میں عافیت ہے۔ اس کی ہوس کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔ اسے ذرا سی چھوٹ ملے تو یہ مادر پدر آزاد ہو جانا چاہتا ہے۔ اسے اس کی خوشی اور سرمستی کے چند لمحے مل جائیں تو یہ ساعتوں کا مطالبہ کرنے لگتا ہے۔

مجیب انور کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ وہ وحشت زدہ رہنے لگا تھا۔ درشتی اس کی چہرے پر چپک کر رہ گئی تھی۔ آنکھوں سے ہر وقت سختی جھلکتی رہتی۔ وہ بے سکون ہو گیا تھا۔ اپنا آپ اسے برا لگنے لگا تھا لیکن وہ اس سلسلے میں سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا دماغ اس کے طے شدہ راہ سے ہٹ کر نہیں چلتا تھا۔ وہ اپنی غلط سوچوں پر راسخ ہو گیا تھا۔

کام البتہ وہ ٹھیک ٹھاک اور ذرا تیز رفتاری سے کر رہا تھا۔ کبھی اسے خیال آتا کہ وہ اپنے برے اعمال کے حصار میں اس طرح قید ہو گیا ہے کہ کچھ اچھا کرنا اس کے

اختیار میں نہیں رہا۔ اسے اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہئے لیکن وہ اس پر غور کرتا تو اسے چکر آنے لگتے۔ برائی اس پر پوری طرح حاوی آگئی تھی۔ کبھی وہ سوچتا کہ وہ کیسا قابل فخر اور صاحب کردار تھا۔ شاید اس کے غرور نے اسے یہ دن دکھایا ہے۔ اس نے خود پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کر کے اپنے آپ کو آزمائش میں ڈالا تھا اور نتیجے میں شکست کھا گیا۔

مگر یہ اچھی سوچ بس لمحاتی ہوتی تھی۔ چند لمحے بعد اس کا نفس اس سے مطالبے شروع کر دیتا۔ اس کا ذہن پراگندہ ہو جاتا۔

رات کو سوتے وقت اور مصیبت ہوتی۔ نفس بپھرتا' پکارتا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ صفیہ کو مسل ڈالے۔ کچل ڈالے لیکن وہ پیسے لینے سے انکار کر چکی تھی اور وہ اس کے بغیر اس سے تعلق رکھنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اسے ٹھیک سے نیند نہیں آتی تھی مگر وہ اپنے موقف پر ڈٹا ہوا تھا۔

یوں تین بے کیف راتیں گزر گئیں!

چوتھی رات جیسے تیسے وہ سو گیا۔ لیکن برے برے خواب دیکھتا رہا پھر ایک موقع پر اس کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھیں کھلتے ہی اسے سحاب کا چہرہ نظر آیا۔ وہ اس کی طرف رخ کئے اس کے قریب..... بہت قریب سو رہی تھی۔ اس کا معصوم اور پاکیزہ چہرہ سوتے میں بہت حسین لگ رہا تھا۔

ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ یہ سحاب تو نہیں ہو سکتی۔ وہ یہاں کہاں مگر آنکھیں مل مل کر دیکھنے پر بھی اس چہرے کے خد و خال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ وہ خوشی کے احساس سے لبالب بھر گیا۔

ایسی سچی خوشی اسے طویل عرصے کے بعد ملی تھی۔ وہ تو اس کے لئے ترس گیا تھا۔ بھول ہی چکا تھا۔ ایک عجیب سی بے تابی اس کے اندر امنڈنے لگی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بڑی نرمی اور محبت سے اسے چھو لیا.....



صفورہ بہت بے سکون اور دکھی ہو گئی تھی۔ اس کے روز و شب بے کیفی سے گزر کر اذیت ناکی کی حدود میں داخل ہو گئے تھے۔ مجیب انور اس کا پسندیدہ شخص

تھا..... اس کا آئیڈیل اور اس نے اسے بہت اچھا دیکھا اور پایا تھا مگر اب وہ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے تباہ ہوتے دیکھ رہی تھی اور بے بسی سے کڑھنے کے سوا وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اس رات کے بعد وہ بالکل بدل کر رہ گیا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ وہ اس موضوع پر اس سے کھل کر بات بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسے اندازہ تھا وہ معقولیت کے موڈ میں ہے ہی نہیں۔ وہ جانتی تھی کہ نامعقولیت اس کے اندر پہلے سے پل رہی تھی۔ اگرچہ اتنی طاقت ور نہیں تھی۔ اس کا ثبوت یہ تھا کہ وہ اس سے بلا وجہ چڑنے اور جھنجلانے لگا تھا۔ اس کا سبب وہ نہیں سمجھ سکی۔ ورنہ اس سبب کو ہی دور کرنے کی کوشش کرتی۔ جو کچھ وہ سمجھ سکی تھی' اس کے تحت اس کا سبب وہ خود تھی۔ شاید اس کا وجود ہی اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر دیتا تھا۔ اس کے اندر ایک تضاد موجود تھا۔ کبھی وہ اس میں دلچسپی لیتا اور کبھی توہین کی حد تک نظر انداز کرنے لگتا۔

پھر اس رات جو کچھ ہوا' اس سے ثابت ہو گیا کہ وہ اسے اہمیت دیتا رہا ہے لیکن ہر چیز منفی رخ اختیار کر گئی تھی اور اس کے بعد وہ بتدریج اسے خراب سے خراب تر ہوتا دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر چھائی رہنی والی نرمی اور شگفتگی کی جگہ کرختگی نے لے لی تھی۔ مسکراتی آنکھوں کی معصومیت نجانے کہاں جا کھوئی تھی۔ اب تو ان آنکھوں میں بس نفسانی خواہش ہلکورے لیتی نظر آتی تھی۔ اذیت ناک بات یہ تھی کہ بڑے سکون سے' سرد مزاجی سے ایسی گھٹیا باتیں کر گزرتا تھا' جو اس کے شایان شان نہیں تھیں۔ وہ دانستہ اسے اذیت پہنچانے کی کوشش کرتا تھا۔

صفورہ کو اپنے سلسلے میں اس سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اس کا رونا بس یہ تھا کہ وہ کیا سے کیا ہوا جا رہا ہے۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ جان دے کر بھی اس اچھے مجیب انور کو واپس لانے کی کوشش کرتی' جو اس کا آئیڈیل تھا لیکن یہ اس کے اختیار میں نہیں تھا۔

اس واقعے کے بعد سے اب تک کبھی وہ اچھی نیند نہیں سو سکی۔ نیند دیر سے آتی اور گہری بھی نہ ہوتی۔ اس کے نتیجے میں اس پر اضمحلال طاری ہونے لگتا۔ مجیب کے لئے وہ اس حد تک پریشان تھی کہ اسے اپنے عدم تحفظ کے بارے میں سوچنے کی

مہلت بھی نہیں مل رہی تھی۔

اس رات بھی سونے سے پہلے وہ دیر تک یونہی لیٹی رہی۔ بالآخر اسے نیند آگئی۔ خواب میں اس نے ویسا ہی منظر دیکھا' جیسا اسکرپٹ لکھتے ہوئے مجیب کی مدد کرنے میں اسے سنایا تھا فرق یہ تھا کہ اس بار کردار وہ خود تھی۔

وہ ایک صحرائے عظیم میں کھڑی تھی۔ سورج نصف النہار پر تھا اور آگ برساتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے پیروں میں چھالے تھے۔ ایک قدم اٹھانا بھی دوبھر تھا اور پیاس کی شدت کا یہ عالم تھا کہ حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے اور زبان اینٹھ گئی تھی۔ حد نظر تک ریت کے سوا کہیں کچھ نہیں تھا۔ وہ مایوس تھی۔

اچانک اس کے چہرے پر نرم پھوار پڑنے لگی۔ اس نے چہرہ اوپر کی طرف اٹھایا۔ بارش کے چند قطرے اس کے ہونٹوں پر پڑے۔ اس نے ہونٹ کھول دیئے۔ تاکہ حلق تر کر سکے۔

پھر وہ خواب دیکھتے دیکھتے چونکی۔ اس کے چہرے پر سچ مچ پھوار گر رہی تھی۔ محبت کی پھوار۔ وہ جاگ گئی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور حیران رہ گئی۔ مجیب بڑی محبت اور والہانہ نرمی سے اس کے چہرے کو چھو رہا تھا۔ اندھیرے میں وہ اس کا چہرہ تو نہیں دیکھ سکی مگر وہ مجیب کے سوا کون ہو سکتا تھا اور وہ لمس ایسا جیتا جاگتا اور منہ سے بولتا تھا کہ اس کے چہرے کا تاثر دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ سراپا سپردگی بن گئی۔

نگاہیں اندھیرے سے ہم آہنگ ہوئیں تو صفورہ نے اسے دیکھا۔ وہ وہی تھا' جس کی محبت میں وہ گرفتار ہوئی تھی۔ وہ نہیں' جو وہ پچھلے ایک ہفتے میں بن گیا تھا۔ اس کے ہر انداز میں نرمی تھی' ایذا رسانی نہیں۔ وہ جارحیت نہیں' محبت کر رہا تھا۔ وہ توہین نہیں کر رہا تھا' عزت دے رہا تھا۔

طلسم ٹوٹا مگر پھر بھی نہیں ٹوٹا۔ وہ اسی سحر میں گم تھی پھر ایک عجیب سی آواز نے اسے چونکا دیا۔ وہ مجیب تھا لیکن اس کا چہرہ بدل گیا تھا..... مسخ ہو گیا تھا۔ وہ اسے دوبارہ پہلے والے عالم میں دیکھ کر گھبرا گئی..... ڈر گئی!



مجیب بہت خوش تھا۔ اتنے عرصے بعد اپنی سحاب اسے ملی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ

اس کے سامنے دل کا ہر بوجھ ہلکا کر دے۔ اسے بتا دے کہ وہ کیسی اذیتیں سہتا رہا ہے۔ لیکن اس کی قرب کی لطافت اسے پکار رہی تھی۔ وہ بے تاب ہو رہا تھا۔ باتیں تو وہ کسی بھی وقت کر سکتا تھا۔

ہمیشہ کی طرح اسے نیند آنے لگی۔ اس کی عادت تھی کہ وہ سحاب سے لپٹ کر بے سدھ ہو کر سو جاتا تھا اور وہ اتنی تیزی سے سوتا تھا' جیسے اسے نیند کا کوئی سریع الاثر انجکشن لگا دیا گیا ہو۔

مگر نیند میں گم ہوتے ہوئے اسے خیال آیا کہ اسے تو سحاب سے بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ یہ اب ممکن نہیں تھا۔ نیند ہی ایسی آ رہی تھی۔ اس نے سوچا' وہ سحاب کا چہرہ دیکھے گا اور سو جائے گا۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے آنکھیں کھولیں اور ہکا بکا رہ گیا۔ وہ سحاب نہیں' صفیہ تھی۔

غصے اور وحشت سے اس کا چہرہ مسخ ہو کر رہ گیا۔ تو یہ سراب تھا..... دھوکا۔ اسے پہلے ہی سمجھ لینا چاہئے تھا کہ اس کی نظریں دھوکا کھا رہی ہیں۔ سحاب سے تو وہ کب سے بچھڑا ہوا تھا۔ یہاں تو وہ صفیہ کے ساتھ تھا۔ صفیہ جو اپنی اصل حیثیت تسلیم کر کے اس کے لئے آسانیاں پیدا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ جو سطحی اور وقتی ضرورت کو گہرے سچے جذبوں کا رنگ دے کر اسے ایکس پلائٹ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ نجانے اس کے کیا عزائم تھے۔

اس نے صفیہ کو دیکھا' جس کے چہرے پر ابتدا میں پھیلنے والی حیرت کی جگہ گھبراہٹ نے لے لی تھی۔ وہ جھنجلانے لگا۔ یہ غلطی بہت بڑی تھی۔ ایک فریب نظر کا شکار ہو کر اس نے اپنی ازدواجی زندگی کی سچی خوشیوں سے بھرے لمحے صفیہ کی گود میں ڈال دیئے تھے' جو ان کی مستحق نہیں تھی۔ اب وہ کیا کرے۔ وہ واپس تو نہیں لئے جا سکتے۔ ہاں' وہ انہیں خراب کر سکتا ہے۔ صفیہ کو اس کی اوقات یاد دلا سکتا ہے۔

اس نے جیب سے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا "یہ لو۔"

صفورہ نے زخمی نگاہوں سے اسے دیکھا "میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں....." اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"رکھ لو۔ کاروبار میں مروت نہیں چلتی۔" اس نے نپے تلے مصنوعی تحمل سے

کہا۔

"آپ.... آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں؟" صفورہ تقریباً رو دی۔

"ایک دکان دار جہاں آسودہ لمحے ملتے ہیں۔"

صفورہ رونا نہیں چاہتی تھی۔ جب آدمی کو رونا آئے اور وہ رونا نہ چاہے تو مشتعل ہو جاتا ہے۔ یہی صفورہ کے ساتھ ہوا "آپ کاروبار کو سمجھتے بھی ہیں؟ دکان کی تعریف بھی معلوم ہے آپ کو؟" اس نے چیلنج کیا۔

مجیب طمانیت سے مسکرایا۔ وہ زخمی نظر آ رہی تھی "تم ہی بتا دو۔"

"دکان کی پہلی شرط یہ ہے کہ وہ بازار میں ہو' جہاں مسابقت ہوتی ہے۔ جہاں کسی چیز یا چیزوں کے ایسے خریدار موجود ہوں' جن کے پاس قوت خرید بھی ہو اور خواہش خرید بھی' دکان جہاں اشیا کی قیمتوں کا تعین مسابقت کے نتیجے میں ہوتا ہو۔ اب بتائیے' میں دکان ہوں؟"

"تم تو برا مان گئیں۔" مجیب نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔ "کاروبار دو افراد کے درمیان بھی تو ہوتا ہے۔"

"جی ہاں لیکن اس میں کوئی فریق دکان دار نہیں ہوتا۔ پہلے آپ یہ تسلیم کریں کہ میں دکان نہیں ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ تسلیم کر لیا۔"

"تو دو افراد کے درمیان جو کاروبار ہوتا ہے' وہ بارٹر سسٹم کے تحت ہوتا ہے۔ خواہ تبادلے میں زر ہی کیوں نہ لیا جائے...."

"تو لے لو نا۔ یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔"

صفورہ نے بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا "پلیز مجھے بات پوری کرنے دیں۔ آپ کے اور آپ کی بیگم کے درمیان جو کاروبار ہو رہا ہے...."

مجیب کا چہرہ تمتما اٹھا۔ اسے احساس نہیں تھا کہ چھینٹے اڑ کر اس تک بھی آ سکتے ہیں۔ لیکن بات شروع اس نے ہی کی تھی۔ وہ غصہ نہیں کر سکتا تھا "یہ اور بات ہے۔" اس نے تحمل سے کہا۔ "وہاں بات کسی ایک کی ضرورت کی نہیں۔ دونوں کی بے شمار ضرورتیں ہیں۔ لہٰذا بارٹر سسٹم کے تحت فیصلہ نہیں ہو سکتا...."

"جی نہیں۔" صفورہ نے اس کی بات کاٹ دی "اصل ضرورت مند آپ کی بیگم ہیں اور بنیادی ضرورت ایک ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"انہیں آپ سے معاشرتی اور معاشی تحفظ چاہئے۔ معاشرے میں ایک باعزت مقام.... یعنی بیوی کا۔ یہ ان کی بنیادی ضرورت ہے۔ یہ ایک کمیاب جنس ہے' جو آسانی سے نہیں ملتی۔ اس کے عوض وہ آپ کو رفاقت' محبت اور وفا دیتی ہیں۔ آپ کا خیال رکھتی ہیں۔ آپ کے گھر کو سنبھالتی ہیں اور آپ کو آسودگی کے لمحے دیتی ہیں۔ صرف ایک معاشرتی تحفظ کے بدلے وہ آپ کی ہر ضرورت پوری کرتی ہیں۔"

مجیب کھسیانے لگا۔ وہ خود کو بری طرح گھرا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ "اور میں جو اس سے محبت کرتا ہوں۔" اس نے کہا۔

"محبت کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ نہ کوئی اس کی قیمت دے سکتا ہے' نہ اس کی ضرورت ہے۔ محبت کے دو رخ ہیں۔ محبت کرنے والے کے لئے وہ مجبوری ہے۔ اسی لئے وہ اس کی قیمت وصول نہیں کر سکتا۔ مجبوری تو مجبوری ہے نا۔ دوسری طرف محبوب کے لئے وہ آسمانوں پر لکھا جانے والا رزق ہے۔ وہ اس کی خوش قسمتی ہے۔ محبت کرنے والے مجبور کو قیمت تو کیا ملے گی۔ کبھی کبھی تو اس میں عزت بھی چلی جاتی ہے۔ ذلت اور پستی ملتی ہے اور وہ پھر بھی محبت کئے جاتا ہے۔ مجبور جو ہوا۔" آخری بات کہتے کہتے اس کے لہجے میں درد آ گیا۔

"تم موضوع سے ہٹ گئیں۔" مجیب نے سرد لہجے میں کہا۔ "حقیقت تو یہ ہے کہ تمہارے اور میرے درمیان بھی کاروبار ہو رہا ہے۔ تم میری بہت اہم ضرورت پوری کر رہی ہو۔ مجھے آسودگی کے لمحے فراہم کرتی ہو۔ بدلے میں میں بھی تو تمہیں کچھ دوں گا۔ کاروبار یک طرفہ تو نہیں ہوتا۔"

"درست ہے مگر یہ کاروبار نہیں۔ میرے اور آپ کے درمیان یہ طے نہیں ہوا کہ میں آپ کی ضرورت پوری کروں گی۔ نہ ہی کوئی قیمت طے ہوئی...."

"وہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ کاروبار ہے تو میں تمہیں اپنی حیثیت کے مطابق قیمت دے رہا ہوں۔ تمہیں زیادہ چاہئے تو بتا دو۔"

صفورہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا "منہ مانگی قیمت دیں گے آپ؟" اس کے لہجے میں چیلنج تھا۔

مجیب خاموش رہا۔ وہ نروس ہو گیا تھا۔

"بات صرف جسمانی آسودگی کی نہیں۔" صفورہ نے تند لہجے میں کہا "میں نے آپ کو ہر وہ آسائش فراہم کی' جو آپ کی بیگم دے سکتی ہیں۔ یہاں تک کہ....." وہ کہتے کہتے رک گئی اور دانتوں سے ہونٹ کاٹنے لگی "اور ہمارے درمیان ایک معاہدہ بھی ہوا تھا۔ مجھے پیسے کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میں نے ہر چیز کے بدلے صرف ایک چیز مانگی تھی آپ سے..... عزت اور احترام۔ آپ نے مجھ سے وہ بھی چھین لیا۔ آپ نے تذلیل کی میری پھر بھی میں معاہدے کا پاس رکھ رہی ہوں۔ اب آپ مجھے دکان' اس جگہ کو بازار اور خود کو تماش بین بنانے پر اصرار کرتے ہیں تو میں مزاحمت کروں گی۔ کرتی رہوں گی۔ اپنے لئے نہیں' آپ کی خاطر لیکن معاہدے سے کبھی منہ نہیں پھروں گی میں۔"

"کیوں؟ کس لئے؟"

"میری مجبوری ہے۔ میں مجبور ہوں۔" صفورہ نے دھیمے لہجے میں سادگی سے کہا۔

مجیب ہل کر رہ گیا۔ بیک وقت اتنا ڈھکا چھپا اور اتنا صاف اور واضح' اتنا مختصر اور جامع اظہار محبت کب کسی نے کیا ہو گا۔ ایسے کہ اس ظاہر پر گرفت بھی نہ کی جا سکے اور ایسے کہ اس سے انکار بھی ممکن نہ ہو۔ پہلے اس نے کہا کہ محبت تو مجبوری ہے' کسی کا رزق ہے جو کسی اور پر اترتا ہے اور جس پر اترے وہ اسے حق دار تک پہنچانے پر مجبور ہوتا ہے اور اب اس نے کہا کہ وہ مجبور ہے۔ جو کر رہی ہے' جو اسے کرنا ہے اس سے منہ نہیں پھیر سکتی۔

اس نے شروع ہی میں دیکھ لیا تھا کہ وہ ایک غیر معمولی لڑکی ہے۔ پڑھا لکھا ہونا کوئی بڑی بات نہیں مگر وہ دانش مند بھی تھی۔ مطالعہ بھی تھا اس کے پاس۔ لفظ تھے۔ اپنی بات موثر پیرائے میں کہنا جانتی تھی۔ اس کے پاس قوت استدلال بھی تھی اور قوت تجزیہ بھی۔ جس حیثیت میں وہ اس کے ساتھ آئی تھی' اس میں وہ بے حد خطرناک لڑکی تھی اور یہ بات اس نے شروع ہی میں سمجھ لی تھی۔ اس نے اس

خطرناکی کم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ شاید اسی کے نتیجے میں یہ سب کچھ ہوا۔ اس سلسلے میں شاید کا استعمال وہ صرف اس لئے کر رہا تھا کہ فی الحال تجزیہ کرنا اس کے لئے ممکن نہیں تھا۔

بہرکیف اس وقت اسے بدترین شکست ہوئی تھی۔ اس کے پاس جواب میں کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا اور سن اتنا کچھ لیا تھا اس نے۔

وہ خاموشی سے منہ لپیٹ کر لیٹ گیا!



اگلے روز اس سے کام بالکل نہیں کیا گیا۔ مسئلہ صفیہ کی گزشتہ رات کی گفتگو بالکل نہیں بنی۔ اسے تو اس نے نہایت آسانی سے پس شعور میں دھکیل دیا تھا۔ صفیہ کی باتوں پر سوچنے اور صورت حال کا تجزیہ کرنے سے وہ ڈر رہا تھا۔ اسے خوف تھا.... اور لاشعوری طور پر وہ جانتا تھا کہ زیادہ سوچنے اور کریدنے پر کوئی ایسی بات سامنے آئی گی، جس کا وہ سامنا نہیں کرنا چاہتا۔ جو صورت حال کو پاگل کر دینے والی حد تک پیچیدہ بنا دے گی۔ چنانچہ اس پورے معاملے کو ذہن کے نہاں خانے میں ڈال دینا ہی بہتر ہے۔

اب اس کے ساتھ کچھ اور ہی ہوا۔ وہی جو شیر آیا.... شیر آیا.... کی آواز لگانے والے لڑکے کے ساتھ ہوا تھا۔ یعنی شیر سچ مچ آ گیا.... اور بچانے والا کوئی نہیں تھا۔

اپنے اندر اس نے بڑی شدت سے جسمانی تقاضوں کا ڈھنڈورا پیٹا تھا۔ دوسری طرف نفس کو جو ایک نئی لذت ملی تو وہ پھیل کر دنبہ بن گیا۔ اب اسے پتہ چلا کہ جسمانی تقاضے کیا ہوتے ہیں، کتنے طاقت ور ہوتے ہیں اور کس طرح آدمی کو پاگل بنا دیتے ہیں۔ یہ تجربہ اسے پہلی بار ہوا تھا۔ اس لئے اور زیادہ سخت تھا۔ اسے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ انہیں کس طرح دبایا جا سکتا ہے۔ ان سے کیسے لڑا جاتا ہے۔

قلم ہاتھ میں لئے وہ پاگلوں کی طرح نجانے کیا کیا سوچتا رہا۔ اس وقت وہ نہایت بے بس تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ تصور اور تخیل، جو اس کا اثاثہ تھا، جو اس کے کام کو بلندی کی طرف لے جاتا تھا، جو اس کے لئے بے حد محترم اور مقدس تھا، کتنا شرم ناک ہو سکتا ہے۔

اس روز وہ ٹھیک سے کھانا بھی نہیں کھا سکا۔ دماغ بھی ماؤف ہوا جا رہا تھا۔ جیسے وہ کسی شے کا عادی ہو چکا ہو اور اب اس کی طلب کے ہاتھوں خوار ہو رہا ہو۔ وہ جانتا تھا کہ تسکین کا سامان بہت قریب ہے.... اس کی پہنچ میں لیکن اس کے لئے اسے

شکست تسلیم کرنا تھی۔ یہ اسے گوارا نہیں تھا۔

"اب آئے ہو جسمانی تقاضوں کے پہاڑ کے نیچے۔" اندر کے آدمی نے طنز کیا۔

"میں تو پہلے ہی سے کہہ رہا تھا۔" اس نے کھسیا کر کہا۔

"پہلے صرف کہہ رہے تھے۔ اب بھگت رہے ہو۔ اب پتہ چلا کہ کیا ہوتے ہیں جسمانی تقاضے۔ کسی چیز کو خود پر طاری کرنا اور بات ہے اور اس کے تسلط میں آنا اور بات...."

"اب میں کیا کروں؟" اس نے بے بسی سے کہا۔

"کچھ بھی نہیں۔ محبت کو قبول اور تسلیم کرو۔ عزت اور احترام کے سکوں میں قیمت ادا کرو اور جو جی چاہے، خرید لو۔"

"یہ ممکن نہیں۔" اس نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کیا۔

"تو بازار بہت بڑا ہے۔ جاؤ اور ضرورت پوری کر لو۔"

یوں ایک در امکاں کھل گیا۔ واقعی.... بازار تو موجود ہے۔ جیب میں پیسہ ہو تو ضرورت کی کون سی ایسی چیز ہے، جو نہیں ملتی لیکن سوچنا آسان تھا اور عمل کرنے کا تصور بھی دشوار۔ مسئلہ وہی تھا۔ اسے اس کا تجربہ نہیں تھا اور وہ کوئی تماش بین نہیں تھا۔ اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی وہ عزت دار آدمی تھا۔ دنیا کی نظر میں بھی اور خود اپنی نظر میں بھی۔ وہ یہ سب کچھ کیسے کر سکتا تھا۔

اس نے تصور میں خود کو بازار میں پایا (وہ بازار کبھی نہیں گیا تھا۔ اس کے پاس وہی حوالے تھے جو اس نے فلموں میں دیکھے تھے) شام کا وقت تھا۔ بازار میں چہل پہل تھی۔ پھول والوں اور پان والوں کی دکانیں بھی کوٹھوں کی طرح سجی بنی تھیں۔ کوٹھوں کی طرف سے گھنگھروؤں، ہارمونیم اور طبلے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بالا خانوں پر سجی سنوری مورتیاں کھڑی تھیں۔ نیچے سڑک پر، ادھر ادھر گلیوں میں دلال پھر رہے تھے۔

"آؤ باؤ جی.... آؤ تو...." اسے ساحر لدھیانوی کی نظم یاد آ گئی.... ثنا خوان تقدیس مشرق کہاں ہیں۔

کیا وہ یہ سب کچھ کر سکے گا؟ اس نے سوچا اور فوراً ہی اس خیال کو اور ساحر کی نظم کو ذہن سے جھٹک دیا۔ یہ جدید دور تھا۔ وہ زمانہ نہیں تھا، جہاں یہ سب ضروری

ہو۔ شرفا گھر بیٹھے بھی اپنی ضرورت پوری کر سکتے ہیں۔ طوائف کا نام اب کال گرل ہے۔ کوٹھے اب بنگلوں میں اتر آئے ہیں۔ طبلے' ہارمونیم اور گھنگرو کی جگہ اب سی ڈی اسٹیریو ہے۔ معاملات ٹیلی فون پر بھی طے ہو جاتے ہیں۔ نائیکہ کو اب بصد احترام مسز ایکس کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اونچے حلقوں میں اس کا اثر رسوخ ہوتا ہے۔ مہمان داری گھر پر ہی ہو جاتی ہے اور ہوم سروس اور روم سروس کی سہولت بھی موجود ہے۔ ہوٹلوں میں ویٹر بے حد تہذیب سے کہتے ہیں....؟ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو بلاتکلف کہہ دیں سر۔ ہر طرح کی' ہر علاقے کی چیز موجود ہے۔ پہلے دیکھیں اور پسند کریں پھر جی چاہے تو ہائر کریں۔"

اسے خیال آیا کہ اتنا تجربہ تو اسے بھی ہو چکا ہے۔ اس میں کرنا بھی کیا ہوتا ہے۔ بس گئے اور ہوٹل میں ایک کمرا لے لیا۔ باقی کام ویٹر خود کر لے گا۔

لیکن اگر ہوٹل کی پالیسی محتاط ہوئی یا ویٹر شریف آدمی ہوا تو....تو؟ اسے گھبراہٹ ہونے لگی پھر اسے اپنا پچھلا تجربہ یاد آیا' جو خوش گوار ہرگز نہیں تھا اور جبکہ اس موقعے پر اسے صرف کمپنی کی ضرورت تھی۔ اس کی کوئی ایسی ویسی ضرورت' کوئی خواہش نہیں تھی۔ اس بار تو وہ ضرورت کے ہاتھوں ستایا ہوا تھا۔

اس کی ہمت بالکل ہی جواب دے گئی۔ اس کے نتیجے میں ڈپریشن بڑھنے لگا۔ اچانک اسے جمشید یاد آ گیا۔

جمشید کالج کے زمانے میں اس کا ہم جماعت رہا تھا۔ دونوں میں بہت گہری دوستی تھی۔ کالج سے نکل کر وہ بچھڑ گئے۔ ان کے درمیان رابطہ نہیں رہا پھر سات سال پہلے جمشید نے اتفاق سے شاہکار ڈائجسٹ میں اس کا نام پڑھ لیا۔ کہانی سے تو اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اس نے شاہکار کی معرفت مجیب کو خط لکھ دیا۔ یوں ان کے درمیان رابطہ ہوا۔ دو سال پہلے مجیب پنڈی آیا تو جمشید کے پاس ہی ٹھہرا۔

جمشید عملی زندگی میں بہت کامیاب رہا تھا' پنڈی میں اس کی دو بڑی دکانیں تھیں۔ صدر بازار میں صرف ان دکانوں کی قیمت ہی لاکھوں کی تھی۔ کاسمیٹکس کی دکان وہ خود چلا رہا تھا اور الیکٹرونکس کی دکان اس کا چھوٹا بھائی۔

پچھلی بار قیام کی دوران مجیب کو پتہ چل گیا تھا کہ جمشید شوقین مزاج آدمی ہے۔

روپے پیسے کی فراوانی تھی۔ چنانچہ وہ خوب عیاشی کر سکتا تھا اور کرتا تھا۔ پینے پلانے کا بھی اسے شوق تھا اور حسن پرست تو وہ کالج کے زمانے سے ہی تھا۔ البتہ اب وہ حسن پرستی بوالہوسی کی حد میں داخل ہو چکی تھی۔

جمشید نے اپنے لئے ٹھکانے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ وہاں اس کے کسی شغل میں کوئی مداخلت کرنے والا نہیں تھا۔ مجیب نے پہلی بار اس کے ٹھکانے کو دیکھا تو وہ اسے بہت اچھا لگا۔ وہ تو ایک پرسکون گوشہ عافیت تھا۔ لکھنے کے لئے آئیڈیل جگہ مگر جب جمشید نے بوتل نکالی تو وہ بہت بدمزہ ہوا۔

مجیب کے منہ سے انکار سننے کے بعد جمشید بھی اتنا ہی بدمزہ ہوا "یار دیکھنے میں تو تم ایسے زاہد خشک نہیں لگتے۔"

"زاہد خشک ہوں بھی نہیں۔ بس پینے کو کبھی دل ہی نہیں چاہتا۔" مجیب نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اور مجھے اکیلے پینا اچھا نہیں لگتا۔ خیر کوئی مسئلہ نہیں۔ کمپنی تو ابھی مل جائے گی دو منٹ میں۔ تمہیں بھی اکیلے بور نہیں ہونے دوں گا۔"

"کیا مطلب؟"

جمشید نے وضاحت کی تو مجیب نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا "اللہ کا شکر ہے۔ اس شوق سے بھی محفوظ ہوں مگر یار بھابی اتنی اچھی ہیں۔"

"اسی لئے تو ملکہ بنا کر رکھا ہے اسے مگر یار میں روز ایک ہی تصویر دیکھنے کا قائل نہیں۔"

"اور مجھ سے کوئی اور تصویر دیکھی ہی نہیں جاتی۔" مجیب نے سرد آہ بھر کے کہا تھا۔

تو اس وقت جمشید کا خیال آیا اور گویا مسئلہ حل ہو گیا۔ اس نے جلدی سے اپنی ڈائری تلاش کی' اس میں سے جمشید کا پتہ اور فون نمبر نوٹ کئے پھر اس نے جمشید کا فون نمبر ملایا وہ اپنی دکان پر موجود تھا "کہاں سے بول رہے ہو؟ کراچی سے؟" جمشید نے پوچھا۔

"نہیں بھائی۔ میں اس وقت مری میں ہوں۔"

"کب آئے؟"

"ڈیڑھ مہینہ ہو گیا۔"

"اتنے قریب بیٹھے ہو اور آج میرا خیال آیا ہے۔ اتنے دن بعد۔"

"بہت مصروف تھا۔ کام کے سلسلے میں آیا ہوں۔" مجیب نے کہا اور وضاحت سے بتایا۔

"تو آج کیسے خیال آگیا۔"

"ہوم سک ہو رہا ہوں یار۔ دل بہت گھبرا رہا ہے۔ کام بھی نہیں ہو رہا ہے۔"

اس کے لہجے میں کوئی بات رہی ہو گی۔ جمشید نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "میں سمجھتا ہوں۔ گھر اور بیوی بچے یاد آ رہے ہوں گے۔ تم تو جانتے ہو یار کہ اپنے پاس ہر طرح کا علاج موجود ہے مگر پہلے یہ بتاؤ کہ اب بھی وہی زاہد خشک ہو کیا؟"

"مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ اب میں کیا ہوں۔"

"بس تم میرے پاس آ جاؤ اور خود کو میرے حوالے کر دو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا میرے یار۔"

"ٹھیک ہے۔ میں آ رہا ہوں۔" مجیب نے اطمینان کی سانس لے کر کہا۔ بغیر کچھ کہے مسئلہ حل ہو گیا تھا۔



صفورہ نے مجیب کی تیاریاں دیکھیں اور تشویش میں پڑ گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اسے پینٹ شرٹ میں دیکھ رہی تھی۔ جوتوں کے فیتے باندھنے کے بعد مجیب نے باتھ روم میں ہاتھ دھوئے۔ واپس آ کر اس نے ڈریسنگ ٹیبل سے پرفیوم نکالی اور اسپرے کیا۔ پھر اس نے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے دیکھ کر اسے افسوس ہوا۔ یہ سب نیند پوری نہ ہونے کی وجہ سے تھا اور نیند اس لئے نہیں آتی تھی کہ.....

صفورہ بھی آئینے میں اس کا عکس دیکھ رہی تھی مگر اس کے دیکھنے کا انداز اور تھا۔ مجیب بہت اچھا اور اسمارٹ لگ رہا تھا۔ یوں بھی وہ اپنی عمر سے کم لگتا تھا مگر پینٹ شرٹ میں اس کی عمر اور کم لگ رہی تھی "کہیں جا رہے ہیں آپ؟" اس نے پوچھا۔

مجیب نے آئینے میں اس کے عکس کو دیکھتے ہوئے کہا "ہاں۔ ایک دوست سے

ملنے جا رہا ہوں۔"

اس وقت شام کے چھ بجے تھے اور وہ دوست یہاں مری میں تو نہیں ہو سکتا تھا۔ تیاری بھی یہی بتاتی تھی کہ لمبا پروگرام ہے۔ ہونی تو نہیں چاہئے تھی لیکن نجانے کیوں اسے پریشانی ہو رہی تھی۔ کوئی عجیب سی بات تھی مجیب کے انداز میں۔ وہ پوچھنا نہیں چاہتی تھی۔ ایک تو اسے پوچھنے کا حق نہیں تھا۔ دوسرے ڈر تھا کہ وہ چڑچڑے پن کا مظاہرہ کرے گا مگر اس سے پوچھے بغیر بھی نہیں رہا گیا۔

البتہ ایک ڈپلومیٹک جملہ سوجھ گیا اسے "کھانا گھر پر ہی کھائیں گے نا؟"

"نہیں اور واپسی میں مجھے بہت دیر بھی ہو سکتی ہے۔ اچھا ہے' تم زیادہ سکون سے سو سکو گی۔"

وہ خفگی کا اظہار کر رہا تھا اور صفورہ کچھ کہہ نہیں سکتی تھی "قریب ہی جا رہے ہیں نا؟" اس نے پھر خطرہ مول لیا۔ مجیب کہہ سکتا تھا کہ اسے تجسس کا.... اس سے پوچھنے کا کوئی حق نہیں۔ وہ اپنے کام سے کام رکھے۔

"پنڈی سے کچھ منگوانا ہو تو بتاؤ۔"

"نہیں۔ کچھ نہیں۔"

مجیب باہر نکلا۔ افضل خان کو وہ پہلے ہی تیار رہنے کو کہہ چکا تھا۔ گاڑی تیار تھی۔ صفورہ کھڑکی میں کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔



مجیب ساڑھے سات بجے جمشید کے پاس پہنچا۔ جمشید نے اپنے ملازموں کو دکان بند کرنے کے سلسلے میں ہدایات دیں پھر مجیب سے بولا "چلو یار۔"

"کہاں؟"

جمشید نے اسے بہت غور سے دیکھا "کیا بات ہے۔ آج تو بہت بے تاب لگ رہے ہو۔ یقین نہیں آتا۔" مجیب کھسیا گیا۔ جمشید نے مزید کہا "پہلے گھر چلیں گے۔ ڈٹ کر کھائیں پئیں گے اور پھر تفریح۔ دیکھنا تمہاری home sickness کا کیسا علاج کرتا ہوں میں۔"

مجیب اس کے گھر نہیں جانا چاہتا تھا لیکن زیادہ بے تابی ظاہر کرنا وقار کے منافی تھا

پھر اسے افضل خان کا خیال آ گیا' جو باہر کھڑا تھا۔ اسے ساتھ لے کر بھی نہیں جایا جا سکتا تھا اور یہاں دکان کے باہر چھوڑنا بھی مناسب نہیں تھا۔ یہ زیادہ مناسب تھا کہ اسے جمشید کے گھر چھوڑ دیا جائے۔

باہر نکل کر اس نے افضل خان سے کہا کہ وہ جمشید کی گاڑی کے پیچھے پیچھے آئے پھر وہ جمشید کے ساتھ بیٹھ گیا "تو گاڑی میں آئے ہو تم؟" جمشید نے ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے سوچا' پتا نہیں' رات کس وقت واپسی ہو۔"

گھر پہنچ کر جمشید نے افضل خان کو سرونٹ کوارٹر میں اپنے ملازم کے پاس بھیج دیا۔ پھر وہ مجیب کو لے کر گھر میں چلا آیا۔

مگر مجیب سے ٹھیک طرح سے کھایا بھی نہیں گیا "گھبراہٹ کیا ہے یار۔ ٹھیک سے کھانا تو کھا لو۔" جمشید نے اسے ٹوکا۔

جمشید ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مجیب نروس ہو رہا تھا لیکن اس نے بات بنائی "آج کل ٹھیک سے بھوک ہی نہیں لگ رہی ہے۔"

"فکر نہ کرو۔ آج علاج ہو جائے گا اس کا۔ اس کے بعد جب بھی ایسا ہو' میرے پاس چلے آنا۔"

کھانے کے بعد مجیب نے کچھ دیر جمشید کی بیوی سے باتیں کیں۔ اس کا ذہن ایک دم سے پلٹ گیا تھا۔ کہاں تو اسے وہاں سے نکلنے کی بے تابی ہو رہی تھی۔ کہاں یہ ہوا کہ وہ جانے سے جی چرانے لگا۔ جان بوجھ کر شبانہ سے طویل گفتگو کرنے لگا۔ وہ نروس تھا۔ آنے والے مرحلے سے اسے خوف آ رہا تھا۔

جمشید نے کئی بار کھنکھار کر اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ بالآخر اس سے رہا نہیں گیا "یار مجیب' دیر ہو رہی ہے۔"

اس کی بیوی شبانہ نے چونک کر اسے دیکھا "کیا مطلب؟ میرا خیال تھا کہ مجیب بھائی رات کو رکیں گے۔"

مجیب کچھ کہنے ہی والا تھا کہ جمشید نے جلدی سے کہا "یہ کام کے سلسلے میں آئے ہیں۔ رک نہیں سکتے۔ صبح مری پہنچ کر کام شروع کرنا ہے۔"

"پھر بھی.... اتنی جلدی کیا ہے۔"

"ایک دوست سے ملنے جانا ہے۔ مجیب کو اس کا پتہ معلوم نہیں تھا۔"

یوں بات بن گئی۔ وہ گھر سے نکل آئے۔



جمشید کا عیش کدہ چھوٹا مگر پرآسائش تھا۔ وہاں دو بیڈ روم تھے۔ ایک ڈرائنگ روم اور اس کے علاوہ ٹی وی لاؤنج۔ جمشید نے کہیں فون کیا اور اس کے بعد بوتل اور جام نکال لئے "آج تو ساتھ دو گے نا؟" اس نے مجیب سے پوچھا۔

"سوری یار۔"

"کیوں پرہیز کرتے ہو اس سے۔ کیا مذہب کی وجہ سے۔"

"یہ بات نہیں۔ بس طبیعت ادھر نہیں آتی۔ ویسے اس گریز کا بنیادی سبب مذہب ہی ہونا چاہئے۔"

"کیوں بھئی؟"

"آدمی زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔"

جمشید نے اسے غور سے دیکھا "ویسے کون سے ہم مذہب کے مطابق زندگی گزار رہے ہیں۔ تو اس معاملے میں مذہب کیوں؟"

"یہ درست ہے کہ انسان تو گناہ کرتا رہتا ہے۔ فطرت ہے اس کی۔" مجیب نے فلسفیانہ انداز میں کہا "لیکن جہاں تک ممکن ہو' وہاں تک عمل کرنا چاہئے۔ میں ایک بات کا قائل ہوں۔ آدمی کے اللہ سے رابطے کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ رہے اور آدمی کے دل میں اللہ کا خیال اور اس کا خوف رہے تو اس کی بچت ہو جاتی ہے۔ اچھی توفیق بھی ملتی ہے اور برائی سے وفاع بھی۔"

"چھوڑو یار.... مزہ خراب مت کرو۔ ایسے موقعوں پر اس طرح کی گفتگو...."

کال بیل کی آواز کی وجہ سے جمشید کی بات پوری نہیں ہو سکی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا "آؤ بھئی.... بہت جلدی آ گئیں۔" اس نے آنے والی لڑکیوں سے خیر مقدمی انداز میں کہا۔

وہ دو لڑکیاں تھیں۔ اندر آنے کے بعد ان میں سے ایک نے کہا "اگر جلدی ہے تو ہم واپس چلے جاتے ہیں۔"

"گھر آئی نعمت کو ہم واپس نہیں جانے دیتے۔" جمشید نے چہک کر کہا "آؤ.... تمہیں اپنے دوست سے ملواؤں۔"

جمشید نے ان کا تعارف کرایا۔ ایک کا نام سیماب تھا' دوسری کا شاہینہ۔ مجیب نے انہیں بہت غور سے دیکھا۔ دونوں خوب صورت تھیں لیکن مختلف انداز میں شاہینہ کا سراپا قیامت خیز تھا اور سیماب ہر اعتبار سے حسین لڑکی تھی۔ دونوں نے بڑے سلیقے کا لباس پہنا ہوا تھا لیکن رنگوں کا انتخاب اچھا نہیں تھا۔ اس کے علاوہ میک اپ بھی برا لگ رہا تھا۔

"آؤ بھئی۔ میرا ساتھ دو گی؟" جمشید نے لڑکیوں کو دعوت دی۔

"نہیں۔ ابھی نہیں۔"

ایک خاموش انڈر اسٹینڈنگ کے تحت سیماب مجیب کے برابر صوفے پر آ بیٹھی اور شاہینہ جمشید کے پاس چلی گئی۔ مجیب نروس ہونے لگا۔ سیماب اس سے چپک کر بیٹھی تھی۔

"پہلے تم دونوں کچھ کام کرو۔" جمشید نے لڑکیوں سے کہا "فریج میں کباب رکھے ہیں' وہ تل لاؤ اور میرے دوست کو یقیناً کافی کی ضرورت ہے۔"

دونوں لڑکیاں اٹھیں اور کچن کی طرف چلی گئیں۔ جمشید نے مجیب سے پوچھا۔ "سیماب ٹھیک ہے نا تمہارے لئے؟"

مجیب نے کچھ کہنے کے بجائے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ نروس ہونے سے قطع نظر وہ بہت ایکسائیٹ ہو رہا تھا۔ پورے دن جو خواہش کی دھیمی دھیمی آگ اس کے اندر جلتی رہی تھی' اب اور بھڑک اٹھی تھی۔ لگتا تھا' جسم دہکتے ہوئے لاوے سے بھرا ہوا ہے۔

لڑکیاں واپس آ گئیں۔ سیماب بھی اپنے لئے کافی لائی تھی۔ شاہینہ نے کباب کی پلیٹ میز پر رکھتے ہوئے جمشید سے کہا "اب میرے لئے بھی جام بنا دو۔"

تھوڑی ہی دیر میں کمرے کا ماحول تبدیل ہو گیا۔ پینے والے ترنگ میں آ گئے اور بے تکلفی کا مظاہرہ شروع ہو گیا۔ سیماب نے مجیب کے چہرے کا بدلتا رنگ دیکھا تو بولی "ہم چلیں یہاں سے۔ خوامخواہ مخل ہونے کا فائدہ۔"

"ہاں۔ کباب میں ہڈی کسے اچھی لگتی ہے اور یہاں تو دو دو ہیں۔" شاہینہ نے

کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔ کباب ہڈیوں سے بچنے کے لئے خود نقل مکانی کر سکتا ہے۔" جمشید نے اٹھتے ہوئے کہا "چلو شاہینہ۔" جمشید نے بوتل اٹھائی اور شاہینہ نے دونوں جام۔ کمرے سے نکلتے نکلتے جمشید نے پلٹ کر سیماب سے کہا "سیماب.... میرے دوست کا خیال رکھنا۔۔۔ خاص خیال۔ یہ رائٹر ہے اور بہت نازک طبع ہے۔"

"آپ فکر ہی نہ کریں۔" سیماب نے جواب دیا اور مجیب کا چہرہ تمتما اٹھا۔

جمشید اور شاہینہ کے جانے کے بعد سیماب بے باک ہونے لگی "آپ تو مجھے دیکھ بھی نہیں رہے۔" اس نے اٹھلا کر کہا۔

مجیب نے نظر بھر کر اسے دیکھا.... اور دیکھتا رہا لیکن ایک گہری نظر دیکھنے کے بعد وہاں دیکھنے کو کچھ بھی نہیں رہا۔ اسے حیرت ہونے لگی۔ ایک نظر میں بھی سب کچھ دیکھا جا سکتا ہے اور صفیہ کو وہ اتنے عرصے ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا مگر کچھ بھی نہ دیکھ سکا۔ یہاں تک کہ اب بھی تصور میں وہ اسے نہیں دیکھ سکتا۔

اس نے پلکیں جھپکائیں اور پھر دیکھا۔ یہ لڑکی بلاشبہ حسین تھی۔ اس کے چہرے کا ایک ایک نقش خوب صورت تھا۔ الگ الگ موازنہ کرنے پر وہ صفیہ سے زیادہ خوب صورت ثابت ہوتی تھی لیکن وہ اس میں صفیہ جیسی کشش محسوس نہیں کر رہا تھا۔ حالانکہ اس وقت اس کے اندر خواہش کا ایک آتش فشاں دہک رہا تھا۔

وہ الجھ گیا اور اس فرق کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ صفیہ کا چہرہ اس کے تصور میں ابھر آیا۔ پہلا تاثر پاکیزگی کا تھا۔ وہ چہرہ سفلہ جذبوں کو نہیں ابھارتا تھا۔ بلکہ اسے دیکھ کر کوئی اور جذبہ دل میں ابھرتا تھا.... کوئی نازک لطیف جذبہ۔ اگرچہ مری میں کبھی اسے اس بات کا احساس نہیں ہوا تھا لیکن اس وقت یہ بات واضح طور پر اس کی سمجھ میں آئی تھی پھر صفیہ کی آنکھیں.... وہ بہت خوب صورت تھیں۔ اس لڑکی کی آنکھیں شاید دیکھنے میں صفیہ سے بھی حسین تھیں لیکن صفیہ کی آنکھوں کی طرح بولتی نہیں تھیں۔ اور جب بولتی تھیں تو ان کی زبان عامیانہ ہوتی تھی۔ جبکہ صفیہ کی آنکھیں شاعری کرتی محسوس ہوتی تھیں۔ وہ تو جب جھکی ہوتی تھیں' جب ان پر پلکوں کی چلمنیں گری ہوتی تھیں' تب بھی بولتی تھیں ان میں بے حجابی نہیں' حیا تھی اور وہ ان

چھوئے ہونٹ.....

سیماب مجیب کو دیکھ رہی تھی' جو بظاہر اسے دیکھ رہا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ ایسا نہیں ہے۔ اسے دیکھنے کے بجائے اس کے پار گزرتی ہوئی ان نگاہوں میں کوئی تصور تھا۔ وہ یہاں نہیں' کہیں بہت دور دیکھ رہی تھیں "کیا بات ہے.....؟" اس نے پکارا۔

مجیب کو اس کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ بھول گیا کہ کیا سوچ رہا تھا۔ بس اتنا یاد رہا کہ وہ اس سیماب کا صفیہ سے موازنہ کر رہا تھا۔ کیوں..... ایک کال گرل کا دوسری کال گرل سے موازنہ کیوں؟ اس لئے کہ ان میں سے ایک کال گرل نہیں لگتی تھی۔ اس میں اس کی جمالیاتی حس کے لئے اپیل تھی۔ وہ اس کی جمالیاتی حس کو مجروح نہیں کرتی تھی۔

"کیا بات ہے؟ میں اچھی نہیں لگی؟" سیماب نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"کھل کر بات کرو یار۔ ہم جیسوں سے تکلف نہیں کیا جاتا۔ کہو تو میں جمشید کے پاس چلی جاؤں اور شاہینہ کو یہاں بھیج دوں؟"

مجیب کے ذہن پر اس کا یار کہنا ہتھوڑے کی طرح لگا۔ اس کی جمالیاتی حس کو ٹھیس پہنچی۔ وجود میں دہکتا ہوا خواہش کا جہنم سرد ہوتا محسوس ہوا۔ اس نے ذرا جھنجلا کر کہا "کہا نا' ایسی کوئی بات نہیں۔"

"کوئی یاد آ رہا ہے؟"

مجیب جانتا تھا کہ اسے کون یاد آ رہا ہے لیکن یہ بات کہہ نہیں سکتا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"میں آدمی کو ایک نظر میں جان لیتی ہوں۔ ہر طرح کے آدمی سے واسطہ پڑ چکا ہے میرا۔ تم جیسے لوگوں کو جب کوئی یاد آتا ہے تو وہ ہم جیسوں کا سہارا تلاش کرتے ہیں۔ مجھے یاد آنے والوں کو بھلانا بھی آتا ہے۔ آؤ یار..... اب تکلف چھوڑو۔"

اس بار اس کے منہ سے یار سن کر مجیب کو کراہت کا احساس ہونے لگا لیکن اس کے لپٹنے سے آتش فشاں پھر دہکنے لگا۔ اب تو لگ رہا تھا کہ وہ پھٹ جائے گا۔

چند لمحے یونہی گزرے پھر سیماب نے ایسی خوف ناک بے تکلفی کا مظاہرہ کیا' جو

مجیب کے خواب و خیال میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔ وہ تو نسوانیت کی توہین تھی اور اس کا رد عمل بہت عجیب تھا۔ لاوا تو ویسے ہی دہکتا رہا لیکن اس کا جسم سرد ہو گیا۔ وجود پر جیسے کسی نے برف کی سل رکھ دی ہو۔

آدمی کو سب کچھ خواہش اور مزاج کے مطابق مل جائے تو وہ اس کی اہمیت نہیں سمجھ پاتا اور مزاج کے خلاف کچھ ملے تو اس کی اہمیت کا بھی پتہ چلتا ہے اور اپنے مزاج کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ورنہ کیسا ہی سمجھ دار آدمی ہو' خود کو سمجھنا آسان نہیں ہوتا۔ ان لمحوں میں مجیب نے سمجھ لیا کہ اسے عورت کا پیش قدمی کرنا پسند نہیں۔ جارحیت کرنے والی عورت اسے عورت ہی نہیں لگتی اور یہ ناپسندیدگی اس کے جذبات کو سرد نہیں کرتی۔ البتہ اس کی قوت عمل کو معطل کر دیتی ہے۔

شرمندگی سے بچنے کے لئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بے حد عجیب اور خوف ناک صورت حال تھی۔ خواہش جنون کی حدوں کو چھو رہی تھی اور عملاً وہ ناکارہ ہو چکا تھا۔

"کیا بات ہے یار' آؤ نا۔" سیماب نے بوجھل آواز میں اسے پکارا۔

وہ جھنجلا گیا۔ یا یوں کہئے کہ اس نے جھنجلاہٹ کو اپنے ناکارہ پن کا پردہ بنا لیا۔

"میں بہت تیز دوڑنے کا قائل نہیں ہوں۔" اس نے کہا پھر بولا "مجھے پیاس لگ رہی ہے۔"

وہ فریج کی طرف بڑھا۔ اسی لمحے اسے لاہوری کال گرل کی باتیں یاد آئیں۔ ہوٹل ویٹر کا دوا دارو' والا جملہ یاد آیا' جسے وہ اس وقت سمجھ نہیں سکا تھا۔ وہاں' جہاں وہ جسمانی طور پر ملوث ہی نہیں ہوا تھا' اس قسم کی باتیں کی گئی تھیں تو یہاں کیا ہو گا۔ یہاں تو وہ جسمانی طور پر ملوث ہو چکا ہے۔ یہ سوچ کر اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے کسی دلدل میں پاؤں رکھ دیا ہے۔

اس نے فریج کھول کر پانی کی بوتل نکالی اور گلاس میں پانی انڈیلا۔ کیسا خسارے کا سودا ہے۔ اس کے ہاتھ بھی کچھ نہیں آئے گا اور یہ لڑکی سیماب جانے کیسی باتیں کرے گی۔ جمشید کو معلوم ہو گا تو کیا ہو گا۔ وہ شرمندہ بھی ہو گا اور اسے اس پر غصہ بھی آئے گا۔ اس نے پانی ایک ہی گھونٹ میں پی لیا۔ یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اس کی عجیب کیفیت تھی۔ گھبراہٹ بھی ہو رہی تھی اور وحشت بھی۔ وہ کیا کرے۔ اس

صورت حال سے کیسے نمٹے۔ یہاں سے منہ چھپا کر بھاگا بھی نہیں جا سکتا۔

پانی کی بوتل فریج میں رکھتے ہوئے اچانک بلا ارادہ اس نے شراب کی بوتل نکال لی۔ ذہن کو ایک خیال بس چھو کر گزرا۔ شاید یہی اس عالم میں کچھ مدد کر سکے۔

اس نے ڈھکن کھولا اور آگ کو پانی کی طرح غٹاغٹ پیتا چلا گیا۔ جس وقت تک اس کے آگ ہونے کا احساس ہوا' سینہ دہک اٹھا تھا۔ گلے سے سینے کے اندر تک دہکتی ہوئی لکیریں سی کھنچ گئی تھیں۔

وہ بوتل ہاتھ میں لئے صوفے کی طرف آیا۔ سچ یہ ہے کہ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا تھا "ارے' تم تو نیٹ ہی پینے لگے۔ کیا پہلی بار پی رہے ہو؟" سیماب نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سرہلا دیا۔ بولنا اس کے لئے ممکن ہی نہیں تھا۔

"ٹھہرو۔ میں گلاس لاتی ہوں..... اور پانی بھی۔"

اس نے بوتل میز پر رکھی اور دھم سے صوفے پر گر گیا۔ اس کی آنکھیں مندنے لگیں۔ نجانے کتنی دیر وہ یونہی بیٹھا رہا۔

"لو... اب پیو۔"

سیماب کی آواز سن کر اس نے آنکھیں کھولیں۔ وہ اس کی طرف جام بڑھا رہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر جام لیا۔

"چھوٹے چھوٹے گھونٹ لو تو لطف آئے گا اور ساتھ میں کچھ کھاتے بھی رہو۔ ورنہ یہ تمہیں اندر ہی کاٹ ڈالے گی۔"

اسے سیماب کا ناصحانہ لہجہ بہت برا لگا لیکن بات ٹھیک تھی۔ اسے پینے کے آداب نہیں آتے تھے اور وہ تجربے کار تھی۔

اس نے چھوٹا سا گھونٹ لیا اور سوچنے کی کوشش کی لیکن اس کا ذہن دھندلا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں بس اتنا آیا کہ اچھی خاصی تو وہ بوتل سے ہی پی گیا تھا۔ اب اسے بچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ ورنہ آؤٹ ہو جائے گا۔

اس نے سیماب کی طرف دیکھا' جو پیاسوں کی طرح پی رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی اور چہرے پر تمتماہٹ۔ انداز سے لگتا تھا کہ خلاف امید پینے کا موقع ملنے

پر وہ بہت خوش ہے اور اس مہلت سے پوری طرح استفادہ کرنا چاہتی ہے۔

اگلے مرحلے پر مجیب نے اپنے جسم کو محسوس کرنے کی کوشش کی۔ سب کچھ ویسے کا ویسا تھا۔ پاگل خواہش جسم کی سرد دیوار سے سر پھوڑ رہی تھی لیکن اس زنداں میں روزن نکلنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اسے مایوسی سے زیادہ تشویش ہوئی۔ "اب کیا ہو گا؟"

سیماب کے ہاتھ میں اب تیسرا جام تھا اور آنکھوں میں سرخ ڈورے۔ وہ اس پر گر گئی "کم آن یار۔ ٹیک می آن۔ کیوں وقت ضائع کرتے ہو۔" اس کی آواز میں خفیف سی لڑکھڑاہٹ تھی۔

بے بسی مجیب کی جھنجلاہٹ بڑھا رہی تھی "میں نے کہا نا' میں تیز دوڑنے کا عادی نہیں ہوں۔" اسے احساس نہیں تھا کہ اس کی آواز بھی لڑکھڑا رہی ہے۔

"تو ٹھیک ہے یار لیکن رینگو تو مت۔" وہ اٹھلائی۔

"اور یہ یار' یار کیا لگا رکھی ہے۔" مجیب کی جھنجلاہٹ ناقابل برداشت ہو گئی۔

"مائنڈ یور لینگویج۔"

سیماب نے چونک کر اسے دیکھا "ٹھیک ہے۔ جانتی ہوں' تم رائٹر ہو۔ نازک طبع ہو۔ مگر یار' اوورایکٹنگ مت کرو۔ تم بھی جانتے ہو کہ میں گھر میں بیٹھی ہوئی بیوی نہیں ہوں کہ بولنے میں احتیاط کروں۔ میری زبان یہی ہے اور تم بازار میں بیٹھے ہو۔ یہاں تو وہی زبان چلے گی۔"

"لیکن یہ بازار نہیں ہے۔"

"بازار ہی ہے۔ بازار کو گھر میں لے جاؤ گے تو وہ گھر نہیں رہے گا۔ بازار بن جائے گا۔"

مجیب کو کرنٹ سا لگا۔ صفیہ نے مختلف بات کہی تھی۔ اس نے مری والے بنگلے کے حوالے سے کہا تھا..... نہ یہ بازار ہے اور نہ ہی میں دکان ہوں اور سیماب کچھ اور کہہ رہی تھی اور اسے یقین تھا کہ درست کہہ رہی ہے۔ تو کیا صفیہ نے غلط کہا تھا؟ یا یوں ہے کہ صفیہ بازار نہیں ہے۔ ورنہ مری کا وہ بنگلہ بھی بازار بن جاتا مگر وہاں تو نہایت اچھے پیرائے میں نہایت اچھی گفتگو ہوتی تھی۔ تو کیا صفیہ وہ نہیں' جو وہ اسے

سمجھتا ہے۔ وہ.....

"مرد تین طرح کے ہوتے ہیں۔" سیماب کی آواز نے اسے چونکا دیا "ایک وہ اوپر سے بھیڑیئے لگتے ہیں۔ دوسرے وہ جو بظاہر مہذب انسان نظر آتے ہیں مگر موقع آنے پر انسانی کھال اتار دیتے ہیں اور بھیڑیئے کے روپ میں سامنے آتے ہیں تیسرے وہ جن کے اند ایک بھیڑ ہوتی ہے' جس نے بھیڑیئے کی کھال اوڑھی ہے۔"

"یہ کیا باتیں کر رہی ہو تم؟"

اس بار وہ اس پر لد ہی گئی۔ مجیب نے خود کو ٹٹولا لیکن اس کے اندر اب بھی کوئی تحریک نہیں تھی۔

"اب میں تمہیں راز کی بات بتاؤں۔" سیماب نے رازدارانہ لہجے میں کہا "مجھے بھیڑیئے بہت اچھے لگتے ہیں۔ چھپے بھیڑیئے سے زیادہ کھلے بھیڑیئے اور ان بھیڑوں سے مجھے نفرت ہے۔ جو بھیڑیئے کی کھال اوڑھ کر بھیڑیا بننے کی کوشش کریں۔"

مجیب کا دل ڈوبنے لگا۔ لڑکی نہیں جانتی تھی کہ وہ اس سے اظہار نفرت کر رہی ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں کہ وہ اندر سے بھیڑ ہے اور بھیڑیا بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ جبکہ اس کے پاس تو بھیڑیئے کی کھال بھی نہیں۔ یہ بات جب اس پر کھلے گی تو ہو گا۔ جمشید بھی شرمندہ ہو گا۔

اچانک اسے کچھ سوجھ گئی "سنو سیماب۔" اس نے نرمی سے اسے خود سے علیحدہ کرتے ہوئے کہا "ذرا دھیرے دھیرے چلو۔ میں زندگی سے لطف اٹھانے والا آدمی ہوں۔ تم پیتی رہو اور مجھے بھی پلاؤ۔ رات بہت بڑی ہے۔ وقت کی کوئی کمی نہیں۔"

یہ حربہ کام آیا۔ وہ خود چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتا اور اسے زیادہ پینے پر اکساتا رہا۔ حسب توقع تھوڑی ہی دیر بعد سیماب آؤٹ ہو گئی اور اس نے سکون کا سانس لیا مگر اگلے ہی لمحے اس پر وحشت طاری ہونے لگی۔ اب وہ فوراً مری پہنچ جانا چاہتا تھا۔ یہ خواہش اتنی شدید تھی کہ وہ بے [illegible] ہو کر اٹھ کھڑا ہوا مگر دو قدم چلتے ہی اسے احساس ہو گیا کہ چلنا اس کے بس کی بات نہیں۔ اس کی ٹانگیں جیسے ربڑ کی ہو رہی تھیں۔ پاؤں کہیں رکھتا تھا اور پڑتے کہیں تھے۔ پہلے اس نے سوچا تھا کہ خاموشی

یہاں سے چلا جائے گا۔ جمشید کے گھر جانا مشکل نہیں تھا اور وہاں سے افضل خان کے ساتھ.....

لیکن اس کی حالت کے پیش نظر یہ ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے بیڈ روم کے دروازے پر دستک دی۔ جمشید نے دروازہ کھولا "مجھے واپس جانا ہے۔" مجیب نے اس سے کہا۔

"اس وقت چھوڑو یار۔ صبح چلے جانا۔ جلدی کیا ہے۔"

"نہیں۔ مجھے اسی وقت جانا ہے۔"

جمشید نے اس کی لڑکھڑاتی آواز سنی تو اسے غور سے دیکھا "ابے چھپے رستم' تو نے پی ہے۔ کمال کر دیا میرے یار۔"

"مجھے جانا ہے۔" مجیب کے ذہن میں اس وقت کچھ اور تھا ہی نہیں۔

"ضرور۔ اس کارنامے پر تو تجھے انعام ملنا چاہیے۔ تو چل' میں انہیں نمٹا کر آتا ہوں۔"

مجیب واپس چلا آیا۔ سیماب اب خراٹے لے رہی تھی۔ دو منٹ بعد جمشید آ گیا۔ اس نے صوفے پر ڈھیر سیماب کو بڑی طمانیت سے دیکھا اور بولا "چل... یہ ضد بھی پوری کر لے۔"

وہ دو بجے کے بعد بنگلے پہنچے۔ افضل خان سو چکا تھا۔ اسے جگایا گیا۔ جیپ میں بیٹھنے کے بعد مجیب نے سکون کی سانس لی۔

مری کے پر پیچ راستوں پر ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بڑے ظالم تھے۔ وہ مجیب کے دماغ کو لوریاں دے کر سلا رہے تھے۔ اسے احساس نہیں تھا کہ نشہ اور گہرا ہو رہا ہے۔



صفورہ کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ بلکہ اسے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ اس شام اس نے کھانا پکانے میں بھی دلچسپی نہیں لی۔ مجیب نے کہہ دیا تھا کہ وہ کھانا کھا کر آئے گا۔ چنانچہ اس نے فاطمہ سے کہا کہ کھانا وہ پکائے۔ کچھ دیر وہ ادھر ادھر کمرے ٹھیک کرتی پھری۔ اسٹڈی کی صفائی کی۔ کتابیں' کاغذات' ہر چیز ترتیب سے رکھے پھر وہ بیڈ روم میں چلی آئی۔

اس نے کتاب اٹھائی اور مطالعہ کرنے کی کوشش کی مگر دل ہی نہیں لگ رہا تھا۔ وہ پہلا موقع تھا کہ مجیب اس سے دور ہوا تھا۔ ورنہ جب وہ اس کی نظروں کے سامنے نہ ہوتا' تب بھی اس کی موجودگی کا احساس ہوتا رہتا تھا مگر اب تو لگ رہا تھا کہ وہ ایک ویرانے میں کھڑی ہے۔ وہ بہت وسیع و عریض ویرانہ تھا۔

یعنی وہ اس کی اس حد تک عادی ہو گئی تھی کہ اس کے بغیر اس کا دل ہی نہیں لگ رہا تھا اور جب وہ اس سے جدا ہو گی..... یہ خیال ہی اس کے لئے روح فرسا تھا۔ وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکی۔ اس سے بچھڑ کر تو اسے مرجانا ہی تھا۔

اپنی اس کیفیت پر اسے سحاب کا خیال آ گیا۔ اسے مجیب کے ساتھ رہتے بمشکل پونے دو مہینے ہوئے تھے اور ابھی مجیب کو گئے ہوئے بمشکل پونے دو گھنٹے ہوئے تھے۔ اور اس کا یہ حال تھا۔ تو آپا پر کیا گزر رہی ہو گی۔ ان کا تو برسوں کا ساتھ ہے اور جدائی کو پونے دو مہینے ہو چکے ہیں اور نجانے کتنا عرصہ لگے۔ کیا حال ہو گا ان کا۔ ہاں' ان کے پاس بچے ہیں۔ ان سے دھیان بٹتا' جی بہلتا ہو گا لیکن پھر بھی.....! وہ محسوس کر سکتی تھی کہ سحاب کا کرب اس سے سوا..... کہیں سوا ہو گا۔

یہ کیسی عجیب بات تھی کہ وہ ایک شادی شدہ مرد سے محبت کرتی تھی اور اسے اس کی بیوی سے بھی محبت ہو گئی تھی۔ ایسا کہاں ہوتا ہے دنیا میں۔ یہ تو انہونی ہے۔ درحقیقت اس محبت کا پہلا سبب تو یہ تھا کہ مجیب' سحاب سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ اس کی تعریفیں کرتا تھا۔ ہر بات ہر کام میں اس کی مثال دیتا' اور اس کی بگڑی ہوئی عادتیں دیکھ کر وہ خود بھی تصور کر سکتی تھی کہ سحاب کیسی مثالی بیوی ہو گی' کیسے اس کا خیال رکھتی ہو گی۔ یوں سحاب کی محبت دھیرے دھیرے اس کے دل میں جڑ پکڑتی گئی۔ وہ تصور میں اسے آپا کہنے لگی۔

یہ بھی عجیب بات تھی کہ سحاب کے متعلق سوچتے ہوئے اس کے دل میں کبھی رقابت کا جذبہ نہیں ابھرا۔ اس نے آپا کو جب سوچا' بہت احترام سے سوچا۔ یوں سوچا' جیسے وہ اس کے لئے ان دیکھی نہ ہو۔ اس نے تصور میں سحاب کا بھی ایک خاکہ بنا لیا پھر اسے پتہ بھی نہیں چلا اور آپا اس کا آئیڈیل بن گئی۔ وہ سوچتی' آپا مجیب کا کس طرح خیال رکھتی ہوں گی' کیا کیا کرتی ہوں گی اور وہ اسی انداز میں کام کرنے کی کوشش

کرتی۔ بلکہ کبھی اسے یہ خیال آتا کہ مجیب اس کے پاس آپا کی ایک قیمتی امانت ہے۔ اسے اسی طرح اس کا خیال رکھنا' اسے ہر تکلیف' ہر پریشانی سے بچانا ہے۔ اس کی ویسے ہی خدمت کرنی ہے تاکہ وہ بہت اچھا کام کر سکے۔

مگر جس رات اسے مجیب کی قربت ملی' وہ آپا کے بارے میں سوچنے' ان سے بات کرنے سے گھبرانے لگی۔ وہ شرمندہ تھی۔ وہ سحاب کو یاد کر کے بہت روئی "آپا..... میں نے خیانت کی امانت میں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں بہت گھٹیا' بہت پست ثابت ہوئی۔ مجھے انہیں روکنا چاہئے تھا' میں انہیں روک سکتی تھی مگر میں نے نہیں روکا۔ اب میں تو یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ میں آپ سے شرمندہ ہوں۔ شرمندگی سے کیا ہوتا ہے۔"

اس دن کے بعد سے وہ آپا کے بارے میں سوچنے سے کترانے لگی۔ ہر وقت اسے لگتا کہ آپا اسے دیکھ رہی ہیں..... غصے سے' مطعون کرنے والی نظروں سے اور وہ اپنے آپ سے بھی نظریں چراتی پھرتی۔

مگر اس وقت وہ آپا کے بارے سوچے بغیر نہ رہ سکی۔ اس دو گھنٹے میں جو گزری تھی اور گزر رہی تھی' اس نے اسے احساس دلایا کہ پچھلے دو ماہ سے آپا پر کیا گزر رہی ہو گی۔ وہ رنجیدہ ہو گئی۔ اپنی اداسی بھول کر آپا کے لئے اداس ہو گئی۔

اچانک اسے کچھ خیال آیا۔ مجیب کے پاس سحاب اور بچوں کا ایک البم تھا۔ وہ اکثر اسے دیکھتا تھا اور اس نے کبھی آپا کی اور بچوں کی تصویریں نہیں دیکھی تھی۔ وہ اٹھی اور البم تلاش کرنے لگی۔ بالآخر ڈریسر کی نچلی دراز میں اسے البم مل گیا۔ البم لے کر وہ بیڈ پر آ بیٹھی۔

البم کی پہلی تصویر سامنے آئی تو وہ دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ وہ مجیب کی پوری فیملی کی تصویر تھی۔ مجیب اور سحاب کے ساتھ تینوں بچے بھی موجود تھے۔ اس نے باری باری ہر چہرہ دیکھا پھر اس کی نظر سحاب کے چہرے پر ٹھہر گئی۔

اسے حیرت ہوئی۔ سحاب اس کے بنائے ہوئے خاکے سے بے حد مشابہ تھی۔ وہ خوب صورت عورت تھی لیکن اس کا سب سے بڑا حسن اس کے چہرے کی نرمی تھی۔ وہ یقیناً بہت محبت کرنے والی' بڑی ایثار والی عورت تھی۔

اس نے ایک ایک کر کے بچوں کو دیکھا۔ بڑا بیٹا شاہد اور بیٹی عالیہ بالکل مجیب جیسے

تھے۔ چھوٹا بیٹا حامد سحاب پر پڑا تھا بچوں کی آنکھوں کی چمک اور چہروں کی مسکراہٹ گواہی دے رہی تھی کہ انہیں ماں باپ کی محبت اور مکمل توجہ حاصل ہے۔

صفورہ نے البم کا ورق الٹا۔ آگے ہر بچے کا ایک ایک کلوز اپ تھا۔ وہ انہیں دیکھتی اور نگاہوں میں بساتی رہی پھر سحاب کا کلوز اپ سامنے آ گیا۔ وہ بڑی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ لگتا تھا' سحاب اس کے سامنے کھڑی ہے۔

"آپا.... میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔" اس نے تصویر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا "انسان سے لغزش ہو جاتی ہے لیکن آپا' اللہ جانتا ہے کہ میں نے انہیں بس آپ کی امانت سمجھا۔ بے شک برسوں سے میری آرزو تھی کہ ان سے میری شادی ہو جائے۔ میں نے دعائیں بھی کیں لیکن جب ان سے ملی اور ان کے حوالے سے آپ کو سمجھا تو میں اپنی آرزو سے دستبردار ہو گئی۔ میں نے تسلیم کر لیا کہ ان پر آپ کا حق ہے اور میں اس میں حصے دار نہیں بننا چاہتی۔ میں نے سمجھ لیا کہ بس میں یہاں آپ کی نمائندہ ہوں۔ میرا فرض ہے کہ انہیں کوئی پریشانی نہ ہونے دوں۔ مکمل یکسوئی فراہم کروں اور میں یہ کرتی رہی مگر اس رات نجانے کیا ہوا۔ میں کمزور ہو گئی مگر آپا' آپ دکھ نہ کریں۔ وہ بہت اچھے ہیں۔ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں اور بے فکر رہیں۔ میری کیچڑ آپ کے چاند تک پہنچنے والی نہیں۔ اگر ان میں ایک نفسیاتی کمزوری نہ ہوتی تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ شاید میں ان سے مل بھی نہ پاتی۔"

اس کے بعد وہ خوب روئی مگر ایک فائدہ ہوا۔ دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔

فاطمہ نے آ کر اسے چونکا دیا "کھانا لگا دوں بی بی صاب؟"

اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ ساڑھے نو بجے تھے "نہیں فاطمہ! بھوک نہیں ہے۔"

"تو چائے بنا لاؤں؟"

اس نے چند لمحے سوچا پھر بولی "ٹھیک ہے۔ لے آؤ۔"

دل کا بوجھ کم ہونے کے بعد وہ قدرے پرسکون ہو گئی تھی۔ اس لئے مطالعہ ممکن ہو گیا۔ ان دنوں وہ قرۃ العین حیدر کا آگ کا دریا پڑھ رہی تھی۔ وہ کتاب میں کھو گئی۔ فاطمہ اسے بتانے کے لئے آئی کہ وہ سونے جا رہی ہے تو اسے اندازہ ہوا کہ بہت

رات ہو گئی ہے۔ بارہ بجنے والے تھے "ٹھیک ہے تم جاؤ۔"

"آپ نہیں سوئیں گی؟"

"نیند نہیں آ رہی ہے۔"

"صاب جی کا انتظار ہے۔ کہیں تو میں جاگتی رہوں؟"

"اس کی ضرورت نہیں۔ جاؤ' تم سو جاؤ۔"

فاطمہ چلی گئی۔ اب صفورہ پریشان تھی۔ اب تک تو مجیب کو آ جانا چاہئے تھا۔ سوچ سوچ کر کمرے میں اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ باہر نکل گئی۔ گیٹ کھولا اور لان میں آ گئی۔ وہاں روشنی ہو رہی تھی۔ موسم بھی بہت خوش گوار تھا۔ وہ لان میں کرسی پر بیٹھ گئی مگر وہاں وقت گزاری کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے سوچنے کے۔ ہر گزرتا لمحہ اس کے اضطراب اور پریشانی میں اضافہ کر رہا تھا اور انتظار کی گھڑیاں تھیں کہ ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھیں۔

وقت چیونٹی کی رفتار سے گزرتا رہا۔ وہ بار بار کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتی۔ دو بج گئے تو وہ ہولنے لگی۔ طرح طرح کے وہم ستانے لگے۔ بے شک وہ رات کے کھانے کو منع کر گیا تھا لیکن اس نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ رات کو واپس ہی نہیں آئے گا۔ کہیں خدانخواستہ.... ہر بار کوئی الٹا سیدھا خیال آتا اور وہ لاحول پڑھ کر اسے ذہن سے جھٹک دیتی۔

اچانک اسے یاد آیا کہ جاتے وقت مجیب نے کیا کہا تھا! اس نے کہا تھا.... "واپسی میں بہت دیر بھی ہو سکتی ہے۔ اچھا ہے۔ تم زیادہ سکون سے سو سکو گی۔"

وہ ان جملوں کی تشریح میں لگ گئی' جیسے وہ غالب کے پیچیدہ' ہشت پہلو مصرعے ہوں۔ واپسی میں بہت دیر بھی ہو سکتی ہے۔ بہت دیر تو ہو گئی۔ ڈھائی بج گئے۔ اگر رات کو نہ آنا ہوتا تو وہ کہتا۔ اب میں کل ہی آؤں گا۔ اچھا ہے' تم زیادہ سکون سے سو سکو گی۔ اس کا مطلب بھی یہی تھا کہ واپسی میں بہت دیر ہو گی۔ بلکہ سو سکو گی کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جتا رہا ہو کہ وہ اس کے سو کر اٹھنے کے بعد ہی آئے گا۔ یعنی صبح کو لیکن نہیں۔ مقصد یہ ہو گا کہ وہ سو چکی ہو گی اور ڈسٹرب نہیں ہو گی۔

اس نے ان دو جملوں کے تمام ممکنہ معنی نکال لئے اور نڈھال ہو گئی۔ گھڑی اب

ساڑھے تین بجا رہی تھی۔ فرصت ہوئی تو اوہام پھر ستانے لگے۔ اس نے سوچوں کا رخ بدلا۔ اب اتنی رات کو تو واپسی ممکن نہیں۔ وہ یقیناً صبح ہی آئے گا اور پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ وہ افضل خان کے ساتھ گیا ہے۔ اسے چل کر سو جانا چاہئے لیکن آنکھوں میں نیند کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اسے یہ خیال الگ ستا رہا تھا کہ راستے اتنے خطرناک ہیں۔

چار بجے تھے کہ گاڑی کی آواز سنائی دی۔ چند لمحے بعد ہیڈلائٹس نظر آئیں۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ جیپ کو دیکھ کر اس نے سکون کی سانس لی۔ افضل خان نے گاڑی اس کے پاس لا کر روکی اور اتر کر عقبی دروازہ کھولا۔ مجیب نیچے اترا۔ افضل خان گاڑی کو گیرج کی طرف لے گیا۔

بولنا مناسب نہیں تھا پھر بھی صفورہ سے بولے بغیر نہ رہا گیا "بہت دیر کر دی۔"

مجیب اپنی جگہ کھڑا جھوم رہا تھا "تم یہاں بیویوں کی طرح انتظار کیوں کر رہی ہو؟"

اس کی آواز بھی بری طرح لڑکھڑا رہی تھی "تم بیوی تو نہیں ہو میری۔"

اس کی حالت دیکھ کر صفورہ کو اندازہ ہو گیا کہ وہ نشے میں ہے مگر اس نے پوچھا اور کہا کچھ نہیں۔ باہر افضل خان موجود تھا۔ آواز سرونٹ کوارٹر تک بھی جا سکتی تھی۔ بہتر یہی تھا کہ وہ اسے عافیت کے ساتھ گھر میں لے جائے۔

وہ دیکھ رہی تھی کہ مجیب کے لئے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا بھی مشکل ہے۔ اس نے اسے سہارا دیا لیکن مجیب نے اسے جھٹک دیا۔ "میں.... میں خود چل سکتا ہوں۔ چلنا آتا ہے مجھے۔"

مجیب نے قدم آگے بڑھایا مگر فوراً ہی گر گیا۔ صفورہ نے سہارا دے کر اسے اٹھایا

"ذرا مجھے سہارا دے دیجئے۔ مجھ سے چلا نہیں جا رہا ہے۔" وہ بولی۔

"کیوں دے دوں سہارا۔" مجیب بھڑک گیا مگر فوراً ہی اسے کچھ خیال آیا اور وہ خوش ہو گیا "تو یوں کہو نا کہ تمہیں سہارا چاہئے۔ میں سمجھا' تم مجھے سہارا دے رہی ہو۔ کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ ہم تمہیں سہارا ضرور دیں گے۔ لو.... کیا یاد کرو گی تم بھی؟"

صفورہ جیسے تیسے اسے اندر لے کر آئی اور دروازہ بند کر دیا۔ اب وہ اس سے

بات کر سکتی تھی "آپ نشے میں ہیں۔"

"تو کیوں نہیں ہو سکتے۔ ہم کسی چیز میں بھی ہو سکتے ہیں۔ ابھی ذرا پہلے ہم گاڑی میں تھے۔ ہم اپنی مرضی کے مالک ہیں۔"

"لیکن' آپ تو شراب سے نفرت کرتے ہیں۔"

"نفرت اور محبت ایک ہی بات ہے۔ محبت کی صورت بگاڑ دو تو نفرت۔ نفرت کو خوب صورت بناؤ تو محبت۔ ہمیں تو پتہ ہی نہیں چلتا اپنی نفرت اور محبت کا۔"

صفورہ اسے بیڈ روم میں لے گئی "میں کپڑے نکالتی ہوں۔ لباس تبدیل کر لیں۔"

"نہیں کریں گے۔ ہم ایسے ہی سوئیں گے۔" مجیب نے کہا اور جوتوں سمیت بستر پر گر گیا۔

صفورہ نے جھک کر اسے پوری طرح بستر پر لٹاتے ہوئے پوچھا "آپ کہاں گئے تھے؟"

"ہمیں کہاں جانا تھا۔ بازار گئے تھے۔ اپنی ضرورت پوری کرنے۔"

صفورہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ پیروں تلے سے جیسے زمین نکل گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا لیکن مجیب کی حالت گواہی دے رہی تھی۔ وہ اس سے مزید پوچھ گچھ کرتی لیکن وہ تو لمحوں میں بے خبر سو گیا تھا۔

صفورہ نے اس کے جوتے اور موزے اتارے' اسے چادر اوڑھائی اور خود بھی لیٹ گئی۔ مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس کے دل و دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ وہ بے چین ہو کر اٹھ بیٹھی۔ اس وقت وہ ایسی تنہائی محسوس کر رہی تھی' جو مجیب کے جانے کے بعد اور آنے سے پہلے بھی محسوس نہیں کی تھی۔

کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" اس نے خود کلامی کی پھر وہ البم اٹھا لائی' جو اس نے دیکھنے کے بعد بیڈ پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ آرام کرسی میں دراز ہو کر اس نے البم کے ورق الٹے اور سحاب کی تصویر نکال لی "یہ کیا ہو رہا ہے آپا؟" اس نے تصویر سے کہا۔

تصویر میں سحاب مسکرا رہی تھی۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ تصویریں نہیں

بولتیں۔

"آپ کی امانت کو میں نے بہت سنبھال کر رکھنے کی کوشش کی۔" اس نے پھر تصویر سے کہا "لیکن خود کو نہ سنبھال سکی اور گر گئی۔ میں آپ کے سامنے شرمندہ ہوئی مگر اب کیا کروں۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اگر یہی ہوتا رہا تو آپ کا تو میں قیامت کے دن بھی سامنا نہیں کر سکوں گی۔ بتائیے' میں کیا کر سکتی ہوں۔ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ کیا کروں میں؟"

مگر سحاب اب بھی مسکرائے جا رہی تھی۔

"بتائیے نہ آپا۔ میں اتنی اکیلی ہوں اور بہت سمجھ دار بھی نہیں ہوں۔ بتائیں تو' میں کیا کروں؟" تصویر کی مسکراہٹ دیکھ کر اس بار وہ جھنجلا گئی "ٹھیک ہے'۔ آپ کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ میری ذمے داری ہے۔ مجھے نبھانی ہے۔ چاہے میں خود تباہ کیوں نہ ہو جاؤں۔" اچانک اس کے لہجے میں نرمی آ گئی "آپ فکر نہ کریں آپا۔ آپ بس آرام سے... سکون سے رہیں۔ میں سب ٹھیک کر لوں گی۔ آپ کو کچھ پتہ بھی نہیں چلے گا۔ آپ سب مجھ پر چھوڑ دیں۔ بے فکر ہو جائیں۔" وہ اٹھی اور ڈریسر کے پاس گئی۔ البم جہاں اور جیسے رکھا تھا' اس نے ویسے ہی رکھ دیا۔ دراز بند کر کے وہ واپس آئی اور کرسی میں دراز ہو گئی۔ اب اس کے چہرے پر سکون تھا... طمانیت تھی۔

اس کی آنکھوں میں ایک فیصلہ چمک رہا تھا!



مجیب کی آنکھیں کھلیں اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ ایک نظر میں ہر بات' سب کچھ غیر معمولی بلکہ خلاف معمول لگا تھا۔ پہلا احساس یہ ہوا کہ بہت دیر ہو چکی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی نظر دیوار گیر کلاک کی طرف گئی۔ بارہ بج چکے تھے۔ اتنی دیر سے وہ پہلے کبھی سو کر نہیں اٹھا تھا۔

وہ تیزی سے بستر سے اترا۔ اسی لمحے اسے احساس ہوا کہ وہ پینٹ شرٹ میں ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے گزری ہوئی رات یاد آ گئی... رات کی ہر بات۔ بس گھر واپس آنا اسے یاد نہیں تھا۔

وہ باتھ روم جانے کی غرض سے اٹھا تھا لیکن سب کچھ یاد آتے ہی وہ دھم سے

بستر پر بیٹھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ میرے خدا... یہ سب کچھ کیا کیا میں نے؟ کیوں؟ کیا ہو گیا تھا مجھے۔

اسے اپنے آپ پر بہت شدت سے شرم آئی۔ گر تو وہ بہت پہلے چکا تھا مگر اب کے اس نے خود کو پوری طرح خراب کر لیا تھا۔ اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس نے شراب پی ہے۔ وہ تو شراب کے سخت خلاف تھا۔ شراب پینے کا تو اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

اسی وقت دروازہ کھلا اور صفورہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ معمول کے مطابق نظریں جھکی ہوئی تھیں "آپ ناشتہ کریں گے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔" مجیب نے بھی نظریں اٹھائے بغیر کہا "اب کوئی ناشتہ کرنے کا وقت ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ کھانا جلدی کھا لیجئے گا۔ باتھ روم تیار ہے۔ آپ نہا لیں۔"

اس کا انداز ایسا تھا' جیسے اسے رات کی بات کا کچھ پتہ نہ ہو۔ مجیب کو ذرا حوصلہ ہوا۔ اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا "رات تو بہت اچھی نیند آئی ہو گی تمہیں؟"

"جی... مجھے تو روز ہی بہت اچھی نیند آتی ہے۔"

مجیب جاننا چاہتا تھا کہ صفیہ نے رات کو اسے دیکھا تھا یا نہیں لیکن وہ بہت غیر واضح جواب تھا۔ اس سے کچھ ثابت نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ اس نے بات آگے بڑھائی۔

"رات واپسی میں بہت دیر ہو گئی تھی مجھے۔"

صفورہ سمجھ گئی کہ وہ کیا جاننا چاہتا ہے۔ وہ اسے اپنے سامنے شرمندہ دیکھنا چاہتی بھی نہیں تھی۔ اس نے بڑی معصومیت سے کہا "اچھا۔ کس وقت آئے تھے آپ؟ مجھے تو پتہ بھی نہیں چلا۔"

مجیب اچانک ہی شیر ہو گیا "خیر' یہ بتانا ضروری تو نہیں۔"

"آپ خود ہی کہہ رہے تھے کہ بہت دیر سے واپس آئے تھے۔"

"چھوڑو اس بات کو۔ تم جاؤ' اپنا کام کرو۔"

صفورہ جانے کی لئے پلٹ گئی۔ مجیب اسے دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کے وجود میں

کوئی کیمیائی رد عمل ہوا اور وہی خواہش طوفان کی طرح امنڈی' جس نے رات کو اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ ساتھ ہی اسے یاد آیا کہ اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود وہ پیاسے کا پیاسا ہی تھا۔ یہ سوچ کر اس پر وحشت طاری ہونے لگی۔

وہ باتھ روم میں گیا۔ دانت برش کرتے ہوئے اس نے باتھ روم کا جائزہ لیا۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی پھر اسے اپنے منہ کے کسیلے پن کا احساس ہوا۔ اس کا سبب یاد آیا لیکن وہ یہ سب کچھ یاد کر کے اپنے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا تھا۔

وہ شاور کے ٹھنڈے پانی کی پھواروں میں دیر تک کھڑا رہا لیکن جسم تپا ہوا لگ رہا تھا۔ اندر کی آگ ابھی سرد نہیں ہوئی۔

دوپہر کا کھانا جلدی کھانے کی بعد اس نے اسٹڈی کا رخ کیا۔ کاغذ سامنے رکھ کر اس نے قلم کھولا لیکن لکھ کچھ بھی نہیں سکا۔ اس کی وہی گزشتہ روز والی کیفیت تھی۔ لیکن مزید پیچیدگیوں کے ساتھ۔ ہوائے ہوس چلی تو شرمندگی کا احساس مٹ گیا۔ بس اسے اپنی گزشتہ روز کی ناکامی یاد رہی اور وہ اس پر جھنجلاتا رہا۔ یہ کیسی کمزوری ہے کہ میں پیاسا ہوں' پانی سامنے ہے اور پھر بھی میں پی نہیں سکتا۔ اگر یہ شرافت کی کمزوری ہے تو صفیہ کے معاملے میں کیوں آڑے نہیں آئی اور ایسی کیا کمزوری کہ ہوش و خرد سے بے گانہ کر دینے والی شراب بھی اسے نہ مٹا سکی۔ یہ کیسی مزاحمت ہے میرے اندر اور صفیہ کے معاملے میں یہ کام کیوں نہیں کرتی۔

اس نے ارادہ کر لیا کہ آج پھر راولپنڈی جائے گا۔ بعض لوگوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہو گا۔ شاید پہلی بار۔ کوئی جھجک ہو' جو دوبارہ کوشش کرنے پر مٹ جائے گی مگر شام ہوتے ہوتے اسے احساس ہو گیا کہ اس کے کے ارادے میں پختگی نہیں ہے۔ اندر سے وہ ڈر رہا ہے۔ گزشتہ روز اس نے خود کو جس سچویشن سے دوچار کیا تھا' آج بھی اس کا سامنا کرنے سے خوف زدہ ہے شاید اس کے اندر کہیں یہ یقین بیٹھا ہوا تھا کہ وہ اس طرح کی صورت حال سے نمٹنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ بلکہ شاید یوں ہے کہ بری عورتوں کی صحبت اس کے لئے ناقابل برداشت ہے اور اس کے جذبات اور خواہشات کو سرد کر دیتی ہے۔

اس موقعے پر صفیہ پھر اس کے سامنے سوالیہ نشان کی طرح آ کھڑی ہوئی۔ پہلی بار

اس نے تسلیم کیا کہ وہ بری نہیں اچھی ہے۔ کیونکہ اس کی قربت میں وہ خوش رہتا ہے۔ کبھی نروس نہیں ہوتا۔ تجربے کے بعد یہ بات ثابت ہو گئی تھی۔

اس کشمکش میں شام ہو گئی۔ اب اسے جانے یا نہ جانے کا فیصلہ کرنا تھا۔ خوف اسے صفیہ کا راستہ دکھا رہا تھا۔ جواب میں بس عزت اور احترام ہی تو دینا تھا' جو اس کے لئے ویسے بھی مشکل نہیں تھا۔ وہ تو تھا ہی دوسروں کو عزت دینے والا لیکن اب اسے نجانے کیا ہو گیا تھا۔ شاید اسے اس نے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔

اچانک اسے گزشتہ رات اپنی واپسی خواب کی طرح یاد آ گئی۔ وہ آیا تو وہ جاگ رہی تھی۔ شاید اس نے اسے سہارا بھی دیا تھا اور کچھ بات چیت بھی ہوئی تھی' جو ذہن پر لاکھ زور دینے کے باوجود اسے یاد نہیں آ رہی تھی۔ بلکہ جو یاد آیا تھا' اس کے بارے میں بھی وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس کا تصور ہے یا سچ مچ ایسا ہوا تھا۔

بہرکیف آخر میں اس نے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ تیار ہونے کے لئے بیڈ روم میں گیا تو صفیہ وہاں بیٹھی تھی۔ اسے ڈریسر کھولتے دیکھا تو اس نے پوچھا "کیا پھر کہیں جانے کا ارادہ ہے؟"

مجیب اس "پھر" کی چبھن محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکا "ہاں' جا رہا ہوں مگر تمہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟"

"دوست سے ملنے جانے میں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن آپ کو بازار میں ہرگز نہیں جانے دوں گی۔"

"تمہیں نہ اعتراض کرنے کا کوئی حق ہے نہ مجھے روکنے کا۔" مجیب نے غصے سے کہا۔

"آپ میری جو بھی حیثیت سمجھتے ہیں' اس میں مجھے یہ حق ہے۔" صفورہ نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

"میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ اب اس صورت میں تم کیا کرو گی؟"

"میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔ آپ بے شک اسی حیثیت میں کسی اور کو لے آئیں پھر جو جی چاہے کریں۔"

اس دھمکی نے مجیب کو کچا کر دیا۔ بعد کے مسائل پسپا ہو گئے اور بنیادی مسائل سامنے آ کھڑے ہوئے۔ وہ مسائل جن کی وجہ سے وہ صفیہ کو ساتھ لایا تھا۔

"لیکن مجھے یقین ہی کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔" صفورہ نے ذرا توقف کے بعد کہا۔

"اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"پورے بازار میں آپ کو میرے جیسی دکان کہیں اور نہیں ملے گی۔" صفورہ نے زخمی لہجے میں کہا "نہ کہیں جانے کی زحمت کرنی ہو گی نہ عزت کو کوئی خطرہ ہو گا۔"

"لیکن..."

صفورہ نے اس کی بات کاٹ دی "آپ چاہتے ہیں تو یہی سہی۔ اب یہ بازار ہے اور میں دکان۔ آپ شوق سے خریدار بن جائیے۔ تماش بین بن جائیے۔ تماشا آپ کے سامنے موجود ہے۔"

"میری شرط وہی ہے۔"

"مجھے منظور ہے۔"

"میں اس تبدیلی کا سبب جاننا چاہتا ہوں۔"

"کاروبار۔" صفورہ نے عجیب سے لہجے میں کہا "آپ کی دی ہوئی حیثیت میں سوچا تو بات سمجھ ٹیں آ گئی۔ کوئی اچھا کاروباری نہ اپنا نقصان گوارا کرتا ہے' نہ اپنے گاہک کا۔ آپ اتنی دور جائیں گے تو اخراجات بھی زیادہ ہوں گے پھر آپ کو کل کی طرح بے آرامی بھی ہو گی اور کام کا حرج بھی ہو گا۔ نقصان ہی نقصان ہے آپ کا۔"

"اور تمہارا...؟"

"ظاہر ہے۔ میرا نقصان بھی ہے۔ آتا ہوا پیسہ کسے برا لگتا ہے۔" صفورہ کا لہجہ زہریلا تھا۔ انداز ایسا تھا' جیسے خود کو جوتے مار رہی ہو۔

"ٹھیک ہے۔" مجیب نے گہری سانس لے کر کہا۔



صفورہ بیڈ کی چادریں بدل رہی تھی۔ اس نے اپنا تکیہ اٹھایا تو اس کے نیچے پانچ سو روپے والے کچھ نوٹ نظر آئے۔ وہ ہاتھ لگائے بغیر بتا سکتی تھی کہ وہ چار نوٹ ہیں۔ جس شام اس نے مجیب کو راولپنڈی جانے سے روکنے کے لئے سمجھوتا کیا تھا ان میں سے تین نوٹ مجیب نے اسے اسی رات دیئے تھے۔ وہ اس رات کا کرب نہ بھولی تھی' نہ کبھی بھول سکتی تھی۔

مجیب نے جب وہ تین نوٹ اسے دیئے تھے تو اس نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

"یہ اتنے کیوں؟" اس نے مرے مرے لہجے میں پوچھا تھا۔

"دو نوٹ وہ ہیں' جو تم نے پہلے قبول نہیں کئے تھے اور تیسرا آج کا ہے۔" مجیب نے کہا تھا "میں اپنے اوپر قرض کا بوجھ رکھنا پسند نہیں کرتا۔"

اگر وہ پہلے اتنا کرب نہ برداشت کر چکی ہوتی تو شاید ان نوٹوں کے بوجھ سے دب کر مر جاتی لیکن دکھ سے مرحلہ وار گزرنے میں یہ آسانی ہوتی ہے کہ انسان مار ڈالنے والی اذیت جھیل کر بھی زندہ رہتا ہے۔

اپنے اوپر بوجھ رکھنا کون پسند کرتا ہے۔ اس نے دل میں سوچا تھا اور تم اس بوجھ سے گھبرا رہے ہو' تو تم نے زبردستی اپنایا ہے' جو تمہارا بوجھ ہے ہی نہیں اور اسے اتارنے کے لئے تم نے میری روح پر غلاظت کا بوجھ لاد دیا ہے۔ خیر' کوئی بات نہیں۔ چلو یوں ہی سہی۔

اس رات کے بعد اسے ایک نوٹ کا کوڑا اور لگا تھا۔

اس نے ان نوٹوں کو بدلنے والی چادر سے پکڑ کر ایک طرف رکھ دیا۔ وہ انہیں ہاتھ بھی نہیں لگانا چاہتی تھی۔ کئی بار تو اس کا جی چاہا کہ بے عزتی کی ان علامتوں کو پرزے پرزے کر کے پھینک دے مگر نجانے کیوں' جی نہیں چاہا۔ اگرچہ اسے ان سے کراہت آتی تھی لیکن یہ خیال بھی آتا تھا کہ کبھی وہ اس کے بہت کام آئیں گے۔

اسے ان کی ضرورت ہو گی۔ اسے یہ خیال بھی آتا تھا کہ ان نوٹوں کا کوئی بدل بھی نہیں۔ یہ خیال اتنا طاقت ور تھا کہ بے پناہ کراہت کے احساس پر بھی غالب آ گیا تھا۔

اس نے بستر پر دوسری دھلی ہوئی چادر بچھائی اور میلی چادر سے پکڑ کر نوٹوں کو پھر اپنے تکیئے کے نیچے رکھ دیا۔ جیسے وہ ان کی جگہ ہو۔

بیڈ روم سے فارغ ہو کر اس نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ گیارہ بجنے والے تھے۔ وہ لپک کر نکلی اور کچن کی طرف گئی۔ مجیب کی چائے کا وقت ہو رہا تھا۔

کچن میں اس نے سالن کو دیکھا۔ وہ تقریباً تیار تھا۔ اس نے چائے میں چینی ملائی اور پیالی لے کر اسٹڈی کی طرف چلی دی۔

○

نئے سمجھوتے کو ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ وہ پورا ہفتہ مجیب کے لئے بے حد طمانیت بخش ثابت ہوا۔ اس کے کام پر بہت اچھا اثر پڑا تھا۔ رفتار بھی بڑھی تھی اور معیار بھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ پرسکون ہو گیا تھا۔ اندر کے خلفشار سے اسے نجات مل گئی تھی۔

ایک نئے معمول کے سوا سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ صفیہ اب پھر اسٹڈی میں اس کے قریب بیٹھنے لگی تھی۔ پہلے کی طرح وہ خود سے بات کم ہی کرتی تھی۔ مجیب کا کبھی موڈ ہوتا تو ان کے درمیان دیر تک گفتگو ہوتی۔ وہ اردو ادب پر بات کرتی۔ کبھی مجیب اس کی سامنے اسکرپٹ کا کوئی تکنیکی مسئلہ رکھتا' جو ذرا سی بات چیت کے بعد حل ہو جاتا۔

باقی سب کچھ ویسے کا ویسا تھا۔ البتہ صفیہ اب اس کا زیادہ خیال رکھنے لگی تھی۔ تین دن پہلے اس کے سر میں شدید درد ہوا تو وہ تیل کی شیشی لے آئی "پرسکون ہو کر بیٹھ جائیں۔ میں آپ کے سر میں تیل لگاتی ہوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔"

"ضرورت ہے۔ دماغی کام کرتے ہیں اور دماغ کی غذا کا خیال نہیں رکھتے۔ آپ کو تو ہر روز تیل لگوانا چاہئے۔"

"میں نے کہا نا' اس کی ضرورت نہیں۔"

وہ خاموش ہو گئی لیکن اس نے ایک اور ترکیب استعمال کی۔ اس رات بیڈ روم میں اس نے کسی بہانے سے فاطمہ کو روک لیا اور اس کی موجودگی میں ہی اس کے سر میں تیل لگانے بیٹھ گئی۔ اب مجیب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

صفیہ نے تین بار اس کے سر میں تیل لگایا "کیسا پیاسا سر ہے۔ اتنا تیل لگایا اور بال خشک کے خشک۔" وہ بولی۔

مجیب خاموش رہا۔ سر میں تیل لگے دو مہینے ہو چکے تھے۔

"آپ جسم کو ڈھیلا نہیں چھوڑ سکتے۔ گردن بھی اکڑائے بیٹھے ہیں۔" صفیہ نے کہا۔

"کوشش کرتا ہوں مگر ہوتا نہیں۔" مجیب کے لہجے میں بے بسی تھی۔

"یہ اعصابی تناؤ ہے۔ کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ ریلیکس ہونے کی کوشش کریں۔"

مجیب کو سحاب یاد آئی۔۔۔ اور بہت شدت سے یاد آئی۔ وہ بھی یہی کہتی تھی۔

اس کے بعد سر میں ہر رات تیل لگنا معمول بن گیا۔

سب کچھ تھا مگر کبھی کبھی مجیب کو ایک خلش محسوس ہوتی۔ جو بھی ہو رہا تھا' اچھا نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ صفیہ نے بادل نخواستہ سمجھوتا کیا ہے۔ کیوں؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی لیکن وہ اس پر زیادہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ الجھنوں کو کرید کر الجھنیں بڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

سحاب کو وہ روز فون کرتا تھا۔ بچوں کی آواز بھی سن لیتا تھا۔ ابھی پچھلے روز سحاب پوچھنے لگی "کتنا کام اور رہ گیا ہے؟"

"ابھی تو آدھا بھی نہیں ہوا۔" مجیب نے جواب دیا۔

"خدایا۔ تو ابھی دو ڈھائی مہینے اور لگیں گے؟"

"ہاں' یہ تو ہے۔ گھبرا گئیں؟"

"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ اتنا مشکل ثابت ہو گا۔ میں بہت مس کر رہی ہوں آپ کو؟"

"مجھ سے زیادہ نہیں۔ تمہارے پاس تو بچے ہیں۔ میں یہاں۔۔۔۔ گھر سے دور بالکل اکیلا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ حوصلہ رکھیں۔ وقت گزرتے کیا دیر لگتی ہے۔" وہ پھر وہی مضبوط سحاب بن گئی۔

قدموں کی چاپ سن کر مجیب چونکا۔ وہ صفیہ تھی اور اس کے لئے چائے لائی تھی۔ چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھ کر وہ اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھ گئی۔ چائے کا گھونٹ لے کر مجیب نے اسے دیکھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

مجیب کو خیال آیا کہ گزشتہ روز سے وہ نجانے کیوں پریشان لگ رہی ہے۔ بیٹھے بیٹھے کھو سی جاتی ہے "کیا بات ہے صفیہ۔ تم پریشان لگ رہی ہو؟" اس نے بلا ارادہ کہا۔

"جی نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"کچھ تو ہے۔ کل سے میں تمہیں ایسے ہی دیکھ رہا ہوں۔"

"بس کچھ طبیعت مضمحل سی ہے۔"

"تو ڈاکٹر کو دکھا آؤ۔"

"جاؤں گی....."

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ مجیب نے فون ریسیو کیا۔ دوسری طرف جمشید تھا "تم کیا کر رہے ہو یار۔ فوراً آ جاؤ۔" اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

"خیریت تو ہے۔ اتنی جلدی کیا ہے۔"

"ابے..... تم بڑے بے مروت ہو۔ اس دن کے بعد پلٹ کر فون کرنے کی توفیق بھی نہیں ہوئی۔ خیریت کی اطلاع تک نہیں دی۔"

"بس بھائی' کام میں ایسا لگا کہ....." مجیب نے شرمندگی سے کہا۔

"چھوڑو اس بات کو۔ اب آ جاؤ۔ آج میری اور میری بیوی کی سالگرہ....."

"تمہاری اور بھابی کی سالگرہ؟ ایک ہی دن!"

جمشید ہنسنے لگا "مطلب' ہماری شادی کی سالگرہ۔"

"تو سالگرہ شام کو ہی ہو گی نا۔ ابھی تو گیارہ بجے ہیں۔"

"دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھانا پھر مجھے شاپنگ کرا دینا۔ تحفے وغیرہ کی سمجھ نہیں ہے مجھ میں۔ تم ٹھہرے رائٹر آدمی۔"

"اچھا..... ٹھیک ہے۔" مجیب نے گھڑی دیکھی "میں ڈیڑھ بجے تک پہنچ جاؤں گا۔"

ریسیور رکھنے کے بعد مجیب صفورہ کی طرف مڑا' جو بہت غور سے اسے دیکھ رہی "مجھے آدھے گھنٹے کے اندر نکل جانا ہے۔" اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

صفورہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی "پینٹ شرٹ استری کر دیتی ہوں۔"

مجیب نے جا کر افضل خان کو گاڑی تیار رکھنے کی ہدایت دی "راولپنڈی جانا ہے۔" اس نے کہا۔



شاپنگ ہو چکی تو مجیب نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا "مہمان کتنے ہوں گے؟"

"کیسے مہمان؟" جمشید ہنسنے لگا پھر مجیب کی حیرت دیکھ کر اس نے وضاحت کی "یہ خالص گھریلو تقریب ہوتی ہے ہماری۔ تمہارے علاوہ باہر کا کوئی نہ ہو گا۔"

مجیب نے بھی خاموشی سے جمشید اور اس کی بیوی کے لئے تحفے لے لئے تھے۔ گھر پہنچ کر جمشید اسے اوپری منزل کے ایک کمرے میں لے گیا "اب تمہارے پاس تین گھنٹے ہیں۔ میرا خیال ہے نہا دھو کر فریش ہو جاؤ اور کچھ دیر سو جاؤ۔"

مجیب نے اس کے جانے کے بعد درواہ بند کیا اور شاپر سے تحفے نکال لئے۔ پھول دار کاغذ وہ لے کر آیا تھا۔ انہیں پیک کرنا تھا۔ وہ کاغذ پھیلا کر بیٹھ گیا۔

جمشید کی بیوی کے لئے اس نے گلدانوں کی بہت خوب صورت جوڑی لی تھی۔ اس کا جی چاہا کہ پیک کرنے سے پہلے وہ انہیں پھر دیکھے۔ اس نے گتے کا باکس کھولا۔ دکان دار نے گلدانوں کو اخباری کاغذ میں پیک کیا تھا۔ وہ کاغذ ہٹا ہی رہا تھا کہ اس کی نظر اخبار میں چھپی ایک تصویر پر پڑی۔ وہ بری طرح چونکا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ صفیہ کی تصویر ہے۔

اس نے جلدی سے اخبار کا وہ صفحہ نکالا اور اس کا جائزہ لیا۔ وہ ایک اشتہار تھا۔ سرخی پڑھ کر ہی وہ جیسے سانس لینا بھول گیا۔ جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی۔ چند لمحے تو وہ سرخی ہی دیکھتا رہا پھر اسے اشتہار پڑھنے کا خیال آیا۔ وہ پڑھنے لگا۔

صفورہ سفیان' تم کہاں ہو؟

اشتہار کے مطابق صفورہ سفیان 17 مارچ کو لاہور ریلوے اسٹیشن سے اچانک لاپتہ

ہوئی تھی۔ اس کی عمر اٹھائیس سال تھی۔ اس کے غائب ہو جانے کے بعد اس کے والدین کا حال بہت تباہ ہو گیا تھا۔ اشتہار میں اپیل کی گئی تھی کہ کسی نے صفورہ کو کہیں دیکھا ہو یا اس کے متعلق کچھ معلوم ہو تو اس پتے یا فون نمبر پر رابطہ کرے۔ صفورہ خود پڑھے تو چلی آئے۔

پتہ اور فون نمبر لاہور کا تھا اور اشتہار کسی صابر احمد کی طرف سے شائع ہوا تھا۔

اسے پڑھنے کے بعد مجیب سر تھام کر بیٹھ گیا۔ اس طرح کی صورت حال کا تو اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ اس کے ساتھ رہنے والی صفیہ وہی لڑکی ہے۔ وہ 17 مارچ کو لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر اسے ملی تھی۔ بلکہ یہ ہے کہ وہ خود اس کے کوپے میں آئی تھی مگر یہ چکر کیا ہے؟

مجیب کو سب کچھ یاد آنے لگا۔ اس نے ویٹر سلیم کا حوالہ دیا تھا لیکن نہیں.... حوالہ اس نے دیا تھا۔ صفیہ نے تو بس تائید کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ دراصل یہ بتانے کے لئے آئی ہے کہ.... لیکن مجیب نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی تھی۔

اسے اپنی وہ کیفیت یاد آ گئی۔ ریل میں رات گزارنے کے بعد وہ کتنا سہما ہوا تھا۔

یہ بات واضح تھی کہ وہ اس کے ساتھ جانے کے لئے نہیں آئی تھی لیکن اس نے صفیہ کو اندر بلا کر کوپے کا دروازہ بند کر لیا تھا۔ وہ لرز رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ اسے واپس جانا ہے مگر وہ خوف زدہ تھا.... اور یہ سمجھنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھا۔ وہ اسے چھوڑ ہی نہیں سکتا تھا۔

پھر مجیب کو اس کا جاتی ہوئی ٹرین کو کھڑکی سے دیکھنا یاد آیا۔ اس کے چہرے پر کیسی بے بسی تھی اور گاڑی گزر گئی تو وہ کیسے رونے لگی تھی۔ اس نے سمجھا کہ اسے کسی کو رخصت کرنا تھا۔ اس محرومی پر رو رہی ہے اور وہ اسے اپنے خوف کے متعلق بتاتا رہا تھا۔ وہ غور سے سنتی رہی تھی پھر جب ان کی ٹرین چل دی تو وہ گھبرا گئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اسے تو ہر حال میں یہاں اترنا تھا۔

پھر مجیب کو یاد آیا کہ صفورہ خالی ہاتھ تھی۔ اس کے پاس تو پرس بھی نہیں تھا۔ اور اس کے استفسار پر اس نے وضاحت کی تھی۔ "دراصل میں آپ کے ساتھ جانے کے ارادے سے نہیں آئی تھی۔ مجھے کہیں اور جانا تھا۔" اس وقت مجیب یہ سب کچھ

سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی باتیں تو اب سمجھ میں آ رہی تھیں۔ اسے یاد تھا کہ نام پوچھنے پر وہ صف..... کہہ کر رک گئی تھی۔ ذرا توقف کے بعد اس نے لفظ صفیہ پورا کیا تھا۔

اور وہ ہمیشہ صرف ایک چیز مانگتی رہی تھی۔ عزت اور احترام۔ اس نے جب بھی اسے کال گرل سمجھا تو اس نے احتجاج کیا۔ وہ کہتی تھی.... ابھی یہ میری پوزیشن نہیں ہے.... میرا یہ اسٹیٹس نہیں ہے۔ میں ایک شریف گھر کی لڑکی ہوں۔

مگر ایک بات مجیب کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس صفیہ یا صفورہ نے اس کے ساتھ جانا کیوں گوارا کیا۔ جبکہ وہ "وہ نہیں تھی" جو وہ اسے سمجھ رہا تھا اور بعد میں اتنا کچھ جو ہوا' وہ اس نے کیوں گوارا کیا۔ وہ سختی سے ڈٹ کیوں نہ گئی۔

اچانک ہی اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور سب کچھ جیسے روشن ہو گیا۔ وہ کہانیاں' انسانی نفسیات لکھنے والا کتنا بڑا ڈفر تھا کہ سامنے کی بات بھی نہیں سمجھ سکا۔ یہ لڑکی اس سے محبت کرتی تھی.... بے پناہ محبت۔

اس محبت کے بارے میں سوچ کر اس پر لرزہ چڑھ گیا۔ یہ کیسی محبت ہے کہ اس لڑکی نے اپنا سب کچھ' اپنا تن من' اپنی عزت اور آبرو سب کچھ اس پر وار دیا اور اس نے جواب میں اسے کیا دیا۔ توہین تذلیل۔ وہ اسے لوٹتا رہا اور وہ خاموشی سے لٹتی رہی۔ کون شریف لڑکی یہ ذلت گوارا کر سکتی ہے کہ اسے بازار کی چیز.... طوائف سمجھا جائے۔ خواہ سمجھنے والا اس کا محبوب ہو مگر صفیہ.... صفورہ نے یہ سب برداشت کیا۔ یہ کیسی محبت ہے۔ ایسی محبت تو قصے کہانیوں میں ہی ہوتی ہے اور یہ ایسی محبت ہے کہ جسے بھی سنائی جائے' وہ مذمت ہی کرے گا۔ کوئی اس کی تعریف نہیں کر سکتا۔

ہاں.... ایک میں ہوں' جو اس محبت کی قدر کر سکتا ہوں اور مجھے کرنی چاہئے۔ کسی نے اپنے آپ سمیت پوری دنیا چھوڑ دی میرے لئے اور میں اس کی ناقدری کرتا رہا۔ اس کے دل میں خیال ابھرا' اب تو کوئی بھی اسے قبول نہیں کرے گا۔ اس کے در کے سوا کوئی در نہیں اس کے پاس۔

اور وہ ہے کیسی.... اسے تو اب اپنے آپ پر شرم آ رہی تھی.... غصہ آ رہا تھا۔ وہ جیسی تھی' اسے کال گرل کوئی گدھا ہی سمجھ سکتا تھا۔ وہ پڑھی لکھی' اردو ادب کے

مطالعے کی شوقین، خوش گفتار، خوش اطوار۔ وہ جس کا سراپا ایک نظر دیکھنے کے لئے وہ اتنے دن خوار ہوتا رہا۔ وہ شرم و حیا والی۔ کال گرل کوئی ایسی ہوتی ہے۔ یہ سوچنا بھی گناہ تھا اس کے لئے مگر وہ سوچتا رہا۔ بلکہ صرف سوچنے تک محدود بھی نہیں رہا۔

مجیب بیٹھے بیٹھے لرزنے لگا۔ یہ کیسا گناہ سرزد ہوا ہے اس سے، جس کا کوئی کفارہ بھی نہیں۔ کوئی تلافی بھی نہیں۔ ایک پاک دامن لڑکی کو وہ بازار کی چیز کی طرح برتتا رہا۔ وہ کیسا حقیر، کیسا ذلیل ہوا ہے اس کے سامنے۔ اس بے چاری نے تو اس سے شکایت بھی نہیں کی۔ نجانے وہ چھپ چھپ کر کتنا روئی ہو گی۔ اسے تو اس کے ایک ایک آنسو کا حساب دینا ہو گا اور ایک آنسو کے حساب کے لئے اس کی عمر بھی تھوڑی ہے۔

اسے صفیہ.... صفورہ کی آخری قربانی یاد آئی۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ وہ پیسے نہیں لے گی لیکن وہ اسے گرتے.... پست ہوتے نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے بازار جانے سے بچانے کے لئے اس نے وہ ذلت قبول کر لی، جو ذلت کی حد ہے۔ کوئی عورت کسی کی محبت میں اس سے بڑی قربانی نہیں دے سکتی اور کروڑوں میں کوئی ایک عورت ہی ایسا کر سکتی ہے۔ وہ خوش نصیب تھا کہ اسے ایسی محبت ملی لیکن بے خبری میں وہ اس کی ناقدری کرتا رہا۔

یہ تصور بھی اس کے لئے خوف ناک تھا کہ اس کے دیئے ہوئے پیسے قبول کرتے ہوئے ص.... صفورہ پر کیا گزرتی ہو گی۔ اس کی روح کیسی داغی جاتی ہو گی۔

اس نے چونک کر گھڑی کی طرف دیکھا اور حیران رہ گیا۔ اشتہار والا اخبار تھام کر یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اسے دو گھنٹے ہو گئے تھے۔ اس وقت اس کا جی چاہ رہا تھا کہ اڑ کر صفورہ کے پاس پہنچ جائے مگر اب وہ تقریب چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔

وہ تحفے پیک کرنے میں مصروف ہو گیا۔



جمشید کے گھر سے نکلتے نکلتے بھی گیارہ بج گئے۔ جمشید اور اس کی بیوی تو اصرار کر رہے تھے کہ وہ رات کو رک جائے لیکن اس نے انکار کر دیا کہ یہ ممکن نہیں۔

"تم تو ایسے بے تاب ہو، جیسے وہاں بھابھی تمہاری منتظر ہوں۔" جمشید نے ہنس کر

کہا۔

"یہی بات ہے۔" مجیب بے ساختہ بولا۔

"کیا مطلب؟ بھابی بھی تمہارے ساتھ ہیں؟"

مجیب گڑبڑا گیا "دو بیویاں ہیں میری۔" اس نے بات بنائی "ایک ہر وقت میرے ساتھ رہتی ہے۔ وہ ہے میرا کام۔"

جمشید اور اس کی بیوی ہنسنے لگے۔

مری کے سفر میں اس کی بے تابی خود اس کے لئے بھی حیرت انگیز تھی۔ اسے خوشی بھی ہو رہی تھی۔ بڑے عرصے کے بعد وہ خود کو پہلے جیسا محسوس کر رہا تھا۔ اندر کی، سب غلاظت جیسے دھل گئی تھی۔ وہ خود کو بہت اچھا اور صاف ستھرا محسوس کر رہا تھا۔

ایسے میں اسے توبہ کا خیال آ گیا۔ یہ اللہ کی کتنی بڑی رحمت ہے کہ انسان کتنا ہی گناہ گار کیوں نہ ہو، توبہ کرتے ہی، قبول ہوتے ہی بچے کی طرح معصوم ہو جاتا ہے۔ گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے اور یہ اس کی رحیمی ہے کہ بندہ توبہ کے بعد گناہ کرے اور پھر توبہ کرے.... اور ہزار بار ایسا ہو، تب بھی اللہ اسے بخش دیتا ہے۔ وہ ایسا ہی غفور الرحیم ہے۔

توبہ سے پہلے مجیب نے خود کو ٹٹولا۔ وہ اپنے گناہوں پر نادم تھا، بے حد شرم سار تھا اور اسے یقین تھا کہ اللہ کی رحمت شامل حال رہی تو وہ کبھی اعادہ گناہ نہیں کرے گا۔ اس کے بعد توبہ اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلی۔ دھڑکنوں کی زبان میں ہوئی اور اس کے اندر اطمینان کی ایک بڑی لہر اٹھی، جس نے سب کچھ دھو ڈالا۔

وہ بنگلے پر پہنچا تو ایک بجنے والا تھا۔ اسے یاد آیا کہ ابھی ایک ہفتہ پہلے واپس آنے پر اس کی زبان میں اور اس کے قدموں میں.... لڑکھراہٹ تھی اور اب اس وقت اس کے قدموں میں وارفتگی تھی۔ وہ تلافی اور محبت کے احساس سے یوں بھرا ہوا تھا کہ وہ اس کے انگ انگ سے چھلک رہی تھی۔

گاڑی سے اتر کر وہ بنگلے میں داخل ہوا۔ اندر ہر طرف روشنی تھی مگر گہرا سناٹا تھا۔ شکور اور فاطمہ سونے کے لئے جا چکے ہوں گے اور صفورہ یقیناً اکیلی ہو گی۔ اس

نے بیڈ روم کی طرف بڑھتے ہوئے سوچا۔ اس کے دل کی دھڑکنوں میں ایسی بے تابی تھی' جیسے وہ پہلی بار اپنی محبت سے ملنے جا رہا ہو۔

دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی اسے صفورہ کے رونے کی آواز سنائی دے گئی۔ وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔ وہ پریشان ہو گیا۔ اس کے قدموں میں تیزی آ گئی۔ بیڈ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ صفورہ بیڈ پر بیٹھی تھی اور بڑی دردناک آواز میں رو رہی تھی۔

وہ بے تابانہ اس کی طرف لپکا اور بیڈ پر بیٹھتے ہوئے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا "کیا ہوا صفورہ؟ کیا بات ہے میری جان؟"

صفورہ اس وقت اتنی نیم جان ہو رہی تھی کہ ایک ساتھ کئی اتنی بڑی تبدیلیوں کو بھی محسوس نہ کر سکی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو پہلے وہ اپنے اصل نام سے پکارے جانے پر چونکتی پھر اسے والہانہ انداز میں لپٹائے جانے پر حیرت ہوتی اور اس کے بعد اسے اس کے لہجے اور لفظوں پر حیرانی ہوتی۔

مگر اس وقت وہ ایسی ٹوٹی ہوئی تھی کہ اسے نہ اپنا ہوش تھا نہ گرد و پیش کا احساس۔ وہ بدستور روتی رہی۔

مجیب نے نرمی سے اسے جھنجوڑا "بتاتی کیوں نہیں کیا بات ہے؟"

صفورہ نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا "م... میں آج... ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔" اس نے بڑی مشکل سے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

مجیب پریشان ہو گیا۔ دل جیسے دھڑکنا بھول گیا "کیا... خدانخواستہ... کوئی بڑی...."

"میں... میں ماں بننے والی ہوں۔"

مجیب حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔ اس کی پریشانی کم نہیں ہوئی تھی۔ اس نے سنا ضرور تھا لیکن صفورہ کے لفظ اس کے شعور کو نہیں چھو سکے تھے۔ وہ پریشانی سے اسے دیکھتا رہا۔ وہ پھر سر جھکا کر رونے لگی تھی۔

اور پھر اچانک بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے صفورہ کو جھنجوڑ ڈالا "کیا... کیا کہا تم نے؟"

"یہ سچ ہے۔ اب کیا ہو گا۔" صفورہ نے سر جھکائے جھکائے کہا۔ وہ اب بھی

سسک رہی تھی۔

مجیب نے بڑی نرمی سے اس کا چہرہ اٹھایا اور اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں بھر لیا "صفورہ سفیان' تم ابھی ماں نہیں بنو گی۔" اس کے لہجے میں محبت تھی۔

صفورہ نے نظریں اٹھائیں۔ اس کی نگاہوں میں مظلومیت تھی۔ "تو میں کب چاہتی ہوں۔"

"تم میرا مطلب نہیں سمجھیں۔ تم ماں ضرور بنو گی مگر بعد میں۔ پہلے... فوری طور پر تمہیں بیوی بننا ہو گا... میری بیوی اور تمہارا نام بدلے گا۔ تم صفورہ سفیان سے صفورہ مجیب بنو گی۔ اس کے بعد انشاء اللہ تم ماں بنو گی۔ میں تمہارے ہر دکھ کی تلافی کروں گا۔"

صفورہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ وہ یقیناً کوئی بہت بے رحمانہ مذاق کر رہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں اسے محبت کے سوا کچھ نظر نہیں آیا اور وہ ایسی محبت تھی کہ وہ اس پر شک نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اٹل اور یقینی محبت تھی۔

اس بار وہ ایسے روئی' جیسے عمر بھر کے آنسو بہا دینے کا ارادہ ہو۔ اس کے آنسو مجیب کے سینے پر...دل پر گر رہے تھے۔



وہ سونے کی نہیں' جاگنے کی رات تھی۔ تعارف کی رات تھی۔ تلافی کی رات تھی۔ بہت مقدس رات تھی وہ۔

صفورہ' مجیب سے یوں لپٹی ہوئی تھی' جیسے اس کے وجود کا حصہ ہو لیکن اس ہم آغوشی میں آلودگی نہیں' پاکیزگی تھی۔

"مجھے اپنے آپ پر بڑا افسوس ہے۔ مجھے تو آدمی کی بڑی پہچان ہے لیکن آنکھوں پر... بلکہ عقل پر بھی پردہ پڑ گیا تھا۔" مجیب کہہ رہا تھا "میں تمہیں دیکھتا رہا۔ تمہارے ساتھ رہتا رہا لیکن میں نے تمہیں جانا نہیں۔ تمہیں پہچان نہیں سکا میں۔"

"مگر میں نے آپ کو برسوں پہلے پہچان لیا تھا... دیکھے بغیر... سمجھے بغیر۔"

"کیسے؟"

جواب میں صفورہ نے جو کچھ بتایا' اس کے بعد مجیب کو لگا کہ وہ اس لمحے سے پہلے

بھی۔۔۔ جان کر بھی اسے نہیں جان سکا تھا۔ وہ اس کے لئے انکشافات کی رات تھی "تم۔۔۔ تم وہ لڑکی ہو' جس نے مجھے وہ خط لکھے تھے۔ دو خط۔"

"جی ہاں۔ میں آپ کی فین تھی۔ میں آپ سے محبت کرتی تھی۔ آپ کے خواب دیکھتی تھی۔ آپ سے ملنے کی آرزو مند تھی۔ اس بار جو آئی تو اس کا امکان بھی سامنے آیا لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اس بار پاکستان کی سرزمیں پر قدم رکھنے سے پہلے ہی میں آپ کو دیکھ چکی ہوں۔ ہاں میں نے آپ کو دیکھ کر یہ ضرور سوچا تھا کہ آپ ایسے ہی ہوں گے۔۔۔"

مجیب کے لئے وہ الف لیلیٰ تھی۔ اسے وہ واقعہ یاد تھا' وہ بڑھیا یاد تھی' جسے اس نے بچایا تھا لیکن انڈیا سے آنے والی ٹرین میں بیٹھی مفورہ نے وہ منظر دیکھا تھا' یہ ناقابل یقین لگ رہا تھا "کیسی انہونی ہے یہ؟"

"یہ تو داستان ہی انہونیوں کی ہے۔" مفورہ مسکرائی۔

مجیب نے اس کی ایسی سچی مسکراہٹ دیکھی ہی نہیں تھی۔ اس لمحے وہ اسے بہت خوب صورت لگی "اور کس امکان کی بات کر رہی تھیں تم؟"

مفورہ نے اسے صابر بھائی کے متعلق بتایا۔ مجیب کی حیرت کی کوئی حد نہیں تھی "ارے۔۔۔ وہ ہوٹل کا ریسپشنسٹ صابر۔ اوہ۔۔۔ اب یاد آیا۔ پتہ ہے' اس نے تمہارے متعلق بتایا تھا مجھے۔ تمہارے لئے آٹوگراف بھی لئے تھے۔ اب سمجھ میں آیا کہ تمہارا نام کیوں جانا پہچانا لگ رہا تھا۔ صابر کا اصرار تھا کہ میں اس کے گھر میں کھانا کھاؤں۔"

"میری وجہ سے۔ وہ چاہتے تھے کہ میرا آپ سے ملنے کا ارمان پورا ہو جائے۔" مفورہ نے کہا "میں آپ کی دوبارہ آمد کے انتظار میں دن گن گن کر کاٹتی رہی۔ یہاں تک کہ ہماری روانگی کا دن آ پہنچا۔ ایک دن پہلے مجھے پتہ چلا۔۔۔" وہ بتاتی رہی۔

"میری ٹرین وقت پر آ جاتی تو یہ سب نہ ہوتا۔" مجیب نے گہری سانس لے کر کہا "لیکن تم نے بہت بڑا رسک لیا مجھ سے ملنے کی خاطر۔" اب ساری کڑیاں مل گئی تھیں۔

"ہاں' سب کچھ ختم کر لیا۔ زندگی برباد کر لی اپنی۔"

"نہیں۔ زندگی تو انشاء اللہ برباد نہیں ہو گی تمہاری۔"

مفورہ نے گھڑی دیکھی اور چونک پڑی۔ ساڑھے پانچ بج چکے تھے۔ وہ اٹھی' کھڑکی کی طرف گئی اور پردے سرکا دیئے۔ کمرا ہلکی روشنی سے بھر گیا۔

نئی زندگی کی پہلی صبح طلوع ہو رہی تھی۔



مجیب نے صبح سویرے فون کر کے جمشید کو جگا دیا "سوری بھائی۔ معاملہ اہم نہ ہوتا تو میں تمہیں زحمت نہ دیتا۔" اس نے اپنے اور مفورہ کے گرنے کا احوال چھوڑ کر سب کچھ اسے بتا دیا "اب میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"تم خوش نصیب ہو یار کہ ایسی محبت ملی۔" جمشید نے کہا "اب تم فکر نہ کرو۔ بس یہاں آ جاؤ۔ ٹھیک ٹھاک شادی کراؤں گا تمہاری۔"

"لیکن بھابی ناخوش ہوں گی۔"

"ارے نہیں۔ میں سمجھا لوں گا اسے۔ ایسی محبت کو کون برا کہہ سکتا ہے۔ بس تم آ جاؤ۔ میں تمہارا منتظر ہوں۔"

ساڑھے آٹھ بجے وہ گھر سے نکل آئے۔ مجیب نے جیپ استعمال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ملازمین کو کچھ معلوم نہیں ہونا چاہئے تھا۔ یہ عزت کا معاملہ تھا۔

وہ ویگن کے ذریعے راولپنڈی پہنچے۔ بازار پوری طرح کھلے نہیں تھے پھر بھی دو تین جیولری شاپس نظر آ گئیں "میں تمہیں زیورات سے تو نہیں لاد سکتا۔" مجیب نے مفورہ سے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "لیکن شادی کی انگوٹھی تمہیں ضرور ملے گی۔"

"مجھے اس کی بھی آرزو نہیں۔ جو چاہا' وہ مجھے مل گیا۔" مفورہ نے اسے محبت پاش نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

انگوٹھی خرید کر وہ نکلے اور سیدھے جمشید کے گھر گئے۔ شبانہ اور جمشید نے بڑے تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا۔ شبانہ نے مفورہ کو لپٹایا اور اس کی پیشانی چوم لی پھر وہ مجیب کی طرف مڑی "چھپے رستم نکلے آپ تو۔ ویسے آپ کی خوش نصیبی میں کوئی شک نہیں۔ مفورہ بہت پیاری ہیں۔"

مفورہ شرما گئی۔ جمشید نے مجیب سے پوچھا "اب کیا پروگرام ہے؟"

"میں آج ہی شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ تو بھول جا یار۔ یہ شادی نہیں ہو سکتی۔" جمشید نے افسردگی سے کہا "تمہاری بھابی پھیل گئی ہیں۔"

مجیب ہکا بکا ہو کر اسے دیکھتا رہا۔ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" شبانہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مطلب یہ کہ یہ شادی آج نہیں ہو سکتی۔ البتہ پرسوں ہو گی۔" جمشید بولا۔

"ہم سب طے کر چکے ہیں۔" شبانہ نے کہا "ابھی یہ گھر مہمانوں سے بھر جائے گا۔ ہم صفورہ کو مایوں بٹھائیں گے۔ آپ دونوں کو یہاں سے نکال دیا جائے گا۔ یہ گھر لڑکی کا ہے اور میں لڑکی والی ہوں اور یہ......" اس نے جمشید کی طرف اشارہ کیا "...یہ لڑکے والے ہیں۔ جائیں آپ لوگ اب اپنا ٹھکانہ تلاش کریں۔"

"دیکھا۔ خود تو بے گھر ہوا۔ مجھے بھی نکلوا دیا۔" جمشید نے مجیب کو ملامت بھری نظروں سے دیکھا۔

"بس اب چل دیں۔ پرسوں شام عصر کے بعد آیئے گا بارات لے کر۔" شبانہ نے جمشید کو دھکیلا۔

"اچھا بابا...... جاتے ہیں۔"



شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ اتنے مختصر نوٹس کے باوجود شبانہ نے اچھے خاصے لوگوں کو اکٹھا کر لیا تھا۔ مجیب نے دو دن جمشید کے ساتھ اس کے دوسرے فلیٹ پر گزارے تھے، جہاں جمشید کے کچھ دوست اکٹھا ہو گئے تھے "مجھے خوشی ہے کہ اس فلیٹ میں کوئی نیک کام ہو رہا ہے۔" جمشید نے مجیب سے کہا۔

وہ باقاعدہ بارات لے کر گئے اور شادی ہوئی۔ خوب تصویریں کھینچی گئیں۔ صفورہ کے کہنے کے مطابق حق مہر تین ہزار روپے مقرر ہوا۔

بالآخر رخصتی کا وقت آ گیا۔ جمشید اپنی گاڑی میں انہیں چھوڑنے کے لئے آیا۔ رخصت ہوتے وقت صفورہ نے سادہ لباس پہن لیا تھا۔ آئی وہ خالی ہاتھ تھی اور جاتے وقت اس کے ساتھ ایک بڑا سوٹ کیس تھا۔

جمشید کو انہوں نے اصرار کر کے چائے کے لئے روکا۔ فاطمہ نے چائے بنائی "دو

تین دن میں شبانہ کے ساتھ آؤں گا..... تمہاری تصویروں کا البم لے کر۔" جمشید نے رخصت ہوتے وقت کہا۔

اب وہ اکیلے تھے۔ صفورہ نے مجیب سے کہا "جایئے... چہل قدمی تو کر آیئے۔"

"واہ... مجھے نکالنا چاہ رہی ہو۔" مجیب نے شوخی سے کہا۔

"جایئے تو۔" صفورہ نے اسے دھکیلا۔

مجیب عقبی باغیچے میں چلا گیا۔ وہ کئی دن بعد یہاں آیا تھا۔ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ایسے میں سحاب یاد آ گئی۔ اس عرصے میں بھی وہ سحاب کو بھولا نہیں تھا۔ پنڈی سے بھی وہ اسے فون کرتا رہا تھا۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ اس نے سحاب کے ساتھ زیادتی کی ہے لیکن یہ خیال فوراً ہی محو ہو گیا- وہ جانتا تھا کہ اس نے جو کچھ کیا ہے، وہ بہت ضروری تھا۔ اب بھی..... اس تلافی کے بعد بھی لازم نہیں کہ اس کی بخشش ہو جائے لیکن یہ طے ہے کہ اس کی توبہ زیادہ سچی ہو جائے گی۔ اسے یقین تھا کہ سحاب کو وہ یہ سب کچھ بتائے گا تو وہ بھی یہی کہے گی کہ یہ ضروری تھا۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے وہ ٹہلتا رہا اور وقت کا پتہ بھی نہیں چلا۔ شاید کوئی آدھے گھنٹے کے بعد وہ بنگلے میں واپس آیا۔

بیڈ روم کا دروازہ بند تھا۔ اس نے ناب گھمائی تو دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی اسے صفورہ نظر آئی، جو بیڈ پر دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اس نے دروازہ بند کر کے لاک کیا اور بیڈ کی طرف بڑھا "تو یہ اہتمام کرنا تھا میری دلہن کو۔" اس نے صفورہ کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

اس نے گھونگھٹ اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ صفورہ معنی خیز انداز میں کھنکھاری۔

"اوہ..... میں تو بھول ہی گیا تھا۔" مجیب نے جیب میں ہاتھ ڈال کر جڑاؤ کنگن نکالا اور اسے ہاتھ میں پہنا دیا "یہ ہے تمہاری منہ دکھائی۔"

وہ پھر ہاتھ بڑھا رہا تھا کہ صفورہ نے کہا "میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ آپ مہر تو ادا کریں۔"

"ارے ہاں....." مجیب نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

"جی نہیں۔ ادھر دیکھیے۔" صفورہ نے تکیہ الٹا اور اس کے نیچے رکھے ہوئے نوٹوں کی طرف اشارہ کیا "یہ ہے میری مہر کی رقم۔ اسے اٹھائیں اور عزت و احترام سے مجھے دیں۔"

مجیب نے حیرت سے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا "لیکن...."

"مجھے یہی مہر چاہئے۔"

مجیب نے نوٹوں کو اکٹھا کر کے گنا۔ وہ پانچ سو والے چھ نوٹ تھے۔ پورے تین ہزار۔ اس کی سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا تھا۔ تاہم اس نے وہ نوٹ اٹھائے اور بڑی محبت سے اس کے ہاتھ میں دے کر مٹھی بند کر دی "بیگم.... یہ ہے تمہارا مہر۔"

"جزاک اللہ۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ آپ کی خوشیوں کو ہمیشہ مقدم رکھوں گی۔ کبھی آپ کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کروں گی۔" صفورہ کی آواز آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔

"مگر اب تو ان نوٹوں کا راز بتا دو۔" مجیب کو وہی الجھن ستا رہی تھی۔

"یہ وہ نوٹ ہیں، جو آپ کے مجبور کرنے پر میں آپ سے لیتی رہی۔" صفورہ کے لہجے میں شرمندگی تھی۔

ایک لمحے کو تو مجیب کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا اور پھر وہ اچھل ہی پڑا "اوہ.... تو بلیک منی کو وائٹ کر رہی ہو؟"

"اللہ توبہ قبول فرما کر آدمی کو اپنی رحمت سے دھو ڈالتا ہے مگر کہیں گھر میں گندگی ہو تو وہ دھونا ہی پڑتی ہے نا۔"

مجیب اس لمحے دل کی گہرائیوں سے شرمندہ ہوا "اللہ مجھے معاف کرے۔ میں بہت برا ہوں۔"

"ایسا نہ کہیں۔" صفورہ کے لہجے میں التجا تھی "اچھے سے اچھا آدمی بھی کبھی برا ہو جاتا ہے۔ اصل میں اچھائی صرف اللہ کی طرف سے ہے۔"

مجیب نے گھونگھٹ اٹھا کر اسے دیکھا اور دیکھتے کا دیکھتا رہ گیا، وہ بہت حسین لگ رہی تھی، جیسے کوئی خواب ہو پھر اسے حیرت ہوئی "ارے.... یہ اتنے زیور!"

"جی ہاں۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ مجھے بس ایک انگوٹھی دے سکتے ہیں۔ لیکن

اللہ کی تائید ساتھ تھی۔ شبانہ بھابی نے مجھے زیور اس طرح دلائے، جیسے جہیز کا سامان کر رہی ہوں۔ کچھ اور لوگوں نے تحفے دیئے۔ میرے پاس اتنے زیور اور کپڑے ہیں کہ میں خواب میں بھی نہیں سوچ سکتی تھی۔"

"واقعی.... یہ تو اللہ کی تائید ہے۔" مجیب ابھی تک حیرت سے نہیں سنبھل پایا تھا۔

"اللہ کا شکر ہے۔ ویسے میں تو اس کے شکر کا حق ادا ہی نہیں کر سکتی۔" صفورہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا "میں نے جو کچھ بھی مانگا تھا، میرے غلط طریق کار، میری لغزشوں اور بداعمالیوں کے باوجود اللہ نے مجھے دیا اور بڑی عزت سے دیا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اس سب کی مستحق نہیں تھی۔ مجھے تو زندہ رہنے کا حق بھی نہیں تھا۔ وہ کیسا رحمت والا ہے۔ کیسا دعاؤں کا سننے والا ہے اور وہ ناممکن کو ممکن بنا دیتا ہے۔"

"بے شک۔" مجیب نے بڑی مشکل سے کہا۔ اس کی اپنی کیفیت بڑی عجیب ہو رہی تھی۔

"آپ ذرا سا انتظار کریں۔ میں شکر کے نفل پڑھ لوں۔"

"ضرور۔"

شب عروسی شروع ہو رہی تھی!



زندگی کسی ندی کی سی ہمواری کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ ہر لمحہ خوشی اور سکون سے عبارت تھا۔ مجیب خوش تھا کہ اسے ایسی خدمت گزار، اطاعت شعار، قناعت پسند اور شکر گزار بیوی ملی۔ اسے اپنی کسی ضرورت کے لئے کہنا نہیں پڑتا تھا۔ وہ کہنے سے پہلے ہی سمجھ لیتی تھی اور اس کی ضرورت پوری کر دیتی تھی۔

مگر شادی کے اگلے ہی روز اس پر صفورہ کی شخصیت کا ایک اور انوکھا پہلو منکشف ہوا۔ وہ اسٹڈی میں اس کے پاس بیٹھی کسی سوچ میں گم تھی۔ مجیب نے اسے دیکھا۔

"ارے.... تم تو ابھی سے ناخوش نظر آنے لگیں۔"

"جی نہیں۔ اس سے زیادہ خوشی تو کسی کو بھی نہیں مل سکتی۔ بس ایک خلش مجھے ستاتی ہے...."

"پلیز۔ میری لغزشوں اور بدسلوکیوں کو بھول جاؤ۔ میں تلافی کر دوں گا ہر زیادتی کی۔"

"یہ بات نہیں۔ وہ سب تو مٹ چکا میرے دل و دماغ سے۔ یاد کرنے کی کوشش کروں تو بھی یاد نہیں آتا مگر مجھے یہ خلش ستاتی ہے کہ آپا کے ساتھ زیادتی ہوئی۔"

"آپا... کون آپا؟"

"سحاب آپا۔ خدا کی قسم' میں نے ان کا حق چھیننے کا... انہیں دکھ پہنچانے کا کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔"

مجیب حیران رہ گیا "میری بیوی کی بات کر رہی ہو؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا "وہ تمہاری آپا کب سے ہو گئی؟"

"یہاں آنے کے فوراً بعد ہی... مجھے ان سے محبت ہو گئی۔"

"اس کے ساتھ اگر کوئی زیادتی ہوئی بھی ہے تو تمہاری طرف سے نہیں۔ میری طرف سے ہوئی ہے۔" مجیب نے سرد آہ بھر کے کہا "تم اسے بوجھ نہ بناؤ۔"

صفورہ کچھ سوچ رہی تھی پھر اس نے سر اٹھایا "مجیب... مجھے تو سب کچھ عزت کے ساتھ مل چکا ہے۔ میری اوقات سے بہت زیادہ۔ میں سیر ہو چکی ہوں۔ اب خدا کی قسم' کبھی مجھے احساس ہوا کہ میں آپا کے لئے تکلیف کا باعث ہوں تو خود ہی راستے سے ہٹ جاؤں گی۔"

"تم ایسا کچھ نہیں کرو گی۔" مجیب نے سخت لہجے میں کہا "اچھا... یہ بتاؤ' رقیب سے محبت کیسے ہو گئی تمہیں۔"

"ایسا نہ کہیں۔ وہ میری رقیب تو نہیں۔ ہاں میں ان کی رقیب ضرور بن گئی۔ اس کا افسوس ہے مجھے۔"

"تم نے جواب نہیں دیا میری بات کا۔ تمہیں سحاب سے محبت کیسے ہو گئی۔"

"بس ہو گئی۔ آپ ان سے اتنی محبت کرتے ہیں تو مجھے کیوں نہ ہوتی۔" اس نے سادگی سے کہا۔

"تمہیں شادی کے وقت خیال نہیں آیا سحاب کا؟"

"آدمی بڑا خود غرض ہوتا ہے۔" صفورہ نے گہری سانس لے کر کہا "اپنی خوشی کے

وقت کچھ یاد نہیں رہتا۔ اگر مجھے ان کا خیال آ گیا ہوتا تو میں شادی ہی نہیں کرتی۔"

"اور شادی نہ ہوتی تو ہم دھلتے بھی نہیں۔ اپنی برائی کے احساس کے مستقل اسیر ہو کر بد سے بدتر ہوتے چلے جاتے ہم۔"

"جی ہاں۔ یہی تو مشکل ہے۔ میں کیا کروں۔ اللہ میری خوشی کے اس گہن کو بھی دور کر دے تو ہر سانس شکر ادا کروں اس کا۔" یہ کہتے کہتے وہ چونک کر اٹھی اور کمرے سے جانے لگی۔

"ارے... کہاں چل دیں۔"

"آپ کی چائے کا وقت ہو گیا ہے۔"

مجیب چند لمحے دروازے کو دیکھتا رہا' جس سے گزر کر وہ باہر گئی تھی پھر وہ کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ خوش تھا کہ کام بہت اچھا ہو رہا ہے۔



صفورہ کے سامنے اپنی اور مجیب کی شادی کی ایک تصویر رکھی تھی۔ وہ کبھی اس تصویر کو دیکھتی اور کبھی سامنے رکھے پیڈ کے صفحے کو۔ اس کے ہاتھ میں قلم تھا اور وہ ایک بہت مشکل خط لکھنا چاہ رہی تھی۔ کاغذ پر القاب و آداب وہ لکھ چکی تھی۔ پیاری' بہت پیاری اماں' السلام علیکم...

جو خط اسے لکھنا تھا' وہ بہت عجیب اور بے حد مشکل تھا۔ اس میں جھوٹ بھی ہوتا اور سچ بھی۔ مکمل سچ لکھنے کا اس میں حوصلہ بھی نہیں تھا۔ اسے سب سے بچھڑے ڈھائی مہینے ہو چکے تھے۔ اتنے عرصے خط نہ لکھنے کا کوئی جواز بھی گھڑنا تھا اسے اور صابر بھائی سے رابطہ نہ کرنے کی وجہ بھی سوچنی تھی۔ وہ واقعی بہت مشکل خط تھا۔

ہاں' یہ لکھنا بہت آسان اور ایسا فطری تھا' جیسے سانس لینا کہ مجیب بہت اچھے ہیں۔ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ میرا خیال رکھتے ہیں۔ کیونکہ وہ تھا ہی ایسا۔ اسے شادی کے بعد کی صبح یاد آ گئی۔ اس نے مجیب کی اسٹڈی میں اس کی میز پر رکھنے کے لئے بڑا خوب صورت گلدستہ بنایا۔ اسے گلدان میں سجا کر وہ اسٹڈی میں لے گئی اور میز پر رکھا تو مجیب نے ہنس کر کہا "اوہ تو گلدستے بنائے جا رہے ہیں۔ اچھا... ذرا ہاتھ تو بڑھاؤ اپنا۔"

اس نے ہاتھ بڑھایا تو مجیب نے چپکے سے پھولوں کا بہت حسین گجرا اس کی کلائی میں باندھ دیا۔ وہ اسے دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ نجانے کب' چپکے چپکے وہ اس گجرے کے لئے پھول جمع کرتا پھرا ہو گا اور اس لمحے اس کی آنکھوں میں بے پایاں محبت تھی۔

خوشیاں لکھنا کتنا کتنا آسان ہوتا ہے۔ اس نے سوچا اور دکھ' پریشانیاں اور ذلتیں لکھنا کتنا مشکل ہے۔ اس لئے کہ وہ لکھنے کی نہیں' صرف سہنے کی چیز ہوتی ہیں۔ انہیں لکھنا بھی نہیں چاہئے۔ جھوٹ لکھ دینا ان سے بہتر ہے۔

وہ خط لکھنے لگی "اماں.... ٹرین میں میرا دم گھٹ رہا تھا۔ لگتا تھا' سانس رک جائے گی۔ میں گھبرا کر نیچے اتر گئی۔ پلیٹ فارم پر ہجوم کے درمیان یہ کیفیت اور بڑھ گئی تو میں ایک سنسان گوشے کی طرف چل دی۔ چلتے چلتے مجھے چکر آیا پھر نجانے کیا ہوا کہ مجھے ہوش نہیں رہا۔ ہوش آیا تو نہ ٹرین تھی نہ چچا میاں یا کوئی اور' اور میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ چچا میاں کا پتہ' نہ ان کا فون نمبر۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ ایسے میں وہ مجھے مل گئے۔ وہ نہ ملتے تو میں برباد ہو جاتی۔

وہ سوچتی اور لکھتی رہی۔

"اماں.... بہت دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ زیور تم تصویر میں دیکھ ہی لو گی۔
گروپ تصویر میں شبانہ باجی ہیں' جنھوں نے بہن بن کر مجھے اپنے گھر سے وداع کیا۔

"مجیب شادی شدہ ہیں۔ ان کے تین بچے ہیں لیکن وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں اماں' میں بہت خوش ہوں۔ ابھی انہوں نے سحاب آپا کو نہیں بتایا ہے۔ کراچی جائیں گے تو بتائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی مجھے قبول کرلیں گی۔ میں چاہتی ہوں اماں کہ ابھی صابر بھائی کو نہ بتائیں۔ میں کراچی جاکر سحاب آپا کے ساتھ رہنے لگوں گی تو آپ کو خط لکھوں گی پھر صابر بھائی کو بتا دیجئے گا۔ میں خود بھی ان سے رابطہ کروں گی۔ ابھی شاید انہیں یہ سب اچھا نہ لگے۔ بے عزتی محسوس ہو انہیں۔ ابا کو بتا دیجئے گا کہ اب وہ بے فکر ہو جائیں۔ اللہ کے فضل و کرم سے ان کی عزت ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئی۔

موقع ملتے ہی ہم انڈیا آئیں گے اور جب میں کراچی چلی جاؤں گی تو آپ لوگ بھی ہمارے ہاں ضرور آیئے گا...."

دو تصویروں کے ساتھ یہ خط اس نے انڈیا کے پتے پر پوسٹ کر دیا۔ مری کا پتہ بھی بھیج دیا۔ دو ہفتے بعد اس خط کا جواب آگیا۔ اماں بہت خوش تھیں اور ابا بھی۔ انہیں مجیب بہت اچھا لگا تھا۔

پھر اس کی فرمائش پر مجیب نے بھی ابا اور اماں کو خط لکھا۔ یقین دہانیاں کرائیں۔ اس کا جواب بھی آگیا۔

اللہ کے کرم سے بچھڑے ہوئے دل مل گئے تھے۔ ٹوٹے ہوئے ناتے جڑ گئے تھے۔ سارے زخم بھر گئے تھے۔



پھر جدائی کی رات آ گئی!

خوشیوں کے دن خوشبو کی طرح یوں اڑ گئے تھے' جیسے لمحے ہوں۔ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا لیکن اسکرپٹ مکمل ہو گیا۔ مجیب نے ایوب ساغر کو فون کر کے اسے صورت حال بتائی۔ اس نے کہا' کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ صفورہ کو وہاں چھوڑ سکتا ہے۔

صفورہ اس سے یوں لپٹی ہوئی تھی' جیسے کبھی جدا نہیں ہو گی "آپ مجھے جلد سے جلد کراچی لے جائیں گے نا۔"

"بس سحاب سے بات کرنے کی دیر ہے۔" مجیب نے اسے یقین دلایا "اور سحاب بے حد معقول بھی ہے اور مجھ سے بے تحاشا محبت بھی کرتی ہے۔"

"وہ مان تو جائیں گی نا۔ ان سے کہئے گا' میں ان کی کنیز ہوں۔ کبھی برابری نہیں کروں گی ان کی۔"

"تم تو پگلی ہو۔"

صبح مجیب نے تینوں ملازموں کو صفورہ کا خیال رکھنے کی ہدایت کی۔ فاطمہ سے اس نے اکیلے میں بات کی "دیکھو فاطمہ۔۔۔۔ بی بی کا بہت خیال رکھنا۔ یہ پہلا بچہ ہے نا۔"

"آپ فکر نہ کریں صاحب جی۔"

مجیب خود کئی بار صفورہ کو ڈاکٹر کے پاس لے جا چکا تھا "دیکھو فاطمہ' چیک اپ ہر مہینے ہونا ہے۔ یہ یاد رکھنا اور خود لے کر جانا بی بی کو۔"

چلتے وقت اس نے صفورہ سے بھی اپنا خیال رکھنے کو کہا "تمہارے اکاؤنٹ میں پچیس ہزار کے قریب رقم ہے اور میں مزید بھجوا دوں گا۔"

صفورہ سہم گئی "آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں' جیسے بہت دن لگیں گے۔"

"ارے نہیں۔ یہ اگست ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں تمہیں لینے آؤں گا۔"

"یہ بھی بہت ہے۔ میں تو ایک دن بھی آپ سے دور نہیں رہ پائی تھی۔ بڑی تکلیف اٹھائی تھی میں نے۔ میں تو مرجاؤں گی۔" صفورہ نے فریاد کی۔ اس لمحے اسے سحاب کا خیال آیا۔ وہ اس سے زیادہ۔۔۔ کہیں زیادہ مجیب کی عادی ہے۔ محبت بھی بہت کرتی ہے۔ لیکن ابھی مجیب پانچ ماہ کی جدائی کے بعد اس کے پاس جا رہا تھا۔ اس نے کتنا کرب سہا ہو گا۔ کتنی صابر ہے وہ۔ اسے بھی تو ایسا ہی ہونا چاہئے "نہیں۔۔۔۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔" اس نے مستحکم لہجے میں کہا "سب ٹھیک ہے۔ آپ نہیں ہوں گے' آپ کی محبت تو میرے پاس ہو گی پتہ نہیں کیوں' میں اتنی کم ظرف ہوں۔"

مجیب نے محبت سے اس کے رخسار تھپتھپائے "تم بہت اچھی ہو۔"



سحاب نے دروازہ کھولا اور حیران رہ گئی۔ سامنے سامان سے لدا پھندا مجیب کھڑا تھا۔ اسے جیسے سکتہ ہو گیا۔

"میں اندر آ سکتا ہوں مادام؟"

سحاب چونکی اور راستے سے ہٹ گئی "بہت خراب ہیں آپ۔ آپ نے فون کیوں نہیں کیا مجھے؟"

"سرپرائز جو دینا تھا۔ اتنی خوشی ویسے تو نہیں ہو سکتی تھی۔"

"آپ کی واپسی ہر حال میں میرے لئے خوشی کا باعث ہے۔"

مجیب سوٹ کیس اندر لایا۔ پلٹ کر دیکھا تو سحاب بیگ کا اسٹرپ تھام رہی تھی۔ وہ اس کی جسمانی تبدیلی دیکھ چکا تھا "کیا کرتی ہو؟" اس نے چیخ کر کہا "ہٹو ایک طرف۔ سامان میں لے آؤں گا۔ اس حالت میں کیا حماقت کر رہی ہو۔"

سامان اندر لا کر سکون سے بیٹھتے ہوئے اس نے پوچھا "سب لوگ کہاں ہیں؟"

"اسکول گئے ہوئے ہیں۔" سحاب نے جواب دیا۔

"اور امی؟"

"سمیع کی طبیعت خراب ہو گئی۔ ٹائی فائڈ ہو گیا تھا۔ امی پندرہ دن پہلے گھر چلی گئیں۔"

"اور تم نے فون پر مجھے بتایا بھی نہیں۔"

"کیا فائدہ تھا۔ پریشان ہو جاتے خوامخواہ۔ کر کچھ بھی نہیں سکتے تھے۔"

"اور تمہارا کیا حال ہے؟" مجیب نے آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سحاب جھینپ گئی۔ "ٹھیک ہے۔ رجسٹریشن کرا لیا ہے۔"

مجیب کو صفورہ کا خیال آ گیا۔ کیسی ان ہونیاں ہو رہی تھیں اس کے ساتھ۔ تقریباً ایک ہی وقت میں دو مختلف مقامات پر وہ بیک وقت دو بچوں کا باپ بنے گا۔

وہ سحاب سے کراچی کے بارے میں اور سحاب اس سے مری کے بارے میں پوچھتے اور باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ بچے اسکول سے واپس آ گئے۔

وہ عجیب دن تھا۔ جیسے زندگی میں شامل ہی نہ ہو۔ بچوں نے اس کے لائے ہوئے تحفوں میں دلچسپی نہیں لی۔ وہ اس سے یوں لپٹے کہ الگ ہونے کا نام ہی نہیں لیا۔ سوئے بھی وہ اس سے لپٹ کر۔ بعد میں اس نے انہیں ان کے بستروں پر لٹایا۔

پھر پوری رات وہ اور سحاب باتیں کرتے رہے۔ اگلے روز بچے اسکول بھی نہیں گئے۔



فرصت ملتے ہی مجیب نے سب سے پہلے سب سے اہم کام کیا۔ کچھ جان پہچان بھی تھی اور پیسہ خرچ کرنے پر یہاں ویسے بھی ہر کام ہو جاتا ہے۔ صفورہ مجیب کا شناختی کارڈ بننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اس نے کارڈ کوریئر سروس کے ذریعے صفورہ کو بھجوا دیا۔ اس نے باہر سے فون کر کے صفورہ کو اپنی خیریت بتائی اور اس کی خیریت پوچھی۔

"آپ نے آپا سے بات کی۔" صفورہ نے بے تابی سے پوچھا۔

"ارے۔۔۔ ابھی تو آیا ہوں۔ اتنی بڑی بات ایسے تو نہیں کی جا سکتی۔"

پندرہ دن گزرے تو گھر کی صورت حال نارمل ہو گئی لیکن مجیب خود نارمل نہیں رہا۔ پندرہ دن بھی وہ اس لئے نارمل رہا تھا کہ بیوی اور بچوں سے پانچ ماہ دور رہا تھا۔ چنانچہ ان میں گم ہو کر صفورہ سے بے پرواہ ہو گیا۔ اسے اس کا خیال زیادہ نہیں آیا مگر زندگی نارمل ہوتے ہی اسے صفورہ کا خیال۔۔۔ اس کی یاد ستانے لگی۔

اب مجیب کو پتہ چلا کہ نفاق کتنی بری چیز ہے۔ بیک وقت دو دنیاؤں میں رہنا کتنا

مشکل ہے۔ ایک دنیا میں وہ رہ رہا تھا اور اس کا تصور' اس کا ذہن دوسری دنیا میں الجھا ہوا تھا۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ صفورہ نے اس کے دل پر ان مٹ نقش چھوڑا ہے۔ وہ کوئی وقتی تاثر نہیں تھا' جو زائل ہو جاتا۔ وہ جلد از جلد اس نفاق کو دور کر لینا چاہتا تھا۔

کئی بار اس نے اس سلسلے میں سحاب سے بات کرنے کا ارادہ کیا لیکن ہر بار وہ یہ سوچ کر رہ گیا کہ اس سے سحاب کو ناقابل بیان تکلیف ہو گی۔ وہ ایسی عورت تھی' جو بیانگ دہل کہہ چکی تھی کہ اسے اس کی دوسری شادی پر کبھی اعتراض نہیں ہو گا۔ بشرطیکہ وہ دوسری بیوی سے محبت نہ کرے۔ وہ اسے شیئر کر سکتی ہے' اس کی محبت کو شیئر نہیں کر سکتی۔ دشواری یہ تھی کہ صفورہ کی تو کہانی کا عنوان ہی محبت تھا۔ اور وہ بھی یک طرفہ نہیں' دو طرفہ محبت۔ چنانچہ اس کی ہمت نہیں ہوئی کہ یہ تذکرہ چھیڑتا۔ دن میں کئی بار وہ ارادے باندھتا' اس غرض سے سحاب کے پاس بیٹھتا اور اسے دیکھ کر ارادہ توڑ دیتا۔

ایک دن سحاب نے اسے ٹوک دیا "مجھے لگتا ہے کہ آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔"

مجیب گڑبڑایا مگر اس نے بہت تیزی سے خود کو سنبھال لیا "یہ خیال کیسے آیا تمہیں؟"

"بس لگتا ہے۔"

"کچھ کہنا چاہوں گا تو جھجکوں گا کیوں۔ کہہ نہ دوں گا۔" مجیب نے لہجے میں اعتماد سموتے ہوئے کہا۔

"یہی سوچ کر تو الجھن ہوتی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ آپ کچھ کہتے کہتے رک جاتے ہیں۔"

مجیب اتنی دیر میں راستہ ڈھونڈ چکا تھا "ایسی کوئی بات نہیں۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا "اب اسکرپٹ سے نمٹا ہوں تو نئی کہانی کی فکر لگی ہے اور اسکرپٹ لکھنے کے بعد کہانی لکھنا کچھ دشوار معلوم ہو رہا ہے۔ ایک میڈیم سے دوسرے میڈیم میں جانا اور پھر واپس آنا بڑا مشکل کام ہے۔"

"پریشان نہ ہوں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" سحاب نے بڑے خلوص سے کہا۔
لیکن مجیب جانتا تھا کہ اتنی آسانی سے کچھ ٹھیک ہونے والا نہیں۔
اگلے روز اس نے صفورہ کو فون کیا تو اس نے وہی بات پوچھی "آپا سے بات کی آپ نے؟"

"موقع ہی نہیں مل رہا ہے۔"

"کہیں تو میں خود ہی بات کر لوں۔"

مجیب یہ سن کر گھبرا گیا۔ یہ وہ چاہتا نہیں تھا۔ سحاب کو یہ خبر اسے ہی سنانی تھی۔ کسی اور کی..... اور خاص طور پر صفورہ کی زبانی یہ علم ہوا تو سحاب کو یقیناً بہت اذیت ہو گی اور صفورہ جس طرح بے تاب ہو رہی تھی' اس سے بھی اسے خوف آ رہا تھا۔ صفورہ کے پاس گھر کا فون نمبر بھی تھا۔ وہ کسی بھی وقت ایسا کر سکتی تھی' "سنو صفورہ' ایسا ہرگز نہ کرنا۔"

"میں نے یہ کب کہا کہ میں بات کروں گی۔ میں تو آپ سے اجازت مانگ رہی ہوں۔"

"یہ مناسب نہیں ہو گا صفورہ۔ میں تمہاری بے تابی سمجھ رہا ہوں لیکن....."

"آپ پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کی کیفیت سمجھ رہی ہوں۔ اس معاملے کی نزاکت کو بھی سمجھتی ہوں میں۔ آپ بالکل نہ سوچئے گا کہ میں بے تاب ہو کر فون کر بیٹھوں گی انہیں۔ میں نے تو عہد کیا ہے کہ آپ کی مرضی کے خلاف کبھی کچھ نہیں کروں گی۔"

مجیب کو اس پر پیار آ گیا۔ کیسی سمجھ دار تھی وہ۔ ہر بات بغیر کہے جان لیتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے سمجھ لیا کہ وہ کیوں پریشان ہو رہا ہے "تم بہت اچھی ہو صفورہ۔ آئی لو یو۔" اس نے بے حد سچائی سے کہا "اور تم پریشان نہ ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس اپنا خیال رکھو۔"

"آپ میری فکر نہ کریں۔ میں ٹھیک ہوں۔"



ایوب ساغر ریکارڈنگ کے لئے مری روانہ ہونے والا تھا۔ وہ مجیب سے تفصیلی

ملاقات کے لئے آیا تھا۔ وہ لوکیشنز کی تفصیل بنا کر ساتھ لایا تھا اور ان کے بارے میں سمجھ کر جانا چاہتا تھا۔

"اندازاً تم مری کی ریکارڈنگ کب تک نمٹا لو گے؟" مجیب نے پوچھا۔

ایوب دل ہی دل میں حساب لگاتا رہا پھر بولا "میرے خیال میں اکتوبر کے وسط تک مکمل ہو جائے گی۔ ہمارے پاس مہلت کب تک ہو گی سر۔"

"نومبر کے آخر میں خزاں آتی ہے۔"

"اس وقت تک ہم کام نمٹا لیں گے سر۔" ایوب نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

"بنگلے کے سلسلے میں کوئی پریشانی تو نہیں ہو گی؟" مجیب نے پرتشویش سرگوشی میں پوچھا۔

"ارے نہیں سر۔ میں نے خلیل صاحب سے بات کر لی ہے۔ وہ کوئی پرابلم نہیں سر۔ اس کی فکر نہ کریں۔"

مجیب نے سکون کی سانس لی "مجھے کچھ گرم کپڑے بھجوانے ہیں۔ وہ مری میں اپنی بھابھی کو دے دینا۔ میں کل تمہارے دفتر آؤں گا۔"

"ٹھیک ہے سر!"

مجیب نے ایوب ساغر کو اسی وقت تفصیل سے سب کچھ بتا دیا تھا' جب وہ اس کے کراچی آنے کے بعد مکمل اسکرپٹ لینے کے لئے آیا تھا۔

"اور نئی کہانی شروع کر دی آپ نے؟" ایوب نے پوچھا۔

"ہاں۔ شروع تو کر دی ہے۔ ابھی ہاتھ جم نہیں رہا ہے۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا سر!"

"ہاں' انشاء اللہ۔"

کہانی کے معاملے میں پہلی دشواری تو یہ پیش آئی تھی کہاں سے نئی کہانی کے لئے تھیم تلاش کرنی پڑے۔ ورنہ پہلے وہ اس طرف سے بے فکر تھا۔ اس نے تو نئی کہانی کا پلاٹ تک تیار کر لیا تھا لیکن ہوا یہ کہ اس کی اپنی زندگی کی کہانی بن گئی۔ اب اسے ہمت نہیں ہوئی کہ وہ اسے لکھے۔ وہ تو سیدھی سادھی آپ بیتی بن جاتی۔

بہرکیف اب نئی کہانی کا پلاٹ اس کے ذہن میں موجود تھا مگر ابھی تک وہ اسکرپٹ

کی تکنیک کو ذہن سے نہیں جھٹک سکا تھا جو گزشتہ چھ ماہ کے مسلسل کام کے نتیجے میں اس کی عادت بن گئی تھی۔

وہ کہانی پر تیزی سے کام کرنا چاہتا تھا۔ اس پر کمال صاحب کا دباؤ بھی تھا کہ چھ ماہ سے اس نے ان کے لئے کام نہیں کیا ہے۔ چنانچہ وہ اب اس کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔ دوسرے ویسے بھی اس وقت کہانی اس کی ضرورت تھی۔ کہانی اسے ارتکاز کے ایک ایسے عالم میں لے جاتی تھی، جہاں اسے گرد و پیش کا احساس رہتا تھا، نہ اپنے مسائل کا۔

اب کہانی تو وہ شروع کر چکا تھا لیکن ابھی ارتکاز اسے میسر نہیں تھا۔ اسے امید تھی کہ جلد ہی وہ بھی اسے مل جائے گا۔



منورہ کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وقت گزارنا آسان نہیں تھا۔ مجیب ساتھ تھا تو وہ اتنی مصروف رہتی تھی کہ وقت کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا مگر اس کے جانے کے بعد زندگی جیسے ٹھہر گئی تھی۔ وقت کا پتہ چلتا تھا۔ اسے شمار کرنا پڑتا تھا کہ ایک گھنٹے میں ساٹھ منٹ اور ایک منٹ میں ساٹھ سیکنڈ ہوتے ہیں۔

دس بارہ دن گزرے تو اس کا جی اوبنے لگا۔ کیسی تنہائی تھی۔ وہ اس مسئلے کا حل سوچنے بیٹھی تو پتہ چلا کہ اس نے آپ ہی اپنی مصروفیات ختم کرلی ہیں۔ کھانا پکانا اس نے چھوڑ دیا تھا۔ کیا پکاتی کہ کھانے میں دلچسپی نہیں رہی تھی۔

وقت گزاری کے لئے اس نے پھر کچن میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ فاطمہ نے بہت شور مچایا مگر اس نے ایک نہ سنی۔ فاطمہ کا خیال یہ تھا کہ صاحب جی نے جو اسے اس کا خیال رکھنے کو کہا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اسے بالکل کام نہ کرنے دیا جائے۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

پھر وہ باغیچے میں بھی دلچسپی لینے لگی۔ اس سلسلے میں اس نے شکور سے مدد لی۔ شکور ہی وہاں مالی بھی تھا۔ شکور سے اس نے بہت سی باتیں سیکھیں پھر اس نے اپنے من پسند پودے منگوائے۔ کچھ بیج ڈالے۔ باغیچے کا خیال رکھنے میں راحت بھی بڑی ملتی تھی۔

اس کا ایک اور مشغلہ اماں کو خط لکھنا تھا مگر یہ موقع پندرہ بیس دن میں ایک بار ملتا تھا۔ ہاں یہ تھا کہ اماں کا خط آتا تو وہ ان کے اگلے خط تک اس خط کو پڑھتی رہتی۔ بعض اوقات تو دن میں کئی کئی بار پڑھتی۔ خط زبانی یاد ہو جاتا۔

پچھلی رات اسے ایک بڑی خوشی ملی۔ اماں کے خط کے ساتھ ابا کا چھوٹا سا خط بھی تھا۔ وہ اسے پڑھ کر خوش بھی ہوئی اور حیران بھی۔ اتنی محبت، اتنی شفقت تھی ابا کے خط میں۔ دعاؤں کی سوا تو کچھ تھا ہی نہیں۔ اسے یقین ہی نہیں آیا کہ درحقیقت ابا ایسے ہیں پھر وہ سمجھی کی عزت کے خوف نے ابا کی محبت اور شفقت کو دبا رکھا تھا۔ اس طرف سے بے فکری ہوئی تو ان کی شخصیت کے یہ دبے ہوئے پہلو ابھر آئے۔

ان ترکیبوں کی وجہ سے دن تو گزر جاتا تھا مگر رات اپنی جگہ ایک لاینحل مسئلہ تھی۔ رات کو تو یہ ہوتا تھا کہ اسے نیند ہی نہ آتی۔ بس مجیب یاد آتا رہتا۔ تنہائی کی وجہ سے اس نے فاطمہ کو کمرے میں اپنے ساتھ سلانا شروع کر دیا تھا۔ فاطمہ کو بے فکری کی نیند سوتے دیکھ کر اسے اس پر رشک آتا۔ کبھی اس کا دل بہت گھبراتا تو وہ عقبی باغیچے میں چلی جاتی۔ کچھ دیر ٹہلتی۔ تھک جاتی تو اس بینچ پر بیٹھ جاتی، جہاں وہ ہمیشہ مجیب کے ساتھ بیٹھتی تھی۔

وہ جو بے تاب تھی کہ سحاب آپا کو سب کچھ معلوم ہو جائے، پھر خواہ کچھ بھی ہو تو اس لئے نہیں کہ وہ کسی مقام کی آرزو مند تھی۔ اسے اب کچھ بھی نہیں چاہئے تھا۔ جو مقام وہ چاہتی تھی، اسے مل گیا تھا۔ وہ مجیب کی قانونی بیوی تھی۔ یہ تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ اس آرزو کی تکمیل کے بعد تو اس کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ تو زندگی سے بھی دستبردار ہونے کے لئے تیار تھی۔ حالانکہ جی چاہتا تھا کہ مجیب کا ساتھ کبھی نہ چھوٹے۔

وہ جانتی تھی کہ اب دنیا میں سحاب کے سوا کوئی نہیں، جو اسے ملعون کر سکے۔ اللہ نے اس کا ہر داغ دھو دیا تھا۔ اس کا پردہ رکھ لیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا کہ درحقیقت اس پر کیا بیتی ہے۔ اسے جو خوشی ملی تھی، ہر اعتبار سے بے داغ تھی۔ داغ تھا تو بس یہ کہ سحاب کو علم نہیں تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس مرحلے سے بھی جلد از جلد گزر جائے۔ اس کے بعد اسے کوئی ملال، کوئی خلش نہیں رہے گی۔ سحاب نے اسے قبول

نہیں کیا تو اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ مجیب سے طلاق لے لی گی۔۔۔ زبردستی۔۔۔ اسے مجبور کر دے گی۔ اس کے لئے اتنا ہی کافی تھی کہ وہ بے عزتی کی مستحق تھی اور اسے پھر بھی عزت اور آبرو ملی اور تھوڑے عرصے ہی کا سہی' اسے مجیب کا ساتھ ملا۔ یہی نہیں' اسے مجیب کی محبت بھی مل گئی۔ اس کا مقصد سحاب کو دکھ دینا۔۔۔ اس کی زندگی میں زہر گھولنا بھی نہیں۔ سحاب اسے قبول کر لیتی تو اس کی خوشی مکمل اور بے داغ ہو جاتی اور اگر سحاب اسے قبول نہ کرتی تو وہ خاموشی سے اس کی اور مجیب کی زندگی سے نکل جاتی۔ عمر بھر ان کی خوشیوں کے لئے دعا کرتی۔

پھر اسے ایک اور مصروفیت مل گئی۔ اماں کا خط آیا۔ انہوں نے لکھا تھا کہ سلمٰی کے گھر خوشی ہونے والی ہے۔ وہ خالہ بننے والی ہے۔ وہ اگلے ہی روز سلائی مشین اور کپڑا خرید کر لائی اور ننھے منے کپڑے سینے لگی۔ شرم کے باوجود اس بار اس نے اپنے خط میں اماں کو لکھ دیا کہ وہ بھی امید سے ہے۔

جمشید اور شبانہ بھی کبھی ویک اینڈ پر آ جاتے تھے اور کبھی ان کے بلانے پر وہ بھی پنڈی چلی جاتی تھی۔ مجیب اسے اجازت دے کر گیا تھا۔

یونہی دن گزرتے رہے۔ ستمبر اختتام کے قریب پہنچ گیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ اس نے اپنے لئے ایک اور مصروفیت نکال لی۔ وہ باقاعدگی سے ڈائری لکھنے لگی۔



مجیب کچھ دن سے دیکھ رہا تھا کہ سحاب مضمحل ہے۔ کام کرتے ہوئے اس کے انداز میں ہمیشہ کی سی تیزی اور پھرتی نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ اس کی چال بھی بدل گئی تھی۔ لگتا تھا کہ ایک ایک قدم سنبھل کر اٹھاتی ہے۔ اسے تشویش ہوئی تو اس نے سحاب سے بات کی "کیا بات ہے؟ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں' کیا ہوتا ہے مجھے۔"

"نہیں۔ اس بار تم نڈھال نظر آتی ہو۔"

"کچھ بھی نہیں۔ وہم ہے آپ کا۔"

مگر مجیب کی تسلی نہیں ہوئی۔ اس نے ڈاکٹر عابدہ سے فون پر بات کی۔ اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔

"اس بار بہت احتیاط کی۔۔۔ خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔" ڈاکٹر عابدہ نے کہا۔

"لیکن بات کیا ہے؟"

"ایسی پریشانی کی بات بھی نہیں ہے۔ ایسا ہوتا ہے" ڈاکٹر عابدہ نے اس کی پریشانی محسوس کرتے ہوئے کہا "کئی باتیں ہیں۔ کمزوری بہت ہے۔ اس کے نتیجے میں آپ کی وائف کا بلڈ پریشر ہائی رہنے لگا ہے۔ وزن بھی ان کا کم ہے۔ کھانے پینے کا خیال رکھا جائے تو یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں۔ ہاں بچے کی پوزیشن نارمل نہیں لیکن اس سلسلے میں کچھ کیا نہیں جا سکتا۔"

"کھانے پینے کا خیال رکھنے کے علاوہ کوئی اور ہدایت۔"

"بس ٹینشن سے بچائیے۔ غصہ ان کے لئے مضر ہے۔ گھر کا ماحول اچھا رہے۔ ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ میں خیال رکھوں گا" مجیب نے بوجھل دل سے کہا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ اب وہ کم از کم سحاب کی فراغت تک اسے صفورہ کے بارے میں نہ بتا سکے گا۔ ورنہ ڈاکٹر کی بتائی ہوئی ہر احتیاط کی خلاف ورزی ہو گی۔ ٹینشن بھی ہو گی۔ سحاب کو غصہ بھی آئے گا۔ گھر کا ماحول بھی خراب ہو گا اور یہ بات اس کی مرضی کے مطابق تو ہو ہی نہیں سکتی جو ہمیشہ سے کہتی آئی ہے کہ وہ اسے تو شیئر کر سکتی ہے لیکن اس کی محبت کو کبھی شیئر نہیں کرے گی۔

ذرا توقف کے بعد اس نے ڈاکٹر سے پوچھا "متوقع تاریخ کیا ہے' آپ کے خیال میں؟"

"جنوری کا پہلا ہفتہ۔"

اس نے سکون کی سانس لی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ دونوں کی تاریخوں میں فرق تھا۔ صفورہ کے لئے جنوری کا آخری ہفتہ تھا۔

اس نے صفورہ کو فون کیا "صفورہ' میں سحاب سے بات نہیں کر سکا۔ کر بھی نہیں سکوں گا۔"

"خیریت تو ہے" صفورہ کو اس کے لہجے کی پریشانی نے پریشان کر دیا۔

اس نے صفورہ کو تفصیل بتانے کے بعد کہا "تم یہ نہ سمجھنا کہ میں دانستہ گریز کر

رہا ہوں۔"

"آپ یہ خیال بھی دل میں نہیں لایئے گا کہ میں ایسا سوچوں گی۔ آپ کو جانتی ہوں میں۔ یہ بات نہ کرنی ہوتی تو آپ اس کی ہامی ہی نہ بھرتے۔ اب میں آپ کو تاکید کر رہی ہوں کہ آپا سے اس سلسلے میں کوئی بات مت کیجئے گا۔"

"تم بہت اچھی ہو صفورہ۔"

"سچ بتاؤں۔ مجھے اس خبر سے بڑی خوشی ہوئی ہے" صفورہ نے کہا "لیکن کاش آپ کچھ دنوں کے لئے آ جاتے۔"

"میں انشاء اللہ نومبر یا دسمبر میں چند روز کے لئے آؤں گا" مجیب نے کہا "لیکن صفورہ' اب میں کام میں مصروف ہونے والا ہوں اور گھر میں سے تمہیں فون نہیں کر سکتا....."

"میں سمجھتی ہوں۔ کبھی آپ سے شکایت نہیں کروں گی۔"

صفورہ کو فون کرنے کے بعد مجیب ہلکا پھلکا ہو گیا۔ اب وہ سحاب سے بات کرنے کے بوجھ سے آزاد تھا۔ لہٰذا سکون اور دل جمعی سے کام کر سکتا تھا۔

اگلے روز اس کی کہانی نے رفتار بھی پکڑ لی۔



صفورہ سلمیٰ کے بچے کے لئے کپڑوں کا پیکٹ بھیج چکی تھی۔ اکتوبر کا مہینہ گزرا۔ نومبر کے پہلے ہفتے میں خوش خبری بھی آ گئی۔ سلمیٰ کے ہاں بیٹا ہوا تھا اور اماں کا وہ خط بے حد محبت بھرا تھا۔ وہ اس کی طرف سے پریشان تھیں۔ انہوں نے بار بار اسے اپنا خیال رکھنے اور احتیاط کرنے کی تاکید کی تھی۔ انہوں نے لکھا تھا کہ ابا اسے بہت یاد کرتے ہیں اور ہر وقت اس کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔

مصروفیت کی تو اسے ضرورت تھی۔ اب وہ اپنے آنے والے مہمان کے لئے کپڑے سینے لگی۔

نومبر کے وسط میں مجیب نے فون کیا۔ اس نے بتایا کہ وہ بے حد مصروف رہا ہے۔ ایک کہانی مکمل کرنے کے بعد دوسری شروع کر دی ہے۔ اس لئے نومبر میں اس کا آنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ دسمبر میں انشاء اللہ وہ ضرور آئے گا اور پھر جنوری کے آخر میں

آتا ہی ہے۔

صفورہ ایسی پرسکون ہوئی تھی کہ اب مایوس تو وہ کبھی ہوتی ہی نہیں تھی۔ اس کے لئے یہی کافی تھا کہ مجیب اسے مل گیا اور وہ باعزت طریقے سے اماں اور ابا سے رابطہ کرنے کے قابل ہو گئی۔ یہ نہ ہوتا تو وہ بے چارے روز جیتے روز مرتے رہتے۔

اس بات پر اسے صابر بھائی کا خیال آیا۔ اس نے سوچا' وہ بھی تو اس کے لئے پریشان ہوں گے۔ کتنی محبت کرتے تھے وہ اسے اور وہ کتنی خود غرض ہے کہ ان کی پریشانی کا اسے خیال ہی نہیں آیا۔ اس نے اماں کو بھی منع کر دیا کہ انہیں اس کے متعلق کچھ نہ بتائیں۔

اس روز سے اسے صابر بھائی کو فون کرنے کی لگ گئی۔ اس نے "صفورہ سفیان' تم کہاں ہو....؟" والے اشتہار کا جو تراشا مجیب سے لیا تھا' اس میں ان کا فون نمبر اور پتہ موجود تھا۔ وہ اس نے ڈائری میں نوٹ کر لیا۔

پھر وہ ان سے رابطے کی کوششوں میں لگی رہی۔ چار پانچ بار اس نے فون کیا۔ کبھی اٹھانے والے چچا میاں تھے اور کبھی بھابی لیکن صابر بھائی کے علاوہ کسی سے بات کرنے کی اس میں ہمت ہی نہیں تھی۔

بالآخر ایک دن اسے فون پر صابر بھائی کی آواز سنائی دے گئی۔ اس کی عجیب کیفیت ہو گئی۔ بولا ہی نہیں جا رہا تھا اس سے۔

"ہیلو۔ کون ہے؟" صابر بھائی جھنجلانے لگے۔

"السلام علیکم!" اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

"وعلیکم السلام۔ جی فرمایئے۔"

"آپ... آپ میری آواز نہیں پہچانتے؟"

لائن پر چند لمحے خاموشی رہی "یقین نہیں آتا" بالآخر صابر بھائی نے کہا "آپ کی آواز میری ایک بہت عزیز ہستی سے ملتی ہے۔"

"کیا میں وہ عزیز ہستی نہیں ہو سکتی؟"

دوسری طرف پھر خاموشی چھا گئی "یہ کیسے ممکن ہے؟" صابر بھائی نے ذرا طویل توقف کے بعد کہا "وہ تو ہم سے یوں بچھڑی کہ کچھ پتا ہی نہیں چلا اس کا۔"

"صابر بھائی پلیز' کسی کو پتا نہ چلے۔ میں مفورہ ہی بول رہی ہوں۔ میں صرف آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں' قریب میں کوئی ہے تو نہیں۔"

"نہیں' میں اکیلا ہوں مگر مفورہ' تم بات کہاں سے کر رہی ہو؟" اب صابر بھائی کے لہجے میں ہیجان تھا۔

"سوری صابر بھائی' یہ میں نہیں بتاؤں گی۔ میں نے صرف اس لئے فون کیا ہے کہ آپ میرے لئے پریشان ہوں گے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ آپ بلا وجہ تکلیف اٹھائیں۔"

"مگر مفورہ۔۔۔"

"صابر بھائی' میں خدا کو گواہ بنا کر کہہ رہی ہوں کہ میں جہاں بھی ہوں' خیریت سے اور عزت و آبرو سے ہوں اور اتنی خوش ہوں کہ بتا نہیں سکتی۔"

"یہ سن کر مجھے خوشی ہوئی' مفورہ' دلی سکون ہوا" صابر بھائی نے کہا "لیکن پریشانی کی بات یہ ہے کہ تم اپنے متعلق کچھ بتا نہیں رہیں۔"

"یقین کریں صابر بھائی! یہ مجبوری ہے" وہ بولی "اور صابر بھائی' میں نے اماں اور ابا کو بھی اطمینان دلا دیا ہے۔"

"شادی ہو گئی تمہاری؟"

"جی صابر بھائی اور انشاء اللہ بہت جلد یہ وقتی مجبوری ختم ہو جائے گی پھر میں آپ کے گھر آؤں گی۔۔۔ آپ کو اپنا گھر دکھاؤں گی۔ اچھا صابر بھائی خدا حافظ۔" آخر میں اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے جلدی سے ریسیور رکھ دیا۔ نہ رکھتی تو شاید رونے لگتی۔

صابر بھائی کو فون کرنے کے بعد اس کا ایک اور بوجھ ہلکا ہو گیا۔ اب ایک ہی بوجھ رہ گیا تھا۔ سحاب آپا والا اور اسے صبر آ گیا تھا کہ ابھی اس کانٹے کو کچھ عرصے اٹکے رہنا ہے۔



مجیب نے پہلی کہانی بہت تیزی سے مکمل کی۔ دوسری کہانی بھی تیز رفتاری سے لکھی جا رہی تھی۔ یہی بات ذہن میں رکھتے ہوئے اس نے مفورہ سے دسمبر میں آنے

کا کہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اپنا وعدہ پورا کر سکے گا۔ دسمبر کی پہلی تاریخ آئی تو کہانی کا بمشکل تین چار دن کا کام رہ گیا تھا۔

مجیب کو سحاب کی طرف سے تشویش تھی۔ اس کی طبیعت بہت گری گری رہنے لگی تھی۔ بلڈ پریشر مسلسل ہائی تھا۔ صورت حال ایسی تھی کہ اس کی امی کو ان کے یہاں رہنے کے لئے آنا پڑا۔ ان کی آمد سے مجیب کو اطمینان ہو گیا۔

مجیب نے 7 دسمبر کی ریزرویشن کروا لی تھی۔ اس کے جانے کی راہ میں کوئی رکاوٹ تھی بھی نہیں لیکن تقدیر کے فیصلوں سے کوئی لڑ نہیں سکتا۔ 4 تاریخ کو اس کے پہلو میں ایسا شدید درد اٹھا کہ وہ تڑپ کر رہ گیا۔ اتنا شدید درد اسے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ کبھی کبھی اس جگہ پر اسے درد محسوس تو ہوتا تھا لیکن اس نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ سردی کا موسم آتا تو اس کا پانی پینا کم ہو جاتا تھا۔۔۔ اور اس کے نتیجے میں اس طرح کا درد ہوتا تھا۔ یہ الگ بات کہ درد کی شدت اتنی زیادہ نہیں ہوتی تھی۔

کہانی کے بمشکل تین چار صفحے رہتے تھے مگر وہ درد عجیب تھا کہ اس کے نتیجے میں وہ کئی گھنٹے نڈھال رہا۔ ابھی وہ پوری طرح سنبھلا بھی نہیں تھا کہ اگلی صبح اس پر درد کا دوسرا حملہ ہوا۔ اس بار درد پہلے سے شدید تھا۔

یہ بات تشویش ناک تھی۔ ویسے بھی وہ اسے نظرانداز نہیں کر سکتا تھا پھر یہاں تو سحاب کا معاملہ بھی تھا۔ وہ تو بہت ہی زیادہ پریشان ہو گئی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ یہی سلسلہ رہا تو سحاب کو نقصان پہنچ جائے گا۔ چنانچہ وہ ڈاکٹر کے پاس چلا گیا۔

وہ دن مختلف قسم کے ٹیسٹ کی نذر ہو گئے۔ مجیب کو اپنی ریزرویشن کینسل کرانی پڑ گئی۔ کیونکہ 7 تاریخ کو یہ بات یقینی طور پر معلوم ہو گئی کہ اس کے گردے میں پتھری ہے۔

یہاں ایک اور مسئلہ سامنے آیا۔ مجیب نے برسوں سے ایلوپیتھک ادویہ کا استعمال ترک کیا ہوا تھا۔ پہلے بھی وہ اسے سوٹ نہیں کرتی تھیں اور اب اتنے برسوں میں تو شاید اس کا جسم اور سسٹم انہیں قبول کرنے کے قابل ہی نہیں رہا ہو گا۔ برسوں سے جب بھی ضرورت پڑتی' وہ ہومیوپیتھک علاج کراتا۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ۔ لیکن گردے کی تکلیف کا ایلوپیتھی میں کوئی شفا بخش علاج

تھا ہی نہیں۔ وہاں تو بس آپریٹ کر کے پتھری نکال دی جاتی تھی۔ اس میں کوئی حرج بھی نہیں تھا بشرطیکہ پتھری سے جان چھوٹ جاتی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ پتھری نکلنے کے نتیجے میں جو خالی جگہ پیدا ہو جاتی تھی' اسے بھرنے کی کوئی صورت نہیں تھی اور تھوڑا سا عرصہ گزرنے پر وہاں دوبارہ پتھری بننا شروع ہو جاتی تھی اور اس کے بعد پھر وہی آپریشن۔۔۔ یہاں تک کہ پتھری کے بجائے گردہ ہی نکال دیا جاتا۔

اس کے برعکس ہومیوپیتھی میں اس تکلیف کی مکمل شفا ہے۔ پتھری ٹوٹتی ہے' ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نکلتی ہے اور پھر دواؤں کے ذریعے گردے میں پیدا ہونے والی جگہ بھی پر ہو جاتی ہے لیکن پتھری ٹوٹنے اور نکلنے کے مرحلے میں بہت شدید تکلیف سے گزرنا ہوتا ہے۔

مجیب پر یہ افتاد اتنی اچانک اور ایسے وقت پڑی تھی جب وہ چاروں طرف سے گھرا ہوا تھا اور اس کی تو عقل خبط ہو کر رہ گئی۔ اس نے ہومیوپیتھک علاج شروع کیا مگر جب درد کا اٹیک ہوتا تو وہ یوں تڑپتا' جیسے پانی سے نکلی ہوئی مچھلی اور اس کی یہ حالت دیکھ کر سحاب کا حال برا ہو جاتا۔

چوتھے پانچویں دن اس کی ساس نے اس سے اس سلسلے میں بات کی۔ اس نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔

"لیکن مجیب میاں' تمہارا آپریشن کرا لینا ہی بہتر رہے گا" اس کی ساس نے کہا۔

"میں نے دشواری بتائی تو ہے آپ کو۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہارا درد سے تڑپنا خدانخواستہ سحاب کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

مجیب سناٹے میں آ گیا۔ وہ اپنی تکلیف میں ایسا گھرا ہوا تھا کہ یہ تو اسے خیال بھی نہیں آیا تھا۔ اب کیا کرے وہ۔ آگے کنواں' پیچھے کھائی والا معاملہ ہے۔

"ایک بات بتاؤ" اس کی ساس نے کہا "پتھر نکل جانے کے بعد تکلیف تو نہیں ہوتی۔"

"یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ میرا خیال ہے کہ نہیں ہوتی ہوگی۔"

"تو کیا یہ ممکن نہیں کہ تم آپریشن کرا لو اور اس کے بعد پتھری کو دوبارہ بننے سے

روکنے کے لئے ہومیوپیتھک دوا استعمال کرو۔"

بات مجیب کے دل کو لگی۔ اس نے اپنے ہومیوپیتھک ڈاکٹر سے بات کی۔ سحاب کی صورت حال جاننے کے بعد ڈاکٹر رضامند ہو گیا۔

یوں پندرہ تاریخ کو مجیب اسپتال میں داخل ہو گیا۔ اسکے سالے سرفراز اور اختر اس کی دیکھ بھال کے لئے اس کے ساتھ تھے۔



دسمبر کا پہلا دن آیا تو صفورہ کے لئے مجیب کے انتظار کا موسم شروع ہو گیا۔ مجیب نے دسمبر کے پہلے ہفتے میں آنے کا امکان ظاہر کیا تھا۔

اب دن قریب آ رہے تھے تو اس کی طبیعت بھی گری گری رہنے لگی تھی۔۔۔ آٹھواں مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ چلنا پھرنا اب اس کے لئے اتنا آسان نہیں رہا تھا۔ چنانچہ اسے اپنی مصروفیتیں ختم کرنی پڑ گئی تھیں اور جب آدمی کو کوئی مصروفیت نہ ہو تو یادوں کے درخت اذیت کے پھولوں سے لد جاتے ہیں۔ ایسے میں انتظار کرنا بڑا اذیت ناک ہوتا ہے۔

لیکن 5 تاریخ کو صبح ایک عجیب بات ہوئی۔ بیٹھے بیٹھے اس کا دل پریشان ہو گیا۔ وہ مضطرب اور بے چین ہو گئی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔۔۔ اور جو ہونے والا تھا' کچھ اچھا نہیں ہے۔ وہ کیفیت صرف دس پندرہ منٹ رہی۔۔۔ اور پھر آپ ہی آپ ختم ہو گئی۔

دوپہر کے کھانے کے بعد وہ بستر پر نیم دراز عبداللہ حسین کی اداس نسلیں پڑھ رہی تھی کہ ایک اور عجیب کیفیت نے اسے آندھی طوفان کی طرح آ لیا۔ کتاب کے صفحے پر چمکتے ہوئے سیاہ حروف اچانک دھندلا گئے۔ لگا کہ پانی میں تیر رہے ہیں۔ یہ تو اس کی سمجھ میں چند لمحوں کے بعد آیا کہ بہت تیزی سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے تیزی سے رخساروں پر بہنے لگے تھے' جیسے پہاڑی چشمے کا پانی ڈھلان پر بہتا ہے۔

آدمی کو اس بات کا علم چند لمحے بعد ہوتا کہ وہ رو رہا ہے' انوکھی بات ہے۔ ایسا ہوتا نہیں۔ عموماً رونے سے پہلے آدمی کو پتہ چلتا ہے کہ اسے رونا آ رہا ہے اور عام

طور پر وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتا ہے لیکن یہاں ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ کیفیت ہی ایسی تھی۔ صفورہ کو تو ابتدا میں علم بھی نہیں تھا کہ وہ رونے والی ہے۔ آنسو اس کی آنکھوں کی طرف یلغار کر رہے ہیں اور جب اسے پتہ چلا تو وہ ششدر رہ گئی۔ یہ بات اس کے لئے بھی انوکھی تھی۔

وہ خود کو ٹٹولتی رہی۔ دل میں کہیں کوئی دکھ نہیں تھا۔ کوئی ٹیس نہیں تھی۔ بلکہ وہاں تو سکون ہی سکون تھا۔ جسم میں بھی کہیں کوئی درد نہیں تھا' کوئی تکلیف نہیں تھی۔ آنکھوں تک میں جلن نہیں تھی۔ بس وہ بے اختیار آنسو چپ چاپ اس کی آنکھوں سے بہے جا رہے تھے۔ روتے وقت جو آدمی کو ایک تکلیف سی ہوتی ہے' اسے وہ بھی نہیں تھی۔ وہ کیفیت بھی نہیں تھی۔ اس کا تو بس یہ حال تھا کہ آنسو بہنے کے احساس کے سوا اسے کسی بات کا خیال تھا نہ احساس۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے خود کو ٹٹولا' خود سے پوچھا۔ یہ آنسو کیسے ہیں۔ نہ ارادہ ہے نہ کوئی سبب۔ نہ خواہش ہے نہ کوئی تکلیف۔ اندر حبس ہے اور باہر برسات ہو رہی ہے۔ وہ تصور میں خود کو دیکھ رہی تھی۔ ہوش مندانہ انداز میں پورے شعور کے ساتھ سوچتے ہوئے بھی وہ آنسو اس کی آنکھوں سے بہے جا رہے تھے جیسے ان کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو۔

"ہاں' یہی بات ہے۔" اس کے اندر کسی نے جلدی سے کہا۔

ایک لمحے میں بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ کوئی اور وقت ہوتا۔۔۔ کوئی اسے بتاتا۔۔۔ یا وہ کسی کتاب میں یہ بات پڑھتی تو کہتی کہ افسانہ ہے لیکن اس وقت وہ اس سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ یہ یقینی بات تھی کہ وہ آنسو اس کے نہیں' کسی اور کے ہیں۔ بس بہہ اس کی آنکھوں سے رہے ہیں اور جس کے آنسو ہیں' کیفیت بھی اس کے پاس ہو گی۔ درد' اذیت' کوئی دکھ' جو بھی ان آنسوؤں کا سبب ہو گا' وہ وہی شخص جانتا ہو گا۔

لیکن وہ کون ہے۔ اس نے اماں کا تصور کیا۔ ابا کے بارے میں سوچا۔ سلمٰی کا تصور کیا۔ صابر بھائی کا خیال کیا لیکن آنسو اسی رفتار سے بہتے رہے۔ اب وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ اسے سب سے پہلے مجیب کا خیال آیا تھا لیکن اس نے اس کا تصور نہیں

...ہا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ مجیب نہ ہو۔ اللہ اسے ہر دکھ' ہر تکلیف سے محفوظ ...کھے مگر اب کوئی اور تھا ہی نہیں۔

اس نے آنکھیں بند کیں اور تصور میں مجیب کا چہرہ لائی۔

ایک لمحے میں دنیا ہی بدل گئی کہ شاید سب کچھ ایک ساتھ ہوا۔ اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو یک لخت رک گئے اور سینے میں دھڑکتے ہوئے دل کو اس نے واضح طور نرم ہوتا محسوس کیا۔ اگلے ہی لمحے وہ ٹیسوں سے' کسی نامعلوم دکھ سے بھر گیا۔

وہ اس کے لئے خوف زدہ کر دینے والے لمحے تھے۔ پہلا احساس اسے یہ ہوا کہ اسے ایک غیر معمولی طاقت اور صلاحیت ودیعت کر دی گئی ہے۔ وہ جس سے محبت کرتی ہے' اس کے دکھ اور اذیت کے لمحوں کو محسوس کر سکتی ہے۔ اس کے محبوب کے آنسو اس کی آنکھوں میں آ جاتے ہیں۔ کیا محبت میں یہ مقام بھی آ جاتا ہے۔ دوسرا احساس فخر کا تھا۔ وہ اس قابل تو نہیں تھی لیکن اس کی محبت کو بہت بلند مقام اور مرتبہ دے دیا گیا۔ اس کے بعد تو کچھ چاہئے بھی نہیں اسے۔

اور پھر اچانک اسے اصل بات یاد آئی۔ وہ سب کچھ بھول گئی۔ اہم ترین بات یہ تھی کہ مجیب انور پریشان تھا' دکھی تھا یا کسی بڑی اذیت سے دوچار تھا۔ وہ تڑپ کر اٹھی اور ٹیلی فون کی طرف لپکی مگر فوراً ہی ٹھٹک گئی۔ یہ کیا کر رہی ہے وہ؟ مجیب نے منع کیا تھا لیکن پھر مجیب کا حال کیسے معلوم ہو۔ یہ جانے بغیر تو وہ پریشان ہوتی رہے گی۔

اسی لمحے کسی نے اس کے اندر کہا "محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اس کا ایک کرشمہ تم ابھی دیکھ چکی ہو۔ اس طاقت کو کھوجو' دریافت کرو' سمجھو۔ اس کے بعد تم کسی رابطے کی محتاج نہیں رہو گی۔ اللہ نے عظمت دی ہی تو اس کی قدر کرو' کم ظرفی نہ کرو۔ ظرف والی بنو۔"

اس نے آنکھیں بند کیں اور مجیب کا تصور کیا۔ اس کا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ وہ بے تاثر چہرہ تھا' جیسے تصویر ہو۔ صفورہ نے اس میں تاثرات کے رنگ بھرنے کی کوشش کی مگر کوئی رنگ جمتا ہی نہیں تھا مگر پھر ایک رنگ ٹھہر گیا۔ اس بار مجیب کے چہرے پر کرب و اذیت کا تاثر بے حد واضح تھا۔

اور صفورہ نے جان لیا کہ وہ بیمار ہے۔ کوئی بہت شدید جسمانی تکلیف اٹھا رہا

ہے۔

دیر تک وہ شل بیٹھی رہی۔ صبح کی کیفیت اسے یاد آئی اور سمجھ میں بھی آ گئی۔ اس نے جان لیا کہ مجیب وعدے کے مطابق نہیں آ سکے گا۔ بلکہ اسے تو اس کی صحت..... اس کی زندگی کے لئے دعا کرنی چاہئے۔ وہ یقیناً بہت تکلیف میں ہے۔

اتنے دن میں اللہ کا بے حساب شکر ادا کرنے کے باوجود اسے نماز کا خیال نہیں آیا تھا مگر اس وقت وہ بے تاب ہو کر اٹھی اور وضو کے لئے چل دی۔ جانماز بچھا کر وہ کھڑی ہوئی تو اس پر منکشف ہوا کہ وہ کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتی۔ اسے بیٹھنا ہو گا اور وہ سجدہ کرنے کے قابل بھی نہیں ہے۔ اسے آدھے سجدے سے کام چلانا ہو گا۔

لیکن یہ بات بھی اسے نماز پڑھنے سے نہیں روک سکی۔ اس روز اس نے باقی تمام نمازیں پڑھیں۔ ہر بار اس کی دعا ایک ہی تھی۔ اے اللہ، مجیب کو صحت اور تندرستی عطا فرما۔ دکھ، پریشانی اور اذیت سے نجات عطا فرما۔ بے شک میرے معبود میری عمر بھی انہیں دے دے۔

رات وہ ڈائری لکھنے بیٹھی۔ اس روز لکھنے کو بہت کچھ تھا۔ وہ لکھتی چلی گئی۔ اپنے انوکھے تجربے کی تفصیل، اپنے احساسات..... سب کچھ۔ لکھنے کے بعد وہ ڈائری بند کر رہی تھی کہ ذہن میں جگنو کی طرح ایک مصرع چمکا۔ وہ ٹھٹک گئی۔ اس نے پہلے کبھی شعر نہیں کہا تھا مگر اس وقت اس پر آمد ہو رہی تھی۔ بنے بنائے مصرعے اترتے چلے آ رہے تھے۔ وہ لکھتی چلی گئی.....

چھینی کسک طلب کی، سکون وفا دیا
معبود تیرا شکر کہ کیا لے کے کیا دیا
سب اس سے کہہ دیا، مری تکمیل ہو گئی
پھر اپنے ہر چراغ کو میں نے بجھا دیا
وہ مل گیا تو کوئی تمنا نہیں رہی
بس آپ اپنے نام کو میں نے مٹا دیا
مجھ سے فرشتے سیکھیں گے آداب بندگی
میں نے عبادتوں کو محبت بنا دیا

ظرف عطا سے اس کے بھی، میری طلب سے بھی
جو کچھ بھی میرے رب نے دیا، وہ سوا دیا
میں نے کیا ہے نقش اسے اپنے آپ پر
خود کو مگر چٹان سے بڑھ کر بنا دیا
کس کیفیت میں نکلی تھی میں تجھ کو ڈھونڈنے
اندھے سمندروں نے مجھے راستہ دیا

لکھنے کے بعد اس نے وہ شعر پڑھے اور حیران رہ گئی۔ یہ شعر اس کے تو نہیں ہو سکتے لیکن ایک بات تھی۔ وہ اس کے اندر کی..... بہت اندر کی سچی آواز تھی۔



سحاب بہت بے چین تھی۔ بے بسی کے احساس نے اسے نڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔ مجیب اسپتال میں تھا اور وہ اس قابل بھی نہیں تھی کہ جا کر اس کی نگہداشت کر سکے۔ اس کے لئے سیڑھیاں اترنا تو ممکن تھا مگر اس کے بعد وہ سیڑھیاں چڑھ نہیں سکتی تھی۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ مجیب کو اس کی ضرورت تھی اور وہ اس کے پاس نہیں تھی۔

ڈاکٹر نے اسے بتا دیا تھا۔ اور وہ جانتی تھی کہ ٹینشن اس کے لئے نقصان دہ ہے۔ مگر ٹینشن پر کب کسی کا اختیار ہوتا ہے۔ آدمی اس کا مریض ہو جائے تو خود ہی اس کے اسباب تخلیق کر لیتا ہے۔ یہاں تو صورت حال ہی ایسی تھی۔ کبھی تو بلڈ پریشر اتنا بڑھ جاتا کہ اسے اپنی کنپٹیاں تڑختی محسوس ہوتیں۔ لگتا، دماغ میں کوئی دھماکا ہو جائے گا۔ نیند تو جیسے اس کی آنکھوں سے روٹھ ہی گئی تھی۔

اسپتال سے کبھی سرفراز اور کبھی اختر فون پر اسے مجیب کی خیریت کی اطلاع دیتے۔ لیکن وہ مطمئن کیسے ہو سکتی تھی۔ اس کے لئے تو وہ بھی پریشانی کی بات تھی کہ کچھ تکنیکی وجوہات کی بنا پر مجیب کے آپریشن میں تاخیر ہو رہی ہے۔ تین دن ہو گئے تھے، آپریشن ٹلے جا رہا تھا۔

اس پریشانی میں کئی بار اس کی طبیعت ایسی بگڑی کہ اسے ہر لمحہ، لمحہ آخر معلوم ہونے لگا مگر عجیب بات تھی۔ ہر بار ایسے لمحے میں اسے ایسا محسوس ہوتا کہ اس کے

جسم میں کوئی برقی رو سی دوڑ گئی ہے۔ طاقت اور استقامت کا کوئی سرچشمہ پھوٹ نکلا ہے۔ وہ اپنی زندگی کی طرف سے خوف زدہ رہنے لگی تھی مگر وہ قوت بخش لمحے آتے تو وہ بے حد پریقین ہو جاتی۔ اسے لگتا کہ اسے کچھ نہیں ہو گا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ وہ لمحے اسے یہ اطمینان بھی دلاتے کہ مجیب کی طرف سے بھی پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

اسے معلوم نہیں تھا کہ مجیب کی درازی عمر کے لئے دل کی گہرائیوں سے سچی دعائیں کرنے والی ایک ہستی کی دعاؤں میں وہ بھی شامل ہو گئی ہے۔



مجیب کی پریشانی کی کوئی حد نہیں تھی۔ آپریشن کے حق میں تو وہ ویسے بھی نہیں تھا۔ ستم بالائے ستم تین دن سے بوجوہ اس کا آپریشن ملتوی کیا جا رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ اسپتال سے بھاگ کھڑا ہوتا مگر دشواری یہ تھی کہ وہ بے حد عجیب صورت حال سے دوچار تھا۔ اس کے لئے ایک ایک دن کی اہمیت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد از جلد اسے اس تکلیف سے نجات مل جائے۔ اسے سحاب اور صفورہ دونوں کی طرف سے فکر تھی۔ سحاب کی حالت اچھی نہیں تھی' کیس خاصا پیچیدہ تھا اور اب دن بھی تھوڑے ہی رہ گئے تھے اور اس کے تھوڑے ہی دن بعد صفورہ کو اس مرحلے سے گزرنا تھا۔ اس کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ بہت اکیلی تھی۔

سو وہ محض وقت کی بچت کی خاطر اسپتال میں پڑا تھا۔ کئی بار اس کے جی میں آئی کہ سرفراز سے بات کرے۔ یہ کچھ مشکل نہیں تھا کہ وہ چپکے سے اسپتال سے نکلے اور اپنی سسرال چلا جائے۔ وہاں وہ سکون سے ہومیوپیتھک علاج کرا سکتا تھا۔ کتنی ہی تکلیف ہوتی اسے' وہ کتنا ہی درد سے تڑپتا' سحاب کو تو پتہ ہی نہیں چلتا لیکن دشواری یہ تھی کہ ہومیوپیتھی میں وقت کی کوئی گارنٹی نہیں تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ تین دن میں ہر معاملہ نمٹ جائے اور یہ بھی ہو سکتا تھا کہ پتھری ٹوٹنے اور نکلنے کا عمل ہفتوں پر پھیل جائے۔ اس کا وہ متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے تو جلد از جلد فٹ ہو کر اپنے معاملات سنبھالنے تھے۔ آپریشن کے بعد ڈاکٹروں کے مطابق اسے اسپتال میں کم از کم تین دن اور رکنا تھا۔

مگر مشکل یہ تھی کہ آپریشن بھی ٹلتا جا رہا تھا۔

اسپتال میں قیام کے عرصے میں اس کے لئے فرصت ہی فرصت تھی۔ وہ سحاب اور صفورہ کے بارے میں سوچتا اور ان کا موازنہ کرتا رہتا تھا۔ دونوں میں بہت مماثلت تھی۔ بہت سی قدریں مشترک تھیں ان میں۔ ان میں ایک یہ بھی تھی کہ دونوں کے ساتھ اس کا نام جڑا تھا۔ وہ سوچتا کہ وہ کتنا خوش نصیب ہے۔ وہ تو ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ ایسی تو ایک بیوی ہی اللہ کی بڑی نعمت ہوتی ہے جبکہ اسے تو دو مل گئی تھیں۔

یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا کہ وہ کس سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اگر یہ حساب کا سوال ہوتا تو وہ آسانی سے حل ہو جاتا۔ سحاب کو اس کے ساتھ دس سال ہو چکے تھے۔ اتنے عرصے کی خدمت گزاری' وفا شعاری اور محبت تول میں اپنی ایک اہمیت رکھتی تھی اور صفورہ سے اسے ملے ایک سال بھی نہیں ہوا تھا۔ خدمت گزاری اور وفا شعاری میں وہ سحاب کی ہم پلہ تھی۔ لہٰذا عرصے کے پیمانے میں پیچھے نظر آتی اور جہاں تک محبت کا تعلق تھا تو اس کا حساب اتنا آسان ہوتا تو وہ یہ فیصلہ ہی نہ کر لیتا کہ وہ صفورہ سے زیادہ محبت کرتا ہے یا سحاب سے۔ محبت تو آدمی کو اپنے گمان کے مطابق ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی درست مقدار کا تو اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ اس لحاظ سے یہ حساب کا کوئی سادہ سوال نہیں تھا کہ فیصلہ آسانی سے دس سال ساتھ گزارنے والی کے حق میں ہو جاتا۔

محبت دھنک کی طرح ہوتی ہے۔ کچھ رنگ اس کے اپنے ہوتے ہیں اور کچھ رنگ دوسرے جذبوں کے۔ مثلاً ایثار' قربانی اور درگزر۔ ان سے وہ پیمائش کرتا تو اسے حیرانی ہوتی۔ ایک سال سے بھی کم عرصے میں صفورہ نے اس کے لئے جس ایثار کا مظاہرہ کیا' جتنی قربانیاں دیں اور اسکی زیادتیوں پر جتنا درگزر سے کام لیا' وہ ناقابل یقین تھا۔ اس نے تو جیسے اپنا وجود تک ترک کر دیا تھا۔ کیا' کیا نہیں کیا تھا اس نے۔ یہ سب کچھ یاد کرنے کے بعد وہ اسے سحاب سے کم تر گردانتا تو اس کے نزدیک یہ گناہ تھا۔

پھر وہ آخری موازنہ کرتا۔ سحاب کے پاس طاقت تھی اور صفورہ کے پاس صرف کمزوری۔ وہ سحاب کی پہلی مضبوطی تھا۔ وہ اس کی پہلی بیوی ہے.... اور پہلی بیوی نڈر

ہوتی ہے۔ اس کا ہر حق مستند ہوتا ہے۔ اس کی اجازت کے بغیر مرد دوسری شادی بھی نہیں کر سکتا۔ اس بنیادی طاقت کے علاوہ بھی وہ قوی اور مضبوط تھی۔ یہاں اس کا اپنا دوسرا گھر تھا۔ ماں باپ' بہن بھائی تھے۔ وہ اس کے لئے لڑ سکتے تھے۔ آواز اٹھا سکتے تھے۔ وہ ہرگز اکیلی نہیں تھی۔

اس کے برعکس صفورہ بہت اکیلی تھی۔ اس کے ساتھ کمزوریاں ہی کمزوریاں تھیں۔ یہاں اس کا کوئی پوچھنے والا تھا ہی نہیں۔ کوئی تھا بھی تو وہ بے خبر تھا۔ صفورہ اسے مدد کے لئے پکار بھی نہیں سکتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سرزمین پر اس کا اپنا وجود بھی غیر قانونی تھا۔ یہ تو بدترین عدم تحفظ ہوتا ہے۔ وہ اپنے لوگوں سے بہت دور' ان سے کٹ کر غیر قانونی طور پر یہاں رہ رہی تھی۔ وہ تو زور سے بول بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کی واحد مضبوطی وہ خود تھا مگر اس مضبوطی کا بھی یہ حال تھا کہ اسے صفورہ سے اپنی شادی کے متعلق سحاب کو بتانا تھا مگر اتنا عرصہ گزر جانے پر بھی وہ اس کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ صفورہ یہاں بھی عدم تحفظ کے احساس کا شکار تھی۔

اب دونوں عورتیں ایک جیسی صورت حال سے دوچار تھیں مگر فرق یہاں بھی تھا۔ سحاب کے پاس سب لوگ تھے۔ خود وہ بھی موجود تھا اور وہ اپنے گھر میں تھی۔ جبکہ صفورہ بیگانوں کے درمیان تھی۔ یہاں اس کا صرف وہ تھا.... اور وہ بھی اس سے دور تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ سحاب پہلے سے تین بچوں کی ماں تھی جبکہ صفورہ کا یہ پہلا موقع تھا اور لوگ کہتے ہیں کہ پہلا موقع بہت اہم اور نازک ہوتا ہے۔ اس میں بہت احتیاط کی جاتی ہے۔

یہ سب کچھ سوچ کر مجیب کا دل صفورہ کے لئے کٹنے لگا۔ وہ ہر اعتبار سے مظلوم اور ضرورت مند تھی۔ اسے اس کے پاس ہونا چاہئے تھا۔ اس پر کیا گزر رہی ہو گی؟ وہ خود کو کتنا تنہا محسوس کر رہی ہو گی۔ یہ احساس مجیب کے لئے بوجھ بن گیا۔ صفورہ صرف اور صرف اس کی ذمے داری تھی۔

اس نے فیصلہ کر لیا کہ ٹھیک ہوتے ہی مری چلا جائے گا اور سحاب بھی نمٹ چکی ہو گی۔ چنانچہ اسے بھی صفورہ کے بارے میں بتا سکے گا۔ یہ سوچ کر اسے ذرا اطمینان ہوا۔ اب اسے بس آپریشن کا انتظار تھا۔

صفورہ اب باقاعدگی سے نماز پڑھ رہی تھی۔ بلکہ وہ نماز کی عادی ہو گئی تھی۔ کبھی کوئی نماز رہ جاتی تو وہ بے چین اور مضطرب ہو جاتی۔ جب تک نماز پڑھ نہ لیتی' اسے چین نہ آتا اور دعا وہ پہلے دن والی ہی چل رہی تھی۔ نہ جانے کیوں خود کار انداز میں یہ دعا اس کے لبوں پر آ جاتی کہ اللہ اس کی عمر بھی مجیب کو لگا دے۔ مجیب کو اس نے جس تکلیف میں محسوس کیا تھا' اس کے بعد وہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔ بعد میں اس کی دعاؤں میں سحاب بھی شامل ہو گئی۔ اس کی تکلیف کو اس نے اپنے حوالے سے سمجھا تھا۔

اب اس کے پاس کرنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ کپڑے وہ سی چکی تھی۔ کچن میں کام کرنے کے اب وہ قابل نہیں تھی۔ ایسے میں نماز اس کے لئے بڑی نعمت بن گئی۔ ساتھ ہی اس نے باقاعدگی سے قرآن شریف پڑھنا بھی شروع کر دیا۔ اس میں دل بھی ایسا لگتا تھا کہ وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ رات کو وہ ڈائری لکھتی تھی۔

ادھر موسم بھی بہت سخت ہو گیا تھا۔ سردی تو نومبر میں ہی شروع ہو گئی تھی مگر دسمبر کا مہینہ لگتے ہی یہ صورت حال ہوئی کہ وہ سردی اسے سردی ہی نہیں لگتی تھی۔ وہ تو کچھ اور چیز تھی' جو زمین سے پھوٹتی' آسمان سے' در و دیوار سے برستی تھی۔ ایسی سردی تو اس نے کبھی دیکھی ہی نہیں تھی۔ اب اس کی سمجھ میں آیا کہ مجیب نے اپنے اس پروڈیوسر کے ہاتھ گرم کپڑے کیوں بھیجے تھے۔ جب وہ یہ کپڑے پہنتی تو اسے مجیب پر پیار آ جاتا۔ اسے کتنا خیال تھا اس کا اور ان کپڑوں میں گرم کے علاوہ اسے مجیب کی محبت بھی محسوس ہوتی۔

اس نے آنے والے مہمان کے لئے گرم اونی کپڑے خود بنے اور بازار سے بھی خریداری کی۔ اسے بڑی فکر تھی کہ وہ ایسے سخت موسم میں آئے گا۔ جتنی تیاریاں ممکن ہو سکتی تھیں' وہ کرنے کے بعد وہ بے فکر ہو گئی۔ اب اسے فکر اور پریشانی تھی تو

بس مجیب اور سحاب کی طرف سے۔ وہ دن میں کئی بار مجیب کا تصور کرتی۔ اسے خوشی ہوتی اور وہ اللہ کا شکر ادا کرتی کہ ان کے درمیان ایسا صاف اور واضح رابطہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ مجیب پریشان ہے۔ وہ اس کی طرف سے فکر مند ہے مگر مجبور ہے ورنہ اب تک آچکا ہوتا۔

18 تاریخ کی صبح سردی کافی کم تھی۔ اس نے جسم پر ہلکا سا کوٹ ڈالا اور چہل قدمی کے لئے عقبی لان میں نکل آئی۔ اس سے زیادہ دیر ٹہلا نہیں گیا۔ وہ ہانپنے لگی۔ بینچ پر بیٹھ کر وہ مجیب کو یاد کرنے لگی۔ ان دنوں کو یاد کرنے لگی' جب وہ اس کے ساتھ یہاں ٹہلا کرتا تھا' بینچ پر بیٹھ کر باتیں کرتا تھا۔ بس وہی دن تو اس کی زندگی کا حاصل.... سرمایہ تھے۔

اچانک اسے اپنا پہاڑی جھرنا یاد آگیا۔ وہاں سے تو اس کی بہت سے یادیں وابستہ تھیں۔ آخری بار وہ وہاں سے بھیگتے ہوئے آئے تھے۔ مجیب اسے بچاتا رہا تھا اور خود بھیگتا اور چوٹیں سہتا رہا تھا۔ اس بھیگنے ہی نے تو اس کی زندگی کا رخ تبدیل کر دیا تھا۔ ابتدا میں وہ رخ منفی تھا اور ایسا لگا تھا کہ اس سے اس کا سب کچھ چھن گیا ہے اور وہ زندہ درگور ہو گئی ہے مگر انجام اتنا خوش گوار تھا کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

اس وقت اس کے بارے میں سوچتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اسے تو اس جگہ سے محبت ہو گئی ہے۔ حیرت اس بات کی تھی کہ اسے اس کا خیال کیوں نہیں آیا۔ وہ اٹھی اور اس پہاڑی ڈھلوان کی طرف چل دی جو جھرنے کی.... وادی کی طرف جاتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جسمانی طور پر وہ نیچے جانے کی اہلیت نہیں رکھتی لیکن چشمے تک تو وہ بہرحال جا سکتی تھی۔ اس کا ٹھنڈا میٹھا پانی پی سکتی تھی۔

یہ لگن ایسی جاگی تھی کہ وہ رک نہیں سکتی تھی۔ ایسا کوئی خیال بھی نہیں آیا اسے۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتی ڈھلوان پر چل دی۔ نیچے اترتے ہوئے اتنا زور نہیں لگانا پڑتا۔ پہاڑ پر چڑھنا آسان ہوتا ہے اور اترنا دشوار۔ مجیب ہمیشہ اسے کہتا تھا' اس کے لئے اس حالت میں اترنا اور زیادہ دشوار ہو گیا تھا مگر اترتے ہوئے یہ اطمینان بھی تھا کہ دشواری سے وہ پہلے گزر رہی ہے۔ بعد کا مرحلہ تو آسان ہو گا۔

درختوں کے پہلے جھنڈ تک پہنچتے پہنچتے وہ ہانپ گئی۔ ایک درخت کے نیچے وہ

سانس درست کرنے کے لئے بیٹھ گئی۔ دھوپ ابھی تک نہیں نکلی تھی۔ اس کا احساس اسے یوں ہوا کہ سردی زیادہ لگنے لگی۔ اس نے کوٹ کو اچھی طرح بند کر لیا۔ اس نے سوچا تھا کہ سورج نکلنے تک واپس چلی جائے گی اور کچھ دیر بینچ پر بیٹھ کر دھوپ لے گی۔

تازہ دم ہو کر وہ نیچے کی طرف چل دی۔ راستہ اب ذرا دشوار تھا مگر اتنا زیادہ بھی نہیں پھر بھی چشمے تک پہنچنے کے لئے اسے ایک بار اور رکنا پڑا۔ سانس بہت تیزی سے پھول رہی تھی۔ اسے احساس ہونے لگا کہ اس نے یہاں تک آکر غلطی کی ہے مگر اس نے اس احساس کو ذہن سے جھٹک دیا۔

چشمے پر پہنچ کر اس نے بے تابی سے چشمے کا پانی پیا لیکن پانی بے حد ٹھنڈا تھا۔ وہ وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ سردی کا احساس بڑھ گیا تھا اور وہ دونوں ہاتھ بغلوں میں دبائے بیٹھی تھی' مگر مجیب کی یادوں کا سلسلہ شروع ہوا تو کسی بات کا احساس نہیں رہا۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ اسے نیچے آئے اتنی دیر ہو گئی اور سورج ابھی تک نہیں نکلا۔ وہ چونکی اور اس وقت جب اچانک ہی بہت تیز بارش شروع ہو گئی۔ وہ بے حد ٹھنڈا پانی تھا... برف جیسا۔ اس نے ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی مگر دوبارہ بیٹھنا پڑ گیا۔ بارش کے سرد کوڑوں نے یہ بات بھلا دی تھی کہ اب وہ ایک دم اٹھنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اسے تو بے حد آہستگی سے اٹھنا چاہئے۔

اٹھتے اٹھتے وہ شرابور ہو گئی۔ بارش بہت تیز تھی اور وہ تیز چل بھی نہیں سکتی تھی۔ بلکہ اب چڑھائی کا سفر کرتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ یہ نارمل لوگوں کے لئے آسان ہوتا ہو گا۔ اس کے لئے تو اترنے سے بھی زیادہ دشوار ہے۔

پھر ایک اور دشواری سامنے آئی۔ ڈھلوانی پگڈنڈی پر بارش کا پانی آنا شروع ہو گیا اور پگڈنڈی پر پھسلن ہو گئی۔ اس کے پاؤں بار بار پھسلنے لگے۔ وہ گرتی رہی۔ اچھا یہ تھا کہ ڈھلوان ذرا بھی عمودی نہیں تھی۔ اس کے چوٹیں نہیں لگیں مگر بار بار گرنے کے نتیجے میں جسم دکھنے لگا۔

ہر قدم پر اسے مجیب یاد آتا رہا۔ اس سے کہیں دشوار راستے پر وہ کیسے اسے پھول کی طرح سنبھال کر لایا تھا۔ اب وہ نہیں تھا تو آسان راستہ بھی کتنا دشوار لگ رہا تھا۔

مردوں کا سہارا ایسا ہی ہوتا ہے۔

ادھر اس کے کپڑے تربتر ہو چکے تھے۔ سرد پانی کی بوچھاڑیں جسم پر کوڑے کی طرح لگ رہی تھیں۔ وہ تھرتھر کانپ رہی تھی۔ سردی لگتا تھا کہ وجود کی جڑوں تک میں اتر گئی ہے۔ جیسے تیسے وہ درختوں کے جھنڈ تک پہنچ گئی۔ ایک درخت کے نیچے اسے سانسیں درست کرنے کے لئے رکنا پڑا۔

جھنڈ گھنا ضرور تھا درخت اتنے گھنے نہیں تھے کہ بارش کا راستہ پوری طرح روک سکتے۔ بھیگ وہ یہاں بھی رہی تھی البتہ بھیگنے میں یہاں کچھ کمی ضرور ہوئی تھی مگر اس سے کیا فرق پڑتا تھا' بھیگ تو وہ پہلے ہی چکی تھی۔

وہ بارش رکنے کی دعا کرتی رہی لیکن بارش رکنے والی نہیں لگتی تھی۔ اب اسے اپنی حماقت کا احساس ہو رہا تھا۔ وقت نہ جانے کتنا ہو چکا تھا۔ وہ تو دھوپ گھڑی لگائے بیٹھی تھی۔ اسے پتہ ہی نہیں تھا کہ گھٹا چھائی ہوئی ہے اور سورج نکل کر بھی نہیں نکلا ہے۔

سانسیں درست ہوئیں تو اس نے سوچا کہ اس کے لئے عافیت اسی میں ہے کہ بارش رکنے کا انتظار کرنے کے بجائے وہ بنگلے کی طرف چل پڑے۔ چنانچہ وہ چل دی۔ جھنڈ سے نکلنے کے بعد وہ براہ راست بارش کی زد میں تھی اور بنگلے میں گھسنے تک بارش سے امان نہیں تھی۔

جسم کی تھرتھری بڑھتی گئی۔ قدموں کے بوجھل پن میں اضافہ ہوتا گیا۔ اب وہ چل نہیں' گھسٹ رہی تھی۔ ہر قدم اٹھانے کے بعد اسے یقین ہونے لگتا تھا کہ وہ اگلا قدم نہیں اٹھا سکے گی بس قوت ارادی کے زور پر وہ چلتی رہی۔

بنگلے میں گھستے ہی اس کی قوت ارادی بھی جواب دے گئی۔ وہ ڈھیر ہو گئی۔ منہ سے آواز نکلنے کا بھی سوال نہیں تھا۔ اس کے دانت یوں بج رہے تھے جیسے سلامت ہی نہیں رہیں گے۔ سردی نے اسے نیم جاں کر دیا تھا۔

نہ جانے کتنی دیر وہ وہاں پڑی رہی پھر فاطمہ آئی تو اسے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ وہ اسے سہارا دے کر کمرے میں لے گئی اور کپڑے بدلنے میں اس کی مدد کی۔ اس کے جسم پر کئی کمبل ڈال کر وہ تولیئے سے اس کے بال خشک کرتی رہی۔

"بہت برا بھیگی ہیں آپ بی بی۔ بہت بری سردی کھائی ہے آپ نے" فاطمہ بڑبڑا رہی تھی۔

وہ کوئی جواب نہ دے سکی۔ اس کے دانت اب بھی بج رہے تھے۔

فاطمہ نے اسے جانے کتنی جڑی بوٹیوں کا عرق پلایا۔ شکور ڈاکٹر کو بلانے کے لئے چلا گیا تھا۔ ذرا دیر بعد فاطمہ نے اس کا ماتھا چھوا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسے تو بہت تیز بخار تھا۔ فاطمہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔

صفورہ اب کراہ رہی تھی۔ بار بار اس کا ہاتھ سینے پر جاتا۔ شاید درد ہو رہا تھا۔

فاطمہ اس علاقے کی رہنے والی تھی۔ جانتی تھی کہ سردی کی بارش میں اس طرح بھیگنا کتنا مہلک ہے۔ نمونیا تو ہوتا ہی ہوتا ہے۔ وہ نہ جانے کیا گرم کر کے لائی اور اس کے سینے کی مالش کرنے لگی۔ صفورہ کو تو اب ہوش ہی نہیں تھا۔

ڈاکٹر آیا اور اس نے صفورہ کی حالت دیکھی تو سر پکڑ کر بیٹھ گیا "تم لوگوں نے غلطی کی کہ مجھے بلایا۔ فوراً انہیں اسپتال لے جانا تھا۔ یہ تو پیچیدہ کیس ہے۔ دیکھو نا' بچے کا مسئلہ بھی تو ہے" ڈاکٹر نے کہا پھر پوچھا "ان کے شوہر کہاں ہیں؟"

"جی وہ تو کراچی میں ہیں۔"

"پہلے انہیں اسپتال لے کر چلو پھر فوراً اطلاع دے کر ان کے شوہر کو بلا لو۔"

صفورہ کو یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ وہ اسپتال لے جائی جا رہی ہے۔



صفورہ نے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا اور نقاہت بھرے لہجے میں پکارا۔ "فاطمہ۔۔۔فاطمہ۔۔۔"

فاطمہ وہیں بیٹھی تھی "کیا بات ہے بی بی؟" اس نے اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے پوچھا۔

"میں کہاں ہوں؟"

"آپ اسپتال میں ہیں بی بی۔"

"کیوں۔۔۔ کیا ہوا مجھے؟"

"آپ بارش میں بھیگ گئی تھیں بی بی۔"

صفورہ کو سب یاد آگیا "بارش رک گئی!" اس نے پوچھا۔ وہ پوری طرح ہوش و حواس میں نہیں معلوم ہو رہی تھی۔

"بارش تو اسی دن رک گئی تھی بی بی۔"

"اسی دن! تو میں یہاں کب سے ہوں؟"

"اس دن سے۔ آج پانچ دن ہو گئے بی بی۔" فاطمہ نے بتایا۔ پھر تیزی سے موضوع بدلا "اب کیسا محسوس کر رہی ہیں آپ؟"

"پتہ نہیں۔ سینے میں آگ لگی ہوئی ہے۔ بہت شدید درد اٹھتا ہے۔" صفورہ کراہنے لگی۔

"بی بی.... اپنا پتہ دیجئے۔ آپ کو تو ہوش ہی نہیں تھا۔ اور ہمارے پاس پتہ نہیں ہے۔"

صفورہ چونکی "ان کے پتے کا کیا کرنا ہے۔"

"ڈاکٹر کہتا ہے' انہیں بلانا ضروری ہے۔"

"وہ کیسے آئیں گے۔ ان کی تو اپنی طبیعت خراب ہے۔" صفورہ نے کہا "اچھا یوں کرو' مجھ سے فون نمبر لو اور جمشید بھائی کو بلا لو۔ میری طبیعت کا بتا دینا۔"

اتنی باتیں کر کے ہی وہ نڈھال ہو گئی تھی۔ پھر بخار بھی تیزی سے بار بار چڑھتا اترتا تھا۔ اس پر غشی طاری ہو گئی۔



بالآخر 21 تاریخ کو مجیب کا آپریشن ہوا اور اسے پتھری سے نجات مل گئی۔ ہوش میں آنے کے فوراً بعد اس نے باقاعدگی سے ہومیوپیتھک دوا لینی شروع کر دی۔ اسے امید تھی کہ پتھری نکالے جانے کے بعد خالی رہ جانے والی جگہ بھر گئی تو یہ مسئلہ دوبارہ اسے پریشان نہیں کرے گا۔

سرفراز نے اسے بتایا کہ اس کے آپریشن کی خبر سن کر آپا مطمئن ہو گئی ہیں۔ یوں اس کے دل سے ایک بوجھ تو ہٹ گیا۔ مگر دوسرا بوجھ بڑھ گیا۔ اب وہ صفورہ کی طرف سے بہت زیادہ پریشان تھا۔ دسمبر کا تیسرا ہفتہ ختم ہو رہا تھا اور وہ وعدے کے مطابق مری نہیں جا سکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ صفورہ بہت پریشان ہو گی۔ وہ بے چاری اکیلی ہے۔

نجانے اس پر کیا گزر رہی ہو۔ اس سے تو فون پر بات کئے ہوئے بھی ایک مہینہ ہو چکا تھا۔

کرنے کو تو وہ اسپتال سے بھی صفورہ کو فون کر سکتا تھا۔ لیکن یہاں تنہائی میسر نہیں تھی۔ سرفراز اور اختر میں سے کوئی ایک اس کے پاس ضرور ہوتا تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ چند روز کی ہی تو بات ہے ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ اسے 25 تاریخ کو ڈسچارج کر دیا جائے گا۔ سوچا تو اس نے یہی تھا کہ اسپتال سے رخصت ہونے کے بعد دو تین دن سحاب کو مطمئن کرنے کے لئے رکے گا اور پھر مری چلا جائے گا۔ اگرچہ یہ مشکل ہی تھا۔ مگر اس نے سوچا تھا کہ اس سلسلے میں وہ ایوب ساغر سے مدد لے گا۔ کام کا بہانہ بنایا جا سکتا ہے۔ اور پھر یہ تو تھا کہ وہ فون پر آسانی سے بات کر لے گا۔

اب وہ ایک ایک پل گن کر کاٹ رہا تھا!



جمشید اور شبانہ اگلے ہی روز مری آ گئے۔ انہوں نے صفورہ کا حال دیکھا تو پریشان ہو گئے۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اس وقت بخار ذرا کم تھا۔ اس لئے وہ بات کرنے کے قابل بہرحال تھی "تمہیں مجیب کو بہرحال بلوانا چاہئے۔" جمشید نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے کہ وہ بہت بیمار ہیں۔ میں تو خود ان کے لئے دعا کرتی رہی ہوں۔" صفورہ نے کہا۔

"پھر بھی۔ خیر تم چھوڑو اس بات کو۔ میں اسے گھر فون کرتا ہوں۔"

صفورہ بے چین ہو گئی "پلیز جمشید بھائی' ایسا نہ کیجئے گا۔"

"کیوں؟ بھابی کی وجہ سے کہہ رہی ہو؟"

"جی ہاں۔ ان کا بھی یہی حال ہے۔" صفورہ اسے تو تفصیل سے نہ بتا سکی۔ لیکن وہ ہٹا تو اس نے شبانہ کو بتا دیا "اب اس حال میں آپا کو یہ پتہ چلا تو اچھا نہیں ہو گا۔" اس نے شبانہ کو سب کچھ بتانے کے بعد کہا "مجیب آپا کی طرف سے بہت پریشان تھے۔"

"لیکن تمہارا حال بہت خراب ہے۔" شبانہ بولی۔

"ارے نہیں.... میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔ ہر لمحہ بہتر ہو رہی ہوں۔"

جمشید ڈاکٹر جعفری سے ملا "ان کے شوہر کو فوراً آ جانا چاہئے۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"وہ وہاں بیمار ہے۔" جمشید نے کہا۔

"آپ....؟"

"میں مجیب کا دوست ہوں۔ اور صفورہ کا بھائی سمجھ لیں مجھے۔ آپ مجھے اس کے بارے میں بتا سکتے ہیں۔"

"دیکھیں..... میں اس مرحلے پر کچھ چھپا نہیں سکتا۔" ڈاکٹر جعفری نے گہری سانس لے کر کہا "مریضہ کی کنڈیشن بہت خراب ہے۔ اس موسم میں یہاں بارش میں بھیگنا ہوتا ہی خطرناک ہے..... اور وہ کئی گھنٹے بھیگی ہیں۔ وہ یہاں لائی گئیں تو ان کا پورا جسم نیلا ہو رہا تھا۔ انہیں نمونیا ہو چکا تھا۔ ہم نے ٹیسٹ لئے۔ دونوں پھیپھڑوں میں انفیکشن ہے اور بہت بڑھا ہوا ہے۔ وہ نارمل سانس نہیں لے سکتیں۔"

"مگر ایسے کیسز بھی ٹھیک ہو جاتے ہیں....."

"جی ہاں۔ لیکن یہاں پیچیدگیاں بہت ہیں۔ میں ان کی فائل دیکھ چکا ہوں۔ تین دن بعد ان کا نواں مہینہ شروع ہونے والا ہے۔ ایسے میں ہم تیز دوائیں بھی نہیں دے سکتے۔ اس سے بچے کو نقصان پہنچنے کا ڈر ہے۔"

"لیکن آپ کو تو پہلے صفورہ کی فکر کرنی چاہئے۔"

"میں جانتا ہوں۔ لیکن اس کے لئے بھی بچے کی فکر کرنی ہو گی۔"

"یہ آپ کیسی بات....."

"آپ سمجھ نہیں رہے ہیں۔" ڈاکٹر نے اس کی بات کاٹ دی "بچہ پہلے ہی خطرے میں ہے۔ اسی وجہ سے کیس کی پیچیدگی اور بڑھ گئی ہے۔ دیکھیں اب وقت پر اور نارمل ڈیلیوری تو ہو نہیں سکتی۔ اور نارمل ڈیلیوری نہ ہونے کا مطلب تو آپ سمجھتے ہی ہیں۔ یہ قبل از وقت ڈیلیوری ہو گی اور نیچرل طریقے سے نہیں ہو سکتی۔ دوسری طرف مریضہ کے پھیپھڑوں میں شدید اور بڑھا ہوا انفیکشن اور اس کا تنفس نارمل نہیں ہے۔ لہٰذا ہم anaesthesia استعمال نہیں کر سکتے۔ اور اس کے بغیر یہ عمل اتنا تکلیف دہ ہو گا کہ اس کمزور پوزیشن میں مریضہ کا بچنا بہت مشکل ہے۔"

"تو قبل از وقت ڈیلیوری سے آپ کو گریز کرنا چاہئے۔"

"بچہ ماں کے پیٹ میں ہو تو ماں کی حالت کا اثر قبول کرتا ہی ہے۔ اور یہاں تو ماں بہت خراب حال میں ہے۔ ہم مسلسل کوشش کر رہے ہیں بچے کو بچانے کی....."

"آپ صفورہ کے لئے جدوجہد کریں....."

"اور بچے کا خیال چھوڑ دیں۔" ڈاکٹر نے تیز لہجے میں کہا "میں آپ کو سمجھا ہی نہیں پا رہا ہوں۔ دیکھیں، اگر خدانخواستہ بچہ اندر ختم ہو گیا تو بھی مریضہ کے لئے خطرناک ہو گا۔ اسے ڈیلیوری کرانی پڑے گی۔ اور جو اس کی حالت ہے، اس میں وہ اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ گائنی کا کوئی بھی اچھا ڈاکٹر پیچیدہ صورت حال میں بچے کو نظر انداز کر کے زچہ کو بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن یہاں دونوں صورتوں میں اس عمل سے گزرنا ہے، جو مریضہ کے لئے تباہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔"

جمشید سناٹے میں آ گیا۔ اب وہ پوری طرح سمجھ گیا تھا۔ یہ تو آگے کنواں اور پیچھے کھائی والی صورت حال تھی "آپ مجھے سیدھے لفظوں میں مریضہ کی صورت حال بتا دیں۔ بغیر کسی لحاظ کے۔ ان بلیک اینڈ وائٹ۔"

"ہم پانچ دن سے سر توڑ کوشش کر رہے ہیں لیکن کنڈیشن بہتر نہیں ہوئی ہے۔" ڈاکٹر جعفری نے کہا "اور ہم ڈاکٹر مایوس ہو جائیں، تب بھی مریض کی آخری سانس تک ہار نہیں مانتے۔ لیکن سچ یہ ہے کہ مریضہ کا بس ایک آؤٹ سائیڈ چانس ہے۔ البتہ بچے کو بچایا جا سکتا ہے۔ لیکن فیصلہ کرنے میں دیر ہو گئی تو اس کی بھی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔"

"تو دشواری کیا ہے؟"

"ہم آپریٹ کرنا چاہتے ہیں۔ مگر اپنے طور پر..... اجازت نامے کے بغیر یہ ممکن نہیں۔"

"میں دستخط کر سکتا ہوں۔"

"کر سکتے ہیں۔ مگر بہتر یہ ہو گا کہ ان کے شوہر یا والد ہمیں اجازت دیں۔"

"ڈاکٹر، میں کوشش کرتا ہوں۔ مگر پرسوں سے پہلے کسی ذمے دار شخص کا یہاں پہنچنا مشکل ہے۔"

"ہم دو دن گزارنے کی کوشش کر لیں گے۔ اللہ مالک ہے۔"



بخار پھر تیز ہو گیا تھا۔ صفورہ پر غشی طاری ہو گئی تھی۔ شبانہ دل گرفتہ سی باہر نکل آئی۔ اسی وقت جمشید ڈاکٹر کے کمرے سے نکلا۔ دونوں برآمدے میں کھڑے ہو کر باتیں کرنے لگے۔ جمشید نے جو کچھ ڈاکٹر سے سنا تھا' بیوی کو بتا دیا "میرے پاس مجیب کے گھر کا نمبر ہے۔ میں اسے فون کر رہا ہوں۔"

"اور اگر وہ گھر پر نہ ہوئے....."

"تو میں بھابی کو بتا دوں گا۔ یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔"

"آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ صفورہ نے مجھے بتایا ہے کہ سحاب بھابی کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ اور ان کا کیس بھی پیچیدہ ہے۔ یہ بات نہ ہوتی تو مجیب بھائی اب تک انہیں اپنی اور صفورہ کی شادی کے متعلق بتا چکے ہوتے۔"

"مگر یہ اس سے بڑا مسئلہ ہے۔ میں ڈاکٹر سے بات کر کے آ رہا ہوں۔" جمشید نے بیوی کو سب کچھ بتا دیا۔

"صفورہ نے مجھے قسم دی ہے کہ مجیب بھائی کے گھر فون نہیں کیا جائے۔ ہاں آپ ٹیلی گرام کر سکتے ہیں..... وہ بھی دفتر کے پتے پر۔"

جمشید ہاتھ ملتا رہا۔ وہ بہت پریشان تھا "تو ٹھیک ہے۔ میں ابھی ارجنٹ ٹیلی گرام کرتا ہوں۔ آج ہی پہنچ جائے گا۔"

"یہ ٹھیک ہے۔" شبانہ نے تائید میں سر ہلایا۔



سحاب بہت خوش تھی۔ اگلے روز مجیب اسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر واپس آ رہا تھا۔ اب وہ مطمئن تھی۔ اس کے چہرے پر رونق نظر آ رہی تھی۔

رات آٹھ بجے کی قریب گھنٹی بجی۔ اس نے دروازہ کھولا۔ ڈائجسٹ کے دفتر کا ڈسپیچ رائیڈر کھڑا تھا۔ اس نے ٹیلی گرام کا لفافہ اس کی طرف بڑھایا "مجیب صاحب کا ٹیلی گرام آیا تھا۔ میں نے سوچا' ضروری ہو گا۔ فوراً ہی پہنچا دوں۔"

"شکریہ۔" سحاب لفافہ لے کر اندر آ گئی۔ اپنے کمرے میں اس نے دیکھا۔ وہ

مجیب کے ہی نام تھا۔ اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ ٹیلی گرام کا مطلب ہوتا ہی یہی ہے کہ کوئی اہم بات ہے۔ سرفراز تھوڑی دیر پہلے اسپتال گیا تھا۔ ورنہ وہ اس کے ہاتھ مجیب کو بھجوا دیتی۔

وہ کسی کے نام آئے ہوئے خط کو کھولنا برا سمجھتی تھی۔ لیکن وہ ٹیلی گرام تھا' جس کا لفافہ بند نہیں تھا۔ اور اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ اس نے سوچا' پڑھ کر دیکھ لے گی۔ کوئی ضروری بات ہوئی تو گھر فون کر کے اختر کو بتا دے گی۔ وہ مجیب کو مطلع کر دے گا۔

یہ سوچنے کے باوجود کئی بار وہ لفافے سے ٹیلی گرام نکالتے نکالتے رہ گئی۔ یہ کام اب بھی اسے معیوب لگ رہا تھا۔ لیکن بالآخر اس نے ٹیلی گرام نکال لیا۔ اس نے صرف مضمون پڑھا.....

Safoora is dying. Suffering from pneumonia since 18th December. Come immediately.

(صفورہ مر رہی ہے۔ 18 دسمبر سے نمونیا میں مبتلا ہے۔ فوراً آؤ۔)

پڑھ کر اس نے سوچا کہ یہ ٹیلی گرام مجیب کے نام تو نہیں ہو سکتا۔ اس نے اوپر دیکھا۔ وہاں مجیب کا ہی نام تھا۔ مجیب انور معرفت شاہکار ڈائجسٹ۔ اس نے نیچے دیکھا۔ بھیجنے والے کا نام جمشید تھا۔ اور ٹیلی گرام مری سے بھیجا گیا تھا۔

اس کے وجود میں سناٹے تیر گئے۔ یہ کس قسم کا پیغام ہے۔ پیغام تو ارجنٹ ہے۔ لیکن وہ یہ پیغام کسی کے ذریعے مجیب تک نہیں پہنچا سکتی۔ مجیب اگلے روز گھر آ جائے گا تو وہ ٹیلی گرام اسے دے دے گی۔

اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد وہ ٹیلی گرام اسے ستانے لگا۔ اس نے اضطراری طور پر گھر کا نمبر ملایا۔ وہاں اختر موجود تھا "اختر..... پلیز ایک کام کر دو میرا؟"

اختر اس کے لہجے سے پریشان ہو گیا "کیا بات ہے آپا؟ خیریت تو ہے؟"

"ہاں' خیریت ہے۔ بس تم میرے اور مجیب کے لئے کل شام کی کسی فلائٹ پر سیٹیں ریزرو کرا دو..... پنڈی کے لئے۔"

"لیکن آپا....."

"یہ بہت ضروری ہے۔" سحاب نے اس کی بات کاٹ دی "پلیز بھائی...."

"ٹھیک ہے آپا لیکن بات تو بتائیں۔"

"بعد میں بتاؤں گی۔ فی الحال یہ کام کر دو۔ ٹکٹ لاؤ گے تو میں تمہیں پیسے دے دوں گی۔"

ریسیور رکھنے کے بعد وہ اس ٹیلی گرام کے بارے میں سوچنے لگی۔ پہلے تو اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس ٹیلی گرام سے مجیب کا کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ مگر اب ذرا پرسکون ہو کر سوچا تو تصویر کچھ واضح نظر آنے لگی۔ ٹیلی گرام مری سے کیا گیا تھا۔ اور مری وہ جگہ تھی' جہاں مجیب پانچ ماہ رہ کر آیا تھا۔ وہاں سے اس کے لئے اس طرح کے کسی ٹیلی گرام کا آنا سو فیصد ممکن تھا خواہ اسے ایسا نہ لگے۔

یہ تسلیم کرنے کے بعد ایک سوال اس کے دل میں کانٹے کی طرح چبھنے لگا۔ یہ صفورہ کون ہے؟ اور ٹیلی گرام کے مطابق اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ اسے نمونیہ ہو گیا ہے۔ مجیب کو فوری طور پر وہاں پہنچنا ہے۔ یہ ساری باتیں تھیں اس ٹیلی گرام میں۔

پہلا سوال اس کے ذہن پر چھا گیا۔ صفورہ کون ہے؟ کون ہو سکتی ہے؟ جواب بہت آسان تھا.... بہت سادہ.... لیکن اسے قبول کرنا' اس کی کاٹ سہنا بہت مشکل تھا۔ مگر اسے اس دشوار مرحلے سے گزرنا تھا۔ ایک بہت آسان حل بھی تھا اس مسئلے کا۔ وہ اس ٹیلی گرام کو پھاڑ کر پھینک دے اور مجیب کو پتہ ہی نہ چلنے دے کہ وہ آیا تھا۔ کوئی اور عورت ہوتی تو شاید یہی کرتی۔ لیکن وہ ایسی نہیں تھی۔ یہ خیال اس کے ذہن میں آیا ضرور۔ لیکن فوراً ہی اس نے اس کے ممکنہ نتائج کے بارے میں سوچا۔ بات چھپنے والی نہیں۔

مجیب کو اپنے ڈسپیچ رائڈر ہی سے معلوم ہو جاتا کہ اس کے نام ٹیلی گرام آیا تھا' جو سحاب نے لیا تھا۔ اور پھر اس ٹیلی گرام کے بعد ایک اور ٹیلی گرام بھی تو آنے کا امکان تھا۔ صفورہ مر رہی ہے کی جگہ صفورہ مر چکی ہے۔

کاش ایسا ہی ہو۔ اس کے اندر کسی نے کہا۔

یہ صفورہ کون ہے؟ اس نے تیسری بار خود سے پوچھا۔ جواب اسے معلوم تھا۔

اپنے خوف سے گھبرایا ہوا مجیب اسے اپنے ساتھ مری لے کر گیا ہو گا۔

یہاں تک تو بات ٹھیک تھی۔ مگر اب چار مہینے گزر جانے کے بعد بھی.... مجیب کے واپس آ جانے کے بعد بھی یہ صفورہ مری میں ہی کیوں ہے؟"

ہو سکتا ہے' وہ وہیں کی رہنے والی ہو۔ لیکن نام تو ایسا نہیں لگتا۔

چلو' یہ بھی مان لیا۔ تو اس کے نمونیا میں مبتلا ہونے کی.... موت کے قریب پہنچنے کی اطلاع مجیب کو کیوں دی جا رہی ہے۔ مجیب سے اس کا کیا تعلق؟ مجیب واپس آ گیا' تعلق ختم۔ تو کیا یہ ٹیلی گرام مہمل ہے؟

تم سمجھ رہی ہو۔ مگر سمجھنا نہیں چاہتیں۔ سحاب کے اندر کسی نے کہا۔ اس طرح کی اطلاع گہرے تعلق کی بنا پر ہی دی جاتی ہے۔ متعلقین کو.... گھر والوں کو.... گھر والے کو! اس آخری بات پر سحاب سمٹ سی گئی۔ کیا مجیب نے اس صفورہ سے شادی کر لی ہو گی؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیوں نہیں ہو سکتا۔ ایسا ہوا ہے۔ ٹیلی گرام کھل کر بتا رہا ہے۔

مگر کیوں؟ مجیب نے اس سے شادی کیوں کی ہو گی؟

اس سوال کا جواب تو مجیب ہی دے گا۔ مگر وہ اندازہ لگا سکتی ہے۔ اس نے مجیب کو بھی بتایا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ مجیب کے ساتھ کسی عورت کا رہنا آگ اور پٹرول کا ساتھ نہیں وہ ہائیڈروجن اور آکسیجن کا ساتھ ہے۔ جب تک عمل انگیز نہیں ہو گا' جب تک برقی رو نہیں دوڑے گی' دونوں گیسیں الگ الگ رہیں گی.... اپنا تشخص برقرار رکھیں گی۔ مگر برقی رو کے دوڑتے ہی پانی بن جائے گا۔ وہ مجیب کو سمجھتی تھی۔ جانتی تھی کہ خالص کال گرل میں اسے کبھی کشش محسوس نہیں ہو گی۔ لیکن کوئی گھریلو' عام سی لڑکی' جسے حالات کے جبر نے کال گرل بنا دیا ہو اور پھر بھی وہ پوری طرح نہیں بن سکی ہو' وہ مجیب کو متاثر کر سکتی ہے۔ مجیب نے یہی غلطی کی ہو گی۔ وہ کسی ایسی لڑکی کو اپنے ساتھ لے گیا ہو گا اور پھر....!

مگر یہ تصور بھی ناقابل یقین تھا کہ مجیب شادی کر سکتا ہے۔ اور اگر کر لی تو اسے بتایا کیوں نہیں؟

اس پر سحاب کو یاد آیا کہ مری سے واپسی کے بعد مجیب کھویا کھویا سا رہنے لگا

ہے۔ بارہا ایسا لگا کہ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ لیکن عین وقت پر اس نے بات نوک زبان پر روک لی۔ کئی بار اس نے ٹوکا بھی۔ مگر مجیب نے بہانہ کر دیا کہ وہ کہانی کے بارے میں سوچ رہا ہے.... کہانی میں گم ہے۔ اور ایسی صورت حال میں وہ ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ اور اس کی اپنی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ میں گم تھی۔ زیادہ غور نہ کر سکی۔ غور کرتی تو سمجھ لیتی۔

تو مجیب نے اس کو کیوں نہیں بتایا۔ کیا وہ ڈر رہا ہے؟ نہیں.... یہ بات نہیں ہو سکتی۔ وہ صاف گو ہے۔ لیکن جب آدمی چوری کر بیٹھے' مجرم بن جائے تو اس کے اوصاف دب جاتے ہیں۔ چوری کیسی' کہاں کا جرم؟ دوسری شادی کوئی گناہ تو نہیں۔

وہ اپنے آپ سے الجھتی' بحث کرتی رہی۔ پھر اسے اس الجھن کا جواب بھی مل گیا۔ مجیب اسے بتانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی طبیعت کی وجہ سے.... اس کے بلڈ پریشر کی وجہ سے بتانے کی ہمت نہیں کر سکا۔ ہاں.... یہی بات ہے۔

اب خود کو ٹٹولنا تھا۔ اس نے فلائٹ پر دو سیٹیں کیوں ریزرو کرائی ہیں؟ اس لئے کہ مجیب کا جانا ضروری ہے۔ اور وہ اسے تنہا نہیں جانے دینا چاہتی۔ وہ ساتھ جائے گی۔ وہ منہ نہیں چھپائے گی۔ صورت حال کا سامنا کرے گی اوز اس معاملے کو دفن کر کے ہی واپس آئے گی۔ ہو سکتا ہے۔ زندگی میں ایسے بحران آتے ہی رہتے ہیں۔ سامنا کیا جائے تو گزر جاتے ہیں۔ اسے بھی سامنا کرنا ہے۔

اختر ساڑھے دس بجے ٹکٹ لے کر آیا "آپا.... کچھ بتائیں تو۔"

"واپسی پر بتاؤں گی۔"

امی بھی پریشان ہو گئیں "تم اس حال میں جاؤ گی؟"

"یہ ضروری ہے امی۔"

امی اس کے اس لہجے کو پہچانتی تھیں۔ سمجھ گئیں کہ اب اسے روکا نہیں جا سکتا۔

"اور بچوں کا کیا ہو گا؟"

"بچوں کی موسم سرما کی چھٹیاں شروع ہو چکی ہیں۔ آپ کے یہاں جانے کی ضد بھی کر رہے تھے۔ ایک ہفتہ وہاں رہ لیں گے۔"

سحاب کو خود بھی حیرت ہوئی کہ سب کچھ کتنی آسانی سے طے ہو رہا ہے۔ بچوں

نے یہ سنا تو خوش ہو گئے۔ ان کا بس چلتا تو اسی وقت اختر کے ساتھ چلے جاتے۔ "دیکھو.... تم لوگوں کے کپڑوں اور ضروری چیزوں کا بیگ بھی تیار کرنا ہے۔" سحاب نے نرم لہجے میں انہیں سمجھایا "اور پھر کل ابا اسپتال سے آئیں گے۔ ان سے نہیں ملو گے۔"

"ان سے روز تو ملتے رہے ہیں اسپتال میں۔" حامد نے کہا۔

"بس کل چلے جانا۔"

بات ختم ہو گئی۔ مگر اس رات سحاب ٹھیک سے نہیں سو سکی۔



مجیب صبح دس بجے گھر واپس آ گیا۔ بارہ بجے تک امی اور اختر بچوں کو لے کر چلے گئے۔ مجیب نے اس پر احتجاج کیا۔ لیکن سحاب کے لہجے میں قطعیت محسوس کرتے ہوئے زور نہیں دیا۔ اسے احساس تھا کہ اس کے اسپتال میں قیام کے دوران سحاب کو کتنی ٹینشن رہی ہو گی۔

وہ اکیلے ہوئے تو مجیب نے کہا "تم نے بچوں کو خوامخواہ بھیج دیا۔ میں کب سے ان کو ترسا ہوا تھا۔"

"صرف دس دن سے۔" سحاب کے لہجے میں کاٹ تھی "اس سے پہلے تم پانچ ماہ ان سے دور رہ چکے ہو۔ اس وقت تو ایسی تڑپ نہیں تھی۔ کیوں؟"

مجیب نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ پہلی بار ایسے لہجے میں بات کر رہی تھی۔ یقیناً بلڈ پریشرہائی ہو گیا۔ گویا اسے تحمل سے کام لینا ہے۔

"یہ تنہائی ضروری تھی۔ مجھے کچھ باتیں کرنی ہیں تم سے.... کچھ پوچھنا ہے۔"

مجیب اور دباؤ میں آ گیا۔ نجانے کیا مسئلہ ہے۔ اس نے سوچا "ضرور کرو۔ پوچھو کیا پوچھنا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ جمشید کون ہے؟"

ایک لمحے میں مجیب نے بہت تیزی سے بہت کچھ سوچا۔ ممکن ہے' جمشید نے فون کیا ہو۔ سحاب بہرحال اسے نہیں جانتی تھی۔ مگر سحاب کا رویہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا "میرا ایک پرانا دوست ہے۔ پنڈی میں رہتا ہے۔"

"اور صفورہ کون ہے؟"

مجیب کی چھٹی حس جمشید کے تذکرے پر ہی اسے خبردار کر رہی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ اس کے لئے دھماکا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ آواز بند ہو گئی۔

"گویا میرا اندازہ درست تھا۔" سحاب نے زہریلے لہجے میں کہا "اور تم بزدل بھی نکلے۔ تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔"

مجیب کا ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ "میں نے تمہاری طبیعت کی وجہ سے نہیں بتایا۔ ورنہ تم جانتی ہو کہ میں بزدل نہیں ہوں۔ بزدل ہوتا تو یہ قدم اٹھاتا ہی نہیں۔"

"چلو' اب بتا دو۔" سحاب نے سرد لہجے میں کہا "میں منتظر ہوں۔"

مجیب اسے شروع سے بتانے لگا۔ اس نے کہیں جھوٹ نہیں بولا.... مصلحتاً بھی نہیں۔ سحاب خاموشی سے سنتی رہی۔ وہ اشتہار والے مرحلے تک پہنچا تو وہ اچھل پڑی۔ اور جب مجیب نے صفورہ کی سنائی ہوئی کہانی دہرائی تو اس کی حیرت دیدنی تھی "یہ.... یہ وہ لڑکی تو نہیں' جس نے الٰہ آباد.... انڈیا سے تمھیں دو خط لکھے تھے.... گمنام خط؟" اس نے پوچھا۔

مجیب کو ایک اور شاک لگا "تم.... تمہیں کیسے معلوم؟"

"ہاں۔ ہونا تو نہیں چاہئے تھا۔ تم نے تو مجھ سے چھپائے تھے وہ خط۔ تمہارے مری میں قیام کے دوران میں تمہاری ڈاک لے کر بیٹھی تھی تو وہ خط نظر آئے تھے۔"

"اوہ...." مجیب اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

"ہائے مجیب' یہ تم نے کیا کر دیا۔ کاش.... تم آتے ہی مجھے بتا دیتے سب کچھ۔"

سحاب کا لہجہ ایک دم بدل گیا تھا۔ مجیب نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا "کیا فرق پڑ جاتا اس سے؟"

"سچ بتاؤ مجیب' یہ صفورہ وہی لڑکی ہے؟" سحاب نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔

"سو فی صد وہی ہے۔ جھوٹ کیوں بولوں گا میں۔ ہاں یہ ایسی حقیقت ہے کہ اس پر گھڑے ہوئے قصے کہانی کا گمان ہوتا ہے.... خود مجھے بھی۔"

"اللہ کے کھیل نیارے ہیں...."

"مطلب کیا ہے؟"

"مجیب' اس لڑکی کے خطوں نے میرا دل جیت لیا تھا۔ جانتے ہو' مجھے افسوس ہوا تھا کہ اس نے اپنا پتا نہیں لکھا۔ لکھا ہوتا تو میں خود اسے جوابی خط لکھتی۔ لکھتی کہ تم آ جاؤ۔ میں خود اپنے شوہر سے تمہاری شادی کراؤں گی۔ تم دنیا میں وہ واحد ہستی ہو' جس کے ساتھ میں اپنا شوہر بھی شیئر کر سکتی ہوں اور اس کی محبت بھی...."

مجیب حیرت سے منہ کھولے اسے تک رہا تھا.... اس کی بات سن رہا تھا۔

"اور میں اپنی سوچ میں اتنی پکی تھی کہ تم نے مجھے بتا دیا ہوتا تو میں خود جا کر اسے یہاں لے آتی۔ یہ اس کا بھی گھر ہے۔ مگر تم نے بہت زیادتی کی مجیب۔ پتا ہے' ٹیلی گرام آنے کے بعد سے اب تک میں کتنی ہی بار اس کی موت کی خواہش کر چکی ہوں؟"

مجیب اچھل کر کھڑا ہو گیا "کیسا ٹیلی گرام؟" اس نے چیخ کر کہا۔ موت کے تذکرے پر اس کا دل ڈوبنے لگا تھا۔

"سوری.... میں نے تمہیں بتایا ہی نہیں۔" صفورہ نے کہا اور ٹیلی گرام اس کی طرف بڑھا دیا۔

مجیب نے ٹیلی گرام پڑھا۔ اس کا جسم لرز رہا تھا "یہ کب آیا؟"

"کل رات۔"

"مجھے فوراً جانا ہے سحاب۔"

"پریشان نہ ہوں۔ میں سب بندوبست کر چکی ہوں۔" سحاب نے کہا۔ وہ اٹھ کر گئی اور الماری میں سے ٹکٹ نکال لائی۔ وہ اس نے مجیب کی طرف بڑھا دیئے "پانچ بجے کی فلائٹ ہے۔ ہمیں تین بجے ائرپورٹ پہنچنا ہے۔"

مجیب نے ٹکٹوں کو حیرت سے دیکھا۔ دوسرے ٹکٹ پر سحاب کا نام تھا "تم کیا سوچ کر جا رہی تھیں؟"

"میں بحران کا سامنا کر کے اسے ختم کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اب اس کی ضرورت نہیں۔"

مجیب نے اطمینان کی سانس لی "خدا کا شکر ہے۔ تم اس حالت میں سفر نہیں کر سکتیں۔"

"سفر تو میں کروں گی۔ مجھے جانا ہے۔ نہ جا سکی تو ساری عمر خود کو معاف نہیں کر سکوں گی۔"

"یہ ممکن نہیں ہے سحاب۔"

"نہیں مجیب۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ اس سے ملوں گی' اسے سب بتاؤں گی' کہوں گی کہ وہ مجھے بہت عزیز ہے۔ اسی لئے اتنی تکلیف اٹھا کر آ رہی ہوں۔ اس سے اسے حوصلہ ہو گا اور وہ اپنی جنگ جیتے گی۔ میں اسے بتاؤں گی کہ یہ گھر.... اس کا گھر اس کا منتظر ہے۔"

اس کے جذبے نے مجیب کے دل کو چھو لیا۔ لیکن وہ کوشش کے باوجود اسے نہ روک سکا۔ اچانک اس کی نظر گھڑی پر پڑی "ارے.... ڈھائی بج گئے۔" اس نے گھبرا کر کہا "تین بجے ائرپورٹ پہنچنا ہے۔ تیاری بھی تو کرنی ہے۔"

"اس کی فکر نہ کریں۔" سحاب نے مسکراتے ہوئے کہا "دونوں بیگ تیار ہیں۔"

"تم کتنی اچھی ہو سحاب۔" مجیب نے اسے محبت سے دیکھا "ہر چیز کا.... ہر بات کا پہلے سے خیال رکھنے والی۔"



بخار بہت تیز تھا۔ صفورہ پر غشی طاری تھی۔ شبانہ نے اسے دھیرے سے ہلایا۔

"آنکھیں کھولو صفورہ.... دیکھو تو کون آیا ہے۔"

صفورہ نے آنکھیں کھولیں۔ جو چہرہ اس کے سامنے تھا' وہ صرف خواب میں ہی آ سکتا تھا "آپا.... آپ سچ مچ تو نہیں آ سکتیں۔" سحاب کو حیرت ہوئی کہ وہ اسے آپا کہہ رہی ہے۔ یہ اس کی ضد تھی کہ سب سے پہلے صفورہ کو وہ اپنا چہرہ دکھائے گی۔ اس نے سرگوشی میں مجیب سے کہا "بہت تیز بخار ہے۔ یہ مجھے اپنی بڑی بہن سمجھ رہی ہے۔"

مجیب کی آنکھیں بھیگنے لگیں "اس کی کوئی بڑی بہن نہیں ہے۔ یہ تمہیں آپا کہتی ہے۔ تمہاری تصویر یہ ہزاروں بار دیکھ چکی ہو گی۔"

ایک لمحے کو سحاب کی آنکھوں میں حیرت چمکی اور فوراً ہی آنسو بن گئی۔ اس بار اس نے خود صفورہ کو ہلایا "صفورہ.... یہ سچ مچ میں ہوں.... تمہاری آپا.... سحاب۔"

شبانہ انہیں کمرے میں اکیلا چھوڑ کر چلی گئی۔

صفورہ نے پھر آنکھیں کھولیں "ناممکن...." وہ بڑبڑائی۔

وہ آنکھیں بند کرنے والی تھی کہ سحاب نے اس کا ہاتھ تھام لیا "میں حقیقت ہوں صفورہ۔ تم سے ملنے اتنی دور سے آئی ہوں۔"

اس بار صفورہ کی آنکھیں کھل گئیں۔ پھر اسکی مجیب پر نظر پڑی اور وہ رونے لگی "خدا کی قسم.... میں آپ کو' آپا کو تکلیف نہیں دینا چاہتی تھی۔" اس نے بڑی مشکل سے بات پوری کی اور ہانپنے لگی۔

"تکلیف کیسی۔ ہم تمہیں تمہارے گھر لے جانے کے لئے آئے ہیں۔" سحاب نے کہا۔

"ہاں آپا۔ جانا تو مجھے ہے۔ اچھا کیا' آپ آ گئیں۔ مجھے آپ سے معافی مانگنی تھی۔ آپ معاف کر دیں گی تو سکون سے چلی جاؤں گی۔" صفورہ خود پر جبر کر کے بات کر رہی تھی۔

مجیب کو خجل ہونے کا احساس ہونے لگا۔ اس نے صفورہ کا ہاتھ تھاما اور اسے سہلانے لگا۔ صفورہ نے ملتجیانہ نگاہوں سے اسے دیکھا "صفورہ.... میں ذرا ڈاکٹر سے بات کر لوں۔ ابھی آتا ہوں۔ تم پریشان مت ہونا۔"

صفورہ کی آنکھوں میں تشکر چمکا "میں پریشان کیوں ہوں گی۔ میرے پاس آپا جو ہیں۔"

مجیب باہر نکلا اور جمشید کے ساتھ ڈاکٹر کے کمرے کی طرف چلا گیا۔

مجیب کے جانے کے بعد صفورہ نے کہا "میں بہت بری ہوں آپا۔ مجھے معاف...."

"صفورہ پلیز۔" سحاب نے اس کی بات کاٹ دی "پہلے میری بات سن لو۔ اسی لئے تو میں آئی ہوں۔ یہ سب کچھ مجیب سے کہلواتی تو تمہیں یقین نہ آتا۔"

سحاب بولتی رہی اور صفورہ سنتی رہی۔ پل پل اس کے چہرے کے تاثرات بدلتے۔ کبھی وہ حیران نظر آتی تو کبھی شکرگزار۔ کبھی وہ خوش ہوتی تو کبھی افسردہ۔

"میں اس حال میں تمہیں یہی بتانے کے لئے آئی ہوں۔" سحاب نے آخر میں کہا "...کہ میں تمہیں اپنی بہن سمجھتی ہوں۔ وہ گھر ہم دونوں کا ہے اور ہم انشاء اللہ وہاں بہت خوش رہیں گے۔ محبت سے۔ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔"

صفورہ رونے لگی "آپا۔ میں آپ کو بتا بھی نہیں سکتی۔ اتنی طاقت ہی نہیں ہے مجھ میں۔ میری ڈائری پڑھ لیجئے گا۔ وہ سب کچھ بتا دے گی۔"

"ڈائری کیوں پڑھوں۔ تمہارے اور اپنے گھر میں بیٹھ کر تمہاری زبان سے ہی سنوں گی۔"

"یہ نہیں ہو سکے گا آپا۔ میں جانتی ہوں کہ میں بچوں گی نہیں۔"

"فضول باتیں نہ کرو۔" سحاب نے اسے ڈانٹا "میں تمہاری ساری محرومیاں دور کرنے کے لئے آئی ہوں۔ یوں محروم جانے نہیں دوں گی تمہیں۔"

"نہیں آپا۔ میں محروم نہیں۔ یہ کہنا تو ناشکری ہے۔ اللہ کا شکر' کرم' احسان کہ اتنے کم وقت میں مجھے اس نے سب کچھ دے دیا۔ جو بھی میں نے چاہا۔ حالانکہ میں مستحق نہیں تھی اس کی۔ کیسی عزتیں ملیں مجھے۔ جبکہ میں ذلتوں کی مستحق تھی۔ کیسی محبتیں ملیں مجھے۔ جبکہ میں نفرتوں کی حق دار تھی۔ کیا کچھ نہیں ملا مجھے۔ میں تو سیر ہو کر جا رہی ہوں..... اور مر کر بھی زندگی چھوڑ جاؤں گی میں۔ مجھے کوئی شکایت نہیں۔ ہو ہی نہیں سکتی۔ آپ کی محبت ملنے کے بعد تو کوئی تمنا ہی نہیں رہی۔" وہ کہتے کہتے رکی' سحاب کو روتے دیکھا تو بولی "آپا پلیز' آپ مت روئیں۔ آپ نے تو آخر میں سب کچھ دے دیا مجھے۔ مجھے اپنی ہر خوشی ناجائز لگتی تھی۔ آپ نے محبت کے زمزم سے دھو کر پاک کر دیا سب کو۔"

اس کی سانس اکھڑنے لگی تھی "بس..... اب آرام کرو۔ بولو مت۔" سحاب نے کہا۔

"ایک بات کہنی ہے آپا۔ مجھے معلوم ہے' میرے ہاں بیٹی پیدا ہو گی اور آپ کے ہاں بیٹا۔ آپ کے بیٹے کا نام میں رکھ رہی ہوں۔ خالد۔ میری بیٹی کا نام آپ رکھئے گا۔ اور آپا' میری بیٹی کی زندگی تو میری طرح نہیں ہو گی نا۔ وہ پاک' آزاد زمین پر پیدا ہو رہی ہے۔ ٹھیک ہے نا آپا؟"

"ٹھیک ہے گڑیا۔ اب سو جاؤ۔"

"ایک بات مانیں گی؟" صفورہ نے بچوں کے سے انداز میں کہا۔

"ضرور۔ کہہ کر دیکھو۔"

"یہاں..... میرے پاس لیٹیں مجھ سے لپٹ کر۔ سردی بہت لگ رہی ہے۔"

مجیب' جمشید اور شبانہ واپس آئے تو انہیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی بے خبر سو رہی تھیں۔ وہ دبے پاؤں یوں باہر آئے' جیسے کسی کی عبادت میں مخل ہو کر پلٹے ہوں۔

"یار مجیب..... تم بہت خوش نصیب ہو۔" جمشید نے رشک آمیز لہجے میں کہا "اتنی اچھی..... اتنی پیاری..... اور وہ بھی دو دو۔"

"کہو تو تمہارے لئے بھی بھابی سے بات کر لوں۔" مجیب نے ہنس کر کہا۔

"بات کر دیکھو۔ لیکن ہماری ایسی قسمت کہاں۔"

شبانہ نے آنکھیں نکالیں اور جمشید خاموش ہو گیا۔

"تم دونوں نے بڑی تکلیف اٹھائی ہے۔ اب بنگلے واپس جاؤ اور اچھی طرح نیند پوری کرو۔" مجیب نے ان دونوں سے کہا۔

وہ جانا نہیں چاہ رہے تھے۔ مگر مجیب نے زبردستی انہیں بھیج دیا۔



مجیب نے اجازت نامے پر دستخط کر دیئے تھے۔ صبح وہ صفورہ سے ملا۔ دیر تک وہ اور سحاب' صفورہ سے باتیں کرتے رہے۔ پھر سحاب نے انہیں تنہائی فراہم کی۔ منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہونے کا کہہ کر وہ کمرے سے چلی گئی۔

"مجھے آپ سے بہت کچھ کہنا تھا۔" صفورہ نے آہستہ سے کہا۔

"تو کہو نا۔"

"اب ضرورت ہی نہیں رہی۔ میں کتنی خوش نصیب ہوں۔ آپا بہت اچھی ہیں۔"

مجیب کو اس کی گفتگو بے ربط لگی "ضرورت کیوں نہیں رہی۔"

وہ ہنس دی۔ "سب کچھ آپا سے جو کہہ دیا۔"

"تو میری وقعت ختم۔ آپا آئیں' انہوں نے دیکھا اور فتح کر لیا۔"

صفورہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا "ایسا نہیں کہیں۔ آپ کی وقعت.... آپ تو سب ہیں ہر چیز کل۔ ہر خوشی کل۔ لیکن میں نہیں چاہتی کہ بعد میں آپ بہت دکھی ہوں۔ مجھے یاد کریں۔"

مجیب نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا "اچھی باتیں سوچو' اچھی باتیں کرو۔"

"مجیب' مجھے آپ سے صرف ایک بات کہنی ہے۔ اور وہ بھی کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہہ رہی ہوں کہ پھر کبھی کہہ نہیں سکوں گی۔ میں نے آپ سے بہت سچی محبت کی ہے۔ ہر چیز سے' ہر ہستی سے.... اپنی زندگی سے بھی زیادہ چاہا ہے آپ کو۔ یوں سمجھ لیں کہ میں زمین تھی اور آپ سورج۔ میری ہر غلطی معاف کر دیں۔"

"معافی تو مجھے مانگنی ہے۔ بہت زیادتیاں کیں...."

"اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے اللہ نے ہم دونوں کو معاف کر دیا۔ اس کے بعد کسی معافی کی ضرورت نہیں۔"

"مگر تم ایسی باتیں مت کرو۔"

"دیکھیں مجیب' حقیقت یہ ہے کہ اب جو میں آپریشن تھیٹر جاؤں گی تو زندہ واپس نہیں آؤں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ جھوٹی آس رکھیں۔ اس سے اذیت بڑھ جاتی ہے۔"

مجیب کچھ کہنے لگا تو اس نے اسے روک دیا "محبتیں اور قربتیں بھی رزق کی طرح ہوتی ہیں۔ جتنا نصیب میں ہو اتنا ضرور ملتا ہے۔ سمجھ لیں کہ ہمارا ساتھ اتنا ہی تھا۔ یہیں تک تھا۔ اور کیونکہ بہت اچھا تھا۔ اس لئے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میں دنیا سے اتنی سیراب' اتنی خوش و خرم رخصت ہوں گی۔ یہ سب اللہ کا کرم ہے۔ گواہ رہئے کہ میں آخری سانس تک اس کا شکر ادا کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔"

"لیکن صفورہ...."

"میں مطمئن جا رہی ہوں۔ اس لئے کہ آپا بہت اچھی ہیں۔ انہیں دیکھنے' ان سے ملنے کے بعد مجھے آپ کی فکر.... پریشانی نہیں رہی۔"

مجیب کے لئے اپنے اوپر قابو رکھنا دشوار ہو رہا تھا۔ اسی وقت جمشید اور شبانہ بھی

آ گئے۔



نرسوں نے اسٹریچر کو لیبر روم کے دروازے پر روکا۔ وہاں مجیب' سحاب' جمشید اور شبانہ کے علاوہ شکور' فاطمہ اور افضل خان بھی تھے۔ صفورہ نے کمزور آواز میں ان سب کا شکریہ ادا کیا۔ پھر سحاب اور مجیب سے کہا "الوداع مجیب.... الوداع آپا۔ دیکھیں.... روئیے گا نہیں۔ یاد رکھئے گا کہ میں خالی دامن لے کر آئی تھی اور خوشیوں سے جھولی بھر کر جا رہی ہوں۔ اور شبانہ آپا.... جمشید بھائی' آپ تو میرے بابل ہیں۔ اللہ آپ کو جزائے عظیم عطا فرمائے۔ الوداع۔"

اسٹریچر اندر چلا گیا۔ لیبر روم کا دروازہ بند ہو گیا۔ سحاب بری طرح رو رہی تھی۔ سبھی رو رہے تھے۔ سحاب کو اچانک چکر آیا۔ وہ گرنے لگی۔ مجیب نے اسے تھام لیا۔ اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔

وہ ایک غیر معمولی دن تھا۔ سحاب کو بھی لیبر روم میں لے جایا گیا۔ 27 دسمبر کو ٹھیک بارہ بجنے میں دس منٹ پر مجیب انور دو الگ الگ بیویوں سے دو بچوں کا باپ بنا۔ سحاب سے اسے بیٹا اور صفورہ سے بیٹی ملی۔ لیکن صفورہ بچی کو جنم دینے کے دوران ہی چل بسی۔

دو گھنٹے بعد مجیب سحاب کے پاس بیٹھا تھا۔ "بیٹا مبارک ہو۔" اس نے کہا۔

"صفورہ کی بات سچ نکلی۔" سحاب نے کہا۔

مجیب نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"اس نے کہا تھا کہ اس کے ہاں بیٹی اور میرے ہاں بیٹا ہو گا۔ اس نے بیٹے کا نام خالد تجویز کیا تھا اور کہا تھا کہ بیٹی کا نام میں رکھوں۔"

"اس کے ہاں بیٹی ہی ہوئی ہے۔" مجیب نے کہا۔

"اور صفورہ؟"

"وہ خیریت سے ہے۔" مجیب نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"جھوٹ مت بولیں۔ میں جانتی ہوں' وہ [illegible]

مجیب نے سر جھکا لیا۔

"اپنی بیٹی کا نام میں تجویز کرتی ہوں۔۔۔ طیبہ۔" سحاب نے کہا "اور خالد اور طیبہ جڑواں بہن بھائی ہیں۔"

"وہ تو ہیں۔ دونوں کی پیدائش کے وقت میں بمشکل چند سیکنڈ کا فرق ہے۔" مجیب نے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔



سحاب نے صفورہ کی ڈائری بند کر کے ایک طرف رکھ دی "مجھے رشک آتا ہے صفورہ پر۔ کاش میں اتنی محبت کر سکتی آپ سے۔" وہ بولی۔ مجیب نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ وہ اور سحاب اب تک یہ ڈائری کئی کئی بار پڑھ چکے تھے۔

"کیسی افسانوں جیسی بات ہے۔" سحاب نے مزید کہا "وہ آپ کو محسوس کر سکتی تھی۔ دور رہ کر بھی جان لیتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ آپ بیمار ہیں۔ اور وہ آپ پر قربان ہو گئی۔ وہ دعا کرتی رہی کہ اس کی زندگی آپ کو مل جائے۔ اور کیسی مقبول دعا تھی وہ۔ مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ آپ بہت جئیں گے۔"

مجیب کا گلا رندھ گیا تھا۔ اس سے بولا بھی نہیں گیا۔

"اور یہ غزل۔۔۔ کیسے کیسے شعر ہیں اس میں۔" سحاب نے کہا "سچے شعر ہیں۔ مجھ سے فرشتے سیکھیں گے آداب بندگی۔ میں نے عبادتوں کو محبت بنا دیا۔" پھر سحاب نے انڈیا سے آیا ہوا خط نکال لیا اور کھول کر پڑھنے لگی۔

پیارے بیٹے مجیب!

اور پیاری بیٹی سحاب!

پیار اور دعائیں'

تمہارا خط ملا۔ دکھ ایسا تھا کہ دل خون ہو گیا۔ لیکن پھر ہم نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ جس کو جتنی زندگی ملے' وہ اتنا ہی جیتا ہے۔ شکر کا مقام یہ ہے کہ آدمی کو تمام من پسند خوشیاں مل جائیں۔ ہم جانتے ہیں۔ صفورہ کے خطوط گواہ ہیں کہ وہ بہت خوش رہی۔ تم نے ہماری غریب الوطن بچی کا دامن خوشیوں سے بھر دیا۔ ہمیں خوشی ہے مجیب بیٹے کہ وہ تمہارے ہاتھوں لحد میں

اتری۔ اور بیٹی تمہارے خط نے ثابت کر دیا کہ صفورہ بے سبب تمہاری تعریفیں نہیں کرتی تھی۔ اپنی نواسی طیبہ کی تصویر دیکھ کر ہمارا دکھ کم ہو گیا۔ جی خوش ہوا۔ اللہ اس کے نصیب اچھے کرے۔ بہت اچھی بچی ہے۔ اور خوش نصیب ہے کہ بیٹی سحاب کے ہاتھوں میں پلے گی۔ تم شوق سے انڈیا آؤ ہمارے پاس رہو۔ جو رشتہ صفورہ جوڑ کر گئی ہے' وہ ٹوٹا نہیں ہے۔ بہت پکا ہے وہ۔ یہ گھر تمہارا ہے۔ اور سنو' تمہارے تمام بچے ہمارے نواسی نواسے ہیں۔ ہم تمہاری آمد کا انتظار کریں گے۔ ہم تم لوگوں کے بہت شکرگزار ہیں۔

والسلام

تمہارے والد اور والدہ

ناظورہ احمد اور سفیان احمد

یہ اس خط کا جواب تھا' جو مجیب اور سحاب نے صفورہ کی موت کے بعد مل کر لکھا تھا۔ اب اپریل کا مہینہ تھا۔ بچوں کے امتحان ختم ہو چکے تھے۔ ننھا خالد اور طیبہ چار ماہ کے ہو چکے تھے۔ انڈیا کا ویزا مل گیا تھا۔ دو دن بعد ان کی روانگی تھی۔ انہوں نے سوچا تھا کہ پہلے تین چار دن صابر کے یہاں۔۔۔ صفورہ کے چچا کے ہاں ٹھہریں گے۔

"وہ لوگ شکایت کریں گے کہ ہم نے انہیں صفورہ کی موت کی اطلاع کیوں نہیں دی۔" سحاب نے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ ہم انہیں حالات کا بتائیں گے تو وہ سمجھ جائیں گے۔ ویسے بھی مجھے یہ اطلاع دینا مشکل لگ رہا تھا۔ اب روبرو۔۔۔ اور بات ہو گی۔"

تین دن بعد وہ لاہور پہنچے۔ صفورہ کے چچا کے یہاں سب انہیں بڑی محبت سے ملے۔ کسی نے کوئی شکایت نہیں کی۔ لیکن صابر وہاں موجود نہیں تھا۔

"ہوٹل نے مری میں برانچ کھولی تو انہیں مینجر بنا دیا" صابر کی بیوی نے کہا "ایک ہفتہ ہو گیا انہیں گئے ہوئے۔"

"ان کا فون نمبر ہے آپ کی پاس؟"

"جی ہاں۔"

مجیب نے فون نمبر لے لیا۔

○

شام کا وقت تھا۔ صابر ہوٹل سے چہل قدمی کے لئے نکلا۔ ابھی سیزن شروع نہیں ہوا تھا۔ اس لئے فرصت تھی۔ اس نے سوچا' اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کیوں نہ وہ مری کو اچھی طرح دیکھ لے۔ یہی سوچ کر وہ نکل آیا تھا۔

لیکن وہاں دیکھنے کو بہت زیادہ نہیں تھا۔ ہر سڑک اور اس کا گرد و پیش ایک سا لگتا تھا۔ وہ چلتا رہا۔ خاصا اوپر جا کر اسے ایک خوب صورت بنگلا نظر آیا۔ وہ کافی بڑا بنگلا تھا۔ اس سے آگے گیا تو اسے کچھ قبریں نظر آئیں' جن پر نرگس کے پھول تھے۔

وہ فاتحہ پڑھنے کی غرض سے اس طرف چلا گیا وہاں چار قبریں تھیں۔ اس نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ مگر پتھر کا بت بن کر رہ گیا۔ وہ بت بنا اس کتبے کو دیکھ رہا تھا۔ کتبے پر جو نام تھا' اس نے اسے کیا کچھ یاد دلا دیا۔ صفورہ مجیب۔

عجیب نام تھا وہ۔ اس نے اسے دو نام یاد دلائے۔ صفورہ جو اسے بہت محبوب تھی۔ اور مجیب جو صفورہ کو بہت محبوب تھا۔ کیسی عجیب بات تھی۔ اس نام میں وہ دونوں نام یکجا ہو گئے تھے۔ اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ نجانے کہاں ہو گی صفورہ۔۔۔ اور کس حال میں ہو گی۔ کاش۔۔۔ کاش یہ اسی کی قبر ہو۔ اس نے دل میں خواہش کی اور پھر خود ہی اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے لگا۔ ارے اسے تو یہ دعا کرنی چاہئے کہ وہ بخیر و عافیت اور خوش و خرم ہو۔

اس نے تاریخ وفات دیکھی۔۔۔ 27 دسمبر 1997ء۔۔۔ ابھی کی بات ہے۔ شاید۔۔۔

نیچے ایک شعر لکھا تھا۔

لے آئی اڑا کر اسے' احسان ہوا کا
مٹی تو یہاں کی تھی وہ رہتی تھی کہیں اور

مگر وہ قبر۔۔۔ وہ نام صفورہ مجیب اس کے لئے خلش بن گیا۔ راستے میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ ہوٹل پہنچتے ہی وہ کراچی فون کرے گا اور مجیب انور سے بات کرے گا۔

وہ اس سے پوچھے گا کہ یہ کیسا اتفاق ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ۔۔۔

لیکن ہوٹل پہنچ کر وہ چار بار ٹرائی کرتا رہا۔ بیل جا رہی تھی۔ لیکن ریسیور کوئی نہیں اٹھا رہا تھا۔ شاید مجیب کے گھر پر کوئی نہیں تھا۔ اس نے مایوس ہو کر ریسیور رکھ۔ یہ خلش اسے ستاتی رہے گی۔ وہ سوچ رہا تھا۔

اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا "صابر اسپیکنگ!"

"صابر بھائی' میں مجیب بول رہا ہوں۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

صابر حیران تھا "کون مجیب؟"

"مجیب انور۔۔۔ رائٹر!"

○